اردو میں خواتین کے سفر نامے

مقالہ برائے ایم فل (اردو)

مقالہ نگار

شریٰ علم الدین

سسٹنٹ پروفیسر (اردو)

رنمنٹ کالج برائے خواتین

مدینہ ٹاؤن فیصل آباد

نگران

ڈاکٹر ریاض مجید

پروفیسر شعبۂ (اردو)

گورنمنٹ کالج فیصل آباد
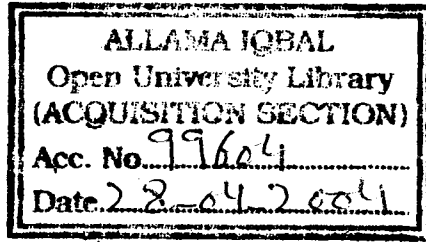
بہ اجازت مراسلہ نمبر ایف ۔ ۱ ۔ ۳ / ۹۷ ۔ اے آر (اے سی)
مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۷ء

شعبۂ اردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد پاکستان
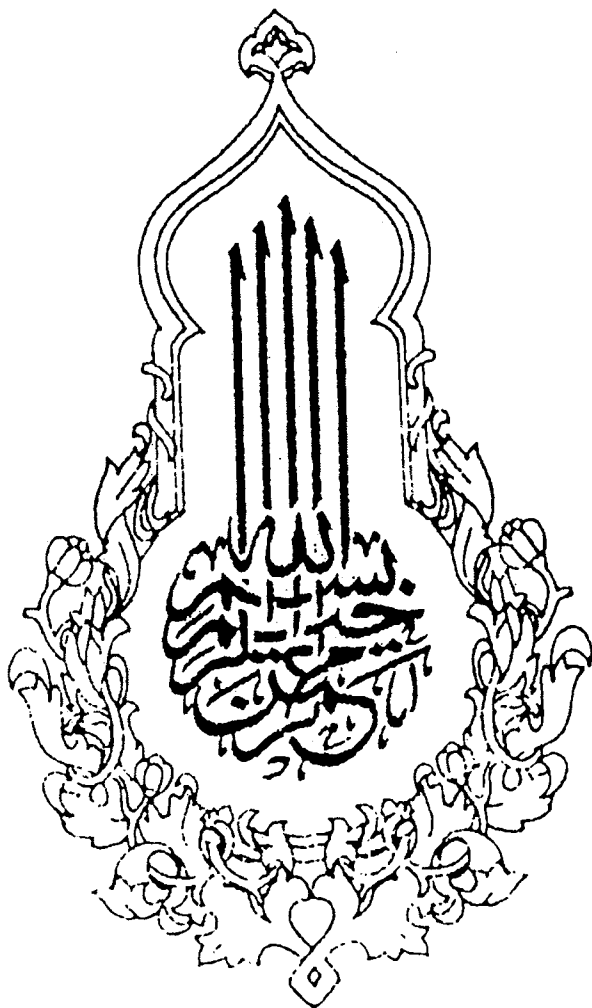
انتساب

بنت حوا کی بے نام و بے پایاں اور انتھک
مسافتوں کے نام جن پر وہ صلے اور ثواب سے
بے نیاز آبلہ پا سفر کرتی ہے

فہرست عنوانات

انتساب | صفحہ

اظہارتشکر

سب تعریفیں اس خدائے ذوالجلال کے لئے جو غفور الرحیم ہے مشکل کشا ہے اور بہترین مسب الاسباب ہے اس خدائے واحد کی رحمتوں کے سایہ میں میرا یہ مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا ہے اور اس کی رحمت کے سہارے میں نے تحقیق کا یہ سفر مکمل کیا ہے تحقیقی کام میں مواد تک رسائی کسی بھی طالب علم کیلئے ہمشہ بہت کھٹن اور صبر آزما کام رہا ہے انسان بنیادی طور پر تنوع پسند ہے اور یہی تنوع پسندی اسے یکسانیت سے نکال کر زمانے کی رفتار میں شامل کرتی ہے۔ ایم فل کے لئے مقالہ لکھنے کا وقت آیا تو اسی تنوع پسندی کی وجہ سے میں نے خواتین کے سفرناموں کا انتخاب کیا جس میں حیرت تجسس ابخانی اوران دیکھی راہوں اور دنیاؤں کو جاننے کا شوق بھی شامل تھا اور لکھنے والوں کیساتھ تخیل کی آنکھ کیساتھ سفر کرنا بھی مقصد تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اس سفر میں پیش آنی والی مشکلات کو اللہ کی رحمت کیساتھ پرخلوص دوستوں اور ساتھیوں کی مدد سے عبور کیا۔ اگر ان سب کی دعائیں اور کوشش اس میں شامل نہ ہوتیں تو میری یہ کاوش بھی کامیاب نہ ہوتی۔ کیونکہ کوئی بھی امر کوئی بھی سفر تنہا طے کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

اس ضمن میں مجھے سب سے قبل اپنے استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے جہنوں نے تمام مراحل میں میرا ساتھ دیا اور تحقیق کے سفر میں گویا مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا موضوع کا انتخاب تھا یا اس پر بحث وتحیص کا انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود مجھے وقت دیا اور اسطرح میری لاابالی طبعیت میں ذمہ داری کا احساس پیدا کیا۔

ڈاکٹر ریاض مجید اردو ادب کا ایک معتبر حوالہ ہیں بالخصوص فیصل آباد میں آپکا وجود ایک روشن اور تابندہ ستارے کی مانند ہے۔ جس کی کرنوں سے ہم سب مستفید ہو رہے ہیں۔ انہوں نے میری کاوش کو اپنی نگرانی میں مکمل کروا کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اپنے شاگردوں کی نفسیات کو سمجھتے بھی ہیں اور ان سے کام کروانا بھی انہی کا کمال ہے۔ میں ایکبار پھر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ان کی ممنون ہوں۔ اللہ تعالی انہیں علم وادب کی راہبری وراہنمائی کے لئے ہمیشہ سلامت رکھے۔ (آمین)

تحقیق کے سلسلے میں میرے والدین کی دعاؤں اور بہن بھائیوں کی محبتوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ خاص طور پر میری بہن ڈاکٹر عصمت ناز اگر میری مدد و معاون ثابت نہ ہوتیں تو شاید میں آئندہ دس سال

تک بھی یہ کام مکمل نہ کر پاتی۔ میرے عزیز از جان بچوں فہد علی اور عبداللہ اور میرے شریک سفر چوہدری علم الدین ایڈووکیٹ نے بھی مجھے بہت حوصلہ دیا اور ایسا ماحول فراہم کیا کہ میں اس کام کو مکمل کر سکوں۔ میں لاہور میں اپنی بہن مسز نقوی کا احسان اتار ہی نہیں سکتی کہ انہوں نے جس طرح سے میرے ساتھ تعاون کیا۔ وہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں میری بہت اچھی اور بہت معاون و مددگار دوست شاہدہ یوسف، نویدہ کوثر اور شبانہ نے بھی تحقیق کے راستوں کو آسان بنانے میں میرا ساتھ دیا۔ انکے قابل قدر مشورے اور کتابوں کی فراہمی میرے لئے احسان عظیم سے کم نہیں۔ میں اپنی شاگردوں جن میں ایم۔اے فائنل کی طالبات، نادیہ و اسماء ہیں جنکا خلوص، عائشہ اور فرح کی محبت اور خاص طور پر طاہرہ بشیر کی دعائیں اور نوافل شامل ہیں وہ ہمہ وقت مجھے یاد دلاتی رہیں کہ میڈم کام مکمل کر لیں۔

میرا شکریہ ان تمام کے لئے بھی ہے جنہوں نے مجھے پنجاب لائبریری دیال سنگھ لائبریری، قائد اعظم لائبریری، سنٹرل لائبریری پنجاب یونیورسٹی، سنٹرل لائبریری بہاولپور، گورنمنٹ کالج برائے خواتین مدینہ ٹاؤن لائبریری، میں تعاون فراہم کیا اور خاص طور پر بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے لائبریرین چوہدری اکرام صاحب نے اس سلسلے میں مثالی تعاون کا مظاہرہ کیا۔ اللہ تعالی ان سب کو جزائے خیر دے اور علم و ادب کے پیاسوں کی آبیاری کے لئے مزید مواقع فراہم کرے۔

بہر حال یہ میری ابتدائی آزمائشی کاوش ہے۔ اس میں جو بھی کوتاہیاں ہوں اسے طالب علمانہ لغزش سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے تو میں شکر گزار ہوں گی اور امید کرتی ہوں کہ یہ تحقیق کا سفر جاری رہیگا۔ تحقیق کبھی مکمل نہیں ہوتی بلکہ ایک تحقیق سے بہت سی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ میں اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہوں اس کا فیصلہ آپکے ہاتھ میں ہے۔

بشریٰ علم الدین

پیش لفظ

سفر نامے اردو زبان وادب کا اہم سرمایہ ہیں اور باقی اصناف ادب کی طرح سفر ناموں نے بھی اردو نثر کے ارتقاء میں بڑا حصہ لیا۔ اس کے ذریعے ہم نہ صرف بصیرت افروز معلومات حاصل کرے ہیں بلکہ دنیا کی دیگر اقوام کے تاریخی، تہذیبی اور تمدنی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی حالات کیساتھ انکی رسم ورواج اور عادات واطوار سے بھی واقفیت حاصل کرتے ہیں اور اس سے جو لطف وانبساط حاصل ہوتا ہے وہ زندگی کے کھٹن سفر کی گھڑیوں کو خوش کن بنا دیتا ہے۔

سفر کی ابتدا ابتدائے آفرینش سے ہی ہوگئی تھی اور کائنات کے ارتقاء کیساتھ یہ سفر بھی جاری رہا ہے۔ سفر میں بے پناہ تحیر اور تجسس کا عنصر شامل ہے۔ احوال ذات سے لیکر امور کائنات تک کا بیان اسرار سفر ہے۔ سفر میں داخل وخارج کے یکجا ہونے سے ایک نیا تجربہ اور نیا ادب سامنے آتا ہے۔ ادب زندگی کی گہری اساس کا نام ہے۔ عملی زندگی میں جہاں تجربہ، فلسفہ اور کتاب کام دیتی ہے وہاں اس وسیع کائنات کا مشاہدہ بھی لازمہ حیات ہے۔ اس کے اسرار ورموز خود انسانی عقل کے لئے دعوت نظارہ دینے کا کام کرتے ہیں۔

اللہ تعالی نے اپنی آخری کتاب قرآن مجید میں بھی کائنات پر غور وفکر کرنے اس کو مسخر کرنے اور اس پر پھیل جانے کی دعوت دیکر گویا قیامت تک کے لیئے سفر کی حیثیت کو اور اسکے فوائد کو مسلم کر دیا اور پھر انبیاء کرام کی ھجرتیں اور صوفیاء کرام اور مبلغین جو مختلف حوالوں سے سفر کرتے رہے۔ انہوں نے نسل انسانی کو سفر کے بارے میں نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔

ایم فل کے لئے جب موضوع کے انتخاب کا وقت آیا تو مجھے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اول تو سفر نامے پر زیادہ کام نہیں ہوا۔ دوسرا سفر نامہ پڑھنے والے لوگ بھی کم ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اکثر سفر ناموں کا ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا اور اس کے بعد وہ منظر عام پر نہیں آیائے کچھ سفر نامے ادبی رسائل میں بالاقساط شائع ہوئے اور کتابی شکل میں دستیاب نہیں تھے یا بہت کم یاب تھے۔ اس میں کچھ ایسے سفر نامے بھی تھے جو میں اپنی بساط بھر کوشش کے باوجود حاصل نہ کر سکی، جنکا مجھے ملال ہے مگر ابھی امید کرتی ہوں کہ مجھے جب بھی یہ دستیاب ہوئے۔ میں انہیں پڑھنا پسند کروں گی اور اپنی اگلی تحقیق میں شامل بھی کرنا چاہوں گی۔

انسان کے سفر کا آغاز تو مرد اور عورت کے اتحاد سے ہوا اور اسی سے اس کی نسل بڑھی۔ علم وادب صنعت وحرفت اور تہذیب وتمدن میں ارتقاء ہوا۔ عورت اور مرد کی قوتوں اور صلاحیتوں کا فرق اور

معیارعزت وذلت اورانا کا معیار بن گیا۔ حتیٰ کہ نہایت عادلانہ معاشروں میں بھی جہاں انسانی حقوق کا بہت چرچا تھا وہاں بھی مرد کی برتری مسلمہ حقیقت بن گئی اور عورت ذات کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اس کے حقوق کی پامالی ہوئی۔ تاریخ عالم پر نظر دوڑائیں تو یوں لگتا ہے کہ پوری تاریخ عورت کے حوالے سے اسکی مظلومیت کی داستان ہے۔

عورت محکوم رہی ۔مظلوم رہی۔ مگر جب یہ چیزیں انتہا کو پہنچتی ہیں تو انقلاب آتا ہے۔ کبھی وہ عرب کی سرزمین پر اسلام کی شکل میں آتا ہے اور کبھی سرزمین ہند پر پاکستان کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور یوں عورت کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ کل تک اسے ذلیل وخوار اور محکوم سمجھا جاتا تھا۔ آج وہ عزت اور سربلندی کیساتھ جی رہی ہے۔آج عورت نہ صرف پاکستان میں بلکہ پورے عالم میں ایک ایسا حوالہ ہے جس کے بغیر کوئی معاشرہ پنپ نہیں سکتا۔ آج اس کی صلاحیتوں کو دیگر میدانوں کے علاوہ علم وادب کے میدانوں میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ میرے اس مقالے ''خواتین کے سفرنامے'' لکھنے کا مقصد خواتین کا ادبی سطح پر اور خاص طور پر صنف سفرنامہ میں انکے مقام ومرتبہ کا تعین کرنا ہے کیونکہ عورت جو نصف انسانیت ہے اس کو یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مرد کے سہارے کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ حالانکہ نوع انسانی اور نسل انسانی کی تشکیل وتکمیل دونوں میں سے ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ ایسا جو بھی حوالہ جس میں عورت کی خوشبو شامل نہیں ہوگی وہ ادھورا اور نامکمل ہی نہیں بلکہ ناقص بھی ہوگا۔

میں نے اس مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔پہلے باب میں سفرنامے بحیثیت موضوع صنف اور اس کی تکنیک کے ساتھ سفرناموں کی اقسام، اسکی تاریخ ،اسکی اہمیت اور خاص طور پر خواتین کے سفرنامے منتخب کرنے کی وجوہات پر روشنی ڈالی ہے تاکہ اس کی صحیح طور پر وضاحت ہوجائے اور اگلا سفر شروع ہو۔

دوسرے باب میں قیام پاکستان سے قبل یعنی ۱۹۴۷ء سے قبل کے سفرنامے شامل ہیں ۔ اس دور میں اگرچہ بہت کم سفرنامے لکھے گئے۔ تاہم ان کے بغیر سفرناموں کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی ہے۔ اس وقت نامساعد حالات اور کم سہولتوں کے باوجود جن خواتین نے اس جانب توجہ کی انکا جائزہ لینا ضروری تھا۔

باب سوئم میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک لکھے جانے والے سفرناموں کا جائزہ لیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں تاریخیں پاکستان کی تاریخ کے اہم حوالوں میں شامل ہیں۔ اس سے نہ صرف لوگوں کے ذہن تبدیل ہوئے بلکہ ان واقعات نے ان کی تہذیب ومعاشرت ،انکی نفسیات اور انکے ادبی رجحانات کو بھی متاثر کیا۔ اس دور کے سفرناموں میں ہم انسانی رویوں اور اس میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو بطور خاص محسوس کرتے ہیں۔

باب چہارم میں ۱۹۷۱ء سے اب تک لکھے گئے سفر ناموں کو شامل کیا گیا ہے اور یہ وہ دور ہے جس میں سب سے زیادہ سفر نامے لکھے گئے۔ میں نے اپنی ادنی کاوش میں بساط بھر تمام سفر ناموں کو جو مجھے دستیاب تھے شامل کیا ہے۔ اسی لیئے یہ باب بقیہ ابواب سے زیادہ طویل ہے اور یہ سفرناموں کی خواتین کے سفرناموں حوالے سے ایک روشن مثال اور زریں عہد ہے۔

باب پنجم کو دانستہ حج کے سفر ناموں کے طور پر علیحدہ رکھا ہے کیونکہ خواتین کی ایک بڑی تعداد نے حج کے سفر نامے لکھے اور مقامات مقدسہ اور اس سفر کی کیفیات وغیرہ کا جو بیان ہے وہ اپنی اہمیت اور عقیدت واحترام کے باعث خاص اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ انہیں الگ رکھا جاتا۔

باب ششم میں خواتین کے سفر ناموں کے ادبی مقام کو تعین کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی انکا تقابلی جائزہ بھی مختصراً پیش کیا گیا ہے

ابواب کے بعد اختتامیہ اور حاصل بحث کے طور پر عمومی اور مجموعی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ایک نظر میں یہ اندازہ کیا جاسکے کہ خواتین کے سفر نامے کن کن مراحل سے گزرتے رہے۔ آخر میں فہرست کتابیت بیانات دی گئی ہے۔

مجھے اس بات کا شدت کا احساس ہے کہ محترم ڈاکٹر انور سدید صاحب، جناب وزیر آغا، مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر تحسین فراقی اور ادبی دنیا کے دیگر بڑے بڑے نام مجموعی حیثیت سے سفر ناموں پر بہت کام کر چکے ہیں لیکن خواتین کے سفر ناموں کو ایک الگ حیثیت سے شناخت کروانے میں میری یہ پہلی کاوش ہے یا بارش کا پہلا قطرہ ہے کیونکہ خواتین کو افسانہ نگاری، ناول نویسی وغیرہ میں تو مانا جاتا ہے مگر ابھی سفر ناموں کا حوالہ زیادہ مقبول نہیں ہوسکا۔

میری یہ کوشش اگر اس سلسلے میں کسی محرک کا کام دے اور کسی اور کو اس جانب مزید تحقیق اور جستجو پر آمادہ کر دے اور اس طرح سے خواتین کا یہ ادبی حوالہ اور خواتین کا سفر ناموں میں مرتبہ ومقام متعین ہو جائے تو میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی کیونکہ تحقیق چراغ سے چراغ جلانے کا نام ہے اور اسی اعتماد کے سہارے میں نے یہ مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچایا ہے۔

باب اول

سفر نامہ بحیثیت صنف

۱) : موضوع تکنیک

۲) : سفرناموں کی اقسام

۳) : اردوسفرنامہ آغازتاحال

۴) : سفرناموں کی اہمیت

۵) : خواتین کے سفرنامے منتخب کرنے کی وجوہات

سفر نامہ بحیثیت صنف

(موضوع، تکنیک)

سفر کا شمار لازمہ زندگی میں ہوتا ہے۔ جس میں بے پناہ تحیر و تجسس کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ حرکت اصول فطرت ہے۔ کائنات کی ہر شے اپنے مدار کے گرد حرکت پر مجبور ہے۔ کچھ اشیاء کی حرکتیں واضح ظاہری اور فوری ہیں اور کچھ کی الجھی ہوئی مخفی اور تاخیری ہوتی ہیں۔

سفر کا رویہ بنیادی طور پر زندگی کا رویہ ہے کہ زندگی حرکت اور عمل سے عبارت ہے۔ دنیا انسان کے لئے ایک عارضی قیام گاہ اور پڑاؤ کی جگہ ہے۔ جہاں انسان کو چند گھڑیاں گزار کر آگے بڑھ جانا ہے۔ کیونکہ

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے   یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یا پھر یوں کہ   میراں شہر پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے

کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

انسان کی زندگی بھی اپنے نقطۂ آغاز سے انجام تک عالم مسافرت ہی سے متعلق ہے۔ انور سدید سفرنامے کی فنی بحث میں لکھتے ہیں:-

''زندگی چونکہ خود ایک مسلسل حرکت ہے۔ اس لیے سفر بھی زندگی کا ہی استعارہ ہے'' (۱)

سفر حرکت اور عمل ہی کا علامتی روپ ہے۔ سفر نامے کا شمار اردو زبان کی بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے۔ سفر نامہ چونکہ چشم دید واقعات پر لکھا جاتا ہے۔ اس لیئے سفر اسکی اساسی شرط ہے۔ سفر میں تحیر کے عنصر کے ساتھ انجانے دیس کی سیر نئی فضا نئے لوگ انوکھے مناظر کا مشاہدہ ہی انسان کو سیاح یا مسافر بننے پر اکساتا ہے۔ کیونکہ انسان بنیادی طور پر تنوع پسند ہے اور یہی تنوع پسندی اسے یکسانیت سے نکلنے پر مجبور کرتی ہے کیونکہ سفر میں حیات کی تلخیاں راستوں میں یوں تحلیل ہو جاتی ہیں کہ جیسے سائنسی زبان میں H_2O کے فارمولے پر عمل کر کے ہم پانی حاصل کرتے ہیں۔ اسطرح

۱۔ انور سدید   اردو ادب میں سفرنامہ   مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۸۷   ص۔ ۴۸

نقل مکانی حیات میں تر و تازگی اور فرصت و انبساط کی کیفیت سے دوچار کر دیتی ہے۔ اور سیاح فطرت کے انوکھے رنگین دلکش اور دلفریب نظاروں سے قدرت کی تخلیق سے اپنا تخلیقی تجربہ اخذ کر لیتا ہے۔ کیوکہ سفر نامہ بنیادی طور پر روداد سفر ہوتا ہے۔ روداد جامد و ساکن اشیاء کی نسبت عمل اور حرکت کرتی ہوئی اشیاء یا انسانوں کی زیادہ دلفریب اور پر تاثیر ہوتی ہے۔ کیونکہ سفر نامہ نگار نے اپنے ساتھ ایک ایسے قافلے کو لے کر چلنا ہے جس نے ان دیسوں کے بارے میں اس کی انگلی تھام کر سفر کرنا ہے۔ اس لیے سفر میں قاری کو شریک سفر بنانا شرط اولین ہے۔ ورنہ سفر نامہ رپورتاژ کا رنگ لیئے ہوئے ہوگا۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:-

> '' ایک کامیاب سفر نامہ وہ ہوتا ہے جو صرف ساکت و جامد فطرت کا عکاس نہ ہو بلکہ لحہ رواں میں آنکھ، زبان، اور احساس سے ٹکرانے والی ہر شے نظر میں سما جانے والی ہو۔ تماشا، نغمہ و نکہت کا ہر صورت و رنگ لفظوں کی امیجری میں جمع ہو کر بیان کو مرقع بہاراں بنا دے اور قاری ان مثالوں کے اندر جذب ہو کر خود کو اس مرکب آئینہ گری کا حصہ بنا لے۔ (۱)

سفر نامہ مناظر اور عناصر سے معمور ہے۔ ہر سفر نامہ نگار مخصوص رجحانات اور معیارات کا حاصل ہوتا ہے۔ لیکن کامیاب سفر نامہ نگار وہ ہے جو زمین ماحول اور انسان کے ساتھ اپنا ناطہ نہ ٹوٹنے دے اور قارئین کو اپنے نظریات سے آگاہ کرے۔

سفر کی اہمیت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ پیغمبروں اور اولیائے اللہ کے ساتھ حکمائے قدیم کے نزدیک زندگی ایک ایسا سفر ہے جو ازل سے ابد تک جاری رہیگا۔ حضرت آدم وحوا کے سفر عرش سے فرش تک کے سفر سے لیکر آج تک انسان عالم مسافرت میں ہیں۔ اگرچہ آج کا جدید انسان چاند اور مریخ تک تسخیر کر چکا ہے لیکن قدیم انسان بھی کم مہم جو نہ تھا۔ اس نے اپنے زور بازو سے نہ صرف فطرت کو تسخیر کیا بلکہ آنکھ کھولنے کے بعد زمین اور فلک کا نظارہ کیا تو جسم و جان کے نازک رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے اور کبھی رزق کی تلاش میں کہیں بہتے دریاؤں کو عبور کیا اور کہیں سنگلاخ چٹانوں کو ریزہ ریزہ کیا۔ اس مہم میں دور دراز کے علاقوں کا سفر کیا اور عجائبات دنیا کا مشاہدہ و مطالعہ کیا۔

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ پیش لفظ حافظ و خیام از مقبول بیگ بدخشانی غالب پبلشرز لاہور ۱۹۷۹ ص۔ ۸

لیکن صرف ضرورت کے تحت سفر نہیں کیا جاتا۔ سفر کبھی کبھی شوق وتحیر کی وجہ سے بھی کیا جاتا ہے جو سیاح کو کشاں کشاں اپنے پسندیدہ مقامات کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ کیونکہ خالق کائنات نے بھی قرآن حکیم میں سفر کی ترغیب دی اور کہا :-

''سیروفی الارض''

یہی وجہ ہے کہ حضرت آدم سے لیکر خاتم النبین ؐ تک تمام انبیاء کرام نے خاص مقصد کے تحت سفر ضرور اختیار کیا۔ سفر معراج بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ کائنات کے سربستہ رازوں کو منکشف کرنے کے اضطراب نے ہی ھیروڈوٹس، فاھیان، ابن بطوطہ، البیرونی اور مارکوپولو جیسے سیاح پیدا کئے۔ سفر نامہ نگار کو بنیادی طور پر سیاح ہونا ضروری ہے۔ بقول وزیر آغا۔

> ''گھر کی دیواروں اور منزل کے دھاگوں سے اسے کوئی سروکار نہیں اور سیاح تو اپنا رستہ خود بناتا ہے اور مسافر حرکت کرتے ہوئے بھی حرکت کی نفی کرتا ہے''۔ (۱)

سفر نامہ سیاح کی ذہنی وقلبی وردات پر ہی منحصر نہیں ہوتا بلکہ یہ معلومات کا وسیع ذخیرہ لیے ہوئے ہوتا ہے۔ سفر نامے کا شمار ادب کی بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے۔ کہ جس کے ذریعے طالبان علم وفن نئی حقیقتوں کا ادراک، انجانے دیسوں کی سیر، بصیرت کی تازگی اور بصارت کی کشادگی حاصل کرتے ہیں۔ اس صنف نے ہمارے مشاہدے اور مطالعے کو نئی جلا بخشی ہے۔ قاری سیاح کے ذریعے مقام حیرت سے مقام شعور تک جا پہنچا ہے اور یہ عمل سطحی نہیں بلکہ بڑا تہہ دار اور محنت وریاضت کا متقاضی ہے کیونکہ سفر نامے کی اولین غرض وغایت اس کرہ ارض میں پھیلے ہوئے انواع واقسام کی قوموں اور انسانوں کے تاریخی جغرافیائی، سماجی، سیاسی معاشی ومعاشرتی حالات سے آگاہی حاصل کرنا ہے۔ کیونکہ مختلف قوموں اور مذہبوں کے درمیان جو مماثلت ہے اس کا مطالعہ انسان کے اندر محنت ریاضت اور کچھ کرنے کے جذبے کو بیدار کرتا ہے۔ مرزا ادیب لکھتے ہیں:-

> ''سفر نامہ نگار تو جو کچھ لکھتا ہے اور جو کچھ پاتا ہے جس مقام سے گزرتا ہے اسکی ساری خوشبوئیں اسکے ساری باطنی رنگ اور اسکی ساری کیفیات جو سراپا راز میں چھپی ہوئی ہیں۔ ان سب کو سمیٹ لیتا ہے۔ وسائل وذرائع

۱۔ وزیر آغا چوری سے یاری تک مکتبہ اردو زبان ریلوے روڈ سرگودھا ۱۹۶۶ ص۔ ۴۸

پر تکیہ کر کے یہ چیزیں ممکن نہیں ہیں۔ سفر نامہ نگاری لازماً ایک تخلیقی تجربہ ہے۔ اسکا اطلاق ان حصوں پر ہوتا ہے جو تخلیقی تجربے سے وابستہ کئے جاتے ہیں''۔ (۱)

موجودہ دور میں سفر نامہ افسانے اور حقیقت کا سنگم نظر آتا ہے۔ افسانہ نگار اپنے تجربے کو تخلیقی کہانی کا روپ دیتا ہے۔ لیکن سفر نامہ نگار اپنے ذاتی تجربے کی شہادت پیش کرتا ہے۔ گویا افسانہ تخیل ہے، تصویر کشی ہے، حقیقت سے دور ہے جبکہ سفر نامہ اپنے اندر ایک فنی تقاضہ رکھتا ہے۔ کیونکہ افسانے کا قاری جانتا ہے کہ افسانے کے کردار و واقعات فرضی اور خیالی ہیں۔ جبکہ سفر نامے کا قاری سیاح کے تجربات و محسوسات میں بڑی خود اعتمادی سے شریک ہو کر لطف و مسرت حاصل کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر سیاحت نامے اور افسانے میں دوستی کروا کے ہاتھ بھی ملواتے ہیں لیکن افسانے کے لیے صرف تخیل کی ضرورت ہے جبکہ سفر نامے کے لئے کھلی آنکھ سے مشاہدے اور مطالعے کی ضرورت ہے۔

مشفق خواجہ لکھتے ہیں:-

''روائتی سفر نامہ ہمیں مقامات سفر سے متعارف کرتا ہے اور غیر روائتی سفر کیفیت سفر سے مقامات سفر کی تفصیل لکھنے والا زمان و مکان کا اسیر ہوتا ہے جبکہ کیفیات سفر قلمبند کرنے والا زمان و مکان سے ہٹ کر بھی سوچتا ہے اور یہ ہی چیز اسکے سفر نامے کو معلومات کا گنجیہ بننے سے بچاتی ہے اور اسکا رشتہ ادب سے قائم کرتی ہے۔ (۲)

سیاح کا تبصرہ بے لاگ ہوتا ہے۔ وہ جو ہے وہی قاری تک لے جائے گا۔ اس دنیا میں مسافروں کی کمی نہیں ہے لیکن سیاح کم ہیں۔ سیاح کا بنیادی وصف یہ ہے وہ اپنے گھر، وطن، نام اور پیسے سے قطعاً منقطع اور بے نیاز ہو، اور اپنے اندر جمود کی بجائے حرکت کا مادہ رکھتا ہو۔ اور جن گذرگاہوں سے گذرے انہیں اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۱۔ مرزا ادیب اوراق لاہور جنوری، فروری ۱۹۷۸ ص۔ ۲۰

۲۔ مشفق خواجہ (موسموں کا عکس دیباچہ) از جمیل زبیری، بختیار اکیڈمی کراچی ۱۹۸۴ ص۔ ۱۰

محمود نظامی اپنے سفر نامے ''نظر نامےؔ'' میں لکھتے ہیں:-

''جہاں میں اس سفر میں بہت سے شہروں سے گذرا ہوں وہاں کئی شہر ایسے بھی تھے جو خود میرے دل سے گذرے ہیں''۔ (۱)

شہر اور سفر نامہ نگار فن اور فنکار کی طرح لازم وملزوم ہیں۔ اس بحث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایسی صنف ادب ہے کہ جس میں غیبی مشاہدات کی قوت سب سے زیادہ روبہ عمل آتی ہے۔ اس کے ساتھ تاریخ اور جغرافیے کی فنی مقاصد کو بھی اپنے اندر جذب کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سفر نامہ بسا اوقات تاریخ کو مس کرتا ہے لیکن یہ مربوط تاریخ پیش نہیں کرتا۔ کیونکہ سیاح منظر کے حسن کو تاریخی صداقت کی نسبت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

جبکہ تاریخی حوالہ کے لئے باقاعدہ مستند ماخذات کی ضرورت ہوئی ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھتا ہے۔ اپنے مشاہدے کو آنے والے زمانے کے لئے تحقیق کا راستہ استوار کرنے میں معاون بناتا ہے۔ کیونکہ اس مشاہدے اور مطالعے میں لفظ بطور وسیلہ استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے سیاح کا ادیب ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ سفر نامے میں حقیقت بھی ہے اور چاشنی بھی، لذت بھی اور مزید جاننے کی خواہش بھی۔ اس لیے سفر نامے کے قارئین میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ سیاح کے اندر انسان شناسی عام انسانوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسکے تجربات حساس اور نیک ہونے کی وجہ سے زندگی کے قریب تر ہوتے ہیں۔ تجربے کو تخلیق کے مشکل مرحلے سے گزار کر اسے ازلی وابدی روپ دینا ہی اسے منفرد کر دیتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سفر نامہ سفر کے تاثرات حالات اور کوائف پر مشتمل ہوتا ہے اور فنی اعتبار سے وہ بیانیہ صنف ہے جو سیاح سفر کے دوران یا سفر کے اختتام پر اپنے مشاہدات، کیفیات اور اکثر اوقات قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے کیونکہ سیاح خارج سے داخل کا سفر کرتا ہے۔ اس لیے اس کا بیانیہ مدلل ہونا چاہیے۔ کیونکہ سفر نامے کی شکل میں لکھی جانے والی بہت سی کتابوں نے بہت سے لوگوں کو ذوق سیاحت بخشا کہ تصویر کو تصور کی آنکھ کی بجائے اپنی آنکھ سے دیکھا جائے۔ حقیقت کے ان متلاشیوں کے ہاں جب اپنے مشاہدات اور تجربات بنی نوع انسان میں تقسیم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تو سفر نامہ وجود میں آ گیا۔ کیونکہ سیاح کا ذوق سفر اسے رنگ ونسل، زبان عقیدے اور مذہب کی تفریق کو ختم کر کے صرف قدرت کی صناعی کو دیکھنے لطف اندوز ہونے اور بیان کرنے کی خواہش کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک سفر نامہ نگار جب قلم اٹھاتا ہے تو وہ محض ایک ٹورسٹ

---

۱ - محمود نظامی ؛ نظر نامہ ، گلدستہ ادب لاہور ۱۹۵۸، ص ۱۴۔

گائیڈ ثابت نہیں ہوتا بلکہ ایک حساس ادیب کی طرح حالات و واقعات افراد، جذبات اور احساسات اور حیات کے زاویہ نظر پر روشنی ڈالتا ہے۔ کیونکہ سفرنامہ نگار دوسرے انسان ملک اور تاریخ سے متعارف کرانے اور انکے درمیان پل تعمیر کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔ آج کا سفرنامہ نگار ابہام سے کام بلکہ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:-

''وہ اپنی نرگیست کے پاسپورٹ پر سفر کرتا ہے'' (۱)

ایسا ایک کامل ادیب نہیں کرتا کیونکہ بعض لوگوں کے خیال میں سفرنامہ بھی تاریخ کی ہی ایک شکل ہے جو معلومات کا ذخیرہ فراہم کرتا ہے اور اس سے بھی ویسے ہی استفادہ کیا جا سکتا ہے جیسے تاریخ کی کتابوں سے لیکن حقیقت میں سفرنامہ اور تاریخ مختلف دھارے ہیں جن میں قدرے مماثلت تو ہے مگر دونوں کو ایک ہی معیار پر پرکھنا مناسب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:-

''سفرنامہ تاریخ اور جغرافیئے کے عملی مقاصد کی تکمیل کے لیے میکانکی انداز میں کوائف جمع نہیں کرتا بلکہ ایک مربوط دلچسپ اور خوشگوار بیانیہ مرتب کرنے کے لئے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ سفرنامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھتا ہے اور زندگی کے مشاہدے کو سفرنامے میں مستقل کر دیتا ہے کہ آنے والا زمانہ اس دور کی روح کو متحرک محسوس کر سکے''۔ (۲)

کیونکہ شہر اور سیاح دو الگ الگ کھاتے نہیں بلکہ ایک ہی پلڑے میں سوار وہ کردار ہیں کہ جن کے بغیر سفرنامہ تخلیق نہیں پا سکتا۔

ابن بطوطہ کے سفرنامے کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

''یہ سفرنامہ لکھ کر اسے تاریخ کے اس عظیم الشان دور کو زندہ کیا ہے۔ اسنے اپنی روداد کچھ اسطرح لکھی ہے کہ روداد جہاں بھی اسمیں شامل ہو گئی ہے۔ اس نے محض ایک تماشائی کی حیثیت سے اپنے تاثرات نہیں لکھے بلکہ جزو تماشا ہو کر اپنی دستاویز تیار کی ہے۔ جس کی قدر و قیمت و افادیت اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی بالغ نظری اور دور اندیشی نے

۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر مجلہ اوراق جنوری، فروری ۱۹۷۸ لاہور ص۔ ۸، ۹

۲۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۸۷

آنے والی نسلوں کے لیے جوترکہ چھوڑا ہے وہ اسکی بصارت اور بصیرت کا
ایک ایسا آئینہ ہے جوکبھی دھندلا نہیں ہوتا ہے''۔ (۱)

سیاح کے لیے یہ بھی ضروری عنصر ہے کہ جس ملک میں وہ سفر کرے وہاں کی رسم ورواج سے آشنا ہو کیونکہ گائیڈ کی معلومات سطحی واجرتی ہوتی ہیں اور اجرت کی وجہ سے دی گئی معلومات میں نہ تو دلچسپی کا عنصر ہوگا اور نہ ہی تحقیقی رنگ۔ اس لیے سفرنامے کو مفید صنف سخن بنانے کے لئے ضروری ہے کہ سیاح اس ملک کی زبان، رسم ورواج، تہذیب، مذہب، سیاست کے بارے میں معلومات رکھتا ہو۔ کیونکہ قاری کے پاس وقت کم ہے اور وہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے جو سفرناموں سے ممکن ہوسکتی ہے۔

محمد کاظم نجیب احمد سے مکالمہ میں لکھتے ہیں۔

'' سفرنامہ ایک ایسی رپورتاژ ہے جو تخلیقی سطح پر قلمبند کیا جاتا ہے اور اس میں قاری صرف ان مقامات ہی کی سیر نہیں کرتا۔ جہاں سیاح کا گزر ہوا تھا اور نہ صرف ان لوگوں سے متعارف ہوتا ہے۔ جن سے سیاح کو واسطہ پیش آیا تھا بلکہ وہ سیاح کے اندر من کی بھی سیر کرتا ہے اور اس کی ذات کے ایسے گوشوں تک اسکی رسائی ہوتی ہے جہاں عام حالات میں شاید نہ پہنچ سکتا ''۔ (۲)

سفرنامے کی اولین غرض و غایت اگرچہ اس وسیع کائنات میں بسنے والی مختلف اقوام کے درمیان پائی جانے والی تاریخی، جغرافیائی، سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات سے آگاہی ہے لیکن دور جدید میں سفرنامہ تخلیقی صورت میں ایک نہ صرف حرکت کا باعث بنتا ہے بلکہ افراد کی ذاتی زندگی میں خوشگوار اثرات بھی مرتب کرتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:-

'' سفرنامہ نگار لفظوں کی شعبدہ بازی نہیں کرتا۔ لفظوں کے حوالے سے اپنے باطن میں چھپی ہوئی حقیقتوں کا انکشاف کرنا اور داخل میں وارد ہونے

۱۔ ابن بطوطہ سفرنامہ ابن بطوطہ رئیس احمد جعفری نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۴۱ ص۔ ۴، ۵

۲۔ محمد کاظم مجیب احمد سے مکالمہ نوائے وقت لاہور ۱۳ مارچ ۱۹۷۷ ادبی ایڈیشن مرتبہ عطاالحق قاسمی

والے ہر تجربے کو لفظوں کی مدد سے ماپنا اور پرکھتا ہے۔ ان تجربات کو محسوس کی سطح پر لانے کے لیے لفظ کے لسانیاتی پیکر ایک نئے کشفی حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ سفرنامے میں ایک دو نہیں کئی مقام آتے ہیں۔ کبھی یہ سفر خارج سے داخل کا ہے --------- یا پھر داخل سے خارج کا سفر ---- " (۱)

اس تمام فنی بحث سے جو نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ سفرنامہ موسموں اور مقام کی ساری خوشیوں اور اپنے تمام تر اندرونی جذبات و کیفیات کے ساتھ اپنے اندر چھپے ہوئے تخلیقی تجربے کو بروئے کار لا کر قاری کے لئے یوں پیش کرتا ہے کہ اس کی منتظر نگاہیں ہر لمحہ پڑھنے والوں کی نظر کا طواف کرتی ہیں کہ کہاں اسے پسند کیا گیا اور کیا اس کی محنت رنگ لائی کہ نہیں اور پھر جہاں کہیں کوئی کمی نظر آتی ہے۔ اس کو دور کرنے کے لیے نئے نئے جہانوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفرنامے جاری وساری ہے اور رہے گا۔ انشاءاللہ۔

تکنیک

تکنیک کا فن ایک ایسا فن ہے کہ جس میں کچھ مخصوص طریقے ہیں اور ان طریقوں میں سے کسی ایک کو اپنائے بغیر سفرنامہ لکھنا ناممکن ہے۔ بنیادی طور پر سفرنامہ بیانیہ اصناف میں شمار ہوتا ہے اور قدیم و جدید سفرناموں میں اسی تکنیک کو مقبول عام کی سند ملتی رہی۔ اس کے باوجود انسان چونکہ فطری طور پر جدت پسند رہا ہے اور اسی جدت پسندی کی وجہ سے تغیر وتبدل کا متقاضی رہا ہے۔

سفر ذاتی تاثر اور مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے اسلوب کے لیئے بیانیہ اسلوب ہی سب سے بہتر تصور کیا جاتا ہے۔ سفرنامے کے لوازمات میں لفظ، نظر، موضوع، دلچسپی اور ذہنی سطح سب اہم ہیں۔ سیاح کے اندر مشاہدے کی خاص قوت اور انسانی حیات کے لیے دلچسپی لازمی امر ہیں۔ لیکن اس کے تاثرات ایسے ہوں کہ خاص طور پر اس مقصد کو واضح کریں کہ سفرنامے کا نقطہ نظر کیا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر وحید قریشی تبصرہ اے آب رود گنگا از رفیق ڈوگر نوائے پبلیکیشنز لاہور ۱۹۸۱ ص۔ ۵

تکنیک کا موزوں انتخاب سفرنامے کی دلچسپی سے قوت باصرہ اور ذہنی بصیرت تک سفر ہے۔ سیاح کی قوت باصرہ اسے مشاہدے کی خاص قوت عطا کرتی ہے جو کہ تعصب سے پاک ہو۔ حقائق کی تہہ تک جا پہنچتی ہے سفرنامہ عموماً واحد متکلم میں لکھا جاتا ہے۔ اس لیے اس اسلوب میں خاص طور پر آپ بیتی کا رنگ نظر آتا ہے۔ کیونکہ سفر میں بہت سے شریک سفر ہونے کے باوجود سیاح کا ذہن دل ودماغ اپنا ہی ہوتا ہے کہ وہ اسی نقطۂ نظر سے دنیا کا مشاہدہ ومطالعہ کرتا ہے۔ اس لیے افسانے کی طرح اس میں ہیرو اور ہیروئن الگ نہیں ہوتے بلکہ خود سیاح ہی دیدہ ودل کا مرکز ہوتا ہے اور اس کے گرد ہی تمام دنیا طواف کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

لیکن اصل سوال یہ ہے کہ سفرنامہ نگار اس میں اپنے مطالعہ ومشاہدہ کو قاری تک پہنچانے کے لئے کونسا طریق کار استعمال کرتا ہے۔ یا اس نے جو کچھ دوران سفر جن حالات و واقعات وتاثرات کو دیکھا اور محسوس کیا ہے اس کو بیان کرنے کا طریقہ کار کونسا اپناتا ہے۔ کیونکہ سفر دراصل کہانی کا اساسی عنصر ہے اور کہانی کے بغیر سیاح اپنے تجربات کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ کیونکہ سفرنامے کی تکنیک میں زیادہ اہمیت اس بات کو ہے کہ سفرنامہ کس وقت لکھا گیا اور سیاح نے اپنی یادداشتوں کو محفوظ کس طرح رکھا۔ اس میں عموماً دو طرح کے طریقے کار استعمال کئے جاتے ہیں۔ اول یہ کہ سیاح دوران سفر اپنی یادداشتوں کو ڈائری کی صورت میں محفوظ کر لیتا ہے اور جو نقطۂ نظر وہ دوران سفر قائم کر لیتا ہے اسے ڈائری میں محفوظ کر لیتا ہے اور اس میں سچائی زیادہ اور تخیل کم ہے کیونکہ کسی واقعہ کو فوری قلم بند کر لینے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ردعمل خوشی یا غمی کا جو تاثر قائم کرتا ہے بعد میں اس کو یاد کرنے سے وہ اثر برقرار رکھنا مشکل ہے۔ اس تکنیک میں فعل حال کا استعمال ایک متحرک فلم کا کام دیتا ہے۔ جس میں واقعات کی ترتیب بدلنے کا امکان بھی کم ہوتا ہے اور قاری بھی سیاح کے ساتھ ساتھ اس کا سایہ بن کر سفر کرتا ہے اور اس کا لطف بھی دوبالا ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں باریک بینی سے بھی کام لیا جاتا ہے اور یہی باریک بینی مناظر کو زندہ اور متحرک بنانے کا کام دیتی ہے۔

سفرنامے کی تکنیک میں دوسرا طریقہ خطوط کی تکنیک کا ہے۔ سفرنامہ نگار نے جس منظر کا

مشاہدہ و مطالعہ کیا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو وہ مکتوب الیہ کو منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس قسم کے سفرناموں میں فعل حال کی نسبت فعل ماضی کا طریقہ کار استعمال کیا جاتا ہے۔ انسان بنیادی طور پر نئی چیزوں کو جذب کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ لہذا وہ دلکشی اور کشش جو رواں ہونے میں ہوتی ہے وہ ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ خطوط میں نہ صرف یہ کہ مختلف کڑیوں کو ملایا جاتا ہے بلکہ خط زیادہ طویل بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے مختصر نویسی کو بھی مدنظر رکھا جا سکتا ہے اور بعض اوقات تسلسل اور منطقی ربط کو قائم رکھنے کی شعوری کوشش بھی کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید اس سلسلے میں لکھتے ہیں:-

> ''خطوط کی بے ربطی عمومی تاثر کو زائل کر دیتی ہے۔ چنانچہ ڈائری میں تخلیقی عمل بے ساختہ اترتا ہے لیکن خطوط میں آرائش اور تخلیق مکرر کا وافر عنصر موجود نظر آتا ہے۔ ان سب کے باوجود چونکہ ڈائری کیطرح خطوط دوران سفر لکھے جاتے ہیں۔ اس لیے انکے تاثر میں صداقت کا عنصر موجود ہے اور قاری انہیں دلچسپی سے پڑھتا ہے''۔ (۱)

یعنی سیاح کا نقطۂ نظر اس کا عمومی تاثر خطوط کی تکنیک میں نکھر کر سامنے نہیں آتا۔ اور یوں ایک اچھا سفرنامہ بھی بے ربطی کا شکار ہو کر مقبول عام کی سند حاصل نہیں کر سکتا۔

سفرنامے کی تکنیک میں ایک اور شکل ان سفرناموں کی منظر عام پر آتی ہے۔ جو عموماً سفر کے بعد لکھے جاتے ہیں۔ دوران سفر سیاح جہاں جاتا ہے وہاں کی تاریخ جغرافیائی ماحول مذہب، عقیدے، معاش اور معاشرت کے بارےمیں اہم نوٹ اپنی ڈائری پر یا ذہنی طور پر محفوظ کر لیتا ہے۔ دنیا کے اکثر سفرنامے اسی صورت میں لکھے گئے ہیں۔ سیاحت گزشتہ منظر یا واقع کو تخلیقی طور پر زندہ کرنا ہے۔ اسی تخیل اور ماضی کی Recalling کی بناء پر اس میں افسانے کا سا تاثر ملتا ہے۔ تکنیکی طور پر یہ انداز سفرنامے کی دلچسپی اور اس کی معراج میں اضافے کا باعث ہے لیکن سوال یہ ہے کہ سیاح کے

۱۔ انور سدید بحوالہ سابقہ ص۔ ۷۰، ۷۱

پاس دیکھنے والی آنکھ اور محسوس کرنے والا دل کیسا ہے کیونکہ بقول درد

سرسری تم جہاں سے گزرے

ورنہ ہر جا جہان دیگر

کیونکہ واقعات کے اخذ و اکتساب کے لیے ذہنی افشاء وطبع کے ساتھ ساتھ گہری نظر اور عمیق مشاہدے کی بھی فرصت (ضرورت) ہوتی ہے۔ کیونکہ سفر عمدہ ہو اور بیان کمتر ہو تو یہ قاری کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا۔ کیونکہ اچھا ادیب اور اچھا سیاح ہی ایک کامیاب سفر نامہ لکھ سکتا ہے۔ کیونکہ جامد منظر کو متحرک کرنا مشکل امر ہے۔ سفرنامے کا بیانیہ اگر میکانکی اور غیر تخلیقی اسلوب میں مرتب کیا جائے تو یہ ادب پارے میں شامل نہیں ہوسکتا ہے اور اس طرح کے سفر ناموں کا عرصہ حیات بہت قلیل ہوتا ہے۔

سفر نامہ چونکہ ایک سنجیدہ اصناف سخن میں ہے۔ اس لیے اس کا اسلوب دلکش رنگین توانا مکمل اور مربوط ہونا چاہیے۔لیکن سچائی کا عنصر لیے ہوئے ہو۔

سفر نامے میں ایک اور تکنیک یہ ہے کہ طنز و مزاح کا رنگ لیے ہوئے اسلوب کو شامل کیا جاتا ہے اور سفر نامہ نگار شریر آنکھ سے مناظر کو دیکھ کر کھل کر تمسخر اڑاتا ہے اور اپنی شوخی و شرارت بھرے قہقہے میں قاری کو شریک قہقہہ بنا لیتا ہے۔

ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں:-

''اچھا سفرنامہ وہ ہے جس میں داستان کی سی داستان طرازی، ناول کی سی فسانہ سازی، ڈرامہ کی سی منظر کشی کچھ آپ بیتی کا مسافر، کچھ جگ بیتی کا سا لطف اور پھر سفر کرنے والا جزو تماشا ہو کر اپنے تاثرات کو اسطرح پیش کرے کہ اسکی تحریر پر لطف بھی ہو اور معلومات افزا بھی''۔ (۱)

سفر نامے میں اس حقیقت کا بھی بہت عمل دخل ہوتا ہے کہ سیاح کے معاشی حالات کیسے ہیں

۱۔ ظہیر احمد صدیقی (سخنے چند) دیکھ لیا ایران از افضل علوی الحروف لاہور ۱۹۸۲ ص۔ د

کیونکہ ایک معاشی حالات سے آسودہ سیاح کی سوچ وفکر اور نگاہ میں فرق ہوگا۔ دوسرا یہ کہ اس نے سفر کے لیے کن وسائل کو استعمال کیا ہے اور ان میں مناظر کی تبدیلی کسطرح سے ہے۔ کیونکہ اگر سمندری سفر ہے تو مناظر کی تبدیلی کم ہوتی ہے۔ سفر کے دوران رہائشی اور سماجی حیثیت کا بھی عمل دخل ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ اعلی طبقے کے لوگوں کی معلومات اور کمتر درجے کی معلومات میں کافی فرق ہوگا۔

ابن بطوطہ اور مارکوپولو کے سفرناموں میں اس حقیقت کا عنصر نظر آتا ہے کہ انہوں نے عام لوگوں میں عام لوگوں کی طرح سفر کیا یہی وجہ ہے کہ ان کے سفرنامے میں داستانوی عنصر اور سفرنامہ نگاری ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل لکھتے ہیں:۔

'' سفرناموں کی تکنیک کا مزاج مختلف النوع طبائع کا منت پذیر ہوتا ہے۔ ہر سفرنامہ نگار اپنے باطن کا پوسٹ مارٹم کر کے آپکے سامنے بکھر جاتا ہے۔ اب اسکی شخصیت کے جزوی سے جزوی جھوٹ اور سچ سے واقف ہو جاتے ہیں۔ بلکہ لکھتے وقت تو اسے خبر بھی نہیں ہوگی کہ وہ کہاں قاری کی گرفت میں اسطرح آ گیا ہے کہ اب اپنا آپ چھپانا مشکل ہے۔ نثر کی دوسری اصناف میں مصنف خود کو چھپا سکتا ہے مگر سفرنامہ وہ صنف نثر ہے جس میں داخلیت سے سروکار رہتا ہے۔ اور ذات کے سمندر کو بلونا پڑتا ہے۔'' (۱)

دراصل سفرنامہ انسانی زندگی کے اس ذہنی ارتقاء کا نام ہے جہاں کا رہنے والا جزوتماشا ہو کر تہذیب وتمدن کو اس طرح مرتب کرے کہ زندگی پوری طرح سفرنامے میں منعکس ہو کر رہ جائے۔

مرزا ریاض سفرنامے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''سیر وسیاحت اب ایک الگ صنف اظہار نہیں رہی۔ ادب کے تخیل کی ایک شاخ بن گئی ہے۔ ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اور زندگی کسی ایک براعظم یا کسی

۱۔ ڈاکٹر آغا سہیل، تبصرہ زرد پتوں کی بہار از رام لعل لاہور ۱۹۷۷ء، ص ۱۷۔

مخصوص خطہ ارضی میں ہی نہیں سارے عالم میں ہوتی ہے۔ سفر زندگی اپنے وسیع
تر تناظر تمامتر رقبے ....اور جغرافیائی ....نشانات .... کے
سفرناموں اور سیاحت ناموں کا موضوع ہے"۔ [۱]

یوں اس بات سے انکار ناممکن ہے کہ سفرنامہ علمی و ادبی اعتبار سے اب فن کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ ہاں اچھے اور برے سفرنامے آتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اچھے سفرنامے شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کرتے ہیں جبکہ باقی سفرنامے اپنی موت آپ مرجاتے ہیں۔

۱۔ وزار ریاض، مسافر نواز بہتیرے، (سیاحت برطانیہ) ندیم بک ہاؤس لاہور ۱۹۸۵ء۔
ص۔ ۸۰۔

سفر ناموں کی اقسام

سفر عربی کا لفظ ہے اور لغت میں اسکے معنی سیاحت کوچ اور روانگی کے ہیں۔ سفر نامہ اپنی قدر و قیمت اور افادیت کے لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے۔ انسانی تعلقات کے بڑھ جانے سے علم الانسان Human, "AnthroPology" میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ عہد جدید میں Psychology اور سوشیالوجی Sociology نے انسانی مسائل پر بحث کرتے ہوئے ان کے مسائل کو سمجھنے اور ان کے حل کے لیے لاکھوں میل کا سفر کیا۔ آرٹسٹوں اور سنگ تراشوں نے اپنے آرٹ میں نئی جہت اور نئی منظر کشی کی تلاش میں سفر کئے۔ مذہب کے پیروکاروں نے مذہب کی پرچار اور لوگوں کو تبلیغ دین کے احاطہ اسلام میں لانے کے لئے سفر کیئے۔

غرض علم حاصل کرنے کے لیے علم کے متلاشیوں نے در بدر کی خاک چھانی۔ شاعروں نے دل کی تسکین کے لیے خوبصورت چہروں کو تلاش کیا۔ لیکن ان سب کے لیے سفر کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ سفر اپنے اندر وسعت تنوع رنگا رنگی، دلچسپی، مذہبی، ثقافتی، تمدنی کوائف لیے ہوئے ہے۔ دنیا کا ہر ادب زندگی کا اور اس کے مسائل کا عکاس ہے کیونکہ ادب دراصل انسان کی ذات کا سفر ہے۔ وہ ذات جو ظاہر اور باطن میں فرق ہے۔

سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:۔

''ادب کا موضوع انسانی زندگی سے مربوط ہے اور اس کا منطقی تجربہ کیجیئے تو آخر یہ بات یہیں آ کر ٹھہرے گی کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو ادب کا موضوع نہ بن سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جس دنیا میں رہتا ہے۔ اس دنیا سے اس کے روابط بھی ادب کا موضوع بن سکتے ہیں اور بنتے ہیں۔ بدیں اعتبار کوئی بھی چیز ایسی نہیں جسے ادیب چاہے تو اسے اپنے ادب کا

موضوع نہ بنا سکے۔ یہ کہنا البتہ درست ہوگا کہ ادب کے موضوعات جتنے انسانی زندگی سے قریب تر ہوں گے اتنے ہی انسان کے لئے زیادہ اہم ہوں گے اور اسی اعتبار سے ادبی تخلیقات میں عظمت اور رفعت پیدا ہوگی'' ۔(۱)

ہر زبان وادب میں سفر ناموں یا سیاحت ناموں کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے ۔ کیونکہ اس صنف سے نہ صرف معلومات کا خزانہ ہاتھ لگا بلکہ لطف وانبساط کے ساتھ پڑھنے والے کو بصیرت بھی ملتی ہے۔ علاوہ ازیں دوسری قوموں کے تہذیبی ،جغرافیائی اور تمدنی حالات سے بھی آ گاہی حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ آ گاہی دل ودماغ میں وسعت اور کشادگی پیدا کرتی ہے۔

آ غا محمد طاہر نبیرہ آزاد کے سیر ایران کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''سفر ناموں میں انسانی زندگی کے ان لوگوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو تاریخ ادب اور جغرافیہ کی دوسری کتابوں میں تاریک چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ جیسے معاشرتی طور پر طریق رواج وعقائد، مذہبی تعلقات تجارتی و صنعتی خصوصیات فرقے ، زبانیں، مشکل وصورت سفر ناموں کی ایسی خصوصیات ہیں جس نے اس کو جغرافیہ کی دوسری کتابوں سے منفرد کر دیا ہے''۔(۲)

سفر نامہ سیاح کے داخل وخارج کا حسین مرقع ہے۔جس کی رنگا رنگی ہی اسے تنوع بخشتی ہے۔ سفر نامے بے شمار موضوعات پر لکھے گئے۔ اس لیے بھی کہ سفر نامے انسانی تجربات میں اضافہ کرنے والے ہیں۔ دنیا کی ہر زبان میں سفر نامے لکھے گئے۔ان کی مسلم اہمیت کو عالمگیر طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ کیونکہ زندہ ادب میں شمار ہوتے ہیں۔ زمانہ قدیم کا ادب آج بھی دلچسپ اور جاندار ہے۔ ادب انسانی زندگی کا عکاس اور ترجمان ہے۔سفر نامہ بھی ناول، ڈرامے افسانے کی طرح ابتداء، ارتقاء اور انتہا سے گذر کر اپنی زندگی مکمل کرتا ہے۔اسی چیز نے سفر نامے کو آفاقیت بخشی ہے اور انسانوں کی تسکین کا باعث بھی بنتا ہے۔

ابتدا میں انسان نے سفر یا تو مذہبی رسوم کی ادائیگی اور مقدس مقامات کی زیارت اور عاقبت کے خوف سے کیا یا کاروباری اشیاء کی خرید وفروخت کے ساتھ ساتھ ذریعہ معاش کی تلاش، علم کی جستجو،

۱۔ سید عابد علی عابد اصول انتقاد وادبیات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۷ ص۔ ۲۸

۲۔ آغا طاہر نبیرہ آزاد دیباچہ سیر ایران از محمد حسین آزاد کریمی پریس لاہور ۱۹۸۶ ص۔ ۷

نئی دنیاؤں کی تسخیر یا فاتح عالم کہلانے کے شوق میں کیا لیکن سفر خواہ کسی قسم کسی نوعیت کا اور کسی مقصد کے لیے بھی کیا گیا ہو۔ اندرون ملک کا ہو یا بیرون ملک کا، سیاسی ہو یا مذہبی، تعلیمی ہو یا نئی دنیاؤں کی تسخیر کا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سے حالات و واقعات پر اسطرح روشنی ڈالی جائے کہ اس کے تجربات سے معلومات حاصل ہوسکیں۔ کیونکہ عموماً ایسے سفر نامے زیادہ مقبول ہوئے جن میں ادبی علمی، تاریخی، مذہبی، جغرافیائی اور سوانحی حالات و واقعات کو مدنظر رکھا گیا ہو۔

قطب النساء ہاشمی تین مسافر میں لکھتی ہیں :۔

> ''آج سفر نامہ ہمہ مقصد بن گیا ہے۔ مسافر چاہے تجارتی اغراض کے تحت سفر کرتا ہو یا مذہبی اعتقادات کی بناء پر چل پڑتا ہو۔ سیر وتفریح ہو یا ذوق تجسس کی تسکین ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر سفر نامہ لکھنا ہے تو اس کا مقصد ذاتی معلومات کو عام کرنا، اپنے تجربات ومشاہدات کو دوسروں تک پہنچانا ساتھ ہی ساتھ اپنے جذبہ اظہار کی تسکین بھی کرنا چاہتا ہے اور اکثر اوقات وہ جو کچھ اپنی ذات کے لیے کرنا چاہتا ہے۔ وہ پھیل کر سفر ناموں کے ذریعہ عام انسانوں سے متعلق ہوجاتا ہے''۔(۱)

دیگر اصناف کی طرح سفر ناموں میں موضوع اور تکنیک کا تنوع نظر آتا ہے۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سفر کی سہولتوں میں اضافے نے اس تنوع میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ مختلف سمتوں میں سفر کرنے والوں کے مقاصد انداز اور سفر کے لیے سہولتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ سفر نے زندگی کی حقیتوں کی بے نقابی کے ساتھ ساتھ ادب میں گہری سوچ اور خلیفانہ اپج سے کام لیا ہے۔ کیونکہ مسافر کا سچا ذوق سماجی حیثیت زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر علمیت، حقیقت پسندی یہ سب اس کے وہ ہتھیار ہیں کہ جن کے بغیر سفری زندگی کی جنگ ناممکن ہے۔

اس صدی کو سفر نامے کی صدی کہنا چاہیے۔ کیونکہ شاعری کے ساتھ ساتھ جس صنف ادب

۱۔ قطب النساء ہاشمی تین مسافر نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد ۱۹۶۶ ص۔ ۹

میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے وہ سفر نامہ ہے۔اس لیے شاعروں نے بھی اس کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے۔

حسن عابد''رنگ لایا ہے جنون'' میں لکھتے ہیں:۔

''مسافر بن گئے اہل قلم سب
ادب میں یہ سفرناموں کے دن ہیں۔

یا شاید اسی لیے بھی کہ سفر کے لیئے بہت سی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ مہینوں کا سفر دنوں میں اور گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے اور اسی وجہ سے لوگوں میں شوق سفر زیادہ بیدار ہوا ہے۔ عموماً سفرناموں کو ان اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1) یورپ کے سفرنامے
2) مذہبی سفرنامے
3) مشرقی سفرنامے
4) مقامی سفرنامے
5) سیاسی سفرنامے
6) تاریخی سفر نامے

ادب میں خاص طور پر جب باقی اصناف ادب کی نسبت سفر نامہ لکھنے کا رواج ہوا تو اس وقت مغلیہ دور حکومت کا خاتمہ اور انگریز سامراج کا تسلط چھا رہا تھا۔ جہاں پر تہذیبی تمدنی، جغرافیائی ٹکراؤ کے ساتھ قوموں کی کشمکش بھی عیاں ہو رہی تھی۔ صدیوں سے حکمرانی کرنے والے خاندان آہستہ آہستہ وقت کی قید میں مقید ہو رہے تھے۔ تہذیب نیا لبادہ اوڑھ کر نئے سانچے میں ڈھل کر انگڑائی لیکر بیدار ہو رہی تھی۔ زبان کے ساتھ کلچر اور کلچر کے ساتھ نئی دنیاؤں سے آشنائی پیدا ہو رہی تھی۔ نئے اور پرانے سانچے آپس میں ٹکرا رہے تھے مشرق اپنی مشرقیت کو برقرار رکھنے کے لیے اکھڑے سانسوں کے باوجود زندہ رہنے کی تگ و دو میں مصروف تھا۔ اور مغرب نئی تہذیب کے ساتھ اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ دل و دماغ کو خیرہ کر رہا تھا۔دوسری طرح سیاسی کشمکش بھی عروج پر تھی۔ ہر شخص دل سے غلامی کا طوق اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس سلسلے میں کچھ قومی رہنماؤں نے سیاسی

نوعیت کے سفر کیئے۔ کچھ نے تجارتی اور کچھ نے یورپ کی پر آسائش زندگی کے قصے سن سن کر اور وہاں کی زندگی کو تحسین و دلفریب پیش کرنے کی غرض سے۔

اس قسم کے سفر ناموں میں یوسف خان کمبل پوش کا ''عجائبات فرنگ'' کافی اہم ہے۔ وہ یورپ کی ہر چیز کو عجوبہ روزگار تصور کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ سیاح کا عمومی لفظ نظر بھی اس مد میں زیادہ نمایاں ہیں کہ ہر سیاح دوسرے ملک میں جا کر وہاں کی چیزوں سے اپنی ثقافت وتمدن کا مقابلہ کرتا ہے۔ یورپ میں جا کر وہاں کی سائنسی، علمی، تہذیبی اور جغرافیائی ترقی نے یہاں کے سیاحوں کی آنکھیں کھول دیں اور وہ اپنے ملک کو حقیر گردانںے لگے۔ لیکن اس پر آشوب دور میں کچھ سیاح ایسے بھی تھے کہ جو یورپ کی ترقی سے متاثر ضرور ہوئے لیکن وہ اپنے ملک میں ویسی ہی ترقی لانے کے خواہش مند تھے۔ ان میں سرسید احمد خان کا ''مسافران لندن'' اس چیز کا غماز ہے کہ وہ یورپ کی ترقی کو اپنے ملک کی خرابیوں سے مقابلہ کر کے انہیں دور کرنے کی تمنا دل میں بسائے ہوئے واپس آئے۔

لیکن ایک بات جو اس دور کے سفر ناموں میں نظر آتی ہے کہ رویہ خوشامدانہ اور لہجہ عاجزانہ ہے۔ جو کہ ایک سیاح کو زیب نہیں دیتا کیونکہ وہ اپنے ملک کا سفیر ہوتا ہے۔ ملک وقوم سے ہمدردی اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار لوگوں کا یہ شیوہ نہیں ہوتا۔ البتہ آج کا سیاح اس رویے سے برعکس انداز لیے ہوئے ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یورپ کی اب وہ دھاک نہیں ہے کہ وہ سر چڑھ کر بولے۔

مذہبی سفر نامے عموماً عقیدت واحترام محبت اور مذہب کی سرشاری سے سرشار ہوتے ہیں۔ عموماً حاجی لوگ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، حرمین شریف اور دوسرے متبرک مقامات کے بارے اپنے جذبات کیفیات اور احساسات کو تفصیل سے لکھ دیتے ہیں۔ ایسے سفر نامے زائرین کے لیے ایک گائیڈ بک کا کام دیتے ہیں۔

مدینے کا مسافر منزل سے ہمکنار ہونے کے لیے جاتا ہے۔ یہ وہ بھٹکا ہوا آہو ہے جو سوئے

انسانوں

حرم جا رہا ہے کیونکہ یہ وہ منزل ہے، وہ مقام ہے کہ جس نے افسانوں کو نیا جنم دیا۔ نئی تاریخ دی۔ نیا نظام دیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس روئے ارض پر کوئی اپنا گھر نشان کروایا۔ ورنہ ایک بے بس انسان کی پہنچ کہاں کہ وہ اپنے رب اور اس کے محبوب کی نشانیوں کو دیکھ سکے۔ اسطرح کے سفر ناموں میں پوری فضا عقیدتوں اور پاکیزہ جذبوں کی ایک ایسی دلآ ویز داستان ہے کہ جس کے ایک ایک حرف میں رفعت اور ایمان افروز تاثرات صداقت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں کہ جہاں قدموں کی بجائے سر کے بل چلتے ہیں کہ یہ راستہ کوئی اور ہے۔ غرض مکہ و مدینہ وہ مقدس مقامات ہیں جہاں زندگی آداب سیکھتی ہے۔

اس کے ساتھ عراق، ایران کے مقامات مقدسہ کے بارے میں بھی سفر نامے ملتے ہیں لیکن سفر ناموں کی عقیدت تین انداز سے ڈھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ایک وہ کہ جن میں حاجی یا عقیدت مند ذاتی تاثرات و حالات بیان کرتا ہے اور اپنی ایمان افروزی کے واقعات تفصیلاً بیان کرتا ہے۔ دوسری قسم کے سفر نامے مکہ میں راہ کی دشواریاں، مسافت کی تلخیاں اور مقامات مقدسہ کی مداحت اور تاریخ کے بارے میں معلومات ہوتی ہیں۔ تیسرے وہ کہ جوان کا مرکب ہوتے ہیں کہ جن میں تاریخ، تہذیب، معاشرت ذرائع رسل و رسائل کے ساتھ ساتھ مقامات مقدسہ کی تفصیل اور قبور کے بارے میں بھی تقدُس علمی دلائل ہوتے ہیں۔

اس طرز کے سفر ناموں میں بعض اوقات مقامات مقدسہ کی تصاویر کے ساتھ ساتھ جغرافیائی حد بندیوں کو سمجھانے کے لیے نقشوں سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ ان سفر ناموں سے معاشرتی اور تاریخی شعور کو بھی مدد ملتی ہے لیکن بات بیان کرنے والے کے لفظ نظر اور اسلوب بیان پر منحصر ہے کہ وہ کیسے دوسروں کے جذبات پر اثر پذیر ہوتی ہے۔

مشرق ہمیشہ سے ہی تہذیبی و تمدنی لحاظ کے ساتھ ساتھ لبادوں اور قصے کہانیوں کی عظیم داستانوں کو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہے۔

ایران، عراق، عرب، مصر و شام، قسطنطنیہ اور پھر بہادروں کی سرزمین ترکی اپنے اندر عظیم الشان تاریخی حقائق اور عدیم المثال عظمت و شوکت کی داستان سناتا ہے۔

بہادری اور اولوالعزمی جانفشانی کے ساتھ ساتھ مشرق کی تہذیب، معاشرت بھی مغرب کے لیے ہمیشہ قابل کشش اور اور قابل تقلید رہی ہے کیونکہ جو رکھ رکھاؤ یہاں کی قوموں میں بہت زیادہ ترقی نہ کرنے کے باوجود ہے وہ مغرب میں چاند کو چھو لینے کے باوجود نہیں ہے۔

ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں:۔

"مشرقی ممالک کا سفر عرب کے حالات جاننے وہاں کی تہذیب و معاشرت کو سمجھنے کی غرض سے بھی کیا گیا ہے۔ مشرقی سفرناموں میں وہاں کی تہذیب طرز معاشرت اور سماجی حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ایران، عرب، عراق اور قسطنطنیہ کی تہذیب سے ہندوستانی تہذیب کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہاں کے تعلیمی نظام سے اپنے ملک کے تعلیمی نظام کا معائنہ کیا ہے۔ وہاں کی عمارتوں کی تفصیل اور قدرتی مناظر کی عکاسی بھی ان سفرناموں میں ملتی ہے"۔ (۱)

اس لیے مشرق کے سفرنامے بھی اپنے اندر بہت زیادہ دلچسپی اور کشش رکھتے ہیں۔

مقامی سفرنامے کا نام ذہن میں آتے ہی یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کو اس چیز میں زیادہ کشش محسوس ہوتی ہے جو دسترس سے باہر ہو جو ہاتھ آ گیا تو جام جم تو نہ رہا۔ انیسویں صدی میں کچھ سفرنامے ایسے بھی تحریر کئے کہ جو اندرون ملک کے سفر پر مشتمل ہیں۔ جیسے سیر کشمیر، کے ٹو کہانی، میرا پاکستان، دیکھ لیا ایران، سیر پنجاب و دھلی وغیرہ یہ حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد لاکھوں پاکستانی دیار غیر میں یوں بس گئے ہیں کہ کبھی پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ مادر وطن کو ان کے آباؤ اجداد نے کیسے خون کی ندیاں بہا کر حاصل کیا تھا۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہیں کہ جنہوں نے اس سرزمین وطن کی خاک کو یہی آنکھوں کا سرمہ بنالیا۔

کشمیر، سوات بلتستان، شمالی علاقہ جات، گلگت، سکردو وغیرہ ایسے مقامات ہیں کہ جہاں مقامی حسن قدرت کی صناعی کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ دعوت نظارہ دے رہا ہے۔

خاص طور پر کشمیر کو جنت نظیر کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس میں بھی سفرناموں کی تقسیم کچھ اس طرح سے ہے کہ کچھ سفرنامے ایسے ہیں جو جہاں کے حسن و دلکشی کا حال بیان کرتے

۱۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی، اردو سفرنامہ انیسویں صدی میں نصرت پبلشرز لکھنؤ ۱۹۹۱۔ ص ۴۲۔

ہیں۔ کچھ یہاں کی تاریخ وغربت کے بارے میں بتاتے ہیں اور کچھ مستنصر حسین تارڑ کی طرح یہاں کے دلفریب نظاروں کے ساتھ ساتھ راستوں کی تکالیف لوگوں کے حسن تاریخ، جہالت، مذہب پذیرائی، دلکشی کے ساتھ ساتھ تعلیم سے بے خبری اور مشقت ومحنت کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ بعض سفرنامے برصغیر پاک وہند کی تقسیم سے قبل کے ہیں کہ جن دھلی کے کھنڈرات، عمارات کے بارے میں تفصیلاً حال بیان کیا ہے کہ ان سے تاریخ بھی مرتب کی جاسکتی ہے۔ کچھ میں وہاں کے رسوم ورواج تہذیب ومعاشرت کا بھی علم ہوتا ہے۔

سیاسی سفرنامے اور صنف ادب میں ایک ناقابل فراموش سبق آموز اور قابل قدر اضافہ ہیں۔ خاص طور پر جعفر تھانیسری کا ''کالا پانی'' اور انگریزوں کے دور کا ایک اور سفرنامہ اسیر مالٹا انگریزوں کے ظلم واستبداد اور مہر کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ مشاہدات کابل افغانستان تحریک ہجرت اور جدوجہد آزادی کی پروردہ داستان سے پردہ اٹھاتا ہے اور افغانستان کے حکمرانوں کی غداری کا راز فشت ازبام کرتا ہے۔ اسطرح سے مولانا عبیداللہ سندھی کا سفرنامہ کابل میں سات برس اور ذاتی ڈائری انہی حقیقتوں کو اجاگر کرتی ہے۔ قاضی عبدالغفار کے سفرنامہ نقش فرنگ، خالدہ ادیب خانم کا سفرنامہ اندرون ہندوہندوستان کے گہرے سیاسی مشاہدے پر مبنی ہے۔ وہ ان سفرناموں سے انگریزوں کی سیاسی چال بازیوں اور ان کے ظلم وستم کو پیش کرتے ہیں۔

ان سفرناموں میں خاص طور پر قید وبند کی صعوبتیں اور غلامی میں ظلم وجبر کو برداشت کرنے اور حکمران طبقے کی مطلق العنانی کے بارے میں تفصیلات بھی ملتی ہیں جو تاریخ کے اوراق میں ہمیں نظر نہیں آتیں۔ کیونکہ تاریخ ہمیشہ بادشاہوں وکجکلاہوں کی داستانیں بیان کرتی ہے۔ عام آدمی ہمیشہ اس کی نظر اور قلم سے اوجھل رہے ہیں۔

علم تاریخ کو بھی سفرناموں کی تاریخی اہمیت میں خاص جگہ دی جاتی ہے کہ تاریخ جب لکھی جاتی ہے تو وہ خاص لوگوں کی خاص داستان ہے۔ اس میں عظیم الشان سلطنتیں، جنگیں، اور شاہی حکم درج ہوتے ہیں لیکن اگر ان بادشاہوں کے احساسات ومحسوسات اور نجی زندگی کے بارے میں روشنی ڈالی گئی تو صرف سفرناموں میں کیونکہ سفرنامے میں ہمیں ۳۰۰ ق۔م کے ہندوستان کی تصویر میکاستھینز

کے سفر نامے میں زندہ وجاوید اور متحرک نظر آتی ہے۔

۳۹۹ سے ۶۴۵ کے برصغیر خصوصاً اس وقت کے بدھ مذہب اور اسکے خانقاہوں کے علاوہ ان سنٹروں کی حالت اور تہذیبی زندگی کے بارے میں فاھیان اور ھیونگ شیانگ کی تحقیق کے مطابق ہندوستان و پاکستان کی تاریخی اہمیت ان سیاحوں کے بیانات میں فرق ہے۔

اس کے ساتھ ۹۲۲۔۹۲۱ کے روس کے حالات ابن فضلان کے ''سیاحت نامہ روس'' پڑھ کر ہوتا ہے اور دسویں صدی عیسوی میں مراکش سے تاشقند تک حالات و واقعات ابوعبیداللہ کے سفرنامے ''احسن التقاسیم'' معرفتہ الاقالیم، سے ملتا ہے۔

آج کے دور میں بھی بیروت، کشمیر، فلسطین، افغانستان کے حالات اس دور کے سفرناموں میں جن حقائق سے نظر آتے ہیں وہ حقائق ہمیں دستاویزات اور تاریخ سے بھی ملنے ناممکن ہیں کیونکہ اس قبیل کے بیسیوں سفرنامے مختلف ممالک کی تاریخ کے اہم ماخذ ہیں۔

سفرنامے کی مندرجہ بالا تقسیم سے یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ بنیادی طور پر سفر کرنے کی جو وجوہات ہوتی ہیں۔ انہیں (ان) کی وجہ سے سفر نامے کو مختلف اقسام میں بانٹا گیا کوئی ملک سے تعلیم حاصل کرنے جاتا ہے اور کوئی فارن سروس کا ممبر بن کر، کوئی تاجرانہ عزم لیکر اور کوئی محض زیارات کے مقدس ارادے سے نکلتا ہے۔ اسی لیے وحیدالدین سلیم لکھتے ہیں۔

'' ایک گروہ تجارت کی غرض سے نکلتا ہے اور ایک گروہ نئے ملکوں کو فتح کرنے کے لیے اٹھتا ہے تو مشرق سے مغرب تک کو روند ڈالتا ہے۔ ایک گروہ علماء کا تھا۔ جنہوں نے حدیث کی تلاش میں عراق سے اسپین تک اسپین سے عراق تک سفر کیا اور بہت سے ایسے تھے جو حرمین کی زیارت کے بہانے نکلے اور جدھر کو منہ اٹھا دور تک نکل گئے''۔ (۱)

سفرناموں کی مندرجہ بالا اقسام کے علاوہ تقسیم قدیم اور جدید سفرناموں کے حوالوں سے بھی کی جاتی ہے۔ لیکن اس تقسیم میں مردانہ اور زنانہ لکھنے والوں کی بھی ہے کہ جن کو جغرافیائی، تاریخی منظرکشی کے حوالے سے بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے اور قدیم و جدید کے علاوہ سفر کی سہولتوں کے ساتھ واقعات کا احاطہ تحریر میں لانے کے انداز میں بھی۔

۱۔ وحیدالدین سلیم ج ۲ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۶۱ ص۔ ۶

اردو سفرنامہ آغاز تا حال

سفر ماضی سے موجود کی طرف ہوتا ہے۔ سفر کے تحیر و تجسس کی ایک معصوم اور دلآویز فضا جو قاری کے ذوق کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور اس کی بصارت کو بے تکلف اپنائیت مین رچے مناظر کے رو برو اسطرح کھڑا کرتی ہے کہ وہ ان مناظر کو زندگی کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ قبول کرنے کی صلاحیت اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ سفر نامہ وہ صنف ادب ہے جس میں معلومات اور بصیرت کے ساتھ قاری کو تخلیقی ادب کا لطف بھی فراہم ہوتا ہے۔ سفرنامے میں نثر کی دلکشی اور مشاہدے کی گہرائی پائی جاتی ہے اس سے علم اور تجربے میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ سفرنامہ انسانی زندگی کے اس ذہنی ارتقاء کا نام ہے کہ جس میں انسانی تہذیب و تمدن ایک نئی شکل اختیار کر کے زندگی کے بظاہر سکھ، سکون اور آسائش کے لمحوں کو از سر نو تشکیل کرتا ہے۔ سفر اپنے عہد کے شعور کو تمام تر سچائیوں سمیت قبول کرنے اور انہیں عقل سے پرکھ کر لفظی سانچوں میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی سے جہان دیگر کی تلاش شروع ہوتی ہے۔

انسانی زندگی اور اس کے رابطے سفر سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ زندگی کو بامعنی اور پر اثر سفر بناتا ہے۔ مسرت حاصل کرنا ہر انسان کی ازلی و ابدی خواہش ہے۔ مسرت لفظوں سے ہو تو بھی سکون کا باعث بنتی ہے اور اگر حقیقی معنی میں ہو تو لذت دیگر ہے۔ باوا آدم کی اولاد روز اول ہی سے دو دنیاؤں کے درمیان سفر کرتی ہے۔ خارجی صورت اور معنوی صورت۔ ان دونوں کے درمیان ربط کا کام الفاظ دیتے ہیں۔ عمیق مشاہدہ اور وسعت مطالعہ انہیں خوبصورت تر کر دیتا ہے۔

سفر دینی اور دنیاوی دونوں اعتبار سے کارآمد ہے۔ سفر سے تجربہ وسیع اور زمانے کے نشیب و فراز کو سمجھنے دنیا کے رسوم و رواج، طرز معاشرت اور سیاسی اور انتظامی امور سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ فیروز اللغات میں اس کا مطلب کچھ یوں ہے:۔

'' سفر۔ س فر) (ع۔ا۔وز) (1) مسافرت۔ سیاحت (2) کوچ۔ روانگی

۱۔ فیروز اللغات مرتبہ فیروز الدین فیروز سنز لاہور نیا ایڈیشن س۔ن۔ص ۔۸۰۱

جامع اللغات میں اس کے معنی یوں درج ہیں۔

سفر مذکر، شہر سے دور باہر جانا، مسافرت کوچ، روانگی کے ہیں۔ (۱)

ڈاکٹر انور سدید سفر کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

'' سفرنامہ سفر کے تاثرات، حالات اور کوائف پر مشتمل ہوتا ہے۔فنی طور پر سفرنامہ وہ بیانیہ ہے۔ جو سفرنامہ نگار سفر کے دوران یا اختتام سفر پر اپنے مشاہدات کیفیات اور اکثر اوقات قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے۔اس صنف ادب کا تمام تر مواد موجود منظر کے گرد و پیش میں بکھرا ہوتا ہے لیکن واضح رہے کہ سفرنامہ نگار صرف خارجی ماحول کا ہی مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ اپنے بیانیہ کو مدلّل اور ہمہ جہت بنانے کے لئے بہت سی دوسری جزئیات کو بھی سمیٹتا چلا جاتا ہے سفرنامہ نگار کی آنکھ جتنی باریک بین ہوگی جزئیات اتنی ہی تفصیل سے اس کے مشاہدے میں آئیں گی''۔(۲)

ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں:۔

''تمام دنیا کے بانیان مذاہب نے '' سفر وسیلہ ظفر'' کی صداقت کو تسلیم کیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ اس پر معنی جملے میں دینی اور دنیاوی ترقیات کے بے شمار اسرار پوشیدہ ہیں''۔ (۳)

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں۔

'' سفرنامہ ہر ادب کی ایک مستقل بیانیہ صنف ہے۔ جس میں خارجی مشاہدے کو تخیل پر فوقیت حاصل ہے۔ '' (۴)

سفر انسان کی جبلت میں شامل ہے۔ ہر دنیا کا انسان سفر میں ہے کوئی اندرونی طور پر کوئی بیرونی طور پر، نفیسہ حق سفرنامہ، فن اور جواز مشمولہ سہ ماہی ~~ایئر پیپر~~ الزبیر میں لکھتی ہیں۔

''سفر عربی زبان کا لفظ ہے۔جس کے معانی مسافت طے کرنا، سیاحت کے لیے نکلنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا، ایک شہر سے دوسرے شہر میں

۱۔ خواجہ عبدالجید بی۔اے جامع اللغات ج ۳ جامع اللغات کمپنی لاہور جون ۱۸۹۲ ص۔ ۳۶۹

۲۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص۔ ۵۹

۳۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی اردو سفرنامے انیسویں صدی میں جامعہ نگر نئی دہلی فروری ۹۱۸۷ ص۔ ۲۱

۴۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۷ ص۔ ۱۰

منتقل ہونا کے ہیں۔ اردو زبان میں یہ لفظ عربی سے مستعار ہے۔ اور انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ نامہ فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہے خط، فرمان یا مجموعی طور پر تحریر شدہ عبارت۔ اس لیے اردو کے علماء نے سفر عربی سے اور نامہ فارسی سے لے کر سفر نامہ کی اصطلاح وضع کی ہے۔ اردو میں سفر نامہ روداد سفر یا سفری تجربات مشاہدات کو رقم کرتے ہیں''۔ (۱)

Webster نے سفر نامہ کی تعریف کچھ یوں کی ہے۔

"A documentary ~~Flim~~ Film about travelled place, A lecture or talk on trave, (U.SU) Illastrateed Picturia by Aso Tra've.....log." Websters New world Dictionary of the American ~~Long Wage~~ Language A lecture on travels usually accompained by the showingof Pictur" (۲)

ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں۔

'' ہر زبان کے ادب میں سفر ناموں یا سیاحت ناموں کی ایک خاص اہمیت رہی ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے کہ جو معلومات بھی بہم پہنچاتی ہے۔ بصیرت بھی دیتی ہے اور پڑھنے والے کو تخلیقی ادب کا لطف و انبساط بھی فراہم کرتی ہے۔اس کے ذریعہ قاری دنیا کی دوسری قوموں کے تہذیبی جغرافیائی اور تمدنی حالات کی آگاہی حاصل کر کے انسانی فطرت کی وسعتوں سے آشنا ہوتا ہے اور اس طرح اس کے دل و دماغ میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی ہے''۔ (۳)

۱۔ نفیسہ حق سفر نامہ فن اور جواز مشمولہ سماہی الزبیر (سفر نامہ نمبر) ج ۳۶ ۔۳۷ اردو اکیڈمی بہاولپور ۱۹۹۸ ص۔ ۹۴

۲۔ Websters New World Dictionary of the American Language Page No۸۴
Second College Edition - Page = ۱۵۱۳

۳۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۵

سفر نامے کے لفظی مطلب اور اس کے تاریخی پس منظر کے بعد دیکھنا ہے کہ آخر سفر ہے کیا۔ اور سفر نامہ آخر سیاح کیوں لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ سفر نامے کا اہم عنصر اس میں حرکت اور زندگی ہے ۔ زندگی چونکہ خود حرکت سے ہے۔ اس لیے زندگی دراصل استعارہ ہے۔ غم، خوشی، ہجر وفراق، ملاپ، خود اعتمادی، حوصلے پامردی اور سب سے بڑھ کر ان دیکھی انجانی ہواؤں اور فضاؤں کا خوشبوؤں کا، کچھ کھو کر پانے کا، کچھ پا کر کھونے کا جستجو کا، تلاش کا اور اپنے آپ کو منوانے کا سب سے منفرد اور الگ رکھنے کا۔ ان سب سے مل کر سیاح جنم لیتا ہے اور یہ سفر رزق کی تلاش کا ہو، ادب میں نام کا ہو، اسلام کی تبلیغ کا ہو۔ تاریخ کو کنگھالنے کا ہو۔ جغرافیہ معلوم کرنے کا ہو تہذیب و تمدن و معاشرت سے آگہی کا ہو۔ حج یا عمرہ ہو یا مقامات مقدمہ کی زیارت کا ہو۔ یا ذہنی تسکین کا ہو۔ سفر ہے اور انسان کی دنیا میں آمد و رفت بھی سفر ہے۔ باوا آدم کا ~~حوا کی خطا پر جنت~~ سے نکلنا بھی سفر ہے۔

اور اس دن کے بعد سے یہ سفر قیامت تک جاری و ساری ہے اور جب تک اللہ تعالی انسان سے مایوس نہیں ہوتا یہ سفر جاری رہے گا۔ اس میں اچھے برے انسان پیدا ہوتے رہیں گے اور سفر جاری رہے گا۔

ڈاکٹر عصمت ناز لکھتی ہیں۔

> '' پیغمبروں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی سفر کیئے اور اپنے سفر کے احوال وہ اپنے ساتھیوں اور حواریوں سے بیان کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی یہ سفر ضرورت کے تحت تھے کبھی تبلیغ کی خاطر اور کبھی اللہ کا نام بلند کرنے کی کوشش میں وہاں کے مقامی لوگوں نے جب انتہائی تنگ کیا تو سفر مجبوری بن گیا اور کبھی بادشاہ کے دربار سے دوسرے بادشاہوں تک رسائی کا سفر کیا۔ حضرت موسیٰؑ کا بچپنے کا دریا میں سفر کبھی ملکہ سبا کا سلیمان کے دربار میں سفر، کبھی نوح علیہ السلام کا کشتی میں سفر، کبھی ہاجرہ اور اسماعیلؑ کا سفر اور پھر پیغمبر آخر الزمانؐ کے ماننے والوں کا ہجرت کا سفر حبشہ اور پھر خود آپؐ کا سفر ہجرت جو مدینہ کی طرف

ہوااور آپؐ نے مختلف علاقوں میں جو سفر کیئے وہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کرام کی زبانی جب لوگوں تک پہنچے تو اپنی دیگر نوعیتوں کے علاوہ وہ سفر ناموں کی حیثیت رکھتے تھے علاوہ ازیں

''تجارت کی غرض سے سفر اور پھر سفر معراج بھی آپؐ کی پہچان ہیں یعنی سفر سنت انبیاء رہا اور پھر اولیاء اور صالحین نے بھی اس روایت کو زندہ رکھا۔ خلفائے راشدین نے بھی فتوحات کے ضمن میں بے شمار سفر کیئے اور مشرق سے مغرب تک اسلام کا نام روشن کیا۔''(۱)

لیکن اگر جغرافیائی لحاظ سے دیکھا جائے تو ہیرودوٹس ہی پہلا شخص تھا جس نے ۴۸۴ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور اس نے دنیا کے بارے میں اور زمین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے سفر کیا۔ اس کا سفر بحر اسود پھر یونان اور جنوبی اٹلی تک کا تھا۔ اس نے لوگوں کی رہائش احساسات طبائع اور بودوباش کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کیا۔

اس کے بعد ''سٹرابو'' بطلیموس اور رومن جرنیل اگریپا نے رہنمائے جغرافیہ جیسی اہم کتابیں لکھیں اور انسانی تاریخ اور تمدن کے بارے میں بے حد مفید معلومات فراہم کیں۔ ''سیرونی الارض'' کا ذکر قرآن پاک میں سات مقامات پر آیا ہے۔ تین مقامات پر اس رنگ میں کہ جھٹلانے والوں کا انجام دیکھنے کے لیے۔ (سورۃ الملک پارہ نمبر ۲۹) ایک مقام پر مجرمین کا انجام دیکھنے کے لیے (سورۃ الملک پارہ ۲۹ آیات نمبر ۲۴, ۲۵, ۲۶, ۲۷) ایک مقام پر مشرکین کے انجام کے لیے۔ (سورۃ الملک آیات نمبر ۲۸, ۲۹, ۳۰۔

چھٹے مقام پر اس لیے کہ دیکھو اللہ نے مخلوق کی پیدائش کی''

سورۂ نوح میں فرمایا گیا ہے کہ :۔

''حالانکہ اس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے۔ کیا دیکھتے نہیں کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بر تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا۔ پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکا یک تم کو نکال کھڑا کرے گا اور اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تا کہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو۔''(۲)

۱۔ ڈاکٹر عصمت ناز سفرناموں کی تاریخ وتدوین سہ ماہی معاصر جولائی تا دسمبر ۲۰۰ شمارہ ۳، ۴ ص ۔ ۲۶۷

۲۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ج ۶ (سورۃ نوح پارہ ۲۹) ترجمان القرآن لاہور ص۔ ۱۰۱، ۱۰۲

ساتویں مرحلے میں سورۃ المرسلت پارہ ۲۹ کی آیات نمبر ۲۵, ۲۶, ۲۷, ۲۸ میں مخلوق کی پیدائش کے بارے میں بتایا۔

''یہی ایک کرہ ہے جو کروڑوں اور اربوں سال سے بے حد وحساب مخلوقات کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہے۔ ہر قسم کی نباتات اور ہر قسم کے حیوانات اور انسان اس پر جی رہے ہیں''۔(۱)

ان سات مقامات میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا کہ ان بستیوں کے درمیان راتوں کو بھی اور دن کو بھی سفر کرو۔ انسان نے سفر کیا ملاپ کے لیے۔ جہاد کے لیے، تبلیغ کے لیے اور سب سے بڑھ کر حج اور مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے اس لیے ہم سفر کی اہمیت و تکالیف سے انکار نہیں کر سکتے۔

پھر حدیث کی تدوین کے سلسلے میں صحابہ کرام کے دور میں دور دراز کے سفر کیے گئے۔ اور حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ

''علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے''

اس لیے تدوین حدیث کے سلسلے میں جن لوگوں نے سفر کیئے انہوں نے بھی وہاں کے لوگوں کے بارے میں معلومات فراہم کیں تاریخ اور اسلام کو مدنظر رکھا جائے تو بری اور بحری سفر سب سے زیادہ مسلمانوں نے کیئے۔ یورپ والے اس میں بہت بعد میں شامل ہوئے۔

محققین نے یونانی مؤرخ لیبر ہیروڈسن کو اولین سفرنامہ نگار مانا ہے۔لیکن ''المسعودی'' کو عرب کا ہیروڈوٹس کہا جاتا ہے۔اس نے ایران، ارمینیا، وادی سندھ سیون، افریقہ، رنجبار اور مڈغاسکر تک کا سفر کیا۔ اور اخبار الزمان تیس جلدوں پر مشتمل کتاب لکھی۔ یونانی مؤرخ زینوفون کی کتاب Anabasis ''میں سفر کے لوازمات موجود ہیں۔

روم میں Aelius اور Horace نے اپنے سفر کی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔

اندلس کے سفرناموں میں ''ابن جبیر'' کا نام بہت مشہور ہے۔

عرب ممالک میں بغداد ایک ایسا علاقہ تھا کہ جس کا ذکر تمام قدیم داستانوں میں شان و شوکت کے ساتھ شہزادوں اور شہزادیوں کے حسن وعشق کی داستانوں کا طلسم لیے ہر خاص وعام کے دل

۱۔ لغیہم الخزن ، بحوالہ سابقہ، ص ۱۰۱ - ۱۰۲۔

پر نقش تھا۔ اور وہ اس سحر انگیز ماحول اور لوگوں کی خوبصورتی کو جاننا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر تارا چند نے لکھا ہے۔

''چھٹی صدی قبل مسیح تاریخ عالم کے حیرت ناک ادوار میں شمار ہوتی ہے۔ اس صدی میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں خیالات کی ترسیل کا سلسلہ براہ راست جاری تھا اور چین سے لے کر مصر اور یونان تک اثرات پہنچتے تھے۔ ان خیالات کا مرکز تمدن کا گہوارہ بغداد تھا۔'' (۱)

سفر نامہ دراصل تاریخ اور جغرافیائی معلومات ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ ذوق علم اور ذوق سیاحت کو بڑھانے کا کام بھی دیتا ہے اور قرآن حکیم میں تو واضح طور پر سفر کو وسیلہ ظفر قرار دیا گیا ہے اور ہر ملک ملک ما است کہ ملک خدائے ما است کے نظریے کے تحت یہ ساری دنیا انسان کے لیے بنائی گئی ہے کہ وہ اس کو تسخیر کرے اور اس میں چھپے ہوئے رازوں کو تلاش کرے۔

ابن بطوطہ چودھویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا۔ ابن بطوطہ نے پچیس برس کا طویل عرصہ سیاحت میں گزارا اور ہندوستان میں محمد بن تغلق کے عہد میں نو برس رہا۔ اس کے سفر نامے ہندوستان کی تاریخ کے یادگار اور اہم ترین سفر نامے ہیں۔

ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں۔

'' ابن بطوطہ آٹھویں صدیں ہجری کا مشہور مسلمان سیاح ہے۔ جس نے اپنی عمر کے چھبیس سال مشرق و مغرب کی سیاحت میں بسر کیئے۔ وہ مختلف علوم و فنون میں دستگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ نگاہ دوربین رکھتا تھا۔ اسی لیے وہ جہاں بھی کہیں گیا وہاں کے سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی حالات کا مطالعہ بڑی دقیقہ رسی کے ساتھ کیا وہ کسی بادشاہوں کے دربار میں اعزاز و اکرام کی کسی بڑی کرسی پر نظر آتا ہے تو کبھی صوفیائے کرام کی مجلس و جدو حال میں شریک دیکھا جاتا ہے۔ اس بنا پر اس کا سفر نامہ جہاں بے حد دلچسپ اور دل آویز ہے وہاں پر نایاب اور بیش قیمت معلومات کا گنجینہ بھی ہے'' (۲) ۔ ابن بطوطہ کا سفر نامہ صرف معلوماتی ہی نہیں بلکہ اسلوب بیان کے لحاظ سے بھی منفرد ہے۔ ڈاکٹر عصمت ناز لکھتی ہیں کہ :۔

'' ابن بطوطہ کا اسلوب بہت شاندار اور دلچسپ ہے۔ جس کی

---

۱ - ڈاکٹر تارا چند، تمدن ہند پر اسلامی اثرات الہ آباد ۱۹۴۶ - ص ۴ -
۲ - ڈاکٹر قدسیہ قریشی، بحوالہ سابقہ، ص ۳۶ -

''وجہ ہے اس کے سفر نامے کا شمار ''عظیم ازلی شاہکاروں اور ماہ پاروں میں
ہوتا ور اس طرز تحریر کو بہت سے لوگوں نے اپنا کر اس روایت کو زندہ رکھا
اور اپنے سفر ناموں کو دلچسپ بنایا۔ گویا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خوبصورت
تحریر اور دلچسپ پیرائے میں سفر نگاروں کی ابتدا کا موجد ابن بطوطہ ہی
ہے۔ جس نے آج سے تقریباً چھ صدیاں قبل یہ اعزاز حاصل کیا(۱)

سرزمین برصغیر اہل مغرب کے لیے ایک ایسا خطہ ارضی تھا کہ جو اپنے اندر بے پناہ کشش اور سحر رکھتا تھا۔ اس سحر نے انگریزوں کو ہندوستان کی سیاحت پر مجبور کیا اور پھر ہندوستان مغلوں کے اقتدار سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار میں چلا گیا۔ لیکن انگریزوں کے وارد ہونے سے مشرق کے مکینوں کے لیے بھی یورپ کی کشش میں اضافہ ہوا لیکن اس سے پہلے قدیم آریا تہذیب اور رامائن کے دور میں ہندوستان سے باہر کے سفر کے اشارے ملتے ہیں۔

ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں:۔

'' مہابھارت میں جو نام ملتے ہیں وہ دور دراز ممالک کے نام ہیں جس
سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ دور دراز ملکوں کا سفر کرتے
تھے۔ ویدوں پرانوں، رامائن اور مہابھارت کے علاوہ دوسری کتابوں
میں بھی سفر کا ذکر ملتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر کرنے کی خواہش
قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ (۲)

اور یوں صدیوں انگریز دور کی آمد کے بعد یہ سلسلہ سفر ایسا شروع ہوا کہ آج تک جاری ہے۔

ہندوستان میں سفر ناموں کے ابتدائی نقوش ہمیں ڈاکٹر گستاؤلی بان کی کتاب سے ملتے ہیں جن کے مطابق ہندوستان کا پہلا سیاح میگستھیز ہے۔ جو سلیوکس کے سفیر کی حیثیت سے سوریہ سلطنت کے عہد میں ہندوستان آیا۔

ڈاکٹر برنیر فرانسیسی سیاح ۱۶۵۵ میں اورنگ زیب کے عہد میں آیا۔ اس نے شاہ جہاں اور اورنگ زیب جیسے مغل بادشاہوں کے مذہبی، تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، علمی، فنی غرض کہ محل کے حالات و واقعات اور امور سلطنت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

ہندوستان میں سفر ناموں کے ابتدائی نقوش مغل حکمرانوں کے توزک اور مفاہیم ہیں کہ جن سے ہمیں ان کی سفری روداد کے ساتھ ساتھ ذاتی پسند ناپسند اور شاہانہ جاہ و جلال کا بھی اندازہ

۱۔ ڈاکٹر عصمت ناز، بحوالہ سابقہ ص ۲۷۱۔
۲۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی، بحوالہ سابقہ، ص ۳۸

ہوتا ہے۔

ہندوستان میں انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں پر دو طرح کے اثرات مرتب کیے۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے نو سو برس کی عمارت کے ستون ہلا دیئے تھے اور مسلمانوں کو سیاسی، سماجی، معاشی اور حکمرانی سطح پر کمزور کر دیا تھا۔ دوسرا انہوں نے مغرب کی ترقی کے اثرات ہندوستان میں اتارنے شروع کئے۔ انگریزی تعلیم اور سائنٹیفک سائنسی تعلیم سے نئے تصورات جنم لے رہے تھے۔ اس کے اثرات ہر شعبہ زندگی پر پڑ رہے تھے ابونصر اکبر شاہ ثانی کے اختیارات و معارف میں جب کمی کی گئی تو بادشاہ نے راجہ رام موہن رائے کو اپنا وکیل بنا کر انگلستان بھیجا۔ ڈاکٹر قدسیہ لکھتی ہیں۔

'' راجہ رام موہن رائے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور بادشاہ کے وظیفہ میں تین لاکھ روپے سالانہ کا اضافہ ہو گیا۔ یہ کسی ہندوستانی کا اس نوعیت کا پہلا سفر یورپ تھا۔ اس کے بعد اہل ہندوستان آتے جاتے رہے جن میں دادا بھائی نوروجی کا نام قابل ذکر ہے۔ داد بھائی نوروجی پہلے ہندوستانی ممبر پارلیمنٹ بنے''۔ (۱)

اس کے بعد اردو سفرنامے کی روایت کے ابتدائی نقوش ہمیں سید احمد مشہد مبریلوی کی ''سوانح احمدی'' میں ملتے ہیں۔ اس میں سید احمد حج کے مفصل حالات لکھتے ہیں۔ اس حصے کو اردو میں سفر نامے کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں۔ فارسی سفرناموں میں شاہ ولی اللہ کا ''فیوض الحرمین'' مولوی رفیع الدین مراد آبادی کا ''سوانح حرمین'' نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا ''سراج منیر'' خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ یہ سفرنامے حج کے بارے میں ہیں۔ نواب مصطفیٰ کا فارسی سفرنامہ ''جذب القلوب الی دیار المحبوب'' فارسی میں ہے۔

باقاعدہ سفرنامہ یوسف کمبل پوش کا سفرنامہ ''عجائبات فرنگ'' ہے جسے اردو کا پہلا باقاعدہ اور مکمل سفرنامہ کہا جاتا ہے۔ یوسف کمبل پوش نے اسے خود ''تاریخ یوسفی'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

'' چونکہ اس کتاب میں سب حال اپنا گزر بیان تھا۔ اس لیے اس کا نام تاریخ یوسفی رکھا''۔ (۲)

اس سفرنامے میں انگلستان اور فرانس کے سفیروں کے علاوہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کی

۱۔ ڈاکٹر قدسیہ بحوالہ سابقہ ص۔ ۴۷

۲۔ یوسف خان کمبل پوش عجائبات فرنگ (تاریخ یوسفی) مطبع نول کشور لکھنو ۱۸۳۷ ص۔ ۷

سیاحت کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ اس طرح سے یہ سفر نامہ اس دور کی مذہبی روایات کے ساتھ انیسویں صدی کی نثر کا ایک اچھا اور کامیاب نمونہ ہے۔

ڈاکٹر عصمت ناز لکھتی ہیں:۔

''اردو کے سفر ناموں میں یوسف خان کمبل پوش کا سفر نامہ عجائبات فرنگ کو قدیم ترین کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ فطری طور پر سفر کی پر خطر راہوں اور نت نئے تجربوں کو پسند کرتے تھے اور سفر کے لیے جو بھی مراحل تھے۔ ان کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔ آپ نے اس ضمن میں انگریزی زبان بھی سیکھی تھی۔ تاریخی کتب سے معلومات بھی حاصل کی تھیں اور دوران سفر آپ پر مذہب روایات تہذیب وغیرہ کا اتنا رنگ نظر نہیں آتا بلکہ آپ نے کھلے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ سفر کیا''۔ (۱)

اردو کے اس سفر نامے کے بعد دوسرا سفر نامہ نواب کریم خان کا ''سیاحت نامہ'' ہے۔ یہ بھی لندن کی زندگی کے بارے میں ہے۔ سیاحت نامہ کا قلمی نسخہ'' ڈاکٹر عبادت بریلوی'' نے دریافت کیا۔ اس کے بعد فدا حسین کا ''تاریخ افغانستان'' ۱۸۵۳ میں لکھا گیا۔ یہ ادب میں کسی خاص اضافے کا باعث نہ بن سکا۔

ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں:۔

''میری رائے میں اس سفر نامے کا کینوس محدود ہے اور یہ جنگی مکالمہ نگاری کا ایک غیر مرصع نمونہ نظر آتا ہے۔'' (۲)

۱۸۵۷ کے انقلاب نے برصغیر پاک وہند کے لوگوں کے اندر بے چینی کرب اوزاذیت کی ایک ایسی فضا تیار کر دی تھی کہ ہر شخص بے چین و بے قرار تھا۔ غلامی کا تصور محال ہونے کے باوجود اس طوق کو گلے سے اتارنا بے حد مشکل تھا۔

ہر شخص قدیم و جدید کے اس گھن چکر میں پس رہا ہے اور چکی کے ان دو پاٹوں کے درمیان نہ وہ برقرار ہے، نہ اس کا مذہب قائم ہے۔ وہ اس اندھیری رات کا مسافر ہے کہ جس کو منزل کا علم ہی

۱۔ ڈاکٹر عصمت ناز بحوالہ سابقہ ص ۔۲۷۳

۲۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۱۶

نہیں۔ راستے کا تعین ہی نہیں۔ سفر لمبا ہے اور حوصلے پست۔ ایسے میں سرسید نے اس بھٹکی ہوئی قوم کو سہارا دیا تا کہ انہیں دلدل سے نکالا جائے۔ اسی دور میں سرسید نے لندن کا سفر کیا اور وہاں جا کر مرعوب و مرغوب ہونے کی بجائے اپنی قوم کی پستی اور ان کی برتری کا مشاہدہ کھلی آنکھ سے کیا اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچا کہ اب اپنے ہم وطنوں کے لیے کونسا لائحہ عمل تیار کیا جائے کہ ان مطلق العنان حکمرانوں سے نجات حاصل ہو سکے۔ انہوں نے لندن کے مناظر کو آزادہ روی کی بجائے ہمیشہ مقصد کی آنکھ سے دیکھا۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:۔

> ''بلا شبہ اس مشاہدے میں ان پر کبھی کبھی حیرت کی کیفیت بھی طاری ہوئی اور انہوں نے یورپ کے عجائبات اور تہذیبی خوبیوں کی تحسین بھی کی لیکن ایسا لمحہ جب بھی آتا سرسید کو اپنی زوال آمادہ قوم کے ذہنی افلاس تہذیبی پسماندگی اور علمی کم مائیگی کا خیال آ جاتا۔ ان کی مسرت گہری افسردگی میں تبدیل ہو جاتی۔ اس زاویے سے دیکھئے تو سرسید کا سفرنامہ قوم کا نوحہ ہے اور وہ لندن میں بھی آنسو بہاتے ہوئے نظر آتے ہیں''۔ (۱)

چنانچہ ''مسافرانِ لندن'' سرسید کا سفرنامہ بھی ہے اور قوم کو نوحہ بھی ہے۔

اس دور میں منحصر تھانسیری کا کالا پانی، شبلی نعمانی کا ''سفرنامہ روم و مصر و شام'' انیسویں صدی کے بہترین سفرناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی دور میں حاجی محمد صاحب کا ''ماہ مغرب'' اور حاجی بہادر شاہ کا سفرنامہ ''رفیق حج'' اور حاجی بہادر شاہ کا سفرنامہ بھی حج کے بارے میں ہے۔ انور سدید لکھتے ہیں:۔

> ''سیر حامدی'' نواب محمد حامد علی خان کا ۱۸۹۳ میں لکھا ہوا سفرنامہ ہے۔ اس میں سیلون، ہانگ کانگ، جاپان، امریکہ و انگلستان، فرانس، جرمنی، یونان اور مصر کے بارے میں لکھا گیا ہے اور مشاہدہ اور مطالعہ دونوں کے لحاظ سے اچھا سفرنامہ ہے''۔ (۲)

انیسویں صدی کا قاری بلاد مشرق، بلاد عرب، یورپ اور دیگر ممالک کے بارے میں بہت زیادہ معلومات نہ رکھتا تھا کیونکہ ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل نے غیر ممالک کو دیار غیر بنا دیا تھا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے آج ہر ملک اور ہر ملک کی تاریخ و تہذیب انسان کی دسترس میں ہے۔ قدیم سفرنامہ نگار ماحول کا خاموش بیانیہ مرتب کر کے اپنے فرائض سے بری الذمہ ہو جاتا تھا لیکن سفر

۱۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص ۔۱۳۰

۲۔ ایضاً ؍؍ ص: ۱۳۵۔

نامے انسانی تجربات میں اضافے کے لیے پڑھے جاتے ہیں۔ "اس میں اگر سیاح اپنے جذبات و احساسات کی رنگ آمیزی نہیں کرتا اور قاری کے اندر تحرک اور جوش پیدا کرنے کا باعث نہیں بنتا تو یہ واردات قلبی نہیں بن سکتا۔" (۱)

آج کا قاری سیاح کی آرزوؤں، پناہ گاہوں، جرأتوں، کامیابیوں اور محبتوں میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ کیونکہ بیسوی صدی ادب کی صدی ہے۔ اس صدی نے انسان کے داخل و خارج دونوں سطحوں پر بے شمار تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔نئی تحریکوں نے جنم لیا ہے۔ سائنس نے اپنے قدم چاند تک جما لیے ہیں۔

انیسویں صدی کا سیاح یورپ کو احساس کمتری کا عنصر لیے ہوئے دیکھتا تھا۔ "آج کا سیاح پر اعتماد اور پر یقین ہے۔ وہ یورپ کی تہذیب و معاشرت کو تحسین یا مفاہمت کی بجائے تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔" (۲) پھر آزادی پاکستان نے اسے اپنے پر اعتماد کرنا سکھایا ہے۔ اب اس نے دنیا کو خدائے واحد کی سرزمین کے نقطہ نظر سے دیکھا اور لکھنے کے لیے مشرق زاویہ نگاہ اور مشرقیت پر فخر کر کے سر بلند کر کے لکھنا سکھایا۔

۱۹۰۱ سے ۱۹۴۷ تک کا دور سفر نامے کا عبوری دور ہے۔ اس دور میں اہم سفر نامہ نگاروں میں "سیر یورپ" نازلی رفیعہ سلطان، عطیہ فیضی "زمانہ تحصیل"، "سیاحت سلطانی" شاہ بانو، مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کے سفر نامے مشہور ہیں

"ریاض الحرمین" حاجی نور الدین قصوری سفر نامہ حجاز و مصر و شام" خواجہ حسن نظامی "سفر نامہ جات" فاطمہ بیگم "سفر نامہ حرمین" مولوی رفیع الدین "حج صادق" از نواب آف بہاولپور۔

اس کے علاوہ "سفر نامہ لندن" حسین احمد بیگ، بیگم حسرت موہانی کے سفر نامے، "عروس نیل" سلطانہ آصف فیضی اور "سفر نامہ صارم" از عبدالصمد صارم مشہور ہیں۔

۱۹۴۵ تک سفر نامے عموماً ابھی اس فضا سے دوچار ہیں کہ جہاں آزادی آہستہ آہستہ گھر کے دروازے پر دستک بھی دے رہی تھی اور خوف کی لہر دلوں پر چھائی ہوئی بھی تھی لیکن مغربی تہذیب کی چکا چوند اب کم ہو کے اصل کی طرف لوٹنے کا رجحان زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں حج کے سفر نامے بہت لکھے گئے۔

۱۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص۔ ۴۴۵

۲۔ مشفق خواجہ بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۰

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:۔

'' بیسوی صدی میں جب انگریز کے خلاف بہت سی تحریکیں وجود میں آئیں اور تحریک آزادی میں تحرک اور سرگرمی زیادہ پیدا ہوگئی تو مغربی تہذیب کے خلاف نفرت کے وہ جذبات جن کی ابتدائی نہج اخبارات اور رجعت پسندانہ اذہان کے طفیل ہوئی تھی ۔ زیادہ شدت اختیار کر گئے ۔ اقبال کا مغربی تہذیب کے خلاف ردعمل اس عمل کا نشان پا گیا ہے ۔ مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی نمایاں نظر آتی ہے کہ مغربی تہذیب کو تو مسترد کیا گیا لیکن اس دور میں مغربی علوم اور ادبیات کو قبول کرنے کا رجحان پرورش پانے لگا اور یہ عمل آج بھی جاری ہے۔'' (۱)

پھر ۱۹۴۷ کے بعد ۳ سفر نامے منظر عام پر آئے ۔ وہ قدیم سے مختلف تھے ۔ جدید سفر نامہ نگار نے متنوع کیفیات اور رنگا رنگی بھر کے سفر نامے کو بے جان فضا سے آزاد کروایا۔ وہ جہاں جہاں گیا وہاں کی گزرگاہوں اور انسانوں کو ان کے رویوں کو احساسات اور جذبات اپنے اندر جذب کرتا چلا گیا۔ وہ جزئیات سے پرے کلیات کی جانب ملتا ہے۔ اس کا گہرا مشاہدہ اور عمیق مطالعہ اسے چیزوں شہروں اور انسانوں کی اصل تک پہنچے میں مدد دیتا ہے۔

آج کے سفر نامہ نگار نے سفر نامے کو بیانیہ تکنیک کے استعمال کی وجہ سے متحرک بیانیہ بنا دیا ہے ۔ جدید سفر نامہ اپنے اندر متنوع کیفیات اور رنگا رنگی رکھتا ہے ۔ اور اسی چیز نے اسے قدیم سے جدید کی صف میں لا کھڑا کیا ہے ۔ مشفق خواجہ ''جمیل زبیری'' کے سفر نامے میں لکھتے ہیں:۔

'' روائتی سفر نامہ ہمیں مقامات سفر سے متعارف کراتا ہے۔ اور غیر روائتی سفر نامہ کیفیت سفر سے مقامات سفر کی تفصیل لکھنے والا زمان و مکان کا اسیر ہوتا ہے ۔ جبکہ کیفیات سفر قلمبند کرنے والا زمان و مکان سے ہٹ کر بھی سوچتا ہے اور یہی چیز اس کے سفر نامے کو معلومات کا گنجینہ بننے سے بچاتی ہے اور اس کا رشتہ ادب سے قائم کرتی ہے۔'' (۲)

۱۹۴۷ کے بعد سفر نامہ نگاروں میں محمود نظامی کا ''نظر نامہ'' اردو سفر نامہ نگاری میں ایک

۱۔ ڈاکٹر انور سدید، بحوالہ سابقہ، ۴۴۹۔

۲۔ مشفق خواجہ، بحوالہ سابقہ ص ۱۲۔

منفرد مقام کا حامل ہے۔ شگفتہ اسلوب اور واضح لفظ نظر قاری کو ایک نئے لطف سے آشنا کرتا ہے۔
شگفتہ اسلوب اور واضح لفظ نظر ہر ادیب کے بس کی بات نہیں۔

صالح عابد حسین کا ''راہ نورد'' مشتوق، ''سفر حجاز''، بیگم حسرت موہانی، قرۃ العین حیدر، ''جہان دیگر'' بشریٰ رحمٰن ''براہ راست''، ''داستان حرمین'' از منیر قریشی، ''حدیث دل'' از وحیدہ نسیم جو کہ دور جدید کے حجاز ناموں میں دل کی کیفیات لحاظ سے ایک خوبصورت عکاسی ہے کہ جہاں تہی دستی اور تنگی داماں کے باوجود یقین کامل ہے کہ نوازے جانے کا حق بہر حال ہے۔ اس میں اسلوب بیان اور برمحل اشعار کا استعمال ہے۔

''باؤلی بھکارن از بشریٰ رحمٰن اس میں جو خود رفتگی ہے۔ وہ عام سفر ناموں کے نصیب میں کم کم ہے۔ زبیدہ حئی کا حجاز نامہ ''زہے نصیب'' عمرے کا احوال ہے۔ اس میں عمدہ نثر، نثری آداب اور معلومات کے ساتھ ساتھ عقیدت کا اظہار بہت زیادہ ہے۔ سفر نامہ لاہور سے دیار حبیب تک مختصر ہے
لیکن مشاہدے کی حقیقت اور جذبات کی روانی اشکوں کی زبانی نے اسے منفرد بنا دیا ہے۔

''حدیث دل'' عبداللہ ملک اور ممتاز مفتی کا لبیک ایسے سفر نامے ہیں کہ جن کو دل سے پڑھا اور دل میں محسوس کیا جائے ممتاز مفتی نے لبیک میں رومانی طور پر قاری کو بھی لبیک کی کیفیت سے دوچار کیا ہے۔

اس دور کے لکھے ہوئے سفر ناموں میں بیگم اختر ریاض الدین کے دو سفر نامے ''سمندر پار'' اور ''دھنک پر قدم'' ذہانت و دانشمندی کی عمدہ مثال ہیں اور ان میں صنف نازک کی شوخی و شرارت اور دلکشی بھی پائی جاتی ہے۔ سات سمندر پار دنیا کے چھ بڑے شہروں ٹوکیو، ماسکو، لینن گراڈ، قاہرہ، لندن اور نیو یارک کا سفر نامہ ہے۔ اس میں عمدہ تشبیہات، رنگینی اور جزات کے ساتھ ساتھ حد درجہ فطری انداز ہے۔

مسرت پراچہ کا ''سفر نامہ لندن'' اور جمیل الدین عالی کے دو سفر نامے ''دنیا میرے آگے'' اور ''تماشہ میرے آگے'' ان کے سفر نامے کراچی کے اخبارات میں کالموں کی صورت میں سلسلہ وار

شائع ہوتے رہے۔ انہوں نے قاری کو تاریخی، جغرافیائی، مذہبی اور سیاسی معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ ایسا سیاح ہے جو خود آ گاہی کا سفر طے کر چکا ہے۔ ڈاکٹر ثریا حسین کا ''پیرس و پارس'' نسرین بانو کا '' الکویت'' بھی اسی دور میں لکھے گئے مگر اس دور میں ایک مشہور اور دلوں کو گدا گدانے والا سفر نامہ نگار ابن انشاء ہے۔ ان کے چار سفر نامے ''چلتے ہو تو چین کو چلیئے'' ، ''دنیا گول ہے'' ، ''آوارہ گرد کی ڈائری'' اور ''ابن بطوطہ کے تعاقب میں'' ۱۹۷۴ تک کے لکھے گئے سفر ناموں میں منفرد انداز اسلوب شوخی ظرافت اور اسلوب بیان کے لحاظ سے شہرت عام اور بقائے دوام کے حامل ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے ''نکلے تیری تلاش میں'' ، ''اندلس میں اجنبی'' ، ''خانہ بدوش'' ، ''نانگا پربت''، ''ہنزہ داستان'' ، ''سفر شمال کے'' ، ''اور کے ٹو کہانی'' ایسے سفر نامے ہیں جن میں افسانے کی چاشنی ناول کی کہانی اور سیاح کی تلاش شامل ہے۔ ان کی شخصیت اور اسلوب دونوں میں بڑی دلآویزی ہے۔ مستنصر حسین نے اردو سفر نامے کو ایک نئی جہت اور نئی سمت سے آشنا کیا ہے قدرت اللہ شہاب کے سفر نامے ''اے بنی اسرائیل'' اور ''تو ابھی راہ گزر میں ہے'' خاصے جذباتی سفر نامے ہیں۔ وہ غیر محسوس کو محسوس کرتے ہیں اس لیے ایسی کیفیات پیدا ہونا فطری ہے۔

''بجنگ آمد'' اور ''بسلامت روی'' کرنل محمد خان کے ایسے سفر نامے ہیں کہ ان میں طنز مزاح نمایاں ہے اور قاری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ اسی دور میں ریاض احمد ریاض کا سفر نامہ ''ٹرپل سفر'' شگفتہ ذوق کو سمیٹے ہوئے ہے۔ جمیل زبیری کا ''دھوپ کنارہ'' لندن اور امریکہ کی سیاحت ہے۔ یہ ایک صاحب ادراک کا سفر نامہ ہے۔ جس نے زندگی کو حقیقت کے رنگ میں دیکھا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا ''سفر آشنا'' افضل علوی کا ''دیکھ لیا ایران'' کوثر نیازی کا'' ایک ہفتہ چین میں'' مِس فرح کا سفر نامہ ''نئی دنیا، پرانی دنیا'' امریکہ کو قدیم و جدید نقطہ نظر سے پرکھا ہے اور اشفاق احمد کے سفر ناموں میں ''عرش منور'' ، ''چنگوہ پاچستان'' اور ''سفر در سفر'' میں انہوں نے فلیش بیک ٹیکنیک سے کام لیتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے انداز بیان کی بدولت قاری پر خود فراموشی طاری کر دیتے ہیں۔

عطا الحق قاسمی کا سفر نامہ ''شوق آوارگی'' اور ''مسافتیں'' تخلیقی لحاظ سے عمدہ سفر نامے ہیں۔ حمیدہ حسین کا ''جلاوطن'' عورت کی بے بسی کا عکاس سفر نامہ ہے۔ امجد اسلام امجد کا ''شہر در شہر'' خوبصورت مناظر سے مزین ہے۔ انتظار حسین کے سفر نامے ''زمین اور فلک احد'' نوشانہ نرگس ''سفر کہانی'' سلمی یاسمین نجمی ''کوئے ملامت'' اے حمید کا سفر نامہ ''امریکا نو امریکا نو'' پانچ سال کی یادوں پر مشتمل ہے۔ قمر عباسی کا ''لندن لندن'' کہ جس میں انہوں نے مجموعی تہذیبی تاثر کو نفسیات کے حوالے سے ابھارا ہے۔ مرزا ریاض کا ''مسافر نواز بہتیرے'' پروین عاطف کے سفر نامے کرن، تتلی، بگولے، ''خوابوں کے جزیرے'' بلقیس ظفر کا ''مسافتیں کیسی'' لبنان کی خانہ جنگی کا احوال ہے۔کہ جس میں زندگی کے تمام رنگوں کو مسرت سے بیان کیا گیا ہے۔

منیر فاطمی کا سفر نامہ ''گرد باد'' ایران کے بارے میں ہے۔ ڈاکٹر نعمت اللہ کا سفر نامہ ''یورپ میں آٹھ ہفتے'' وزیر آغا کا سفر نامہ ''بیس دن انگلستان میں'' ادبی منظر نامہ پیش کرتا ہے۔

اسلم کملا کے دو سفر نامے ''اسلم کمال اور سلوٹیں'' اور ''لاہور سے چین تک'' منفرد منظر نامے ہیں۔ ڈاکٹر فرحان فتح پوری کا ''دید و بازدید'' رفیق ڈوگر کا ''اے آب رُود گنگا مشہور ہوئے۔فرخندہ حالی کے سفر نامے ''گرین کارڈ''، ''کریڈٹ کارڈ'' اور ''پرایا سفر'' ایک ڈاکٹر ہونے کے باوجود منفرد اور عمیق مشاہدے کے حامل سفر نامے ہیں۔ اس کے علاوہ کشور ناہید کا ''آجاؤ افریقہ'' خواتین کے مسائل کے لحاظ سے منفرد سفر نامہ ہے۔ کوثر ملک کا ''منگولوں کے شہر میں'' تابندہ بتول کا ''شالیار سے تاج محل تک'' بلقیس ریاض کا ''سفر حرمین'' رضیہ فصیح احمد ''دو تھے مسافر'' ذکیہ ارشد ''سورج کے ساتھ ساتھ'' سلمی اعوان ''ھنزہ داستان''، ''یہ میرا گلگت وھنزہ'' ''نسائی رنگ کے بہترین سفر نامے ہیں۔ غزالہ کا ''اجالوں کا سفر''، حج کا بہترین سفر نامہ ہے۔ اس کے علاوہ ثریا کا ''جس دیس میں گنگا بہتی ہے'' ہندوستان کے بارے میں لکھے گئے بہترین سفر ناموں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

تابندہ بتول کا ''لاہور سے شالیمار تک'' نیلم بشیر کا ''نیلا نیپالہ میں'' فوزیہ سلیمی کا ''حاضری'' کوکب خواجہ ''کانی ہاؤ'' وغیرہ ہیں۔جس میں انہوں نے اپنی ذہنی وفکری کاوشوں کا لوہا منوایا ہے۔

صنف سفر نامہ کو مقبولیت کی موجودہ منزل تک پہنچنے کے لیے بہت طویل عرصہ طے کرنا پڑا۔ انیسوی صدی کے آخر میں باقاعدہ طور پر شروع ہونے والی اس صنف ادب میں ہر اس شخص نے حصہ لیا کہ جس کی جیب میں رقم اور من میں ترنگ نمودار ہوئی۔

نوابوں اور راجاؤں، سیاسی سفیروں، عیاش پسندوں نے ہی مشرق و مغرب کا طویل سفر نہیں کیا بلکہ متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ افراد نے مشرق وسطی، ترکی اور یورپ کی سیر و سیاحت کا شوق پالا اور اسے پروان چڑھایا۔ کیونکہ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف سفر کی سہولتوں میں اضافہ ہوا اور خود آ گاہی کا سفر بھی زیادہ شوق و ذوق سے طے ہونے لگا۔ اور منزلیں نزدیک آتی چلی گئیں۔

مقامات مقدسہ ہمیشہ ہی سے انسان کے لیے نہ صرف کشش کا باعث رہے ہیں بلکہ مذہبی عقیدت و احترام کا مرکز و محور رہے ہیں۔ بلکہ انوارات کی بارش اور دکھوں کی گرد اتارنے کا شوق بھی کشاں کشاں منزل کی جانب لے جانے کا سبب بنا کہ انسان اپنے دکھوں کے مداوے کے لیے دو ہستیوں کا متلاشی رہا ہے۔

ایک وہ جو اس سے بڑا ہو، دوسرا وہ جو اس سے محبت کرنے والا ہو اور یہ تو وہ در ہے کہ جہاں بڑا ہی نہیں بہت بڑی ہستی موجود ہے اور محبت بھی ایسی کہ بے حد و حساب اور یہ بڑا اور محبت کرنے والا دونوں یکجا ہوں وہاں تو کوئی بدنصیب ہی نہ جانے کا متمنی ہوگا کہ وہاں پر دکھ، ہر روگ یوں ختم ہو جاتا ہے کہ جیسے تھا ہی نہیں۔

اس کے علاوہ سفر نامے کی صنف کو وجود میں لانے اسے پروان چڑھانے اور بام عروج تک پہنچانے میں علماء، ادباء، شعراء، اخبار نویسوں اور سیاسی شخصیتوں نے بھر پور انداز میں حصہ لیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ادب میں سفر ناموں کا موسم سدا بہار موسموں کی طرح رہا۔ اتنی بڑی تعداد میں مرد و خواتین کے لکھے گئے سفر نامے اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ اردو ادب کے نقاد اس پر فخر کریں گے کہ سفر نامے نے اردو ادب کو نیا آہنگ، نئی جہت اور نیا مقام دلایا۔

اس سلسلے میں مستنصر حسین تارڑ ثریا حفیظ الرحمٰن کے سفر نامے میں لکھتے ہیں۔

''ادب کے صناع بھی شیشہ گروں سے کم نہیں ہوتے بلکہ کچھ زیادہ ہوتے ہیں۔ وہ شیشے کو شکل دینے والوں کی طرح صرف پھنکنی میں پھونک مار کر نازک گل دان اور فن کا نمونہ ہی تخلیق نہیں کرتے بلکہ وہ دکھوں کی روٹی اور آہوں کے بالن میں سے سانس کشید کرتے ہیں۔ ایک ایسا لمبا سانس جسے پھونکنے سے ایک دنیا ایک کائنات زندہ ہو جاتی ہے۔ ہر ادبی تصویر لفظ تخیل اور جذبے کی شدت سے کورے کاغذ پر اترتی ہے۔ پر ایسا کم ہوتا ہے کبھی لفظوں کے رنگ قابو میں نہیں رہتے اور کینوس پر پھیل کر پوری تصویر کو داغدار کر دیتے ہیں کبھی تخیل کی پرواز تاریخی عقائد اور جغرافیئے کی قید میں پھڑ پھڑا کر رہ جاتی ہے اور کبھی جذبے کی شدت میں اس کو آنچ کی کسر رہ جاتی ہے جو کندن بنانے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ ادبی مصوری میں مجھے گمان ہے کہ ناول اور سفرنامے کی تصویر کینوس پر اتارنا از حد کھٹن ہے کہ دونوں میں دیگر اصناف کی نسبت لفظوں کے ان گنت رنگ درکار ہیں۔ تجربے کی وسعت کا کوئی تعین نہیں اور تخلیقی قوت کا سمندر بھی ناکافی لگتا ہے۔ اسی لیے سفرنامے اور ناول میں ایسا ہوتا نہیں کہ لفظوں کے رنگ بھی قابو میں رہیں۔ تخیل کے پر بھی نہ کٹیں اور جذبے کی شدت بھی کندن بنانے پر قادر ہو۔ ایسا ہوتا نہیں۔'' (۱)

۱۔ مستنصر حسین تارڑ فلیپ جس دیس میں گنگا بہتی ہے از مرزا حفیظ الرحمٰن بک ٹاؤن اسلام آباد ۱۹۹۵

سفر ناموں کی اھمیت

سفر نامہ علمی و ادبی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ واحد صنف ادب ہے۔ جس کا تقریباً تمام اہم معاشرتی علوم سے گہرا تعلق ہے۔ سفر نامہ بنیادی طور پر رُوداد سفر ہے۔

آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد کے سفر نامے ''سیر ایران'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :۔

'' سفر ناموں میں انسانی زندگی کے ان گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو تاریخ ادب اور جغرافیہ کی دوسری کتابوں میں تاریک چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ جیسے معاشرتی طور طریق رواج وعقائد، مذہبی تعلقات تجارتی وصنعتی خصوصیات فرقے، زبانیں، شکل وصورت سفر ناموں کی ایسی خصوصیات ہیں جس نے اس کو جغرافیہ کی دوسری کتابوں سے منفرد کر دیا ہے۔'' (۱)

خالد اقبال یاسر نظم سفر نامہ میں لکھتے ہیں :۔

کڑے عذابوں کی سر زمین تھی
جہاں سے میرا گزر ہوا تھا۔
سیاہ جھلسی ہوئی اس آتش فشاں کی مٹی
یہ جلتے سورج کے ساتھ لامختتم سفر میں
عجیب دہشت تھی جس نے مجھ کو جکڑ لیا تھا
قیام کیسا تھا کہ ساتھ دیوار و در نہیں تھے
اُمید اچھے دنوں کی کیسی
کہ سانس کا اعتبار معدوم ہو چکا تھا
مگر مرے نیم جاں ہونٹوں
پہ تپتے پاؤں کے آبلوں کے لیے دعا تھی

۱۔ محمد حسین آزاد بحوالہ سابقہ ص ۔ ۷

جنہوں نے اپنے وطن کے کانٹوں کی قدر کرنا سکھا دیا تھا
مجھے میرے گھر کی روکھی سوکھی پہ صبر کرنا سکھا دیا تھا

(۱)

ہماری یہ دنیا اور اس کے عناصر بار بار ظہور کرتے ہیں اور بار بار ایک سوال بن کر خواب خیال کا روپ دھار کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ زندگی میں ہم بہت سی کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں۔ جنہیں ہم مدتوں فراموش نہیں کر سکتے، وقت، یاد، محبت، دکھ سکھ، ہجر فراق ملاپ ایسے روپ ہیں کہ جن کو لفظوں کا روپ دے کر ایک نئی شکل اور انوکھا مفہوم دیا جا سکتا ہے اور اس کا سب سے بڑا تحرک سفر بنتا ہے۔

مرزا ریاض لکھتے ہیں:۔

'' سیر و سیاحت اب ایک الگ صنف اظہار نہیں رہی۔ ادب کے نخل کی ایک شاخ بن گئی ہے۔ ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے۔ اور زندگی کسی ایک براعظم یا کسی مخصوص خطہ اراضی میں ہی نہیں سارے عالم میں ہوتی ہے۔ سفر زندگی اپنے وسیع تر تناظر، تمام تر رقبے اور جغرافیائی نشانات کے سفر ناموں اور سیاحت ناموں کا موضوع رہا ہے۔ جغرافیائی اور تاریخی حد بندیوں سے قطع نظر زندگی کے کئی گوشے ایسے ہیں جو ابھی تک دریافت کے عمل سے نہیں گزرے اور نہ ہی ابھی تک کسی سائنس دان، ماہر نفسیات مفکر محقق اور ادیب کی وہاں رسائی ہے۔۔۔۔ سفر نامہ تاریخ ہے محض جغرافیہ اور خالص ادب نہیں ہے مگر ان سب کی ایک ملی جلتی شکل ضرور ہے جو ایک خوبصورت شکل ہے''۔ (۲)

سفر انسان کی جبلت میں شامل ہے کیونکہ اس کی دنیا میں آمد ہی سفر ہے اور موت تک وہ سفر کی حالت میں رہتا ہے۔ سفر ذات کا انکشاف ہی نہیں کائنات کے اسرار و رموز کا بھی انکشاف ہے۔

رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:۔

۱۔ خالد اقبال یاسر، نظم سفرنامہ، ماہنامہ سیپ شمارہ ۵۷ ستمبر ۱۹۹۱ ص ۲۳۔

۲۔ مرزا ریاض، بحوالہ سابقہ ص ۸۔

”سفر نامہ ایک طرح کی روداد یا رپورتاژ ہے۔ جسے آپ بیتی کی ایک شکل کہا جا سکتا ہے۔ سفر نامے کی عمدگی اور دلچسپی دو باتوں پر منحصر ہوتی ہے۔ ایک واقعات سفر کی ندرت و جدت، دوسرے انداز بیان میں تازگی، دلچسپی اور مقبولیت کے لحاظ سے ایک معیاری سفر نامہ ناول اور افسانے سے کسی طرح کم نہیں“۔ (۱)

سفر نامہ کسی خاص خطہ ارضی کی سماجی زندگی اور تہذیبی و ثقافتی میلانات کے براہ راست مشاہدے اور مطالعے سے ترتیب پاتا ہے۔ اس میں سیاح کی ذاتی پسند و ناپسند اور زاویہ نظر خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ پاکستان میں سفر نامہ اپنے موضوع اور نوعیت دونوں لحاظ سے یا تو تاریخ سے نزدیک ہو جاتا ہے یا اس میں خودنوشت ڈائریوں اور آپ بیتی کا رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم سفر نامے کی اہمیت، افادیت سے انکار نہیں کر سکتے ہیں۔

سفر نامہ مختلف خطوں کی تاریخ سے آگاہی کروانے میں اور کسی ملک کی تہذیب و تمدن سے آشنائی اس فن کے لیے لازمی ہے۔ اسی لئے کہ ادیب جب سفر نامہ لکھتا ہے تو بڑے نازک اور کٹھن مراحل سے گزرتا ہے اور یہ فن بڑا نازک اور مشکل فن ہے۔

کسی چیز کی اہمیت کا اندازہ اس کی افادی قدر و قیمت سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہر چند ادب میں افادے کے مقام کا تعین دنیا کی باقی تمام مادی اشیاء یا چیزوں کے مقابلے میں بالکل جدا ہے تاہم پھر بھی ادب کی اصناف سے ہم مختلف جہتوں پر مختلف سطحوں پر افادیت حاصل کرتے ہیں۔ اور اس میں مختلف چیزوں کے ساتھ ساتھ لکھنے والے کی شخصیت ماحول ذاتی تجربے اور خاص نقطہ نظر کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

سفر نامہ خیال سے زیادہ حقیقت سے تعلق رکھتا ہے۔ باقی اصناف ادب میں خیال کو ترجیح دی جاتی ہے لیکن سفر نامہ ڈرائنگ روم یا تاریخ کی کتابیں پڑھ کر لکھنے کی نسبت حقیقی واقعات کو ترجیح دیتا ہے۔ اس میں ماحول، جگہ واقعات شخصیت اپنی تمام تر سچائیوں سمیت منعکس ہوتے ہیں۔ اس کو پڑھ کر خوشی لطف و انبساط حاصل کرنا ہی اصل کام ہے اور خوشی اس وقت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک آپ اپنے اندر اسے جذب نہ کر لیں اور خوشی حقائق سے جنم لیتی ہے خیال سے نہیں۔

۱۔ رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ ص ۱۸۹۔

اسلوب کے لحاظ سے سفر نامہ بیانیہ ہے اور جسطرح مصور اپنا ماڈل سامنے رکھ کر تصویر کشی کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار خطے کو سامنے رکھ کر اور مشاہدہ اور مطالعے کے ذریعے سفر نامہ تخلیق کرتا ہے۔ اسلوب میں ذاتی تاثرات حالات وواقعات بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

سفر نامہ نگار قدیم زمانے کو آنکھوں کے سامنے عیاں کر کے زمانہ حال پر بھی نظر رکھتا ہے اور یوں قدیم وجدید ، تاریخ وادب دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ایک ایسی سمت گامزن ہوتے ہیں کہ جہاں عام قاری بھی اسے پڑھ لیتا ہے۔ اسی لیے اب شاعر حضرات بھی شاعری میں سفر نامے کے بارے میں لکھتے ہیں۔ حسن عابد لکھتے ہیں:۔

مسافر بن گئے اہل قلم سب
ادب میں یہ سفر ناموں کے دن ہیں

کیونکہ ابلاغ اور شہرت لکھنے والے کی جبلت کا فطری تقاضا ہے سفر ناموں کی اہمیت تاریخی، علمی، ادبی، معاشرتی، معلوماتی، تعلیمی ہر لحاظ سے مسلم ہے۔

تاریخ کے بغیر کسی قوم کی پہچان ختم ہو جاتی ہے۔ تاریخ ہمارے ماضی کا وہ گمشدہ خزانہ ہے کہ جو آئندہ آنے والی نسلوں کی رہنمائی کا کام دیتی ہے لیکن تاریخ ہمیشہ بادشاہوں اور کجکلاہوں کی زندگی سے روشناس کرواتی ہے۔ لیکن سفر نامہ نگار اسے ادب کی چاشنی میں رنگ کر ہمارے سامنے تہذیبی، معاشرتی، معاشی اور عام لوگوں کے دکھ سکھ کی تصویر پیش کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار اس دور کے حالات و واقعات مذہبی حالت اور جغرافیائی تہذیبوں سے بھی آشنا کرواتا ہے۔

تاریخ میں انسانی مشاہدات، تجربات اور حالات کا سچا بیان تو ضرور ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ سفر نامہ اجتماعی اور انفرادی دونوں سطحوں پر مطالعہ کرتا ہے۔

سفر نامہ نگار قیمتی تاریخی معلومات ہمارے سامنے پیش کرتا ہے مثلاً اگر ہم ہندوستان کے حالات ۳۹۹ سے ۶۴۵ تک کے جاننا چاہتے ہیں تو تاریخی کتب کے علاوہ اس زمانے کے مشہور سیاح فاھیان اور ھیونگ ہشیانگ کے بیانات سے جان سکتے ہیں جوانہوں نے ہندوستان کا سفر کیا اور اپنے بیانات قلم بند کیئے۔

ابن بطوطہ کے سفرناموں سے ہمیں جو چودھویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی تصویر ملتی ہے۔ بلکہ ہندوستان کی تہذیب، علوم وفنون، صنعت وحرفت اور زراعت تک کا حال اس سفرنامے میں ملتا ہے۔ اٹھارویں صدی ہندوستان میں ایک عظیم انقلابی صدی ہے۔ اس دور کو جہاں تاریخ نے تاریک دور کے طور پر یادرکھا وہیں اس کو ادب میں بھی ہر صنف سخن میں یادرکھا گیا۔

آرکیالوجی یعنی آثار قدیمہ واحد ذریعہ علم ہے جس سے تاریخ کا سراغ ملتا ہے۔ تہذیبوں کا انکشاف ہوتا ہے لیکن تاریخ میں ایسے ادوار بھی ہیں جن کا اظہار آثار قدیمہ سے نہیں ہوتا۔ وہ صرف سفرناموں کے ذریعے ہی ملتا ہے۔ سفرناموں سے ہمیں تاریخی معلومات اور واقعات کی صداقت کا علم ہوتا ہے۔ سفرنامے سے قوت لطافت بھی میسر ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ سیاح کی قلبی مدادت کے ساتھ ساتھ تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ ہر زندہ ادب اپنے ماحول اور معاشرے سے متاثر ہوتا ہے۔ کیونکہ سیاح بھی ماحول اور معاشرے کے ساتھ ساتھ تاریخ کے دھارے کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ اس لیے ہم سفر نامے کی تاریخی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ زمانہ قدیم کی تاریخ کا بہت سا حصہ خاص طور پر سفر ناموں کی وجہ سے منظر عام پر آیا۔ البیرونی کی کتاب کتاب الہند ایک ایسی کتاب ہے کہ جس سے ہمیں اس دور کی اہم تاریخی دستاویزات اور تاریخی واقعات کا علم ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ مقامات مقدسہ کی زیارات، مسجد نبوی کی توسیع، مدنی لوگوں کے طرز بود وباش اور حرمین شریف میں عہد بہ عہد ہونے والے تبدیلیوں کا حال بھی ہمیں سفرناموں میں ملتا ہے۔

اس سے بعد کے آنے والوں کے لیے بہت آسانی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس لیے یہ سفرنامے عقیدت ومحبت کے علاوہ معلوماتی بھی ہیں اور جذباتی بھی کہ آخرکار آل سعود پر خدا تعالیٰ نے خاص کرم کیا اور آج وہ تیل کی دولت سے مالا مال ہیں لیکن انہوں نے خدا کے گھر کی تزئین وآرائش پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں وسعت پیدا ہوئی اور آج کروڑوں فرزندان توحید یہاں حج کی سعادت کرتے ہیں۔

رشید امجد رفعت گل کے سفرنامے کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:۔

''اب سفرنامہ صرف سفر کی روداد نہیں رہا بلکہ ایک سماجی اور تہذیبی بلکہ

سفر نامہ سفری روداد سے بہت آگے نکل کر ایک تاریخی اور تہذیبی مطالعے
کی حدود میں شامل ہو گیا ہے''۔ (۱)

سفر نامے کی ایک اور اہمیت معلوماتی اور تعلیمی لحاظ سے ہے۔ سفر نامہ صرف خیال نہیں ہوتا ہے بلکہ ہر سفر نامہ کسی خاص مقصد کے تحت لکھا جاتا ہے جس میں تخیل کا عنصر کم اور حقیقی واقعات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس میں سیاح کا ذاتی مشاہدہ اور واقعات کو جذبے اور خلوص کے ساتھ اتنا دلکش بنا دینا کہ پڑھنے والا ذہنی طور پر محسوس کرے کہ زندگی کے نت نئے تقاضوں سے آگاہی حاصل کر رہا ہے۔ زندگی کو فن میں سمونے زندگی کے مسائل کا جائزہ لینے اور اس میں ذہنی، دماغی فکری اور فنی صلاحیتوں کو مد نظر رکھ کر ادیب ادبی نقطہ نظر بھی بیان کرتا ہے اور تعلیمی لحاظ سے بھی اثر انداز ہوتا ہے کہ زمانی فاصلوں کے باوجود معلومات دیتا ہے۔ یوں ہم سفر نامے کی علمی افادیت سے بھی انکار نہیں کر سکتے ہیں۔

موضوع کے تنوع کے لحاظ سے اس میں مذہبی، ثقافتی، معاشرتی اور تمدنی معلومات اور کسی ملک یا وہاں کے باشندوں کے دیگر حالات وواقعات کا بھی سفر نامے کے ذریعے پتہ چلتا ہے۔ ان کا تعلق خواہ کسی بھی شعبہ زندگی سے ہو۔ سیاح اس کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کے بعد اسے بڑے غور وخوص کے بعد قاری کو معلومات فراہم کرتا ہے۔

سفر نامے کے ذریعے ہم کسی ملک کی تہذیب و معاشرت کے بارے ضروری معلومات حاصل کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہندوستان کے قدیم ترین سفر نامہ ابو ریحان محمد البیرونی کی کتاب الہند سے ہمیں یہاں کہ مذہب، فلسفہ، رسم و رواج اور معاشرتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

''سفر نامہ لالہ جنیدو رام'' سے ہمیں بنارس، آلہ آباد، آگرہ اور وہاں کے مقامی لوگ خاص طور پر ہندوؤں اور ان کے مذہب اور عبادت گاہوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہے۔

'' سفر نامہ ہندوستان'' خواجہ حسن نظامی کا ۱۹۰۷ کے بمبئی کاٹھیاوارا، جونا گڑھ، گجرات اور سومنات کے بارے میں ہمیں معلومات ملتی ہیں۔ روزنامچہ سفر بھوپال و آگرہ و دھلی بیگم ہمایوں مرزا کا ایسا سفر نامہ ہے جس سے ہمیں ۱۹۱۸ کے رہائش، لباس، طعام اور خصوصاً طبقہ نسواں کی خالص رسوم کا علم ہوتا ہے۔

۱۔ رشید امجد پیش لفظ آسمان گواہ رہنا از رفعت گل، ماڈرن بک ڈپو اسلام آباد جنوری ۱۹۹۴ ص ۔ ۹

یہی نہیں آج کے دور میں بھی پروین عاطف، کشور ناہید، مستنصر حسین تارڑ، جمیل الدین عالی، مش فرخ، صالح عابد حسین، عطا الحق قاسمی، اشفاق احمد، نسرین بانو، بشریٰ رحمٰن، کوثر ملک، رضیہ فصیح احمد، سلمیٰ اعوان، فرخندہ جالی، کشور ناہید وغیرہ۔ ایسے نام ہیں کہ جن کے سفر ناموں سے ہمیں لبنان، لندن، نیو یارک، امریکہ، شمالی علاقہ جات کے بارے میں وسیع معلومات حاصل ہوتی ہیں اور ہم ان علاقوں کے رسم ورواج، لین دین اور درون خانہ زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔

بہت کم ایسے سفر نامے ہیں کہ جو معلوماتی نہ ہوں۔ اور ہم ان کی افادیت کے قائل نہ ہوں۔ مثلاً حج بیت اللہ شریف کے بارے میں اب اتنا زیادہ لکھا گیا ہے کہ اب سمجھ نہیں آتا کہ کسطرح سے اور کن الفاظ میں اپنی کیفیت اور عقیدت کا اظہار کیا جائے لیکن آنکھ جب اشکبار ہوتی ہے تو ٹپکنے والا آنسو دل کی کیفیت کو انوکھے ہی رنگ میں بیان کرتا ہے۔ کوئی ''باؤلی بھکارن'' بن جاتی ہے اور کسی کو وہ ''کالا کوٹھا'' نظر آتا ہے اور کوئی مستانہ وار لبیک لبیک کہہ کر سب کے اندر لبیک ہونے کا جذبہ بیدار کر دیتا ہے۔ کوئی مسجد نبوی کی توسیع کا بیان کر کے ''آفرین آفرین'' کرتا ہے تو کوئی بی بی حاجرہ کی بے قراری کو یاد کر کے تڑپ اٹھتا ہے کوئی شیطان کو کنکریاں مارتے ہوئے نفس کو مار دیتا ہے تو کوئی مدینہ کے گلی کوچوں میں حضرت بلال کی صدائیں سنتا ہے۔ کوئی نبی کریمؐ کے انوار و برکات کی تجلیات دیکھتا ہے تو کوئی جنت البقیع میں دفن ہو جاتا ہے۔ کوئی آب زم زم سے صدیوں کی پیاس بجھاتا ہے تو کوئی کفن کو دھو کر لاتا ہے اور کچھ بدقسمت یہاں کے بازاروں سے صرف سونا خرید کر لے آتے ہیں۔ لیکن معلومات تو یہ بھی فراہم کرتے ہیں کہ کس طرح یہاں کے کوچہ و بازار سونے سے بھرے ہیں اور کوئی چوری نہیں کرتا یہ بھی تو ان کے تجارت کے بارے میں معلومات ہیں۔

سفر ناموں میں مہیا کردہ ان معلومات سے تعلیمی میدانوں میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ غیر ممالک کے ساتھ ساتھ اب پاکستان کے دور دراز کے علاقوں اور خاص شمالی علاقہ جات کے بارے میں بہت سے سفر نامے لکھے گئے ہیں جو کہ معلومات کا خزینہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔

بلکہ ہم ان سفر ناموں کے ذریعے کسی ملک کے جغرافیائی حالات کے بارے میں بھی جان سکتے

ہیں۔ کچھ سفرنامہ نگاروں نے تو فاصلوں کے ساتھ ساتھ وہاں کے کرایوں اور ہوٹلوں کے نام تک درج کردیئے ہیں تاکہ آئندہ آنے والوں کو آسانی ہو۔

اس طرح ابتدائی دور میں لکھے گئے سفرنامے ایسے تھے جن میں مناسک حج اور اس کی خاص دعائیں عمرہ کیسے کیا جاتا ہے اور مسجد نبوی سے ہوٹلوں کے فاصلے، خانہ کعبہ کے غلاف کی تاریخ، خاص دعائیں، حجرا سود کی تاریخی اہمیت کے بارے میں بڑی تفصیل ملتی ہے۔

سفرناموں کی معاشرتی اہمیت بھی بہت زیادہ اہم ہے کیونکہ انسان بنیادی طور پر معاشرتی حیوان ہے۔ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو اور ادب کی کسی بھی صنف سخن پر اظہار کرتا ہو۔ اس کا تعلق معاشرے سے رہے گا کیونکہ ادب کبھی خلا میں تخلیق نہیں ہوسکتا۔

انسانی تعلقات کے بڑھ جانے سے علم الانسان ''AnthroPology'' میں دن بدن اضافہ اور دلچسپی پیدا ہورہی ہے۔ عہد جدید میں Sociology'' کے طالب علم انسانی مسائل پر بحث کرتے ہیں۔ سفرنامہ معاشرے کے افراد سے کٹ کر جنگلوں اور صحرا کی خشک داستان تو ہوسکتا ہے۔ حیاتیات اور معاشرتی شہادتوں کی روشنی میں لطف وانبساط حاصل کرنے والا رومانوی سفرنامہ نہیں ہوسکتا۔ سیاح ایک ملک کی تہذیب کا مطالعہ دوسرے ملک کی تہذیب سے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں پہلے لکھے گئے سفرنامے آج بھی ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

کسی معاشرے کا رہن سہن وہاں کے لوگوں کی رہائش، لباس، انداز فکر، نفسیاتی حوالے، تمدنی حقائق، معاشرتی حقائق، سب چیزیں عوامی زندگی سے قریب تر ہوتی ہیں اور تاریخ کی نسبت سفرنامے میں عوامی تعلق زیادہ نزدیک اور گہرا ہوتا ہے۔ اس لیے سچی عکاسی ہوتی ہے۔ معاشرہ ویسے بھی مجموعہ ہوتا ہے۔ ہر قسم کے طبقہ فکر کے لوگوں کا اس لیے صدیوں کی تاریخ کتابوں کے ساتھ ساتھ انسانوں سے بھی ان کے روائتی، ثقافتی اور تہذیبی میلانات کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔

سفرنامے تاریخی تہذیبی طور پر انسان کی عادات وفضائل کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ اپنے وسیع تر مفہوم میں یہ کسی خاص خطے کی معاشرتی اور تہذیبی حالت ہوتی ہے۔ سفرنامے میں معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ بڑے عالم وفاضل، صوفی، رشی، حاکم، شاعر، ادیب، تاجر، کاشتکار، سنگ تراش، مصور

اور علم و فن کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور معاشرتی روابط مہمان نوازی وسیع النظری، محبت و ایثار کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں۔

ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں:۔

''مختلف ممالک کے تہذیبی حالات اور سیاحوں کے مشاہدات سفر ناموں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیئے جاتے ہیں۔ سفر نامے ایسا آئینہ ہیں جن میں آج سے سینکڑوں سال پہلے کے سیاسی، سماجی، تہذیبی و تمدنی حالات دکھائی دیتے ہیں۔''(۱)

سفر ناموں کا مطالعہ اگر تنقیدی لفظ نظر سے کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ سفر نامہ کے خشک موضوع سے ہٹ کر ایک رومانی اور ادبی لذت فراہم کرتا ہے۔

سفر ناموں کا ایک اور زاویہ ان کی سیاسی اہمیت ہے۔ کیونکہ سیاسی نقطہ نظر اگر چہ سیاح کے پیش نظر نہیں ہوتا لیکن بعض دفعہ کسی ملک کے حالات و واقعات اس قسم کے ہوتے ہیں کہ سیاح ان کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اردو ادب میں سیاسی لحاظ سے سفر نامے کم ہیں لیکن آپ بیتی اور جگ بیتی کے انداز میں ملتے ضرور ہیں۔

مثلاً مولانا محمد جعفر تھانیسری کا'' کالا پانی ۱۸۶۵ سے ۱۸۸۲ سیاسی نوعیت کا سفر نامہ ہے۔ جو انگریز کے دور استبداد کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔

ڈاکٹر انور سید لکھتے ہیں:۔

'' واضح رہے کہ'' کالا پانی'' ایک سیاسی قیدی کا سفر نامہ ہے اس لئے اس کے محسوسات نے عام سیاح کے محسوسات کی نسبت ایک دوسرا جہاں معنی آشکار ہوتا ہے۔ اور یہ احساس مسرت پیدا کرنے کی بجائے احساس تحیر پیدا کرتا ہے''۔ (۲)

اس سفر نامے میں زندگی پر موت غالب ہے۔ اور اس سے انگریزوں کا رویہ بھی عیاں ہوتا ہے جو ظلم انہوں نے محبّ وطن اور حریت پسندوں پر کئے۔

مذہبی اہمیت کے لحاظ سے بھی یہ سفر نامے بہت اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ مقامات مقدسہ کے علاوہ زیارات مقدسہ عراق اور ایران کی زیارتیں مسلمانوں کے لیے خاص محبت اور اہمیت کی حامل

۱۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی پیش لفظ بحوالہ سابقہ ص ۔ ۵۴

۲۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص ۔ ۱۳۹

ہیں اور حج کا موقع تو ایسا ہے کہ جہاں پر خاص و عام کی اولین خواہش ہے کہ وہ دیارِ حبیب جائے۔ اس لیے اس پر بہت کچھ لکھا گیا اور عقیدت و احترام کے جذبوں سے لکھا گیا۔

علماء و فضلا کے علاوہ عام شخص نے بھی اس میں اپنی قلبی واردات کو لکھا۔ حج محبت کا سفر ہے، عقیدت و احترام کے جذبوں سے سرشار جب آدمی لبیک لبیک کی صدا سنتا ہوا طواف کرتا ہے تو ایمان اور اعتقاد مضبوط ہو جاتا ہے۔ حج کے سفرناموں سے ہمیں اجتماعی اخوت و محبت کا درس بھی ملتا ہے جو ملت اور امت کے نظریات سے بالاتر ہے۔ گروہ جب اجتماع میں مدغم ہو جاتا ہے تو ایک آواز اور ایک پکار میں ڈھل جاتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:۔

> ''حج کے سفرنامے لکھنے کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس کا سلسلہ حجۃ الوداع سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ ابتداء میں زائرین حج اپنی قلبی واردات کا اظہار زبانی کرتے تھے اور اس سے دیار محبوب سے روحانی رشتے کا تقدس پیدا کیا جاتا تھا اور قلبی رشتہ مضبوط ہوتا تھا''۔(۱)

برصغیر چونکہ دیار مقدس سے خاصے فاصلے پر واقع ہے اور انیسویں صدی کے اواخر تک سفر کی مناسب سہولتیں بھی دستیاب نہیں تھیں اس لیے اس ملک کے معدودے چند خوش قسمت لوگوں کو ہی حج کی زیارت حاصل ہوئی تھی۔ خاک حجاز سے اس زمینی دوری نے بھی اس ملک کے باشندوں کے دلوں میں آتش شوق فروزاں رکھی اور جب سفر حج کے بعد ثمرات سعادت لوگوں تک پہنچانے کے لیے سفر نامہ حج لکھا گیا تو اس میں ہجر کو وصل میں تبدیل ہو جانے اور زیارات مقدسہ کے بعد ایک دفعہ پھر زائر کو فراق کے مرحلہ سے گزرنا پڑا۔ اس سے جو کیفیت پیدا ہوئی اس نے حج کے سفرنامے میں عجیب گدازگی پیدا کر دی۔

حج کے سفرناموں میں فضائل و مناسک حج بیت اللہ، اہل بیت و صحابہ زیارت کا تمام احوال احادیث قرآن اور روایات کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ اور اس سے آنے والے حجاج کے لیے نہ صرف آسانیاں پیدا ہوتیں بلکہ ان کے اندر جذبہ محبت و عقیدت بھی بیدار ہوا اور حج و عمرہ کرنے کی تڑپ بھی پیدا ہوئی۔

۱۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص ۔ ۱۳۱

ایران، عراق کی زیارت مقدسہ پر شیعہ وسنی حضرات دونوں نے اپنی اپنی عقیدتوں کے تحت سفرنامے تحریر کیے۔ ان سفرناموں کی بدولت نہ صرف یہ کہ لوگوں کے دلوں میں ان مقامات کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا بلکہ وہ امام حسینؓ اور امام حسنؓ سے ان کی دلی عقیدت اور جنگ کے حالات جاننے کا جذبہ بھی بیدار ہوا۔

شام وفلسطین کے سفرنامے ارض الانبیاء واولیاء کے سفرنامے ہیں۔ حج کے سفرنامے ماضی کے اوراق پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ دل کی کیفیات بھی بیاں کرتے ہیں اور تاریخ کو بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ کچھ سفرناموں میں ماضی کی مشکلات راستے کی تکالیف دوران حج قیام وطعام کی مشکلات کا بھی تفصیلی ذکر ہوتا ہے اور کچھ میں سماجی حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں:۔

مذہبی سفرناموں کی تعلیمی اہمیت بھی ہے۔ ان سے ہمیں ایک طرف مذہبی تعلیمات حاصل ہوتی ہیں اور دوسری طرف متعلقہ ممالک کی زندگی سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کیونکہ جو بھی حج کر کے آتا ہے وہ یہ سوچتا ہے کہ میں اپنے خیالات، اپنے تجربات دوسروں تک پہنچاؤں کیونکہ یہ سفرنامے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ان میں سب سے پہلے مذہب کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔ حج اور اسکی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حج عمرہ اور تمام ارکان حج کی تفصیلات ان سفرناموں میں مل جاتی ہے۔ بعض سفرناموں میں دعائیں بھی لکھی ہوتی ہیں۔ مذہبی سفرنامے دینی اور دنیاوی دونوں اعتبار سے مفید اور اہم ہیں۔ ان سفرناموں سے مختلف دینی و دنیاوی تجربات ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سفرناموں کی مذہبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا''۔ (۱)

سفرناموں کی ادبی قدر و قیمت تو الہٰی ہے کہ جس سے کوئی بھی صاحب دانش انکار نہیں کرسکتا ہے کیونکہ سفرنامہ صرف سیاح نے نہیں لکھا اور سیاحتی رنگ چڑھنے کے بعد نہیں لکھا بلکہ سفرنامے کو وجود میں لانے، پروان چڑھانے اور اسے بام عروج تک لے جانے میں بہت زیادہ ہاتھ علماء، شعراء،

۱۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی بحوالہ سابقہ ص۔ ۷۰

صحافی ، ادیب ، مذہبی راہنما اور سیاسی شخصیتوں کا بھی ہے ۔ اگر چہ کچھ سفر نامہ نگار ایسے ہیں جن کا ادب کی کسی اور صنف میں نام نہیں ہے لیکن انہوں نے سفر نامے لکھ کر اپنا بہت بڑا مقام بنا لیا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی ادب کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

'' ادب جذبات کے ساتھ ساتھ شعور وادراک سے بھی گہرا ربط رکھتا ہے ۔ زندگی میں اس سے اجالا ہوتا ہے ۔ افراد اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں ۔ وہ جینا سکھاتا ہے ۔ زندگی کا احساس بڑھاتا ہے ۔ اس کو برتنے اور بسر کرنے کا شعور پیدا کرتا ہے ۔ اس کے نشیب وفراز سے آگاہ کرتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی بدولت تھوڑی دیر کے لیے انسان اپنی سطح سے بلند ہو جاتا ہے ۔ اس کی روح میں کچھ اسطرح نغمے سے گونجنے لگتے ہیں کہ خود اس کی ہستی ایک نغمہ بن جاتی ہے ۔ غرض ادب کے اثرات بڑے دوررس ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خاصی پہلو دار تخلیق ہے ۔ مختلف اور متنوع عناصر کے امتزاج سے اس کی تشکیل عمل میں آتی ہے''۔ (۱)

اردو سفر نامے میں تو شاعروں ، نقادوں ، افسانہ نگاروں اور عام قارئین کو جو صرف حج کی غرض سے گئے ۔ انہوں نے بھی حصہ لیا۔

اردو ادب کی ابتدائی سفر ناموں کو دیکھا جائے تو مولانا محمد حسین آثار، محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کے سفر نامے شامل ہیں ۔ ''سرسید کا مسافران لندن'' اور سفر نامہ پنجاب اول اہمیت کے حامل تو ہیں ہی لیکن ان کا سفر نامہ ''مسافران لندن'' برصغیر کے مسلمانوں کا نوحہ اور اہل یورپ کی ترقی کا گواہ ہے۔

یوسف کمبل پوش کا عجائبات فرنگ اردو کے ابتدائی سفر ناموں میں شمار ہوتا ہے اور ان کو اردو کا پہلا سفر نامہ نگار ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

'' یہ سفر نامہ اس لحاظ سے انفرادی حیثیت رکھتا ہے کہ

۱۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ادب اور ادبی قدریں، ادارہ ادب وتنقید لاہور مارچ ۱۹۸۳ ص ۔ ۲۱ ۔ ۲۲

یوسف خان نے سفر کے دوران اپنے اوپر مذہب کا خوف ، دینداری کا جذبہ اور عاقبت کا اندیشہ طاری نہیں کیا۔ اس نے لندن کو ایک آوارہ نظر، آزاد فکر سیاح کی صورت میں دیکھا اور سفر نامہ لکھ کر ان مسرتوں میں اہل وطن کو شامل کرنے کی کوشش کی۔ لندن اسے بے حد رنگین اور دل آویز شہر نظر آتا ہے اور وہ اس مثبت نظر کو اپنی آنکھوں کے راستے دل میں اتارنے میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے''۔ (۱)

اردو سفر نامے میں ادبی لحاظ سے ایک اور افسانہ بھی کہا کہ دیگر زمانوں کے سفر ناموں کا ترجمہ بھی پیش کیا اور سفر نامے کی ابتدائی نقوش کو ادب کی خدمت شامل نہ بھی کیا جائے تو تقریباً ۱۸۴۷ سے ۲۰۰۲ تک یہ صنف ادب فروغ پائی جا رہی ہے اور ترقی کے مدارج بھی طے کر رہی ہے۔ ہندوستان، ترکی، چین کو بیت لندن امریکہ، فلسطن، عراق، ایران، شمالی علاقہ جات ان سب کے تہذیبی، تمدنی، سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشرتی، ترقی اور سائنسی ترقی کے بارے میں ان سفر ناموں کے بارے میں بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ کچھ ادیب باہر کے ممالک میں معاشرے یا اہل قلم کانفرنس کے سلسلے میں گئے تو انہوں نے وہاں کی اردو ادب کی ترقی ترویج کے بارے میں بھی ساری صورت حال سفر نامے میں تحریر کی ہے۔

اردو سفر نامے نے انیسویں صدی سے لیکر بیسوین صدی تک خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ ہمیں ان سفر ناموں سے ان ملکوں کی تاریخ اور جغرافیئے کے بارے میں بھی خاصی معلومات ملتی ہیں اور زمانی لحاظ سے انہوں نے بتدریج اپنے اندر جو تبدیلی پیدا کی ہے۔ اس کا ہمیں انداز ہوتا ہے۔

دور جدید کے سفر ناموں کا اگر تنقیدی لحاظ سے دیکھا جائے۔ تو اختر ریاض الدین نے سفر نامے کو ایک نئی صنف ادب سے روشناس کرایا ہے۔ جہاں مشاہدہ اور منظر زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر ثریا حسین کا ''پیرس و پارس'' قدیم و جدید کی بہترین مثال ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے سفر نامے میں افسانے اور نرگسیت کا رنگ بھر دیا ہے۔ وہ ماضی سے حال کا سفر اپنی ات کے عکس میں تلاش کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کا جہاں دیگر، جمیل زبیری کا دھوپ کنارہ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا سفر آشنا، اسعد گیلانی کا سفر نامہ ''ایران'' مرزا ادیب کا سفر نامہ ہمالیہ کے اس پار، مس فرخ کا نئی دنیا،

پرانی دنیا ، عطاء الحق قاسمی کا شوق آوارگی ، حمیدہ جبیں کا جلا وطن ، فرخندہ حالی کا گرین کارڈ ، ثریا حفیظ الرحمٰن کا جس دیس میں گنگا بہتی ہے اور بشریٰ اعجاز کا عرض حال سب عمیق مشاہدے، گہرے مطالعے ذوق نظر اور ادبی لحاظ سے منفرد اسلوب کے حامل سفرنامے ہیں۔

ان سفرناموں کی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ صنف ادب ادبی لحاظ سے لسانی قدر و قیمت کے حامل ہیں اور کسی طور بھی افسانہ، ڈرامہ، طنز و مزاح اور سوانح اور شاعری سے کم نہیں ہے۔

کیونکہ اس کے لکھنے والوں میں ہر طبقہ فکر کے لوگ شامل ہیں۔ جنہوں نے اپنے اپنے انداز فکر سے ادب کی چاشنی میں اضافہ کیا اور دور حاضر میں سفرنامہ ادب کی ہر صنف سے نہ صرف آنکھ ملانے کے قابل ہے بلکہ اپنا ایک منفرد مقام بھی رکھا ہے۔ جو اس کے مقام و مرتبہ کو بلند کرتا ہے۔

صنف سفرنامہ کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ ہر طبقہ فکر کی وجہ سے اس کے اسلوب اور انداز نظر سے انداز فکر تک میں تنوع پایا جاتا ہے۔

عمومی لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سفرنامے نہ صرف سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، ادبی، ذہنی اور فکری ارتقاء کے طور پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ عام قاری کے دل میں سیر و سیاحت کا جذبہ بھی ابھارتے ہیں غیر ممالک کی ترقی ان کے اندر آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے وہ وہاں جا کر بہتر معاش بھی تلاش کرتے ہیں اور پاکستان کو خوشحال بھی بناتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ وطن سے دوری ان کے اندر وطن سے محبت کا جذبہ بھی بیدار کرتی ہے اور یہ جذبہ ان کے اندر ذہنی و فکری تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ کیونکہ آج دنیا کے ہر خطے میں مسلمان موجود ہیں اور ہر حیثیت سے موجود ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز ہیں اور چھوٹی سے چھوٹی نوکری کر کے بھی پیٹ کی آگ بجھا رہے ہیں۔

اسلامی ممالک میں جا کر ہمارا نوجوان طبقہ وہاں کے امن و امان اور معاشرتی طور پر محفوظ ہونے کے احساس کو بہت سراہتا ہے۔ اور چاہتا یہ ہے کہ اپنے ملک میں بھی ان سماجی برائیوں کا خاتمہ کرے۔

غیر ممالک کی زبان اگرچہ آتے آتے آتی ہے۔ مگر پھر بھی بہت سے سفرناموں میں انگریزی،

عربی، فرانسیسی زبان جبکہ چینی زبان کے خاص علوم وفنون اور رسم ورواج کے نام انہی کی زبانی بیان کئے جاتے ہیں اس سے بھی زبان و بیان میں کافی تبدیلی آتی ہے۔

اور یوں صنف سفر نامہ ہر لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے اور ہم اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے ہیں۔ ادب کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ اس کی اہمیت کسی ایک قوم ملک یا خطے کے لیے مخصوص نہیں اور نہ ہی کسی خاص عہد یا زمانے کے لیے ہے۔ انسانی خوبیاں، دکھ، غم ہمدردیاں، خوشی لہر، فراق، ملاپ، ابتدا ہی سے انسان کے ساتھ چلے آرہے ہیں اور یہ جذبے جاندار اور متحرک ہیں۔ اس لیے ان جذبوں پر مشتمل ادب بھی آفاقی ادب ہے۔ اس میں لکھی جانے والی داستانیں اور تہذیبیں بھی شہرت عام اور بقائے دوام کی حامل ہیں۔ تو ادب میں سفر نامے کی اہمیت بھی آفاقی ہے زمانی نہیں ہے۔

خواتین کے سفر نامے منتخب کرنے کی وجوہات

ادب کی نوعیت آفاقی ہے۔ یہ انسان کے دکھ، درد، محرومیوں، ناکامیوں، کامیابیوں کا مرانیوں اور شادمانیوں کی داستان ہے۔ ادب انسانی تجربات کا فن کارانہ اظہار بھی ہے۔

ادب زندگی کا مرکز ومحور ہے اور انسان اس کا مواد، معاشرہ عمل اور ادیب نقاد ہے۔ ادب کا جذبات کے ساتھ ساتھ فہم وادراک سے بھی اٹوٹ رشتہ ہے۔ ادبی تخلیق کا موضوع کوئی بھی ہو اس کا تعلق مشاہدے سے ہوتا ہے اور پھر احساسات وجذبات ایک آہنگ میں ڈھل کر نغمے کی طرح صوتی اثرات یوں مرتب کرتے ہیں کہ عورت اور مرد کی تفریق کیئے بغیر جذبات کو اس شدت سے متاثر کرتا ہے کہ تخلیق کار کو ادبی عظمت سے ہمکنار کر دیتے ہیں کیونکہ ہر ادیب کی تخلیق اس کا ذہنی و جذباتی تجزیہ ہوتا ہے جو کہ اس شخصیت کا مظہر ہوتا ہے۔

عورت ہو یا مرد ادیب کی پہلی منزل مشاہدہ اور دوسری مجاہدہ ہے۔ کہ جن کے بغیر کوئی اعلی تخلیق منظر عام پر نہیں آ سکتی۔ اللہ کی اس وسیع کائنارت کو تخلیق ہی اس لیے کیا گیا کہ اس ''زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ تمہارے تصرف میں ہے کہ تم اس کے بارے میں سوچو اور سراغ لگاؤ۔'' کہیں بھی صرف مردوں کے لیے نہیں کہا گیا کہ وہ حق دار ہیں کہ اس کائنات کے اسرار ورموز کے بارے میں آگاہی حاصل کریں۔ یہ آگاہی ہر اس شخص کا مقدر ہے کہ جس نے جدوجہد کی اور منزل کو پانے کے لیے دل میں جوت جگائی۔

ہمارا معاشرہ مختلف اکائیوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں عورت کا وجود بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کسی بھی معاشرے کی ترقی وتنزلی تہذیب وتمدن، فنون لطیفہ، آرٹ، ادب میں عورت کا مقام ہمیشہ بہت بلند رہا ہے۔ اسکی عدم موجودگی سے معاشرہ کی اکائی نامکمل رہ جاتی ہے لیکن یہ بات عجیب ہے کہ عورت کو ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس پر ظلم وتشدد کیا گیا۔ دانستہ احساس کمتری کے عمیق غاروں میں

دھکیلنے کی کوشش کی گئی۔ یہ اللہ تعالی کی طرف سے عورت کو ودیعت کیئے گئے اس حوصلے اور ہمت کی داستان ہے کہ باوجود تذلیل کے اس نے اپنے آپ کو زندگی کے ہر میدان میں نہ صرف منوایا ہے بلکہ اپنے وجود کی کمی کا احساس بھی دلوایا۔ تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خواہ وحشت کا دور ہو یا تمدن کا زن، زر اور زمین ہمیشہ باعث تنازعہ رہیں اور اسطرح عورت کی وہ قدر و منزلت نہ ہوسکی جسکی وہ مستحق تھی۔ حتی کہ بعض مذاہب اور عقائد نے بھی اسکی اہمیت و حیثیت کو نہ سمجھا اور اسکے ساتھ غیر مہذب، سلوک ہی ہوتا رہا۔ یونانی معاشرہ ہو یا رومی معاشرہ عورت ان معاشرہ میں تمام تر ترقی اور سماجی ارتقاء کے باوجود عورت کمتر ہی گردانی گئی جیسا کہ کہا گیا ہے۔

> ''مردوں نے حسب خواہش اسکا جنسی استحصال کرنے اور حسب منشاء اس سے افرادی قوت حاصل کرنے، اسے مزید زچ اور پابند سلاسل کرنے کی ٹھانی۔ انہوں نے مراقبوں وغیرہ کا سہارا لیکر اسکے خلاف کئی تحقیر آمیز نظریات وضع کرڈالے اور اب عورت مادر کائنات ہرگز نہیں رہی تھی بلکہ شیطان کا دروازہ، گناہوں کا محل اور آفات کا پنڈارہ تھی۔'' (۱)

اگرچہ پیشتر علمی، سیاسی، معاشرتی اور فلسفیانہ نظریات کی نسبت یونان سے منسوب ہے اور اسے رومی تہذیب نے پروان چڑھایا۔ ایرانیوں نے جلا بخشی مگر اسکے باوجود انکے لئے عورت کا مقام انتہائی پست تھا۔

> ''عورتوں کا مرتبہ اسقدر گرادیا گیا تھا کہ اس کی حیثیت بچہ پالنے والے غلام کی سی رہ گئی تھی۔ عورتوں کو انکے گھروں تک محدود کردیا گیا تھا۔ انکا معاشرہ میں کوئی مقام نہ تھا اور انکے شوہر انہیں بس گھروں کے سامانوں میں سے ایک سامان سمجھتے تھے''۔ (۲)

اسطرح قدیم تہذیبوں کے ساتھ ساتھ مختلف مذاہب میں بھی عورت کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس سلسلے میں ہندومت، یہودیت اور عیسائیت کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ہندومت میں عورت کی حیثیت ہمیشہ بہت پست رہی ہے۔ ''پتی ورتا'' ہونا اس کا دھرم تھا۔ بیوگی کی صورت میں وہ دوسرا نکاح نہیں کرسکتی تھی نہ طلاق لے سکتی ہے۔ شوہر کے مرنے کے بعد ''ستی'' ہونا اس کا مقدر ہے بلکہ یہاں تک کہ

۱۔ غلام اکبر ملک عورت کا مقدمہ اسلام کی عدالت میں لاہور ۱۹۹۱ ص۔ ۱۱

۲۔ ایضاً

''ہندوؤں نے تو عورت کا شمار انسانوں کی صفت میں کیا ہی نہیں ۔ انہوں
نے اسے ایک جنس قرار دیا جو کسی نہ کسی کی ملکیت رہتی ہے۔ وہ خود کسی چیز
کی مالک نہیں رہ سکتی ۔ اسے جو کچھ دیا جاتا ہے ۔ بطور دان (خیرات) دیا
جاتا ہے۔ ذلت و پستی کی انتہاء اسقدر تھی کہ اگر کسی عورت کے دس غیر
برھمن شوہر موجود ہوں اور کوئی برھمن اسکا ہاتھ پکڑ ے تو وہ ابکا خاوند سمجھا
جاتا تھا کیونکہ برھمن ہی عورتوں کا مالک ہوتا ہے''۔ (۱)

ہندوؤں کے ساتھ ساتھ علمائے یہود نے عورت ذات کے متعلق جتنے بھی تحقیر آمیز نظریات اقوام عالم میں پھیلے ہوئے تھے ۔ انہیں یکجا کر کے اپنے مذہب کی بنیاد اور زینت بنا ڈالے ۔ مثلاً تورات میں مذکور ہے کہ :۔

''خدا نے آدم (مرد) کو پیدا کیا۔ جب وہ تنہائی سے اداس رہنے لگا تو
اسکا دل بہلانے کی خاطر خدا نے اسکی پسلی سے حوا کو پیدا کیا یعنی مقصود
بالذات تو مرد کی پیدائش تھی عورت کھلونے کے طور پر پیدا کی گئی ۔ پھر
عورت شیطان کے فریب یں آ گئی اور اس نے آدم کو بہکا کر جنت سے نکلوا
دیا۔ (۲)

''یہودیت میں عورت کی حیثیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ بیوی
کو یہ ہدایت کی گئی کہ اس کی ہر خواہش اسکے خاوند کے لیے ہو اور وہ اپنے
خاوند کو اپنا آقا سمجھے''۔ (۳)

یا پھر تورات کے یہ الفاظ کہ

''عورت موت سے زیادہ تلخ ہے'' (۴)

یہاں تک کہ بعض حالات میں عورت کی حیثیت جنگ میں لئے ہوئے اس سامان کی سی ہوتی جس پر کوئی بھی قابض ہوسکتا ہے۔ کیونکہ عورت کہیں ملک کی ملکیت ہے اور کہیں قوم کی ملکیت بھی ٹھہرائی جاتی ہے۔

یہودیت کی طرح عیسائیت میں بھی عورتوں کے معاملے میں صورت حال کچھ بہتر ین پائی جاتی تھی ۔ انکے ہاں عورت کو برائیوں کا سر چشمہ قرار دیا گیا اور اسے اتنا قابل نفرت جانا کہ انکے

۱۔ صابر نظامی آزادی عورت، ادارہ تفہیم الاسلام لاہور ۱۹۸۸ ص ۔ ۳۵۴

۲۔ افتخار شیروانی عورتوں کی حکومیت فیروز سنز لاہور ۔۱۹۹۳ ص۔ ۷

۳۔ صابر نظامی بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۵۵

۴۔ گستاؤلی بان تمدن عرب، مترجم سید علی بلگرامی، حیدرآباد دکن ۱۹۳۶ ص ۴۹۵

مذہبی رہنما مجرد کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ عورت کے لیے آسائش و آرام کو غیر ضروری سمجھا جاتا تھا۔ عورت کے استحصال اور ظلم و جبر کے لیے مذہبی سند مل جانے پر اسکی حیثیت اور بھی کمتر ہو گئی۔ مشہور مسیحی راہنما اور مبلغ سینٹ پال نے واضح طور پر ھدایت کی کہ:۔

''مرد عورت سے نہیں بلکہ عورت مرد سے یعنی مرد کو عورت کے نہیں بلکہ عورت کو مرد کے لیے پیدا کیا گیا۔ اس لیے عورت کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی چیز اپنے سر پر اوڑھنی چاہیے جس سے اسکی محکومی عیاں ہو''۔(۱)

حالانکہ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو عورت اخلاقی، نظریاتی اور اقتصادی طور پر زندگی کے ہر میدان میں مرد کے شانہ بشانہ متحرک اور فعال نظر آتی ہے۔ مثلاً کہیں مریمؑ کے روپ میں عیسیٰؑ کو جنم دیتی ہے اور کہیں آسیہؑ بنکر موسیٰؑ کو فرعون کے گھر میں پناہ دیتی ہے۔ کہیں یہ ''ھاجرہؑ'' کے روپ میں عرب کے بے آب و گیاہ خرابوں میں ذبیح اللہ کی پرورش کا بیڑا اٹھایا اور کہیں مادر ابراہیم کے روپ میں ابراہیم علیہ السلام کو جنم دیا کہیں ''کہیں سیتا'' ماتا کے روپ میں رام کے دل کی دھڑکنوں میں سما جاتی ہے اور کہیں ''رادھا بن کر شیام'' کو ملتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ گویا وجود زن انسان کی گہرائیوں میں اتر کر کے اسکے مذہبی عقائد و افکار میں جلوہ فگن ہے۔

اس کے ساتھ ہی اسلام کی آمد کے بعد عورت کی حیثیت میں بنیادی تبدیلی آئی۔ وہ ماں، بہن، بیوی، بیٹی غرض کہ ہر روپ میں محترم ٹھہری۔ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ بہن سلامتی اور دعا کا سبب، بیوی دکھ سکھ کی آماجگاہ، اور بیٹی جنت کی ضمانت کے طور پر سامنے آئی۔ اب باپ اور بھائی کو حقوق و فرائض کے جس بندھن میں باندھا گیا کہ عوزت کو جو حقوق اسلام نے دیئے۔ یورپ کی ترقی یافتہ قوموں نے ایک ہزار سال کے بعد قبول کیئے تھے۔ حالانکہ یہ وہی معاشرہ تھا کہ جس کے بارے میں قرآن میں آیا ہے:۔

''جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی پیدائش کی خبر دی جاتی تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو جاتا اور وہ منہ چھپا کے پھرتا اور کسی گوشے میں بیٹھ کر سوچنے لگتا کہ اس ذلت کے مجسمے کو باقی رکھے یا زندہ در گور کر دے''۔(۲)

۱۔ افتخار شیروانی بحوالہ سابقہ ص۔ ٦

۲۔ سورۃ نحل، پارہ ۱۴ آیت نمبر ۵۸۔ ۵۹

اسی اقدام کے متعلق ایک اور جگہ ارشاد ہوا کہ ؛۔

''اس وقت کو یاد کرو جب نومولود سے یہ پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم میں ماری گئی۔'' (۱)

لیکن اسلامی معاشرے میں عورت کو سماجی ، سیاسی اور معاشرتی طور پر مساوی درجہ حاصل ہے۔ کیونکہ کہیں پر بھی رب کائنات نے خود کو ''رب الرجال'' یعنی مردوں کا باپ نہیں کہا بلکہ خود کو ''رب الناس'' کہا گیا ہے۔ جنت سے نکلنے کی غلطی انسان سے ہوئی۔ اس لیے اس میں مرد اور عورت کی تفریق جائز نہیں ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ اسلام کے جاننے والوں نے بھی عورت کے متعلق تمام نظریات کو پس پشت ڈال کر رفتہ رفتہ پھر اسے اس نظر سے دیکھنا شروع کر دیا جو کہ ازل سے اسکا طرہ امتیاز رہا ہے۔

شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم جس خطہ ارضی میں مقیم ہیں وہاں مردوں کی گہری روایت اور تہذیب وتمدن ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس وجہ سے ہم نے عورت کو وہ مقام نہ دیا جس کی وہ مستحق تھی۔

برصغیر پاک و ہند میں مردوں اور عورتوں کے سماجی حالات میں ہمیشہ ۔۔۔ ایک واضح فرق موجود رہا ہے کیونکہ یہاں مردوں کا معاشرہ ہے اور مردوں کے معاشرے میں مرد کو ہی فوقیت حاصل ہوسکتی ہے بلکہ پاکستان ہی کیا پوری دنیا میں آزادی نسواں کے بلند و بانگ نعروں کی بازگشت کے با وجود عورت کو وہ آزادی یا مقام حاصل نہیں ہے جو مردوں کو حاصل ہے۔

اسی درجہ بندی نے عورت کے رویے، سوچ، عمل اور اظہار میں منفی اثرات کے ساتھ ساتھ ایک جداگانہ رجحانات نے بھی جنم لیا۔

عورتوں کی نفسیات، خواہشات، دکھ، تکلیف، محبت، ہجر فراق، تنہائی کا زھر، گھر کے عذاب، اولاد کا دکھ، مرد کا رعب، باپ کی عزت، بھائی کی شرافت، اپنے مٹنے کا احساس، ہر عمر کا الگ کرب، ہر روپ کا الگ مقام اور ہر مقام کا الگ امتیاز، ہر امتیاز کا الگ مزاج۔ یہ عورت کا ہی خاصا ہے کہ وہ اس کو سمجھ سکے۔ کیونکہ بات کو دیکھنے اور بات میں سے گزر کر دیکھنے کے عمل میں بڑا فرق ہوتا ہے اور یہی وہ فرق ہے کہ جس نے صنف نازک کو جرأت مندانہ عمل کے ساتھ ساتھ بھر پور اظہار کی طرف راغب کیا۔ اور وہ گھٹن کہ جس کا شکار ہو کر وہ قطرہ قطرہ زندگی کے زہر کو اپنی رگوں میں اتارتی تھی۔

۱۔ سورۃ التکویر پارہ ۳۰ آیت نمبر ۸۔ ۹

خاموش لب ساکن آنکھوں متحرک ہونٹوں اور نیچی گردن کے ساتھ اب بھی وہ برداشت سب کچھ کرتی ہے لیکن اس برداشت میں وہ اذیت نہیں کیونکہ اب اس کے ہاتھ میں ''ڈوئی'' کے ساتھ ''قلم'' بھی ہے۔ اب وہ صرف اس لیے نہیں جیتی کہ مرد کے دل میں جگہ بنائے بلکہ دماغ کے نہاں خانوں کو اپنے زور قلم سے جھنجھوڑتی بھی ہے۔ عورت کی حسیات مرد سے تیز تر ہوتی ہیں اور وہ اپنے فہم وادراک کا استعمال اس سیلن زدہ معاشرے میں رہ کر بھی کرسکتی ہے۔ جہاں اسے دوسرے درجے کا مقام حاصل ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ تعلیمی میدان میں کسی طور پر بھی کمتر نہیں ہے۔

مغلیہ عہد میں خواتین کے باقاعدہ پڑھنے لکھنے کا آغاز ہو چکا تھا۔ بالخصوص اعلی طبقات میں تعلیم کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ جسکی مثال گلبدن بیگم کی تصنیف ''ہمایوں نامہ'' ہے۔ ''تزک بابری'' میں خواتین کا ذکر ہے اس کے علاوہ ''جہاں آرا بیگم، زیب النساء، محمدی بیگم، مونی بیگم، جہاں آراء شاہنواز وغیرہ اس کے بعد برطانوی عہد میں خواتین کچھ عرصہ کے لیے پس منظر میں چلی گئیں۔ لیکن مختلف تحریکوں کے نتیجے میں انکی اہمیت اجاگر ہوئی۔ بالخصوص اس دور کے ادبی راہنماؤں سرسید، حالی اور نذیر احمد نے خواتین کے اندر ایک شعور بیدار کیا کہ وہ برطانوی دور حکومت میں بالکل علیحدہ ہو کر نہ بیٹھیں بلکہ پردے میں رہ کر بھی تعلیم حاصل کریں اور اس کے نتیجہ میں خواتین نے نہ صرف ملکی زبان میں تعلیم حاصل کی بلکہ اظہار کے لیے قلم کا بھی سہارا لیا۔ کیونکہ تعلیم حاصل کرنے کا شوق اگر اجاگر ہوتا ہے تو ذہن و دل کی نئی جہتیں بھی وا ہوتی ہیں اور ان کے اظہار کے لیے ادب کا میدان بہترین پیرایہ اظہار ہے۔ لیکن جس انداز سے اس نے اظہار کیا وہ مردوں کے لیے ناقابل برداشت تھا کیونکہ تلخ حقائق کو سن کر نظر انداز کر دینا تو مرد کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کو انمٹ حروف کی شکل میں پڑھنا اس کے لیے مشکل ترین اس لیے کہ جو ازلی وابدی درس وہ عورت کو دبا دبا کر دیتا چلا آیا ہے اور محکومی اس کے خون میں شامل کر دی گئی کہ وہ اونچی آواز میں بولنا تو درکنار آہ بھی نہیں بھر سکتی۔ وہاں اسقدر کھلم کھلا اظہار ہر مرد کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا اس لیے اس نے ریل کے زنانہ و مردانہ ڈبوں کی طرح عورتوں کے ادب کو بھی تقسیم کر دیا اور عورت کو سمجھایا کہ اس کا مقام تو یہ ہے کہ وہ ماں باپ کے گھر دس سال کی ہوئی تو ماں نے ہر قدم پر کہنا شروع کر دیا کہ

پرائے گھر میں جانا ہے۔ باپ کی ہر گھُرکی کے نتیجے میں وہ اور سہم گئی۔ بھائی کے رعب نے اسے باہر نہ نکلنے دیا۔ کیونکہ وہ سانجھی عزت ہے۔ باپ اور بھائی کی اور پھر خاوند کی۔

لیکن سانجھ پن میں نہ وہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی۔ اپنے ہی گھر کی دیواروں میں وہ یوں بوکھلائی پھرتی ہے کہ جیسے یہ گھر اس کا اپنا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دیواریں اسے احساس دلاتی ہیں کہ جہاں وہ پورے خلوص اور تن دہی کے ساتھ ماں کے لیے سراپا خلوص، باپ کے لیے پیار ہی پیار، بھائی کے لیے دعاؤں کے پھول نچھاور کرتی ہے۔ وہیں اس کے ساتھ بھائی سے الگ رویہ رکھا جاتا ہے۔ وہی ماں جو بھائی لیے سراپا شفقت ہے۔ اس کے لیے اس کی آنکھوں میں اتنی بیگانگی کیوں ہے۔

ماں باپ کے گھر میں ماں سہیلی نہ بن سکی کہ وہ دل کی بات بتا سکے۔ سسرال آ کر ساس ماں نہ بن سکی کہ وہ اسے دکھ بتا سکے۔ دل کی بات سمجھا سکے اور پھر اسے وہ خواب چکنا چور نظر آیا کہ جس کی نیت وہ بچپن سے کر رہی تھی۔ وہاں تو کسی اور کی حکمرانی تھی۔ عورت تو نہ ساری عمر کھاتی اپنی مرضی کا نہ جیتی اپنی مرضی سے اور نہ مرتی اپنی مرضی سے۔ کبھی باپ بھائیوں کی مرضی سے اور کبھی شوہر کی مرضی، کبھی اس مرد کی خوشنودی اور کبھی اس مرد کی خوشنودی۔ روپ الگ الگ،، مقام فرق فرق لیکن سوچ ایک ہی، عمل ایک ہی، انداز ایک ہی حکمرانی کا، وہ آزادی کے سکھ سے ناآشنا رہی اور اسی ناآشنائی نے اس کے قلم میں زہر گھول دیا۔

اسی سلسلے میں نیلم احمد بشیر نے اپنے مجموعے ''گلابوں والی گلی'' میں عورت کی نفسیات کو خوبصورت لفظوں میں بیان کیا ہے۔ خاص طور پر ان کا افسانہ ''میں اور میرا ساتھی'' میں اس خوف اور ڈر کی عکاسی کی ہے کہ جس کی وجہ سے وہ ساری عمر وہ اپنے باپ اور بھائی سے ڈرتی ہے اور یہی ان کے دوسرے افسانے ''لالی کی بیٹی'' میں اور بھی نمایاں ہیں۔

اسی لیے کشور ناہید لکھتی ہیں:۔

''تحفظ کا لفظ عورت کی ذات کے ساتھ لازم وملزوم بنا دیا گیا ہے۔ محبت میں تحفظ، پناہ میں تحفظ، مستقبل میں تحفظ، سماج میں تحفظ، ہر لفظ مرد کی

نسبت سے حاصل کرنا اس کا مقدر ہے''۔(۱)

اسی تحفظ کی وجہ سے عورت نے اپنے آپکو عذاب میں ڈال دیا۔ عدم تحفظ نے اس کی شخصیت کی تکمیل نہ ہونے دی۔ عدم توجہ نے اس کے مشاہدے کو نوک قلم تک آنے سے روکا۔

کیونکہ مرد تو آدھی عورت کو پسند کرتا ہے جو صرف خدمت کرنا جانتی ہو۔ ذھین عورت اس کے لیے نا قابل برداشت ہے۔اسی لیے ورجینا وولف کو اظہار بیان کے لیے جن مسائل سے گزرنا پڑا وہ ایک لمبی داستان ہے لیکن بات سچ ثابت کرنے کے لیے ایک آدھ مثال ضروری ہے۔مثلاً ورجینا نے مردوں کو للکارتے ہوئے کہا:۔

''Lock up your libraries if you like
but there is no gate no lock no
bolt that you can set upon the freedom
of my mind'' (۲)

یہ صرف ورجینا وولف کے ساتھ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں عورت کا کام مرد کی شانتی حاصل کرنا اسکی خدمت کرنا اور اس کے بچوں کو بہتر آیا فراہم کرنا ہے جو بغیر Payment کے پورے خلوص اور تن دہی سے دن رات کام میں مصروف رہتی ہے۔ صلہ وستائش کی تمنا کے بغیر لیکن جس باغ کو وہ خون پسینہ ایک کر کے سینچتی ہے وہاں پر سے بوڑھی ہونے کے بعد یوں دھتکاری جاتی ہے جیسے چوکھٹ سے کتا کہ اس کا مقام جانوروں سے بھی بدتر ہے۔

مرد کی شاذہنیت اور عورت کی مظلومیت ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس سے کوئی بھی ذی شعور انکار نہیں کرسکتا۔ باوجود اپنی خود فریبی اور انا پرستی کے۔

عقل وشعور کا عورت سے واسطہ رکھنا بھی مرد کے لئے نا قابل عمل ہے بلکہ یہاں تک کہ ادب میں خواتین کے جادہ فکر پر بھی پابندی تھی۔ وہ جنس یا اس سے متعلقہ موضوعات پر یا باہر کی دنیا مثلاً نائٹ کلبوں کا ریسٹورنٹ کا یا شراب خانے وغیرہ کا ذکر مرد کے حوالے سے بھی نہیں کرسکتی کیونکہ یہ اخلاق سے گری ہوئی ہیں اور عورت کی اخلاقی گراوٹ مرد کے لیے نا قابل برداشت ہے۔

۱۔ کشور ناہید بری عورت کی کتھا سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۹ ص۔ ۱۳۲

۲۔ بحوالہ کشور ناہید ص۔ ۱۳۴

لیکن اس کے باوجود عورت نے اپنی قوت کے ذریعے زندگی کے ایسے رخ سے نقاب کشائی کی کہ مرد حضرات انگشت بدنداں رہ گئے۔

چنانچہ وہ تمام موضوعات جن پر وہ لکھ رہے تھے۔ عورتوں نے بھی طبع آزمائی کی لیکن آج بھی قدیم قبیلوں اور قدیم زبانوں میں مرد اور عورت کے لیے تذکر و تانیث کا فرق بہت واضح ہے۔ اگرچہ اردو ادب میں بھی ہے لیکن ایسا نہیں کہ عورت ان الفاظ کا استعمال نہیں کر سکتی۔

کشور ناہید اس سلسلے میں لکھتی ہیں :۔

''تذکیر و تانیث کا سب سے زیادہ واضح فرق جن زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ ان میں عربی اور عبرانی شامل ہیں۔ ان میں تمام اسم مذکر ہیں یا مونث۔ ان سے متعلق صفت بھی مذکر ہوگی یا مونث حتی کہ فعل بھی اسی حساب سے مذکر یا مونث بن جاتا ہے۔ اگر کوئی کسی سے یہ کہتا ہے کہ'' میں تم سے محبت کرتا ہوں'' تو اسے کہنے کے لیے چار مختلف طریقے ہیں۔ یعنی یہ دیکھا جائے گا کہ عورت مرد سے کہہ رہی ہے یا مرد عورت سے کہہ رہا ہے۔ عورت کسی دوسری عورت سے کہہ رہی ہے یا مرد کسی دوسرے مرد سے کہہ رہا ہے''۔ (۱)

یعنی آج بھی معاشرتی طور پر عورت بہادری، حکمرانی یا وہ اوزار جو مرد جنگلوں میں استعمال کرتا ہے عورت وہ لفظ بھی اپنے نوک قلم سے نہیں نکال سکتی۔ جن میں بہادری کا تاثر پایا جائے کیونکہ ازل و ابدی طور پر وہ نازک، ڈرپوک اور بزدل ہے۔ حالانکہ خدا کی تخلیق میں کہ جس میں انسان شامل ہیں۔ ان میں کسی کو کسی پر اولیت یا بڑائی نہیں۔ بحوالہ مرد اور عورت کے وجود کے کوئی بھی ایک دوسرے سے پہلے نہیں آتا کیونکہ تخلیق کی تعریف کے ضمن میں جنت لازمی نہیں کیونکہ انسانی تخلیق میں عورت اور مرد زوج بنائے گئے نہ کہ کمتر اور برتر بنائے گئے۔ مغربی دنیا ہو یا ہماری دنیا ادب پر ہمیشہ مردوں کا قبضہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مردوں کے مقابلے میں ادب میں خواتین کا حصہ بہت کم ہے۔ دراصل ادب میں لسانی مکسچر کی وجہ سے ایک ایسی تفریق پیدا کر دی گئی ہے کہ اب ادب کے نقاد ادبی سطح پر عورت کی انفرادیت اور مقام کو تسلیم کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔

۱۔ کشور ناہید بحوالہ سابقہ ص۔ ۸۳

کیونکہ اب عورت نے ادب کی تمام اصناف پر طبع آزمائی کی وہ اچھی افسانہ نگار، بہترین، سفر نامہ نگار اور لاجواب ڈرامہ نگار ہے۔ یعنی شاعری اور نثر ہر دو میدان کی اصناف سخن میں اس نے طبع آزمائی کی لیکن امر واضح ہے کہ ادب میں بھی خواتین کا استحصال جاری رہا اور ان سے امتیازی سلوک کیا جاتا رہا۔ لہذا میں نے سوچا کہ اردو سفر نامے میں انور سدید صاحب کا کام لاجواب اور بے مثال ہے۔ اس پر مزید لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اس لیے میں نے خواتین کے سفر ناموں پر لکھنے کے بارے میں سوچا اور اس امر میں میرا خود خاتون ہونا بھی ایک شعوری یا لاشعوری طور پر ایک اہم عنصر یا وجہ کہی جاسکتی ہے۔

کیونکہ اس تجزیئے کے بعد جب ہم مجموعی طور پر عورت کے تاثر کو ابھارتے ہیں تو پوری تاریخ میں عورت محض ایک شے کی مانند رہی ہے۔ جسے مرد نے اپنی خواہشات کے لیے مختلف طریقوں سے استعمال کیا۔ جہاں اسے وہ عزت وتکریم حاصل نہ ہوسکی جس کی وہ مستحق تھی یا ہے۔

باب دوئم

۱۹۴۷ء سے پہلے کے سفر نامے

۱)	نازلی رفیع سلطان	:	سیر یورپ
۲)	سلطان جہان بیگم	:	سیاحت سلطانی
۳)	عطیہ بیگم	:	زمانہ تحصیل
۴)	صغری بیگم حیا	:	سفرنامہ یورپ

نازلی رفیع سلطان (سیر یورپ)

نازلی رفیع سلطان کا سفر نامہ ۱۹۰۸ میں لندن، پیرس آسٹریا، ترکی اور مصر کے حالات کے بارے میں ہے۔ یہ خطوط دوران یورپ لکھے گئے اور انکوانکی خواہر محترمہ زہرا بیگم فیضی نے ترتیب دیا۔ دیباچے میں لکھا گیا ہے:۔

''اصل میں یہ وہ خطوط ہیں کہ جو میں نے اپنے بزرگوں کے نام سیر یورپ کے حوالے سے لکھے ہیں۔ اس میں نہ عبارت آرائی ہے نا قافیہ پیائی۔ صاف ستھری سیدھی عبارت ہے۔ وہاں کے حالات، طرز معاشرت، تدبیر المنازل بعض امور سیاسیہ، سردی، اقسام فنون کی کثرت، تہذیب طریقہ تعلیم، دربار کے آداب جو میں جتنا سمجھ سکی اپنی زبان میں اہل وطن کو سمجھانے کی کوشش کی نسبتاً جب یورپ اور ایشیا کو دیکھتی ہوں تو اپنی نظر میں تھوڑی تھوڑی ہو جاتی ہوں'' (۱)

نازلی رفیع سلطان صاحبہ ۱۹۰۸ میں یورپ کا سفر سر سید احمد خان بہادر، نواب آف ریاست جزیرہ کی معیت میں کیا۔ اسی سفر میں علامہ اقبال سے ملاقات کا بھی ذکر ہے۔ یہ سفر نامہ روزنامچے کی شکل میں ہے۔ اس سفر میں کوئی خاص مقصد نہیں ہے ذاتیات اور معروضیات کا مجموعہ ہے کہ جس میں ان لوگوں کا حال احوال درج ہے جو اس سفر کے دوران یا مختلف مقامات پر ان سے ملے۔

مرزا حامد بیگ اس سفرنامے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

'' اردو کی پہلی سفر نامہ نگار خاتون نازلی رفیع سلطان کا سفر نامہ سیر یورپ ۱۹۰۸ میں شائع ہوا یہ سفر نامہ یورپ کے دوران ہندوستان میں قیام پذیر بزرگوں کو لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے جبکہ اس سفرنامے کی دوسری نمایاں پہچان نسوانی انداز تحریر ہے۔ سیر یورپ میں ایک مشرقی عورت کی نظر سے یورپی تہذیب کا مشاہدہ جداگانہ لطف کا حامل ہے'' (۲)

۱۔ نازلی رفیع سلطان سیر یورپ۔دیباچہ

۲۔ مرزا حامد بیگ اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ص ۴۹۔

ان کا سفر نامہ یورپ پر ناقدانہ نظر کا حامل ہے۔ تعلیمی اور سائنسی ترقی کے نئے مدارج کا سراغ لگانے کے ساتھ ساتھ وہ اس ترقی سے بہت متاثر نظر آتی ہیں وہ یورپ کے علمی خزانوں سے نہ صرف متاثر نظر آتی ہیں بلکہ بعض اوقات احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ہم آج بھی کتنے پس ماندہ ہیں۔ متنوع فضاؤں کا مشاہدہ انسان کے اندر بھی تنوع پیدا کر دیتا ہے۔ مطالعہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو۔ زندگی کے سمندر میں کم معلوم ہوتا ہے کہ زندگی نام ہے تجربے کا اور جب زندگی کی جدوجہد میں شریک ہو کر تجربے حاصل کیئے جاتے ہیں تو زندگی میں سے گزر جانے کا علم ہوتا ہے اور اپنی کم علمی کی وجہ سے بعض اوقات شرمندہ بھی ہونا پڑتا ہے۔ اپنی خود اعتمادی میں کمی کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ یہی چیز ہمیں نازلی کے ہاں نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں :۔

''چنانچہ نازلی رفیع سلطان نہ صرف یورپ کی ترقی سے متاثر تھیں بلکہ انہیں یہ احساس بھی کھائے جاتا تھا کہ ایشائی ممالک بالخصوص برصغیر، ہندوستان تعلیمی لحاظ سے پسماندہ اور تہذیبی اعتبار سے غیر ترقی یافتہ ہے۔ اس سفر نامے کے ذریعے انہوں نے اہل وطن کو نہ صرف ایک نئی دنیا کی سیر کرانے کی کوشش کی بلکہ انہیں یورپ کی صنعتی اور تمدنی ترقی سے بھی روشناس کرایا۔ اس زاویے سے دیکھتے ہیں تو ''سیر یورپ'' ایک ایسا سفر نامہ ہے جس میں قدیم سفر نامہ کی روایت کو برقرار رکھا گیا ہے اور اسے معلومات کا مرقع بنانے کی پوری کاوش کی گئی ہے۔ (۱)

نازلی رفیع سلطان نے قیام یورپ کے دوران جو میل ملاقات کی وہ امراء کے طبقے سے کی اور اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں ان کا قیام رہا۔ اس لیے اس طبقے اور ماحول کی ہی تصویر کشی کی گئی۔ انہی کی بود و باش اور سیر و تفریح کا ذکر ہے۔ اس میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ علامہ اقبال نے فی البدیہہ یہ اشعار لکھے جو مصنفہ نے کتاب میں درج کیئے ہیں۔ یہ اشعار ۱۰ جون ۱۹۰۸ میں لکھے گئے

اور فیض آستاں بوس سے گل بر سر قمر
دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر
جس طرح گردوں بہ صدر محفل اختر قمر

۱۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص ۱۹۷

شمع بزم اھل ملت را چراغ طور کن
یعنی طلعت خانہ ما را سراپا نور کن

نازل رفیع مادام دوسبان کے ہمراہ بیت الطرب (یعنی اوپیرا) میں گئیں وہاں پر مختلف قسم کے کھیل ہو رہے تھے۔ جن کو سمجھنا بہت مشکل تھا لیکن نازلی کھیل سے زیادہ اردگرد کے ماحول کی طرف زیادہ متوجہ رہیں اور خاص طور پر ایک وضعدار نوجوان کہ جس نے لکھنو کے بانکوں کی وضع اختیار کی ہوئی تھی اور بقول نازلی صاحبہ بالکل افسانہ آزاد کے ''چھمی جان'' کی سی سج دھج تھی اور اس زمانہ وضع کو دیکھ کر ان کا دل اس حد تک خراب ہوتا ہے کہ وہ الائچی اور لونگ چبا کر اپنے دل کو گھبراہٹ سے بچاتی ہیں۔
ایک اور جگہ اوپیرا کا حال لکھتی ہیں۔

> ''جلنا جو یورپ کی مشہور گانے والیوں میں سے ہے۔ ان دنوں گانے کو تھی اور لندن یں بہت دنوں کے بعد آئی تھی۔ اس لیے لوگوں کی بہ کثرت تھی کہ اوپیرا کی عالی شان عمارت میں ایک جگہ خالی نہ تھی۔ جلنا کی آواز غضب کی ہے۔ بوڑھی ہوگئی ہے اس پر آواز جوانوں کو مات کرتی ہے۔ ملکہ معظمہ اور شہزادی وکٹوریا بھی جلنا کو ملنے آئی ہوئی تھیں واقعی ہماری ملکہ نے عجب لازوال حسن پایا ہے۔'' (۱)

وقائع نگاری کے اعتبار سے نازلی کا سفرنامہ اس زمانے کی خواتین سے بلند ہے کہ انہوں نے یورپ میں نوادر و عجائبات کو اپنے حوالے سے نہیں بلکہ تاریخی پس منظر میں دیکھا اور ان کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا وہ حقیت کو اس سادگی سے بیان کرتی ہیں کہ اس زمانے میں باوجود اس کے کہ اردو زبان نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ اس میں سادگی وسلاست ہے اور روانی بیان بھی انہوں نے معمولی جزئیات کو بھی پوری تفصیل سے دیکھا ہے۔ اس سفرنامے میں ناظر ومظاہر کا حسن اپنے عروج پر ہے۔

> ''خداتعالی نے جتنی عمدہ چیزیں تھیں وہ سب اس ملک کو عطا کی ہیں۔ مختلف مقامات پر آبشار اور جھرنے بہہ رہے ہیں۔ جنکی سریلی آواز سے ہم بیخود ہو رہے تھے۔ گاڑی کی سڑک کے اوپر بجلی کی ٹرام ہے۔ بجلی ~~یہ بھی تو~~ ان لوگوں کے کھیل ہیں۔ گاڑی اونچائی تک چلی جاتی ہے۔ پلاش کے اوپر ایک ہوٹل ہے جس کو ہوٹل دی نارسس (نرگس

۱۔ نازلی رفیع سلطان، سیر یورپ، یونین سٹیم پریس لاہور ۱۹۰۸ء، ص ۱۲۱

ہوٹل) کہتے ہیں کیونکہ بعض موسم میں لاکھوں نرگس کے پھول اطراف میں
ہوتے ہیں''۔ (۱)

مصوری کا فن بہت قدیم ہے ۔ بلکہ یہ فن بعض مذاہب میں تو بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ نازلی نے مشاہدے کو یوں پیش کیا ہے کہ قاری مظاہر واشیاء کو محسوس کر لیتا ہے اور مختلف موضوعات پر گفتگو کر کے عالمانہ نقطہ نگاہ نے اس سفر نامے کو کامیاب کر دیا ہے ہالینڈ اور اٹلی کے مشہور مصوروں کے کرشمے یہاں ایک جگہ موجود ہیں ۔ نازلی ان کے بارے میں یوں اظہار کرتی ہیں ؛۔

''بے شمار کمرے بنے ہوئے ہیں جنکی دونوں طرف کی دیواریں تصویروں سے معمور ہیں ۔ پرانے صاحبان فن سے موریلو کی تصویریں پسند آئیں ۔ رونز اور ٹیشن وغیرہ کی بھی تصویریں نہایت پسند کی جاتی ہیں ۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی آرٹسٹ ماہر فن کو ساتھ ہونا چاہیے جو ظاہری اور باطنی تمام خوبیوں کو ظاہر کر دے ۔ تب معمولی سمجھ رکھنے والے انسان کی عقل اور آنکھ میں کچھ سما سکے ۔ ہر کمرے کی کاریگری بھی حیرت میں ڈالتی ہے ۔ خدا تعالیٰ اس قوم کو ایسا ذوق سلیم اور حس لطیف عطا کی ہے کہ بیان سے باہر ہے''۔ (۲)

یورپ کے کچھ سفر نامے ایسے بھی ہیں جن میں یورپ کی زندگی سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ یہ سوچ ضرور آتی ہے کہ آخر یہ ملک اتنی تیزی سے کیسے ترقی کر رہا ہے اور ہمارے لوگ آخر ان سے کیوں اتنے پیچھے ہیں ۔ یورپ کے سفر ناموں کی وجہ سے ان کی انگریزوں کی صلاحیت، علمی قابلیت ، سائنسی گرفت ، تہذیب وتمدن کا پتہ تو ضرور چلتا ہے لیکن تہذیب کی چمک بعض اوقات آنکھوں کو چکا چوند کر دیتی ہے لیکن ان میں ایک اور خوبی یہ ہے کہ اگر ان میں کوئی برائی ہے تو وہ ان کو دور کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں ۔ مثلاً

''سر آرتھر نے کہا کہ چند سال کی بات ہے کہ شراب خواری کی یہاں بہت کثرت تھی اور پی اینڈ او کمپنی کے جہازوں پر یہ نوٹس لگے ہوتے تھے کہ لنچ سے پیشتر کوئی صاحب مقررہ بوتل سے زیادہ بیئر (ایک قسم کی شراب) نہیں پی سکتے ۔ اب حالت بدل گئی ہے ۔ لوگ شراب کم پیتے ہیں بلکہ سوڈا لیموئیڈ وغیرہ زیادہ استعمال کرتے ہیں اور واقعی میں نے بھی یہ دیکھا ہے کہ

۱۔ نازلی رفیع سلطان سیر یورپ یونین سٹیم پریس لاہور ۱۹۰۸ ص ۲۴
۲۔ نازلی رفیع سلطان سیر یورپ یونین سٹیم پریس لاہور ۱۹۰۸ ص ۲۰۸

کھانے پر بہت تھوڑے لوگ شراب پیتے ہیں۔ان میں بیبیاں تو بمشکل ہاتھ لگاتی ہیں ہاں اب بیبیوں کو مردوں کے سے کپڑے پہننے اور سگار پینے کا بڑا شوق ہو چلا ہے اور آجکل سوبجسٹ کا زور شور غضب کا ہوگیا ہے''۔ (۱)

خواتین کے سفرناموں میں اگر نسوانی پسند اور رنگ نہ پایا جائے تو وہ سفرنامہ نسوانی کہلانے کا مستحق ہی نہیں۔ایک تو یہ کہ خواتین کا گھریلو امور کی طرف مشاہدہ خاصا گہرا ہوتا ہے دوسرے رنگ و بو کا جو احساس ان کے ہاں ہوتا ہے وہ مرد سفرنامہ نگاروں کے ہاں نہیں ہوتا وہ حالات و واقعات کو احساسات میں ضم کر کے قاری کے سامنے یوں پیش کرتی ہیں کہ مزید جستجو یا تحقیق کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ نازلی رضیہ صاحبہ کا مطالعہ نسائی رنگ لیے ہوئے ہے۔کہتی ہیں؛۔

''کاؤنٹس کی دستکاری ایک طرف رکھی ہوئی تھی جو وہ آپ کرتی تھیں کینوس پر کشیدے کا کام ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کمرے میں بڑی چھ سات چوکیاں رکھی ہوئی تھیں جن پر اس قسم کے کشیدے کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے جو انہی کے ہاتھ کا کام تھا۔ زمین ایک رنگ کی اور اس میں بیل بوٹے وغیرہ دوسرے رنگ کے اسطرح ایک ایک کرسی ایک ایک مہینے میں تیار کر ڈالی ہے اب بڑے کوچ کے لیے آپ کاڑھ رہی ہیں۔ ایک ٹکڑا تیار ہوا اور انہوں نے فرنیچر والے کے پاس بھیجکر کرسی پر جڑوا دیا۔ میں نے کئی مکانوں اور دکانوں میں اس قسم کا سامان دیکھا تھا جس کا بھید آج معلوم ہوا۔ میں بھی تھوڑے سے لیتی آؤنگی تا کہ خانہ دار لڑکیوں سے کڑھواؤں نہایت خوبصورت اور ہنر مندی کا نمونہ معلوم ہوتے ہیں نازک رنگوں سے بھرے ہوئے بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ''(۲)

تاریخی معلومات محض اوقات تاریخ سے نہیں ملتی ہیں۔جتنی کہ تاریخی سفرناموں میں مل جاتی ہیں۔ کیونکہ تاریخ سے تو واقعات اور طرز حکومت کا اندازہ ہو جاتا ہے لیکن سفرنامے میں سماجی اور معاشی حالات کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ سفر کے ذریعے انسان نئے ممالک وہاں کے موسم ،لوگ حالات اور جغرافیئے سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اب سفرنامہ نہ صرف ادبی لحاظ سے بلکہ سماجی ،تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے بھی ایک اہم علمی سرمایہ ہے۔جب نازلی جنیوا پہنچتی ہیں تو وہاں کے پہاڑوں ہوٹلوں، جھیل ،سورج برف ،ابر کوئی بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہتی اور اس کی بھرپور تعریف کرتی ہیں۔

۱۔ نازلی رفیع سلطان بحوالہ سابقہ ص ۷۹

۲۔ نازلی رفیع سلطان بحوالہ سابقہ ص ۱۲۹

لکھتی ہیں :-

''جینیوا'' اچھا شہر ہے۔ آبادی کوئی لاکھ کی ہوگی۔ یہ شہر خصوصاً گھڑیوں کے لئے مشہور ہے۔ یہاں زیادہ سردی ہے۔ سامنے کو (لب دریا پر) پھرنے کو گئے تھے۔ ان شہروں میں یہ بات تو ہے کہ ہمیشہ وقت گزارنیکی جگہیں اور تماشا گاہیں موجود ہیں جہاں دو گھڑی جی بہلا سکتے ہیں۔ یہاں زیادہ ٹھہرنے کا مقصد نہیں ہے بلکہ پیر کو انشاء اللہ تعالی وینیا جائیں گے۔ مونٹ بلانک ایک سمت سے خوابیدہ انسان کے چہرے کا جیسا نظر آتا ہے جو وکٹر ھیوگو (فرانس کا ایک مشہور شاعر) کے چہرے سے پوری مشابہت رکھتا ہے۔ یہ بات ایک صاحب نے ہمیں دکھائی۔ فی الواقع بہت ہی نمایاں شباھت ہے۔ اگر پہاڑ کے نقشے کو دیکھیں تو چوٹی پیشانی کا آخری حصہ معلوم ہوتی ہے اور بائیں طرف چہرے کی حدود معلوم ہوتی ہیں''۔ (۱)

نازلی رفیع سلطان کا انداز بڑا محققانہ ہے۔ وہ نہ صرف شہروں، معشیت اور لوگوں کے دلی جذبات تک کو جاننے کی کوشش کرتی ہیں بلکہ وہ ادب اور اس کے اثرات سے بھی بے خبر نہیں ہیں۔ سیاح کھلی آنکھ سے اگر مشاہدہ نہ کرے تو اکثر چیزوں سے بے خبر رہتا ہے لیکن نازلی صاحبہ کا مطالعہ بڑا گہرا ہے۔ سفرنامہ نگار جہاں جاتا ہے تو وہاں کی آب و ہوا قدرتی مناظر، دریا پہاڑ اور جنگل وغیرہ کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔ اور وہاں کے لوگوں کے اخلاق عادات و اطوار کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ان کی عقیدتوں کا اور بیماریوں کا بھی۔ پلامئے میں جب نازلی صاحبہ جاتی ہیں تو وہاں کی ان قدرتی آبشاروں کا ذکر کرتی ہیں۔ جو اندرونی امراض کے یے بے حد مجرب ہیں اور صدیوں سے لوگ اس طریقہ کار کے مطابق اور اپنے اپنے عقیدے کے مطابق شفا تلاش کرتے ہیں۔ رفیع صاحبہ لکھتی ہیں۔

'' اس جگہ کو پہلے جن لوگوں نے ڈھونڈھا۔ وہ رومن لوگ تھے۔ قدرتی آبشاروں کی خاصیت کو انہی لوگوں نے جانچ پڑتال کر کے سمجھ لیا۔ کوئی پچاس سے زیادہ ایسے گرم پانی کے آبشار ہیں جو اندرونی امراض کے لیے

۱۔ نازلی رفیع سلطان بحوالہ سابقہ ص ۲۰۹

مجرب ثابت ہو چکے ہیں۔ اس شمار سے کوئی دو ہزار برس پہلے ان چشموں کو ایسے ڈھب سے بنایا کہ شدید طوفان یا بارش میں بھی ایک آبشار کا پانی دوسرے آبشار سے نہ ملے۔ اس بات کی احتیاط کے لیے جس وضع سے بند باندھے ہیں آج کے زمانے میں بھی اس پر کوئی اصلاح نہیں کر سکتے ہیں۔ بلکہ حیران ہیں۔ میں نے یہ سب علاقے بچشم خود دیکھے کہ کائی جم گئی ہے۔ پتھر گھس گئے ہیں مگر اب تک ایک پتھر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ حال کے زمانے میں ڈاکٹروں نے سب پانیوں کا امتحان کیا اور سب کو الگ ماہیت کا پایا''۔ (۱)

جینیوا میں قابل دید مقامات کا ذکر کرتے ہوئے نازلی صاحبہ یوں تبصرہ کرتی ہیں۔

''لیک لیمان پر شہر واقع ہے اور دوسرے میں تمام شہر اسی جھیل کے متصل اردگرد موجود ہیں۔ وادی رون میں سے نکل کر اون دریا بھی اسی جھیل میں شامل ہو جاتا ہے اور جینیوا کے شہر میں سے گزر کر بڑی سمندر میں مل جاتا ہے۔ یہ دریا نہایت بڑا ہے اور پانی کا زور بہت ہے۔ ایک بہت بڑا سانچا عین ندی میں نصب کیا ہے کیونکہ پانی کا بہاؤ اتنا زبردست ہے کہ اس کے ذریعے سے بڑے بڑے پنکھے دار چکر پھرتے ہیں اور ان چکروں کے ذریعے اوپر کے بڑے سانچے کام کرتے ہیں یعنی پانی اوپر کھینچ آتا ہے اور اوپر چڑھتے وقت چھنکر تمام شہر میں نل کے ذریعے سے یہ ہی پانی پہنچتا ہے۔ اسطرح تمام کام پانی ہی کرتا ہے''۔ (۲)

خاتون ہونے کے ناطے نازلی صاحبہ نہ صرف ان مسائل کی طرف توجہ دیتی ہیں جو مرد سفر نامہ نگار کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں بلکہ وہ ان تکالیف کا بھی ذکر کرتی ہیں جو ان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ نازلی صاحبہ لکھتی ہیں۔

''دریائے نیل میں اس سال جو پانی کا زور ہے وہ پندرہ سال سے دیکھنے میں نہیں آیا۔ زراعت اور مکانات کا بہت نقصان ہو رہا ہے اور اس کی وجہ سے ہوا میں بھی از حد خنکی پیدا ہو گئی ہے۔ کئی میل سیدھی سڑک اہرام تک چلی جاتی ہے۔ دو رویہ بڑے بڑے درخت اگائے ہوئے ہیں اور اس سیلاب کے سبب تمام پانی جمع ہو گیا ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ منظر کس قدر لطیف اور مثل تصویر نظر آتا ہے جو باتی تصویروں میں دکھائی دیتی

۱۔ نازلی سلطان بحوالہ سابقہ ص ۲۱۰

۲۔ نازلی سلطان بحوالہ سابقہ ص ۲۱۱۔

ہیں وہ سب بچشم خود اب دیکھ رہے ہیں''۔(۱)

اہرام مصر اور دریائے نیل یہ دو ایسی چیزیں جو رہتی دنیا تک سیاحوں کی نظر سے اوجھل نہیں ہو سکتیں۔ ہر سیاح اپنے زاویہ نظر سے اس کا مطالعہ و مشاہدہ کرتا ہے۔ جس طرح دو انسان بیک وقت ایک جیسا سوچ نہیں سکتے اسطرح دو سیاحوں کی نظر بیک وقت ایک چیز کے بارے میں ایک ہی رائے قائم نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ صدیاں گزرنے کے باوجود یہ اہرام اور دریائے نیل پر تنقیدی اور تحقیقی نقطہ نظر سے مشاہدہ و مطالعہ ہو رہا ہے لیکن ابھی تک یہ تاریخ کے بہت سے گوشے ایسے ہیں کہ جن سے نقاب نہیں اٹھایا گیا اور نہ جانے آنے والی کتنی نسلیں اس امر پر مزید غور کریں گی کہ یہ اہرام کیوں بنائے گئے اور وقت کا ظالم ہاتھ اس پر کیوں اثر انداز نہیں ہوا۔ ابھی نہ جانے کتنے دماغوں کے سوئے ہوئے سوتے اس سے ابھریں گے اور زمانوں کو نئی روشنی سے آگاہ کریں گے۔ نازلی صاحبہ لکھتی ہیں:۔

'' دنیا میں شاید کسی عمارت کے متعلق اس قدر قیل قال نہیں ہوئی ہوگی جیسی کہ ان اہرام کے بارے میں ہوئی ہے۔ کسی فرنچ عالم کا یہ تک خیال تھا کہ دریائے نیل کے کنارے کے شہروں کو ریت کے طوفانوں سے بچانے کی خاطر یہ مینار بنائے گئے ہیں لیکن آخر وہ زمانہ بھی آیا کہ عالموں نے ہی اس معمے کو حل کیا اور دنیا کو معلوم ہوا کہ پرانے بادشاہوں کے مقبرے ہیں اور ان میں بادشاہان سلف مدفون ہیں''۔(۲)

مسجد الازہر دنیا کی مشہور مساجد میں سے ہے اور جو مسلمانوں کے لیے اسلامی یونیورسٹی کے طور پر بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے اور یہاں ہر اسلامی تعلیمات کا بہت اچھا انتظام ہے۔
مسجد الازہر کے بارے میں لکھتی ہیں۔

'' شام کو حضور مسجد الازہر دیکھنے گئے وہاں بیبیوں کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ مصطفٰے بہرام بیگ جج کو برٹش سفیر نے بھیجا تھا تاکہ سب ٹھیک ٹھاک طور پر دکھا دیں۔ جامع ازہر دنیا میں اکیلی اسلامی یونیورسٹی ہے۔ دسویں صدی میں اس مسجد کو مکتب کے کام میں لایا گیا۔ فی الحال پندرہ ہزار بچے یہاں پڑھتے ہیں۔ بہت بڑی جائیداد اس کام کے لیے وقف ہے۔ حضور کو ایک ہندوستان کا شخص بھی ملا جو کسی عہدے پر متعین ہے۔ اس

۱۔ نازلی سلطان بحوالہ سابقہ ص ۲۸۷۔
۲۔ ایضاً " ص "۔

نے کہا کاش ہندوستان کے مسلمان بھی ایک قطعہ زمین کا وقف کر دیں اور بچوں کو عربی تعلیم کے لیے یہاں بھیجیں۔ اس سے بہتر جگہ عربی سیکھنے کے لئے نہیں ہے۔ یہ مسجد بہت ہی عمدہ حالت میں ہے اور دنیا بھر میں عربی طرز کا بہترین نمونہ شمار کی جاتی ہے۔''(۱)

نازلی صاحبہ کی شخصیت کا کمال ہے کہ انہوں نے ہمیں جو مناظر تاریخ و معاشرت کے دکھائے ہیں۔ وہ ان کے اس پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں کہ صرف خاص باتیں لکھنے پر اکتفا نہ کیا جائے۔ بعض مقامات اور لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں دل میں بسا لینے کو دل چاہتا ہے۔ پھر من کی ترنگ ان پر اظہار خیال کرنے پر بھی اکساتی ہے۔ لیکن اس میں ایک کمی کا احساس آخر تک ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو بظاہر بڑے غور سے دیکھتی ہیں۔ اس کی شان وشوکت سے متاثر ہوتی ہیں۔ چیزوں کی خریداری بھی کرتی ہیں۔ تاریخ سے آشنائی بھی کرواتی ہیں۔ تجزیہ بھی کرتی ہیں اور تنقید بھی لیکن ان کا مشاہدہ اونچے سنگھاسن پر بیٹھے ہوئے اس سیاح کا ہے جو عوام الناس سے بے تکلف نہیں ہوتا اور سفر نامہ بھی لکھنا چاہتا ہے۔

انور سدید لکھتے ہیں :۔

''رفیع سلطان نے سفر کو روحانی بنانے کے بجائے لذت کام ودھن اور فردوس نظر بنانے کی کوشش کی چنانچہ سادگی اور خلوص کے باوجود اس سفر نامے میں معروضیت نمایاں نہیں ہوسکی اور امارت کی دھند میں لپٹا ہوا مشاہدہ قاری کو اپنا سحر منظر منتقل نہیں کر پایا''۔ (۲)

بہر حال بیسویں صدی کے آغاز میں لکھا ہوا یہ سفر نامہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ لندن کے امراء اور ترکی کے باشندوں کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔

۱۔ نازلی رفیع سلطان بحوالہ سابقہ ص ۳۰۱

۲۔ انور سدید بحوالہ سابقہ ص ۱۹۹

سیاحت سلطانی نواب سلطان جہاں بیگم۔

سفر نامے کے لیے باقی اصناف ادب کی طرح سیاح کا شعور بیدار اور اس کے مطالعے میں وسعت اور ہمہ گیری لازمی ہے۔ سیاحت سلطانی نواب سلطان جہاں بیگم والئی ریاست بھوپال کا سفرنامہ اپریل/اکتوبر ۱۹۱۱ میں شائع ہوا۔

اس سفر نامے میں لندن، فرانس، سوئٹزرلینڈ، ترکی، ھنگری، اٹلی اور مصر کے حالات درج ہیں۔ جسے ان کی بہو میمونہ بیگم (بہو بیگم بھوپال نے) مرتب کیا۔ یہ سفر پردہ نشین عورت نے گھٹی گھٹی فضا میں لکھا ہے۔ سفر نامے کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں بھوپال سے روانگی سے لے کر لندن کے قیام کا ذکر ہے اور حصہ دوم میں جینوا، استنبول اور ھالیٹ، وینس فلارس اور قاھرہ کا ذکر ہے۔

آغاز میں لکھتی ہیں؛۔

''کسی سفر کے حالات لکھنا اور سفر نامہ کو مفید دلچسپ بنانا در اصل ایسے آدمی کا کام ہے جو کافی علم اور وسیع معلومات رکھتا ہو اور اس میں ایسی قابلیت موجود ہو کہ جو دلچسپ اور حیرت انگیز چیز اسکی نظر سے گزرے یا جو کچھ سنے اوسپر کامل غور کے بعد اس سے مفید تجربات و نتائج حاصل کر کے دلنشین الفاظ میں ادا کرے۔ مجھے نہایت سچائی کے ساتھ یہ اقرار ہے کہ مجھ میں نہ قابلیت ہے اور نہ میری معلومات وسیع ہیں۔'' (۱)

دراصل اردو سفر نامے کے ابتدائی دنوں میں جو سفر نامے بیگمات نے لکھے ہیں وہ زیادہ تر یا تو ڈائری کی صورت میں ہیں یا خطوط کی صورت میں۔ عام خواتین کے پاس نہ تو اتنے وسائل تھے کہ وہ سفر نامے تحریر کریں۔ اس لحاظ سے وسائل اور اجازت دونوں ان خواتین کے راستے میں حائل رہیں کہ جن کے پاس سوچنے والا دماغ، محسوس کرنے والا دل اور دیکھنے والی آنکھ تھی کہ اس دل دماغ پر کڑے پہرے تھے اور ان میں سے نکلنا اگر ناممکن نہ تو مشکل ضرور تھا۔ نواب سلطان جہاں لکھتی ہیں؛۔

''میں کیا اور میری قابلیت کیا جو ایسے عظیم سفر نامہ مرتب کروں لیکن سرکار عالیہ کی تعمیل ارشاد اور وعدہ امداد نے مجھ کو آمادہ کیا۔ میں نے اپنے

۱۔ سلطان جہاں بیگم سیاحت سلطانی مفید عام پریس آگرہ 1915 ص ۶

سفر کی یاداشتیں روزانہ لکھیں اور اب میں انکو مسلسل طور پر اپنے ہم عمروں
کے لیے بطور تحفہ پیش کرتی ہوں''۔ (۱)

اس سفرنامے کو جب ہم تفصیلاً پڑھتے ہیں تو ایک چیز کا احساس سارے سفرنامے پر چھایا رہتا ہے کہ اگرچہ اس سفرنامے میں متعدد جگہوں کا ذکر ہے بہت سی چیزوں کے بارے میں بتایا گیا ہے لیکن یہ سب تفصیل ایک طائرانہ نگاہ رکھنے والی ہے۔ ایسی نگاہ جو پختہ شعور کے ساتھ گہرا مشاہدہ اور عمیق مطالعہ کرے کہ ہر چیز پورے جزئیات کے ساتھ ہمارے سامنے اپنے بھرپور رنگوں کے ساتھ موجود ہو۔ اس سفرنامے میں کم کم نظر آتی ہے۔ لیکن اس محدود کینوس میں جو انہوں نے زندگی کا مطالعہ کیا ہے وہ قابل ذکر بھی ہے اور اس زمانے کے حساب سے قابل غور بھی مثلاً لکھتی ہیں۔

''پچھلے زمانہ میں جہاز دن میں آفتاب اور رات میں ستاروں کی مدد اور ہوا کی
موافقت سے سمندر کے کنارے کنارے چلا کرتے تھے لیکن اب لباب کی طاقت
اور قطب نما کی امداد سے سمندر کے بیچ میں سے گذر جاتے ہیں''۔ (۲)

اگر اس بیان کی روشنی میں ان کا مطالعہ دیکھا جائے تو انہوں نے چند لفظوں میں پوری تاریخ دہرادی ہے کہ جہاز نے اب تک چلنے کے لئے کیا کیا سفر کیا۔ لیکن کسی شہر کی سیر و سیاحت کے دوران اس شہر کی پوری تفصیلی عادات واطوار یا رہن سہن کے بارے میں ان کا قلم پوری جولانی طبع کے ساتھ رواں نہیں ہوتا کیونکہ ایک تو ان کا تعلق اعلی طبقے سے تھا۔ دوسرے انہوں نے جن لوگوں سے میل ملاقات کی تھی وہ بھی رئیس اور امراء کے طبقے سے تعلق رکھنے والے تھے۔ اس لیے عوام الناس کی دلچسپیاں ان کی زندگی کے مسائل بہر طور پر ان کی نظروں سے اوجھل رہے۔ جس کی وجہ سے یہ سفر اعلی سوسائٹی کی تصویر کشی ہے۔ وہ یہاں کی نہر سویز، کوہ سینا، حضرت نوح کی کشتی، کوہ آتش فشاں، موسم، گھر زراعت وغیرہ سب پر تبصرہ کرتی ہیں لیکن بالکل اس انداز میں جس طرح کوئی مسافر گاڑی میں سفر کرتا ہے تو وہ راستے میں جتنے مناظر آتے ہیں ان کو جذب نہیں کرتا بلکہ بیان کرتا ہے۔ تو بیگم صاحبہ بھی اس سفرنامے میں لارڈ منٹو اور لیڈی صاحبہ سے ملاقات کا حال بھی بیان کرتے ہوئے اشیا کی غیر دلچسپی سے سارے واقع کو تفصیل لکھتی ہیں کہ ہے۔ یہ تو ہونا ہی تھا کہ والئی بھوپال کو لارڈ منٹو ضرور ملیں۔

۱۔ سلطان جہاں بیگم بحوالہ سابقہ ص ۷

۲۔ سلطان جہاں بیگم بحوالہ سابقہ ص ۲۴

اسی سفرنامے میں جارج پنجم کے جشن تاج پوشی کا بھی ذکر ہے۔ جن میں محترمہ صاحبہ نے شرکت فرمائی اور یہ تقریباً ۲۲ جون ۱۹۱۱ میں منعقد ہوئی۔ لکھتی ہیں۔

''شہنشاہ معظم کی تاجپوشی کے بعد ملکہ کی تاج پوشی ہوئی۔ حضور ممدوحہ اپنی کرسی سے اٹھکر قربان گاہ کے پاس آئیں اور تعظیم ادا کی۔ ایک بڑا گون بدن پر تھا۔ چند خواتین کے جلو میں تھیں اسکا پچھلا حصہ پھیلا دیا اور چار معزز بیگمات نے ایک چھوٹا سا طلائی چترا اوپر لگایا۔ لاٹ پادری (آرچ بشپ) نے شاہی عصا اور ایک چھڑی جو ہاتھی دانت کی بنی ہوئی تھی۔ ملکہ معظّمہ کے ہاتھ میں دی اور بالوں میں لہرا کر تاج سر پر رکھ دیا۔ ملکہ معظّمہ کے تاج پہنتے ہی تمام امراء کی خواتین نے اپنے اپنے تاج پہن لئے۔'' (۱)

محترمہ نے اس سفرنامے میں چونکہ گرجا کی سیر کی اور ان کے قبرستان جانے کا بھی موقع ملا۔ اس لیے وہ جہاں جہاں گئیں ہیں وہاں کی حالت کا ذکر ضرور کرتی ہیں۔

تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اگرچہ سفرنامے کا مقصد یہی ہے کہ آپ حقائق واقعات یعنی صداقت کے ساتھ واقعات کی ترتیب کو جامعیت کے ساتھ بیان کر دیں۔ کیونکہ سفرنامہ نگار جزوی تماشا ہو کر اس علاقے کے عام طرز بود و باش کے علاوہ عادات و اطوار اور مذہبی نقطہ نظر کا بھی مطالعہ کرے تاکہ زندگی کے تمام رنگ قاری کے سامنے آسکیں۔ کیونکہ اس محرک کی وجہ سے ان جانے دیسوں کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن اس جائزے میں ایک بات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ زندگی اور فن ساتھ ساتھ چلیں تاکہ ادبی قدر و قیمت کا بھی یقین کیا جا سکے۔ اس لحاظ سے نواب سلطان بیگم جو ذکر کرتی ہیں وہ کامیاب ہے۔ مثلاً فرانس کی تفریح گاہوں، پیرس کے گرجا گھر یا قبرستان سب کا ذکر گہرے مشاہدے کے بعد کیا ہے جو کچھ یوں ہے۔

'' سرکار عالیہ نے کینڈرل نوٹرلڈیم یعنی پیرس کے عظیم الشان گرجا کی بھی سیر کی۔ اس کینڈرل میں حضرت عیسی کی تصویر معہ ۱۲ حواریوں کے ہے۔ انکے داہنے ہاتھ پر نیک اور بائیں ہاتھ پر بدآدمیوں کی تصویریں ہیں جس

۱۔ سلطان جہاں بیگم بحوالہ سابقہ ص ۸۷

سے مراد ہے کہ قیامت کے دن اسطرح کڑسے ہونگے''۔ (۲)

فرانس کے قبرستانوں اور تفریح گاہوں کا ذکر یوں کرتی ہیں :۔

'' قبرستان بھی نہایت سلیقہ اور صفائی کے ہیں ۔ سرو کے خوشنا درخت بکثرت
بیا نچاے جاتے ہیں جو دور سے دیکھنے میں باغ سرور نظر آتے ہیں ۔ قبرستان
بالعموم گرجا کے قریب ہوتے ہیں ۔ کوئی بڑا گاؤں ایسا نظر نہیں آیا جس میں
گرجا نہ ہو۔'' (۴)

اس سفرنامے میں بیگم صاحبہ عوام میں گھل مل کر کسی شہر کو نہیں دیکھا اور نہ کسی مقام کو کہ جہاں عوام الناس سے ملنے کا موقع ملا کیونکہ وہ جہاں بھی گئی ہیں ۔ خاص انتظام کے ساتھ اور خاص لوگوں میں خاص جگہوں اور خاص تقریبات میں حصہ لیا ہے اور ان کا مشاہدہ اونچے طبقے کے لوگوں اور ان کی رسم ورواج سے ہے۔

ہاں اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سابق والیان ریاسی کس ٹھاٹھ باٹھ سے سیر وسیاحت کرتے تھے اور کسطرح بے دریغ دولت خرچ کیا کرتے تھے ۔ جب کہ ہندوستان میں عوام بھوک اور بیماریوں کے ہاتھوں روز بروز مفلوک الحال ہورہے تھے۔

اس سفرنامے میں منظر نگاری بہت خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ خشکی کے پہاڑ ہوں یا سمندر کا نظارہ بیان میں یوں جان پڑ جاتی ہے کہ وہ نظارہ متحرک ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً

'' اب سمندر بالکل تالاب کی طرح ساکن ہے ۔ آفتاب آدھا ابر میں
چھپا ہوا ہے اور آدھا اپنی شعائیں سمندر پر ڈال رہا ہے ۔ سطح آب بالکل
فرش بلور کی طرح نظر آتا ہے اور اسکی باریک لہریں آب رواں اور اطلاس
کی سی کیفیت پیدا کر رہی ہیں ۔ پھر آفتاب کی جھلک جو ابر میں چھن چھن
کر آرہی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہلکے آسمانی رنگ کی کریب کا
دوپٹہ چنا ہوا ہے۔ جس پر زریں کرکری ہے۔'' (۳)

اگر بیگم صاحبہ کے سفرنامے کو فنی لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو ان کی نظر سطحی رہی ہے کیونکہ کچھ حالات کا انہوں نے ذاتی طور پر مشاہدہ تو کیا لیکن زیادہ تر حالات کا علم شنیدہ ہے اور بالکل وہی فرق ہمیں اس کے اسلوب بیان میں نظر آتا ہے جو کہ ایک سیاح کو دیکھنے میں اور گھر بیٹھ کر سفرنامہ لکھنے میں ہے۔

۱۔ سلطان جہاں بیگم ص ۴۴

۲۔ سلطان جہاں بیگم ص ۳۷

۳۔ ایضاً ۔ ص ۲۹

زمانہ تحصیل ۔(عطیہ بیگم رحیمن)

ہر ادیب کی اپنی ایک انفرادیت اور شخصیت ہوتی ہے۔ اس کا عکس اس کی تحریر میں نظر آتا ہے۔ جہاں وہ تخیل کی آمیزش سے صدیوں کے ماحول کو خوبصورت انداز میں ادبی اور تاریخی پس منظر میں جذب کر کے بیان کر دیتا ہے۔

سیاح کا کام یہ ہے کہ وہ بیدار آنکھ سے ماحول کو دیکھنے کی کاوش کرے اور اپنے تجربات کو سفر نامے میں یوں ڈھالے کہ حیرت بھی جنم لے اور خوشگوار تجربے کا بھی احساس ہو۔عطیہ بیگم کا یہ سفر نامہ دراصل حصول تعلیم کے لیے کیا گیا ہے۔ کیونکہ بیگم عطیہ کو گورنمنٹ کی طرف سے وظیفہ ملا اور وہ اسکالرشپ پر لندن گئیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہاں جا کر بیمار ہوگئیں اور انہوں نے وہاں سے خطوط لکھے۔ جو ان کی ہمشیرہ محترمہ زہرا بیگم نے خواتین کی دلچسپی کے لیے اخبار تہذیب نسواں یں یہ خطوط شائع کروائے اور بعد میں انہیں کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ یہ خطوط کی شکل میں لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں :۔

> ''زمانہ تحصیل اس بخت ناز کا سفر نامہ یورپ ہے۔ جس کے حسن سوزاں نے اردو ادب کی دو محترم شخصیات مولانا شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کو مسحور مسحور کیئے رکھا۔ عطیہ بیگم فیضی رحیمن ۱۹۰۴ء میں سرکاری وظیفے پر لندن گئی تھیں۔ ان کا مقصد تعلیم حاصل کرنا اور معلّمی کا پیشہ اختیار کرنا تھا لیکن تیرہ مہینوں کے دوران ان کی طبعیت ناساز ہوگئی اور وہ بے نیل مرام واپس آ گئیں۔ یہ سفر نامہ ان خطوط سے مرتب کیا گیا ہے''۔ (۱)

عطیہ صاحبہ جب اپنے خاندان سے جدا ہوئی ہیں تو فطرت انسانی کے مطابق وہ اداس و پریشان ہو جاتی ہیں کہ اتنی دور دیار غیر میں جا رہی ہیں اور یہی سوچ انہیں مسلسل پریشان کیئے رکھتی ہے

۱۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص ۱۹۹

لیکن میرا خیال ہے کہ حصول تعلیم قرآن اور حدیث دونوں میں واضح احکامات ہیں کہ علم حاصل کرنے کے لیے جاؤ۔ خواہ اس کے لیے دکھ اور تکالیف ہی کیوں نہ اٹھانی پڑے۔ لیکن بیگم عطیہ اس قدر کم ہمت ثابت ہوئی ہیں کہ جب لانچ چلنے لگتی ہے تو بے قابو ہو جاتی ہیں اور جب تک ان کے عزیز رشتے دار نظر آتے ہیں وہ آخر تک بلکہ نظروں سے اوجھل ہونے تک ان کو دیکھتی رہتی ہیں اور خود محسوس کرتی ہیں کہ یورپ جانا آسان نہیں ہے۔ اگر چہ ان کے گھر کے اور خاندان کے کچھ افراد ان کے ہمراہ تھے مثلاً ان کے بھائی جو ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے جا رہے تھے ان کا بھتیجا اور مسز جو جو ہندو سکالر تھیں۔ ایک اور مس ''داس'' جو بنگال کی سرزمین سے تعلق رکھتی تھیں لیکن اس کے باوجود بھی وہ اداس نظر آتی ہیں لیکن انسان کا دل اللہ تعالیٰ نے اسطرح بنایا ہے کہ آہستہ آہستہ وہ دنیاوی دھندوں اور محبتوں میں گم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ بیگم عطیہ بھی اب سمندر کے نظارے میں گم ہیں۔

> ''شب کو عرشے پر بیٹھنا بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً جس وقت چاندنی چھٹکی ہوئی ہوتی ہے۔ رات کی خوبصورتی میں ایسی دلچسپی ہو جاتی ہے کہ گھنٹوں دیکھا کرو جی نہیں بھرتا''۔ (۱)

بحری جہاز کے سفر میں ساتھ ساتھ جو جزیرے نظر آتے ہیں۔ بیگم عطیہ صاحبہ ان کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتی ہیں تا کہ قاری صرف پانی پانی اور صرف پانی اور سمندر سے گھبرا نہ جائیں اس لیے وہ اردگرد کے ماحول کو خوبصورتی سے بیان کرنے کے فن سے آشنا ہیں۔ لکھتی ہیں ;۔

> '' آج سویرے اٹلی کی سرحد دکھائی دینی شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ ایک طرف مسلسل اور دوسری طرف اٹلی، ہم آبنائے سینا سے گذر رہے ہیں۔ اب میں کسطرح بیان کروں۔ اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے کیسے کیسے نمونے پیدا کیے ہیں۔ وادیوں میں جا بجا گاؤں، باغات اور ندی نالے جو پہاڑوں کی چوٹیوں سے بہہ کر سمندر میں شریک ہو جاتے ہیں اور لب دریا سجے سجائے باغات اور مکانات نہایت خوشنما معلوم ہوتے ہیں''۔ (۲)

آخر کار یہ طویل سفر تمام ہوتا ہے اور محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ منزل مقصود تک پہنچتی ہیں تو اپنی مختلف

۱۔ عطیہ فیضی بیگم — زمانہ تحصیل — مفید عام پریس آگرہ ۱۹۲۲ — ص ۷
۲۔ عطیہ فیضی بیگم — زمانہ تحصیل — مفید عام پریس آگرہ ۱۹۲۲ — ص ۱۲

دوستوں کے پاس جاتی ہیں اوران کے حوالے سے وہاں کے رہن سہن سے آشنا ہوتی ہیں۔

''ان کا مکان فرنچ تصویروں سے سجا ہوا ہے۔ شاھنشاہ لوئی
کے زمانے کی وضع کے کاڑھے ہوئے باتصویر پردے اور سنہری
نقش گاری سے دیواریں اور چھت مزین تھیں اور پھول پتیوں پر
گویا دولت لٹا دی تھی۔ یہی نہیں بلکہ پھولوں میں جمع کر کے رکھی
تھی۔ زینے پر دوانچ لمبے ریشوں کی مخملی چڑھی ہوئی۔ اسطرح
سبھی نرالے ڈھنگ کا اسباب چنا تھا''۔(۱)

سردی گرمی کے موسموں کی شدت کو وہ ویسے نہیں بیان کرتی بلکہ جسطرح جسم و جاں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کا حال اپنی دوست مس داس کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔

''غریب مس داس بالکل سردی برداشت نہیں کرسکتی اور جس قدر
گرم کپڑے پہنتی ہے اس قدر سرد رہتی ہے۔ کبھی گھبرا کے
روتی ہے۔ کبھی بے خبر ہو جاتی ہے اور ہم وطنی کے لحاظ سے میں
بہت سمجھاتی ہوں اور بہت کچھ دلا سے دیتی ہوں۔''(۲)

برٹش میوزیم میں گئے تو وہاں کے کتب خانے کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''اس عجائب خانے میں کتب خانہ ہے۔ جہاں کتب بینی کی جگہ ہے۔ اس کمرے کی زمین موٹے ربڑ کی ہے۔ چلنے میں آواز نہ ہو۔ کمرہ مدور ہے۔ خاصے ہزار آدمی ایک وقت بیٹھ کے پڑھ سکتے ہیں۔ مگر بناوٹ کی خوبی کیا بیان کروں تمام چیزوں کی قطار اور چوگرد دیوار جس میں پچاس ساٹھ لاکھ کی کتابیں موجود ہیں۔ اگر کتب بینی کا شوق ہے تو میز کے قریب بیٹھے اور کتاب کے نام کی چٹھی ایک جگہ رکھ دیجیئے۔ وہ کمرے کے ایک حصے میں جاتی ہے اور چند دقیقوں میں اپنے آپ وہ مطلوبہ کتاب چلی آتی ہے۔ کوئی کتاب ایسی نہیں جو شائع ہوئی ہو اور وہاں موجود نہ ہو۔ ہر عالم اس جگہ کا خاصہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ کیا عظمت اس کمرے اور کیا

۱۔ عطیہ فیضی رحمن بحوالہ سابقہ ص ۲۵
۲۔ عطیہ فیضی رحمن بحوالہ سابقہ ص ۳۲

بند و بست کوئی انتہا ہے''۔(۱)

بیگم عطیہ یورپ میں مقیم تھی تو انہیں دیسی کھانا بہت یاد آتا تھا اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ اسے اپنے علاقے کے رہن سہن کے ساتھ ساتھ غذا بھی دیار غیر میں یاد آتی ہے اور جب کبھی وہاں اپنے علاقے کا کھانا میسر ہو جائے تو بہت مسرت ملتی ہے۔ بیگم عطیہ لکھتی ہیں کہ۔

''آج بہن صاحبہ وزیر النساء نے دعوت دی تھی۔ ازہر مجھے لینے کے لیے آیا تھا اور اس کے ساتھ میں گئی۔ ہاہا کھچڑی کے ساتھ دیسی کی کڑھی بنائی تھی اور دو تین قسم کے لذیذ اچار کس ذوق وشوق سے شکم سیر ہو کر کھایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ کون سی نعمت اس سارے کھانے سے بہتر ہو سکتی تھی''۔ (۲)

دراصل انسان لذت کام و دہن کے لیے ہی تمام دن کی مشقت برداشت کرتا ہے اور اگر یہ بھی من پسند نہ ہو تو پھر فائدہ کچھ نہیں ہے۔ اس لیے بیگم عطیہ کھانا دیکھ کر صرف خوش ہوئیں بلکہ خوب سیر ہو کر کھایا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بھی ادا کیا۔

اس کے بعد وہ ایک نائب کا ذکر کرتی ہیں۔ الف لیلہ کے سند باد کی بلا اس میں سات حصے ہیں جس کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

''تیسرا حصہ جہاز کی تباہی اس کے اثر سے ہم لوگ برف جیسے ٹھنڈے ہو گئے کیا کامل منظر ایک جہاز پر سند باد اور اس کے ساتھی سوار تھے۔ اس عرصے میں شدت طوفان برپا ہوا۔ آسمان کا سیاہ غضب ناک رنگ گھنگور گھٹا کا آنا جانا۔ سمندر میں جوش پیدا ہوئے ہوائے طلاطم سے جہاز کا بے طرح پلٹنا بجلی کا تڑپنا، بادل کا گرجنا، موج کی بھیانک آواز سنائی دینا اس درجے سچا اور حقیقی معلوم ہوتا تھا کہ دنگ رہ گئی اور اسی حالت میں جہاز کا تباہ ہو جانا بس ختم، تمام کمرہ تالیوں سے گویا ٹوٹ پڑا''۔(۳)

کتنے جاندار انداز میں ڈرامے کی ساری پیش کش کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ ارسطو کے اصول و قوانین کے مطابق ڈرامے میں Unity of Time and Place ضروری ہے۔ جو کہ یہاں نظر

۱۔ عطیہ فیضی رحمٰن بحوالہ سابقہ ص ۳۹۔۴۰
۲۔ عطیہ فیضی رحمٰن بحوالہ سابقہ ص ۲۴
۳۔ عطیہ فیضی رحمٰن بحوالہ سابقہ ص ۲۶

آتی ہے۔ اور منظر نگاری بھی بھرپور اور جاندار ہے۔

عطیہ فیضی اس سفر نامے میں علامہ اقبال سے ملاقات کا حال بھی درج کرتی ہیں لیکن اگر ان کا تعلق ڈاکٹر علامہ اقبال سے دیکھا جائے تو اس انداز میں نظر نہیں آتا جیسا کہ ہونا چاہیے تھا بلکہ بہت سرسری سا بیان ملتا ہے۔ جس میں کہیں بھی بہت یا داخلی کیفیت یا نرم گوشہ کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کی ملاقات جب علامہ اقبال کیمرج آئے تو وہاں ان کی ملاقات ہوتی ہے۔ لکھتی ہیں :۔

''مسٹر اقبال بھی تشریف رکھتے تھے۔ یہ صاحب نہایت درجے کے عالم فاضل فلسفی اور شاعر ہیں''۔(۱)

ان کا سفر نامہ نسائی رنگ میں بھی رنگا ہوا ہے اور کچھ کچھ قلم کا چٹخارا نہ ہونے کے باوجود زبان کا لطف بہت اچھا ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ عطیہ بیگم سب مزے دار چیزیں میز پر سجائے قاری کو دعوت عام دیتی ہیں کہ میں نے قلم کے ذریعے ان کے اندر ذائقہ ڈال دیا ہے۔ اب تم چشم تخیل سے لذت دہن محسوس کرو اور واقعی رنگا رنگ کھانے دیکھ کر نہ صرف ان کے ذوق خورد و نوش کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس مسرت کا بھی احساس ہوتا ہے جو عطیہ فیضی صاحبہ کو ہوئی مثلاً :۔

''لذیذ ہندی کھانا کھایا، بریانی اور شادی کباب، زردہ، فیرنی مرچ کا سالن وغیرہ وغیرہ اور کئی قسم کے اچار، پاپڑ اور سب چیزوں پر سبزی روپہلی ورق برابر لگے ہوئے تھے حتی کہ نان بھی موجود تھے۔ یہ سب دیکھ کر اور کھا کر عجیب اثر ہوا''۔(۲)

محترمہ عطیہ فیضی صاحبہ کی آخر میں طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہ کام نامکمل چھوڑ کر انڈیا واپس آ جاتی ہیں لیکن انہیں اس بات کا از حد افسوس ہے کہ وہ جس مقصد کے تحت یورپ کا سفر کر کے گئی اور جس شوق لگن اور جذبہ صادق کے ساتھ وہ وہاں سے علم حاصل کر کے اپنی مسلمان بہنوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتی تھی وہ خواب ان کا پورا نہ ہو سکا لیکن وہ گورنمنٹ کی بے حد احسان مند ہیں کہ وہ اگرچہ ادھوری تعلیم حاصل کر کے واپس آ گئی ہیں لیکن گورنمنٹ نے کوئی تاوان نہیں لیا۔ لکھتی ہیں۔

۱۔ عطیہ فیضی بیگم بحوالہ سابقہ ص ۶۶
۲۔ عطیہ فیضی بیگم بحوالہ سابقہ ص ۶۷

’’میں گورنمنٹ کی ممنون ہوں کہ کسی قسم کا معاوضہ مجھ سے طلب نہ کیا بلکہ نہایت ہمدردی ظاہر فرمائی۔ خیر جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے اس سے مجھے امید ہے کہ میں اپنی بہنوں کے کام آسکوں گی کہ جو میری آرزوئے دل ہے‘‘۔(۱)

بیگم عطیہ صاحبہ ۲۵ اگست کو علامہ اقبال کے ہمراہ ایک مسجد دیکھنے گئیں تو معلوم ہوا کہ مسجد کے بارے میں ان کے کیا خیالات ہیں لکھتی ہیں۔

’’ٹھیک دو بجے ہم سب لوگ سیر کے لیے چلے ایک جگہ مسجد نبوی بنی ہوئی ہے۔ .... اور ایک بات حیرت کی معلوم ہوئی کہ اللہ کا نام ہر جگہ موجود ہے۔ مگر پیغمبر آخرالزمان کا کسی جگہ پر نہیں تھا۔ نہ کسی جگہ مصلی بنا ہوا ہے، نہ منبر۔ مسٹر اقبال نے سب پڑھا اور کہنے لگے کہ صرف عمارت مشرقی ٹھاٹھ سے بنائی ہے مسجد کا پتہ معلوم نہیں ہوتا‘‘۔(۲)

اس سے ان کی تاریخی معلومات اور گہرے مشاہدے کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ ہر چیز کو اپنے ذاتی نقطہ نظر سے پرکھتی ہیں مثلاً پیرس کے بارے میں لکھتی ہیں ;۔

’’ انسان کی اولی العزمی اور عاقلانہ سوچ سمجھ کا بے مثل نمونہ ہے۔ یہ شہر دنیا میں اپنی خوبیوں کے لیے بے نظیر شمار کیا گیا ہے اور ہو تو عجیب ہی کیا ہے ایسا باقرینہ یا منتظم شہر کیونکر دوسرا ہو سکے؟ اتنا زرکثیر خرچ کر کے توڑ جوڑ کرنا اور بے قاعدہ جگہ کو باقاعدہ بنانا ان ہی لوگوں کا شرف حاصل۔‘‘ (۳)

عطیہ فیضی صاحبہ منظر نگاری بھی خوب کرتی ہیں اور ان کی منظر نگاری پڑھ کر کسی قسم کی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ کہتی ہیں ;۔

’’اف وہ رات کا سمندر بلا کا تھا کہ ایک دو مرتبہ تو میں گھبرا کر بے ساختہ کھڑکی کے پاس گئی۔ ایک سماں نظر آیا کہ عمر بھر نہ بھولوں گی کوئی ایک کامل

۱۔ بیگم عطیہ فیضی بحوالہ سابقہ ص ۸۲

۲۔ بیگم عطیہ فیضی بحوالہ سابقہ ص ۹۰

۳۔ بیگم عطیہ فیضی بحوالہ سابقہ ص ۸۶

ہوگا۔ اس قدر روشنی چھائی ہوئی کہ کیا کہوں۔ نیلا رنگ چوطرف مگر وہ کیا
نیلا سمندر مانند پگھلے ہوئے سیسے کے معلوم ہوتا تھا''۔ (۱)

اس لیے ان کے اسلوب بیان کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لفظوں کا استعمال بہت اچھے طریقے سے کرتی ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ کس لفظ کی کتنی قدر و قیمت ہے وہ نہ تو بے جا الفاظ کا استعمال کرتی ہیں کہ طوالت پکڑ لیں اور نہ اتنا مختصر کہ تشنگی کا احساس ہو۔ مجموعی طور پر زمانہ تحصیل، مناظر، الیشیاء، اشیاء، تاریخ، مساجد، ذاتی فضا، خود پسندی اور خودنگری کا سفرنامہ ہے جس کو انہوں نے تھوڑے سے افسوس کو شامل کر کے ایک لطف دیگر فراہم کیا ہے اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ڈائری کی تکنیک میں لکھا گیا یہ سفرنامہ خاصا خوبصورت سفرنامہ ہے۔

۱۔ بیگم عطیہ فیضی بحوالہ سابقہ ص ۷۹

سفر نامہ یورپ (صغری بیگم حیا)

ہر سفر نامہ اپنے اندر حیرتوں کے سمندر لیے ہوئے ہوتا ہے۔ کیونکہ عام معمول اور دسترس میں جو چیز ہے وہ اپنے اندر وہ غیر معمولی کشش نہیں رکھتی جو انجانی ان دیکھی خبروں اور پرائے دیس اور منزلوں میں ہوتی ہے۔ یہی جاننے کی خواہش قاری کو سفر پڑھنے پر مجبور کرتی ہے اور راغب بھی کرتی ہے۔

یورپ مسلمانوں کے لیے ترقی کا دروازہ رہا ہے کہ جہاں وہ کسی بھی مقصد کے لیے گئے ہوں۔ وہاں کی چکا چوند روشنیوں میں کھو گئے اور کچھ دیر کے لیے حیرتوں میں گم ہو گئے۔ نئے انداز، نئی ترقی، نئے رسم و رواج نے اگر ان کے اندر احساس کمتری بھی پیدا کیا تو ساتھ ساتھ ان کے ذہن کو کشادگی بھی بخشی اور یہی ان کے لیے کچھ کرنے کا باعث بنی۔ چونکہ زندگی خود سفر ہے اور انسان مسافر ہے۔ اس سفر میں اس کا مشاہدہ مطالعہ زندگی، کھٹن سفر کو بھی آسان کر دیتا ہے۔

سفر نامہ یورپ جنابہ صغری بیگم کا دو حصوں پر مشتمل سفر نامہ ہے۔ اس کی جلد اول میں حالات سفر، مارسیلز، پیرس اور لندن کا حال درج ہے۔ اور جلد دوم میں ہالینڈ، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور اٹلی کے ساتھ ساتھ واپسی کا سفر بھی درج ہے۔ دونوں سفر نامے ۵۰۸ صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان کا سفر نامہ ضخامت کے اعتبار سے خاصا طویل ہے۔

یہ سفر نامہ روزنامچے کی صورت میں تحریر کیا ہے۔ اس سفر نامے میں صغری صاحبہ نے اپنی اور سید ھمایوں مرزا بیرسٹرایٹ لا کی نجی مصروفیات کا بھی تذکرہ کیا ہے اور یورپ کے حالات پر کم روشنی ڈالی ہے۔

ابتدائی سفر ناموں میں اکثر یہ خامی نظر آئی ہے کہ لکھنے والوں نے ذات کو ملک کی نسبت ترجیح دی ہے۔ شاید اسی وجہ سے بھی صغرای حیا بیگم کا سفر نامہ زیادہ کامیاب سفر نامہ ہے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

''بیسویں صدی کے شدت اول میں یورپی ممالک کو دیکھنے کا رجحان نسبتاً زیادہ تھا۔ چنانچہ اس دور میں یورپ کے جو سفر نامے منظر عام پر آئے ان

میں صغریٰ بیگم حیا کا سفر نامہ یورپ دو حصوں میں شائع ہوا۔ صغریٰ بیگم حیا ''رسالہ نساء'' حیدر آباد دکن کی روشن خیال مدیرہ تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں متعدد سفر کئے اور ''سیر بہار و بنگالہ'' سیاحت ''جنوبی ہند اور'' سفر نامہ عراق'' جیسی کتابیں لکھیں لیکن شہرت زیادہ سفر نامہ یورپ کو حاصل ہوئی۔'' (۱)

صغریٰ بیگم کا سفر نامہ اگر نسوانی لحاظ سے اس کا تجزیہ کیا جائے تو جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ خود ستائشی شاید عورت کی سرشت میں شامل ہے۔ وہ ہر جگہ اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتی ہے۔ یہی خود ستائشی اس سفر نامے میں جا بجا نظر آتی ہے۔ سفر نامہ جس چیز کا تقاضا کرتا ہے اور قاری جس چیز کو پڑھنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ جس ملک کی تعریف و توصیف اپنے حوالے سے کر رہے ہیں۔ اس کی بجائے اس کی تہذیبی، تمدنی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی حوالوں سے اس کا تجزیہ کیا جائے تو ایک بہتر صورت حال پیدا ہو سکتی ہے اور ایک اچھا سفر نامہ ادب میں اضافے کا باعث بنتا ہے ورنہ آپ بیتی تو اپنے ملک میں بیٹھ کر زیادہ فراغت سے لکھی جا سکتی ہے۔

اس سفر نامے کا پہلا حصہ ۱۹۲۴ء کے لندن اور اس کے مقامات وہاں کی قابل دید اور تاریخی عمارت کے متعلق خاصی معلومات مہیا کرتا ہے۔ سفر نامے کے دوسرے حصے میں جرمنی، سوئٹزرلینڈ، فرانس، اٹلی اور واپسی کا سفر تفصیلاً درج ہے۔ اس حصے میں بھی ہر حصے میں ذات نمایاں ہے لیکن چونکہ بہت سے ممالک کا ذکر ہے۔ اس لیے اس میں نجی مصروفیات کے تذکرے قدرے اکتاہٹ کو کم کر دیتے ہیں۔

اس حصے میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ ملاقات ہے جو خلیفہ عبدالمجید ثانی سے مصنفہ اور اس کے خاوند نے ملاقات کی جو کہ سوئٹزرلینڈ کے مقام ''ٹراتے'' میں مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۲۴ء کو ہوئی۔ اس کے بارے میں وہ لکھتی ہیں۔

''عصر کے قریب گرینڈ ہوٹل ڈی ایلیس میں جب ہم لوگ داخل ہوئے تو منیجر ہوٹل نے کہا۔ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ ہم کو جب مسٹر کرامت بے اندر لے گئے تو حضرت کھڑے ہو گئے اور اپنا داہنا ہاتھ سینے پر رکھ کر گردن

۱۔ انور سدید بحوالہ سابقہ ص ۲۳۳

جھکائی۔ ہم لوگوں نے باری باری سے دست بوسی کی ہاتھ کا اشارہ کر کے
مجھ کو اس کرسی پر بٹھایا جو ان سامنے رکھی تھی۔ بیرسٹر صاحب بائیں جانب
والی کرسی پر بیٹھ گئے۔'' (۱)

اس ملاقات میں انہوں نے اس چیز کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے کہ خلیفہ عبدالمجید ثانی اس بات پر بہت خوش تھے کہ کوئی دور دراز کا سفر کر کے اس جلاوطنی میں ان سے ملنے کے لیے آیا ہے۔ اور اس کو وہ اپنے لیے باعث فخر تصور کرتے ہیں۔

ایک خاتون ہونے کے ناطے وہ نہ صرف نشت و برخاست اور ماحول کا جائزہ لیتی ہیں بلکہ حضرت ملکہ شاہنواز خانم کے لباس و انداز کا بھی تنقیدی جائزہ پیش کرتی ہیں۔ لکھتی ہیں۔

''حضرت ملکہ شاہنواز خانم تشریف لائیں ۔۔۔ ان کا لباس سفید اور ستر
پوش تھا۔ سر کے بال مطلق دکھائی نہیں دیتے تھے''۔ صرف چہرہ کھلا تھا۔
اصل اسلامی پردہ ملحوظ رکھتی ہیں۔ حضرت ملکہ نے مجھ سے جب فرمایا۔
میری جلادوطنی کے زمانے میں آپ ہی مسلم خاتون ہیں جو دور دراز کا سفر
اختیار کر کے ہم لوگوں سے ملنے ہمدردی کرنے آئیں ہیں۔ جس کی میں
دل سے قدر کرتی ہوں۔ تو حضرت ملکہ کے چشم مبارک سے آنسو ٹپک
پڑے۔'' (۲)

ڈاکٹر انور سدید صغری بیگم حیا کے سفرنامے کے بارے میں لکھتے ہیں ؛۔

''انہوں نے سفر کی جزائیات کو نسائی لطافت سے پیش کیا ہے۔ اس سفر
میں انہوں نے ہالینڈ، جرمنی، اٹلی اور فرانس کی سیاحت کی اور مغربی تمدن
اور مجلس زندگی کے قابل قدر نقوش سفرنامے میں جمع کیے۔ ان کے سفر
نامے کی خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو ہمیشہ مرکزی حیثیت دے کر اس کی
تزئین میں مصروف نظر آتی ہیں۔ جس سے نمود و نمائش کا زاویہ ابھر آتا
ہے۔ اس سفرنامے کی دوسری خامی نجی مصروفیات کا بے جا تذکرہ ہے۔
جس سے قاری کی دلچسپی کا زاویہ دب جاتا ہے''۔ (۳)

اگر ڈاکٹر انور سدید کی اس رائے کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات درست نظر آتی ہے کہ انہوں نے پورے سفرنامے میں کہیں بھی ذات کو فراموش نہیں کیا۔ حتی کہ خلیفہ صاحب کے لیے

۱۔ صغری بیگم حیا — سفرنامہ یورپ — گیلانی پریس لاہور ۱۹۵۳ — ص ۱۵۱
۲۔ صغری بیگم حیا — سفرنامہ یورپ — گیلانی پریس لاہور ۱۹۵۳ — ص ۱۵۲
۳۔ انور سدید — بحوالہ سابقہ — ص ۲۳۳

صغریٰ صاحب کی ذات قابل فخر تھی لیکن ایک بات جو ان کے سفر نامے میں ذات کے علاوہ ہے کہ وہ جذبات کی عکاسی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے محسوس کرتی ہیں اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ سے بھی واقف ہیں اور آج مسلمانوں کے زوال کے باعث ان کا دل نہ صرف خون کے آنسو روتا ہے بلکہ وہ دعا گو بھی ہیں کہ خدا دوبارہ وہ وقت لائے کہ عالم اسلام جن دشمنان اسلام میں گھرا ہوا ہے۔ وہ ان سے نجات حاصل کر سکیں کیونکہ ان کی دل کی کیفیت کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ وہ لکھتی ہیں:۔

> ''حضرت کا سن شریف ساٹھ کے لگ بھگ ہے مگر قوی نہایت مضبوط ہیں۔ اسلام کے سچے ہمدرد۔۔۔۔جس نے قصر یلدیز دولمہ باغچے میں پرورش پائی ہو اور کچھ عرصہ تک دنیائے اسلام میں امیر المومنین کہلایا وہ آج اس حالت میں نفس شماری کر رہا ہو' جس کے آباؤ اجداد نے چھ سو سال کی جبروت و جاہ و جلال سے حکومت کی ہو۔ یورپ و ایشیا میں شہنشاہی کی ہو۔ مسیحی یورپ کو ناکوں چنے چبوائے ہوں وہ آج دوسروں کا دست نگر ہو''۔ (۱)

اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ صغریٰ حیا بیگم نہ صرف ان بادشاہوں سے محبت کرتی ہیں بلکہ وہ تاریخ اسلام کے سنہری دور کو بھی یاد کرتی ہیں۔

نسوانی نقطہ نظر ان کے تجربے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسلوب بیان موقع محل کے مطابق ہے۔ جہاں شان و شوکت یا ذاتی تعریف و توصیف ہے۔ وہاں الفاظ کا بہاؤ زیادہ ہے۔ منظر نگاری بھی بہتر ہے۔ لیکن زیادہ تر زبان سادہ آسان اور رواں ہے جو کہ گراں نہیں گزرتی۔

۱۔ صغریٰ بیگم حیا بحوالہ سابقہ ص ۱۵۷۔

باب سوئم

۱۹۴۷ سے ۱۹۷۱ تک کے سفر نامے

۱) سلطانہ آصف فیضی : عروس نیل

۲) امیر خانم : میرا سفر

۳) بیگم تاج یسیٰن : آسٹریلیا کی جھلک

۴) مہر النساء : ہمارا سفر سرگزشت

۵) بیگم عطیہ وجیہ الدین : آسٹریلیا اور اس کے لوگ

۶) امت القدیر : کراچی سے چاٹ گام تک

۷) بیگم اختر ریاض الدین : سات سمندر پار

۸) نسرین بانو اکرم : الکویت

۹) قرۃ العین حیدر : جہاں دیگر

~~۱۰) امت القدیر : کراچی سے چاٹ گام تک~~

سلطانہ آصف فیضی (عروس نیل)

سفرنامے کے لیے پہلی منزل ادب کا مشاہدہ ہے۔ جس قدر مشاہدہ گہرا ہوگا۔ اتنی ہی تخلیق میں زندگی بھرپور انداز میں جلوہ گر ہوگی۔ کیونکہ غور وفکر اور مشاہدہ کائنات سے ہی نقطہ نظر کی تشکیل ہوتی ہے۔ مصر سے مسلمانوں کی قدیم وابستگی ہے۔

شاہان وقت آتے جاتے رہتے ہیں۔ تہذیبیں اور حکومتیں بدلتی رہتی ہیں لیکن یہ انبیاء کرام کا شہر ہے۔ بڑے بڑے اولیاء کی سرزمین کہ جہاں حضرت موسیٰؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر پیدا ہوئے اور اسی سرزمین میں فرعون جیسی ہستیاں بھی تھیں کہ جن پر اللہ تعالی کا عذاب نازل ہوا۔

ایک وقت تھا جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ تاریخ اور ادب دو الگ الگ راستے ہیں۔ تاریخ کے خشک اوراق کو کوئی پلٹا نہیں ہے لیکن ناول ہو یا سفرنامہ اس کو قاری دلچسپی سے پڑھ لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تاریخ اور ادب دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلے رہے ہیں۔

عروس نیل محترمہ سلطانہ آصف فیضی کا ۱۹۴۹ سے ۱۹۵۱ء تک کے مصر کا سفرنامہ ہے۔ سلطانہ صاحبہ کے خاوند دو سال تک مصر میں پاکستان کے سفیر رہے۔ اس دوران انہوں نے مصریوں کے رہن سہن کا مطالعہ کیا اور ان کے حالات و واقعات کو من وعن بیان کر دیا ہے۔ اردو ادب میں بہت سے سفرنامے ہیں جو ہمیں قاہرہ، اسکندریہ، اور اہرام مصر کی جھلکیاں تو دکھاتے ہیں مگر مکمل معلومات فراہم نہیں کرتے جو کسی تاریخی مقام یا خطے کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن سلطانہ آصف فیضی کا سفرنامہ اگرچہ بہت مکمل نہیں لیکن کافی حد تک (الاحقر) کی تعریف اور تصویر دکھاتا ہے۔ انہوں نے اس سفرنامے کے ذریعے ہمیں قدیم تہذیب سے بھی آشنائی کروائی ہے۔ یہاں قدیم مصری تہذیب کا بیش بہا خزانہ ملا تھا۔ جو نہ صرف ہمیں تاریخ سے روشناس کرواتا ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک قیمتی سرمایہ ہے۔

محترمہ سلطانہ آصف فیضی چونکہ مؤرخ نہیں تھیں۔ اس لیے نادانستہ طور پر ان سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں ہیں۔ خاص طور اسلام کے بارے معلومات محض سنی سنائی باتوں سے اخذ کی گئی ہیں اور خود ان کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

ڈاکٹر انور سدید اس سفرنامے کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

''سلطانہ آصف فیضی نے سرزمین مصر کو ایک سفارتی نمائندے کی بیگم کی حیثیت سے دیکھا۔ ۵۱۔۱۹۴۵ کے دوران مصر میں ان کے قیام نے انہیں ایسے مواقع فراہم کیئے کہ وہ اس ملک کے باشندوں میں گھل مل سکیں اور ان کا مشاہدہ قریب سے کر سکیں۔ چنانچہ ان کے سفرنامے ''عروس نیل'' میں اعلی درجے کی ضیافتوں، مجلسوں اور چائے کی دعوتوں کے علاوہ نسوانی تاثرات اور مجلسی زندگی کے نقوش زیادہ دستیاب ہیں''۔(۱)

بیگم سلطانہ آصف اس سفرنامے کے پیش لفظ میں لکھتی ہیں :۔

''اہل مصر بہت خلیق مہمان نواز و فیاض واقع ہوئے ہیں۔ بڑے مخلص اور دوست نواز ہیں۔ مصری ہندوستان کے صحیح معنوں میں دوست اور بہی خواہ ہیں۔ ان کے دلوں میں مہاتما گاندھی اور انکی تعلیم بہت پر عظمت ہے اور وہ پنڈت جواہر لال نہرو کو دنیا کا ایک بڑا لیڈر مانتے ہیں''۔ (۲)

مصر براعظم افریقہ میں واقع ہے۔ اس کا پرانا نام کنعان ہے۔ دریائے نیل مصر کا ہی نہیں بلکہ دنیا کا سب سے لمبا دریا ہے۔ یہ دریا جنوب سے شمال کی طرف بہتا ہے۔ مصر میں بنے ہوئے بت ابوالہول کا دھڑ شیر کا اور چہرہ انسان کا ہے۔ یہیں پر دنیا کا عظیم فاتح سکندر اعظم دفن ہے۔ یہیں پر مصر کے فرعون، ریمسس کی بیوی حضرت آسیہ نے حضرت موسی کی پرورش کی۔ محترمہ سلطانہ آصف دریائے نیل کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''آج سے ہزار برس پہلے سے جب خلفائے فاطمین کی حکومت یہاں قائم ہوئی تو ان کے فرمان سے زندہ کنواری دوشیزہ کی قربانی ممنوع کر دی گئی اور اس کی بجائے ایک کپڑے کی گڑیا (جس کو عربی میں عروسہ کہتے ہیں) سجا بنا کے بحر نیل کی نذر کی جانے لگی''۔ (۳)

دریائے نیل کی قربانی ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کو بڑے بڑے تاریخ دانوں نے رقم کیا ہے اور اس پر بغیر تحقیق کے لکھنا مشکل ہے۔ کیونکہ ادیب محقق کی دسترس سے نہیں بچ سکتا۔ اس بیان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا اسلام اور تاریخ کا مطالعہ سطحی سا ہے ورنہ انہیں یہ حقیت معلوم ہوتی حضرت عمرؓ کے عہد میں

۱۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص ۱۰

۲۔ سلطانہ آصف فیضی عروس نیل مکتبہ جامعہ دھلی ۱۹۵۳ ص ۱۶

۳۔ ایضاً ص ۶۰

حضرت عمرو بن العاس نے ۲۱ھ میں مصر فتح کیا تو یہ قربانی ممنوع کر دی گئی تھی۔ اس پر یہ معلومات ناقص ہیں۔
۲۲ اگست کو جب دریا کا پانی کم ہو جاتا ہے اور مصری خوشی سے جھوم رہے ہوتے ہیں کہ وہ صدیوں سے نیل کا جشن منا رہے تھے۔ اس کے بارے میں وہ کچھ یوں معلومات فراہم کرتی ہیں۔

"یہ وہ جشن تھا جس کو مصری بالحاظ مذہب مسلمان ہوں یا عیسائی ہر سال اسی جوش و خروش کے ساتھ مناتے رہے۔ جیسے ہزاروں سال قبل فرعونوں کے زمانے سے ان کے آباؤ اجداد مناتے رہے تھے کہتے ہیں دریائے نیل ہی مصر ہے جو چار ہزار سال قبل سے اسطرح بہتا ہوا چلا آیا ہے کہ اس کے بہاؤ سے مصر کے خشک صحرائی، دشت و میدان کھاد اور سیاہ مٹی سے بھر جاتے ہیں جو کھیتوں کو سرسبز و شاداب کرتا ہوا کنوؤں کو پانی سے لبریز کرتا ہوا بحیرہ روم میں جا گرتا ہے۔ یہ وہی دریائے نیل جس کی لمبائی، چوڑائی اور روانی دیکھ کر عرب اس کو بحر النیل کہتے ہیں"۔ (۱)

مصری ناچ کے بارے میں بھی ان کی معلومات کمتر ہیں۔ یا پھر شاید اس وجہ سے کہ انہوں نے ناچ دیکھا تو ضرور لیکن اس کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے اس کی تاریخ سے آشنائی حاصل نہیں کی۔

"مجھے مصری ناچ دیکھنے کا اتفاق بار بار ہوا ہے۔ اس کو جب دیکھا اور جہاں دیکھا بہت کم امتیاز نظر آیا۔ ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر پیٹ کے نیچے کے حصے کو موسیقی کی لے کے ساتھ ساتھ ہلانا، کبھی تیزی سے اور کبھی آہستگی سے کبھی اس کے ساتھ شانے بھی ہلانا یا جسم کے ہر حصے کو الگ الگ تھرکانا یہ مصری ناچ تھا۔ کبھی کبھی اس جنبش زیر شکم کے ساتھ دونوں ہاتھ اوپر اٹھالے جانا اور چٹکی بجائے جانا"۔ (۲)

مصری ناچ میں مصری رقاصہ کے اعضاء کی تعریف کرتے ہوئے وہ اس رقص کو عربی تہذیب اور الف لیلے کے زمانے سے ملاتی ہیں۔ ان کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں ہے کیونکہ مصری اور عربی تہذیب کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ مصری ناچ خالص مصر کی ایجاد ہے۔

سلطانہ صاحبہ نے مصریوں کے بارے کھانے میں، رقص حرکات و سکنات، زچگی کی حالت، زچہ کی تکلیف اور عورت ہونے کے ناطے زچہ کی تمام رسومات کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھتی ہیں۔ عورت خواہ کسی بھی

۱۔ سلطانہ آصف فیضی ص ۱۴۰
۲۔ ایضاً ص ۱۴۴

خطے میں ہو۔ شادی بیاہ کی رسومات ہوں یا کھانے کا ذکر وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔ لکھتی ہیں۔

''پلاؤ میں چلغوزے، کشمش، بادام، اخروٹ اور مختلف سوکھے میووں کو بھی ملا دیا تھا۔ اس قسم کے پلاؤ کو چرکیہ کہتے ہیں۔'' (۱)

مصر میں عام طور پر شادیاں والدین کی رضامندی ہی سے انجام پاتی ہیں اور ہر صحیح العقل باپ کی طرح ہر مصری باپ بھی اپنی لڑکی کے لئے دولت مند اور معزز، عہدے دار شوہر کی جستجو میں رہتا ہے۔ یہاں طلاق بھی عام ہے۔ خاص طور پر اس کی وجہ سلطانہ صاحبہ کے نزدیک یہ ہے کہ چونکہ یہاں لڑکی پہلی شادی والدین کے حکم پر راضی ہو کر کر لیتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد وہ اس سے طلاق لینے کی حق دار ہوتی ہے۔ وہ پہلے خاوند سے طلاق لے لیتی ہے اور دوسری شادی نہ صرف اپنی مرضی سے بلکہ اپنے دلی جذبات کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کرتی ہے۔ اس کے بارے میں وہ لکھتی ہیں۔

'' اس رسم کو مصری زفتے کہتے ہیں۔ جس میں باقاعدہ عزیزوں، دوستوں اور حاضرین کی گواہی بھری نظروں کے سامنے دلہن، دولہا کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ اس رسم کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ نکاح سے زیادہ اس پر خرچ کیا جاتا ہے۔'' (۲)

زیورات عورت کی ازلی وابدی کمزوری ہیں۔ جس کے پاس موجود ہیں۔ وہ مزید کی خواہش رکھتی ہے۔ اور جس کے پاس بالکل نہیں وہ پانے کی آرزومند ہے۔ عورت عمر کے کسی حصے میں ہو زیورات میں اسے بڑی کشش محسوس ہوتی ہے یا شاید وہ اسے اپنی زندگی میں اپنے لیے تحفظ کی ضمانت سمجھتی ہے۔ مصری زیورات کے بارے میں لکھتی ہیں۔

'' اکثر نوجوان لڑکیوں کی کٹی ہوئی زلفیں گردن پر بل کھاتے زیب دوش بنی ہوئی ہیں۔ سب کے جواہرات مغربی قسم کے ہیں۔ فراکوں میں بروچ لگے ہوئے ہیں۔ اور ہاتھ کی پہنچیاں رات کی روشنی میں دور سے ایسی چمک رہی ہیں کہ اصل اور نقل کا فرق مشکل ہو گیا۔ گلے میں بے شمار موتی کی مالائیں ہیں۔ چہرہ رنگ دغازے سے خوب چمکایا گیا ہے اور ہونٹوں پر اس قدر سرخی نظر آ رہی ہے کہ دور سے ماں اور بیٹی میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔''

(۳)

سفرنامے میں سلطانہ صاحبہ نے ایک عربی روزنامچے کے حوالے سے رمضان کی تعظیم وتکریم کا ذکر کیا ہے جو کہ ناقابل یقین نہیں ہے لیکن حوالے کے طور پر درج ہے۔

۱۔ سلطانہ آصف فیضی ص ۳۶۴

۲۔ ایضاً ص ۸۶

۳۔ ایضاً ص ۷۴

''قبطی صاحب نے جواب میں اپنے کوٹ کی جیب سے ایک عربی روزنامہ نکال کر سامنے کھول کر بچھالیا اور صفحہ پلٹ کے فرمایا دیکھو یہاں رمضان المبارک کا پروگرام ہے۔ اور آج رات کو تحیتہ کاریوکا رقص ہونے والا ہے۔ تحیتے کاریوکا'' قاہرہ کی پہلے نمبر کی رقاصہ سمجھی جاتی ہے''۔ (۱)

مسلمان خواہ کسی بھی درجے کا ہو۔ اعلیٰ ترین یا گھٹیا ترین، رزیل، کمتر یا اشراف میں ہے۔ رمضان المبارک کے تقدس کو یوں پامال نہیں کرتا جسطرح سے اس میں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ مقدس راتیں اگر عبادت گاہوں میں نہیں تو رقص گاہوں میں بھی نہیں گزاری جاتیں۔

لیکن ان غلطیوں کے ساتھ ساتھ مصریوں کے بارے میں چند اہم اور معلوماتی تصویریں اس سفرنامے کو خوبصورت بھی بناتی ہیں۔ جوانی کہیں بھی اور کسی بھی خطے کی ہو قابل غور اور قابل کشش ہوتی ہے اور پھر مصریوں کا حسن تو ہمیشہ سے مشہور و معروف ہے اور ان لڑکیوں کا جوبن دیکھ کر کون کافر ہے جس کے دل میں ہلچل نہ مچ جائے۔ سلطانہ صاحبہ بڑی خوبصورتی سے اس منظر کو بیان کرتی ہیں۔

'' دیہات کی نوجوان لڑکیاں جن کی جوانی ان کے موٹے موٹے فراکوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ آنکھوں میں خوب پیا کاجل ڈالے، کانوں میں موٹی چاندی کی بالیاں لٹکائے اور گلے میں رنگین موتی کی مالائیں ڈالے درختوں کے سائے میں بیٹھی شام کی بہار کا تماشا دیکھ رہی ہیں'' (۲)

اس سفرنامے میں انہوں نے مصری کے کچھ الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ اپنی خادماؤں کی تفصیل جب بیان کرتی ہیں تو وہیں پر وہ کچھ لفظ یا وقتاً فوقتاً کچھ لفظ لکھتی ہیں۔ مثلاً خادمہ کے لیے ''کمریرا'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ''سعاد'' ان کا دل پسند نام ہے۔ ''کفتان'' لمبے چوغے کو کہتے ہیں اور ''مبروک'' مبارک ہو کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کی زندگی کی بھی بڑی مکمل اور بھرپور تصویر کشی کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں۔ مصر میں بھی کھیتوں میں روئی توڑنا، اناج کاشت کرنا، صحرا میں اونٹ چرانا، باغوں میں پھول جمع کرنا، دریا پر کشتی کھینا یہ سب کام عورتوں کے ہیں۔

مصری اپنے عقیدوں اور رسم و رواج کے بارے میں بہت سخت اور روایت پرست ہیں۔ اور ان میں

۱۔ سلطانہ آصف فیضی، بحوالہ سابقہ ص ۱۱۱

۲۔ ایضاً بحوالہ سابقہ ص ۵۲

باوجود ترقی کے کسی قسم کی تبدیلی گوارہ نہیں کرتے۔ سلطانہ صاحبہ لکھتی ہیں۔

''مصری عقیدہ تھا کہ انسان کا دل ایک مرتبان ہے جو غلط بیانی سے بتدریج بھاری ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر صداقت سے روح ان سب دروازوں سے گذر جانے میں کامیاب ہوگئی تو وہ اخیر میں مجلس اراکین انصاف کے حضور پہنچ جائے گی۔ جہاں عدل وانصاف کے دیوتاؤں کو ایک قطار میں متمکن پائے گی''۔ (۱)

اسطرح سے الاحقر کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''یہاں پر فرعونوں کا لاتعداد خزانہ اور صدیوں کی تہذیب زیرزمین دفن یا غاروں میں پوشیدہ ہے۔ جس کی طرف غیر ملکی سائنس دانوں اور دولت مند امریکی سیاحوں نے للچائی ہوئی نظریں بار بار اٹھتی ہیں اگرچہ یہاں کی بہت سی نادراشیاء غیر ملکی عجائبات خانوں کی زیب وزینت بن چکی ہیں پھر بھی نہ معلوم کس قدر چیزیں قعر گمنامی میں زیرزمین پڑی ہوئی ہیں جس کا پتا یا وجود کافی جستجو وتلاش کے اب تک کوئی نہ پاسکا۔ (۲)

اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطانہ صاحبہ کا مشاہدہ بہت گہرا ہے لیکن وسعت مطالعہ کے نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے تاریخی غلطیاں کی ہیں۔ اگر وہ سفرنامہ لکھنے سے پہلے تاریخ سے واقفیت حاصل کرلیتیں تو ان کا سفرنامہ عدیم المثال سفرناموں میں شامل ہوتا ہے۔

۱۔ سلطانہ فیضی بحوالہ سابقہ ص ۱۸۵

۲۔ ایضاً بحوالہ سابقہ ص ۱۵۶

امیر خانم (میرا سفر)

زندگی کی رنگارنگی کی طرح ہر سفر نامہ نگار مخصوص رجحانات اور ایک مخصوص نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ فکری زندگی، فکری تازگی اور ادبی رکھ رکھاؤ بھی رکھتا ہے۔ امیر خانم کا سفر نامہ ''میرا سفر'' میں انگلستان، بیلجیئم، مغربی جرمنی، لکسم برگ، سوئٹزر لینڈ اور مصر و حجاز مقدس کا سفر درج ہے۔ یہ بہت طویل سفر نامہ ہے اور کل ۷۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ امیر خانم اپنا یہ سفر نامہ ''ان مسافروں کے نام کیا ہے جو کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ امیر خانم ۱۹۴۵ء میں تقریباً ۵۰ برس کی عمر میں علاج کی غرض اور کچھ سیر و تفریح کے نقطہ نظر سے انگلستان گئیں۔ جہاں پر ان کے دو صاحب زادے مقیم تھے۔ ایک صاحب زادے ملازمت کرتے تھے اور دوسرے اڈنبرا میں ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے مقیم تھے۔ امیر خانم بہت پڑھی لکھی خاتون نہیں جب وہ بیٹے کے ہاں پہنچی ہیں تو وہ وہاں سے کہیں اور جا چکا ہے وہ بہت مشکل سے پولیس والوں کی مدد سے اور ایک امام مسجد کی مدد سے ان کو تلاش کرتی ہیں۔

یہاں قاری ایک لمحے کے لیے حیرت میں گم ہو جاتا ہے کہ دیارِ غیر کا سفر اور وہ بھی بیماری کی حالت میں پھر بغیر اطلاع کے اور ان کے صاحبزادے بھی بغیر اطلاع کے ایک مقام سے دوسرے مقام پر ہجرت فرماتے ہیں۔ یہ چیز تھوڑی سی بےلطفی پیدا کر دیتی ہے لیکن اگر سفر نامے کا تجزیہ کیا جائے تو جو چیز اس سفر نامے کو متاثر کن بناتی ہے وہ ان کا گہرا مشاہدہ ہے۔ ان کا نقطہ نظر نسوانی ہے لیکن وہ ہر اچھی بڑی چیز کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ امیر خانم غیر ملکی زبان نہیں جانتی تھی۔ اس لیے جگہ جگہ انہیں دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ فرانسیسیوں کے بارے میں لکھتی ہیں۔

> ''فرانسیسی پانی کی طرح شراب یا بیئر پی رہے تھے۔ ہمارے برابر میں جو کمروں کی کھڑکیاں تھیں۔ اس سے اندر کے مسافر کھانا کھاتے نظر آ رہے تھے۔ بس پانی کی جگہ شراب اور شراب کی جگہ بھی شراب تھی''۔ (۱)

امیر خانم ایک خاتون ہونے کے ناطے گھر گرہستی کا کے کاموں کا تجربہ بھی کرتی ہیں۔ یہ کام چونکہ خالصتاً عورتوں کا ہے۔ اس لیے وہ ایسی کھانے پکانے کی چیزوں کا اور گیس وغیرہ کا ذکر کرتی ہیں۔

۱۔ امیر خانم میرا سفر اشرف پریس لاہور ۱۹۵۵ ص ۲

''یہاں کے باورچی خانے بہت اچھے ہیں۔ گیس یا بجلی کے ذریعے کھانا پکایا جاتا ہے اور برتن دھونے کو گرم اور ٹھنڈے پانی کا انتظام بہت اچھا ہے پہلے دھو کر ساتھ ہی ایک ہی چیز پر برتن اوندھے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ وہ میز یا سنگ مرمر کی ہوتی ہے یا تام چینی کی ہوتی ہے۔'' (۱)

امیر خانم نے پوری جزئیات سمیت برتنوں کی صفائی کا حال بیان کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ عورتوں کے زیورات کو بھی خاصی دلچسپی سے دیکھتی ہیں اور پاکستانی زیورات سے مقابلہ کرتی ہیں بلکہ ساتھ تصویر بھی بناتی ہے۔

''میں نے دیکھا ایک عورت نے کان میں ایسے بندے پہن رکھے تھے جن کا پہلے ہمارے ملک میں رواج تھا بالی کے اندر بالی جیسے جالی کی چار بالیوں والی بالیاں پہنے بال اونچے اونچے سیٹ کیے ہوئے۔'' (۲)

مرد حضرات سیاح ہوں بھی تو وہ عورت کے قوس قزح جیسے رنگوں کا تجزیہ یوں نہیں کر سکتے۔ معیشت کو اگر عورت کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وہاں صرف ایک چیز نظر آئے گی کہ گھر کے بچوں کے کپڑے کیسے تھے اور گھر کے بھاگ کا اندازہ اس سے ہی لگا لیا جاتا ہے۔ امیر خانم بھی لکھتی ہیں۔

''میں بازار میں دیکھ رہی تھی کوئی ننگا نہ تھا نہ کوئی میلا۔ ننگا رہ کر تو یہاں کوئی جی ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ ٹھنڈا دیس ہے لیکن سب اجلے ہشاش بشاش چہرے، خوب بنے سجے مرد بھی تھے، عورتیں بھی، بچے بھی، بوڑھے بھی سب توانا، تندرست اور چاک و چوبند''۔ (۳)

ہماری پاکستانی قوم میں ایک عادت ہے کہ وہ جب بھی کہیں باہر کے ممالک میں جاتے ہیں تو وہاں کی ترقی کو عجیب نظروں دے دیکھتے ہیں کہ خود بخود احساس ہوتی ہے کہ یہ قوم ابھی ذہنی و سائنسی لحاظ سے بہت پسماندہ ہے۔ مثلاً امیر خانم جب انڈر گراؤنڈ ٹرین کا نظام لندن میں دیکھتی ہیں تو یوں اظہار کرتی ہیں۔

''انڈر گراؤنڈ میرے لیے ایک نئی چیز تھی۔ وہ چکر دار سیڑھیاں پر سیڑھی پر سیڑھی کھڑے ہو جایئے۔ وہ سیڑھی کا خود اوپر نیچے اترنا اور پھر زمین میں غائب ہوتے

۱۔ امیر خانم بحوالہ سابقہ ص ۸۲۔
۲۔ ایضاً " ص ۱۲۸۔
۳۔ ایضاً " ص ۱۴۱۔

جانا۔انسان خود دیکھے تو ہی سمجھ آ سکتی ہے۔ بس بہت نیچے پہنچ کر اسٹیشن بھی بنے
ہوئے اور زمین کے نیچے ریلوں کا جال''۔ (۱)

اس سفرنامے میں امیر خانم نے مذہبی جذبے کے تحت بھی ان کے مذہبی مزاج سے آشنائی کروائی ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ مذہب سے عقیدت واحترام ہر انسان پر لازم ہے اور وہ بتاتی ہیں کہ یہاں پر گرجوں کی بہتات سے گرجوں کی مخروطی چوٹیاں دور دور سے نظر آتی ہیں جو بہت خوبصورت ہیں اور جو دور سے ہندوؤں کے مندر سے مشابہت رکھتے ہیں اور فرش سے لے کر چوٹیوں تک جو کالا رنگ نظر آتا ہے وہ اس کے لمبے لمبے مینار ہیں کہ جو اس کی عظمت کے عکاس ہیں کہ اس میں بھی عبادت کرنے والے اپنے دل کی سچی لگن کے ساتھ کسی نہ کسی طریقے سے اللہ کے حضور حاضر ہو جاتے ہیں۔

محترم جناب انور سدید صاحب اس سفرنامے کے بارے میں لکھتے ہیں؛۔

'' امیر خانم نے ''میرا سفر'' میں یورپ کے سفر کی جزئیات کو اسطرح سمیٹا ہے جیسے نرم اون سے گرہ دار سوئیٹر بن رہی ہوں۔ ان کی نگہ واقعہ شناس نے معمولی سے معمولی بات کو بھی ایک اہم واقعے کی طرح پیش کیا ہے۔ اور قاری کو اپنا ہم سفر بنانے کی کاوش کی ہے جو اس سفرنامے کی خوبی ہے'' (۲)

امیر خانم نے قیام انگلستان کے دوران چند مختصر سفر کیئے۔مثلاً انہوں نے لندن، اڈنبرا کے علاوہ چند ٹاؤن اور شہر بھی دیکھے۔ جن میں لکسم برگ اور سوئٹزرلینڈ کا مختصر سفر ہے۔

اس سفرنامے کے اختتام پر ایک مصری گھرانے میں قیام کیا۔ انہوں نے نہ صرف ان کو واقعات کے روپ میں پیش کیا ہے بلکہ اس منظر کو متحرک کر کے تصویر پورے رنگوں سمیت زندہ کر دی ہے اور قاری امیر خانم کا ہمسفر بن جاتا ہے۔مثلاً ایک جگہ بس کے انتظار کا حال کچھ یوں لکھتی ہیں۔

'' ہم اس دروازے کے سامنے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اس طرح ہر دروازے کے سامنے قطاریں بنی شروع ہو گئیں۔چشم زدن میں سب مخلوق جو تھوڑی دیر بازاروں میں پھیلی ہوئی تھی سمٹ کر یہاں پہنچتی جا رہی تھی۔ اب بسیں آنا شروع ہو گئیں۔جس کی بس آتی وہ قطار آہستہ آہستہ بس میں سوار ہو جاتی۔یا یوں سمجھیے کہ

۱۔ امیر خانم بحوالہ سابقہ ص ۲۱۸
۲۔ انور سدید بحوالہ سابقہ ص ۳۱۸

بس نکل جاتی۔ اسطرح جب ہمارا نمبر آیا تو ہم بھی بس میں داخل ہو گئے۔ جب
اطمینان سے بیٹھ گئے تو دیکھا اس بس کی کنڈ یکٹر ایک عورت تھی'' (۱)

دراصل ہماری عورت جو محتاج ہے۔ قدم قدم پر ایک مرد کے سہارے کی جبکہ قلم کو پکڑنے سے پہلے بھی وہ محتاج ہے کہ مرد سے اجازت لے تو وہاں کی عورت کو اسطرح کام کرتے دیکھ کر نہ صرف پریشان ہو جاتی ہے بلکہ الٹا اس کو کوستی ہے کہ مغرب کی عورت نے کیوں اپنے آپ کو ہلکان کیا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو تقابلی جائزہ کرنا پڑتا ہے اور وہ دیارِ غیر میں بھی آرام و آسائش ہونے کے باوجود سکون کو سکون سے نہیں گذارتی کہ شاید ازلی و ابدی بے بسی اسے بے چین کیئے رکھتی ہے جو اسے نہ مرنے دیتی ہے اور نہ جینے دیتی ہے اور جب کہیں ایسا ہونے لگے تو وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتی۔

امیر خانم یہاں کے اشخاص کے باطن میں ڈوب کر سفر کا حال لکھتی ہیں۔ اور ان کی صداقت بیان نے ان کے سفرنامے کو پر اثر بنا دیا ہے۔ وہ ظاہری آرائشی کا خیال بھی نہیں رکھتی ہیں بلکہ خیالات کا بہاؤ جسطرح ان کے سامنے آتا جاتا ہے وہ اس کو بیان کرتی چلی جاتی ہیں بلکہ امیر خانم کے ہاں حقیقت کو صداقت کے رنگ میں بیان کرنے کا خوبصورت انداز ملتا ہے۔ کرسمس کے بارے میں وہ لکھتی ہیں۔

''یہاں کرسمس میں دکانوں کو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جس
پہاڑی پر کاسل بنا ہوا ہے۔ اس کی ڈھلان کے اوپر ایک بہت بڑا ٹری (درخت)
کھڑا کیا گیا جو رنگ رنگ کی بتیوں سے جگمگ جگمگ رہا تھا۔'' (۲)

لندن میں مقیم ان کا بیٹا جب واپس چلا جاتا ہے وہ کچھ تو اپنے بھروسے پر اور دوسرا گائیڈ بک کی مدد سے لندن دیکھتی ہیں۔ اس ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بجائے خود عجائب گھر سے یہاں ہر ملک کے انسان آپ کو نظر آئیں گے۔ وہ اظہار کرتی ہیں کہ میں یہاں کی ہر چیز کے بارے میں لکھنا چاہتی ہوں لیکن میں اسے چھپوا نہیں سکتی اس لیے کم چیزوں کا ذکر کرتی ہوں۔ وہ یہاں کے چڑیا گھروں کے جانوروں سے لیکر پرندوں کی اقسام اور سانپوں کے رنگ تک بڑی تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہاں کی زندگی کا کوئی گوشہ اپنی نظر سے اوجھل نہیں رہنے دینا چاہتیں۔ تاریخ کے اوراق ہوں یا یہاں کی پرانی عمارتیں وہ اپنی دلچسپی کے ساتھ دوسروں کے اندر بھی دلچسپی پیدا کر دیتی ہیں۔

۱۔ امیر خانم بحوالہ سابقہ ص ۶۳
۲۔ ایضاً ص ۲۴۴

''آسٹریا کی پرانی عمارتیں پتھروں کی عربوں کی طرز تعمیر لیکن پھر انہیں بنیادوں پر اوپر شہر کو نئے طریقے کا بنا دیا ہوا ہے۔ آسٹریا کا شہر نہایت نیچے سے مکبوتی کی چھتیں کیونکہ بنیادیں مضبوط تھیں اس پر ہی عمارتوں کو اونچا سے اونچا لے گئے''۔ (۱)

سفر کے آخر میں وہ جدہ آتی ہیں۔ یہاں انہوں نے عمرہ کیا اور روضہؐ پاک کی زیارت کی لیکن اس دوران انہیں ایک مسئلے سے دوچار ہونا پڑا۔ جس کا حال وہ بڑی تفصیل سے لکھتی ہیں کہ ویزے کا عرصہ ختم ہو جاتا ہے۔آخر کار ایمبیسی والے بڑی مشکل سے اجازت دیتے ہیں اور وہ جدہ روانہ ہوتی ہیں۔ جہاں وہ تمام مناسک حج طے کرتی ہیں لیکن دینی علوم پر بھی ان کی دسترس عام سی ہے۔ عربی میں دلچسپی اور شغف تو ہے لیکن اسلام کی تعلیمات کے بارے میں ان کا علم صرف سنی سنائی باتوں پر زیادہ ہے۔امیر خانم یہاں بہت سی بدعتوں کا ذکر کرتی ہیں اور وہ نہ صرف ان کے خلاف چلتی ہیں بلکہ ان کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتی ہیں۔

لیکن اس ضمن میں وہ یہ فراموش کر دیتی ہیں کہ کونسی بات درست ہے اور کونسی غلط ہے۔مثلاً وہ خانہ کعبہ کے غلاف کو ناجائز قرار دیتی ہیں اور وہ حجر اسود جو جنت کا پتھر ہے جس کو حضورؐ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے نصب فرمایا۔ اس کو چومنا گناہ اور بت پرستی کے مترادف قرار دیتی ہیں۔ یہ وہ علم ہے کہ جہاں اپنے آباؤ اجداد کے علم اور ان کی توہم پرستی کی بجائے خود محقق بننا پڑتا ہے۔

امیر خانم کے والد جناب علی احمد خان جالندھری نے قرآن پاک کی تفسیر لکھی تھی اور ان کی بہن نے ایک کتاب (Peace) ''امن'' کے نام لکھی اس ناطے وہ بھی اپنے آپ کو عالم گھرانے کا ایک اہم فرد مانتی ہیں۔ بلکہ وہ یہاں تک اپنے اوپر فخر کرتی ہیں کہ لکھتی ہیں کہ جو کچھ میں لکھ رہی ہوں اس کے مستند ہونے میں شک نہیں۔

لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس حجر اسود کو خود حضور پاکؐ نے چوما تھا جو ان کی امت کے لیے سنت رسولؐ بن گیا۔ اسطرح ان کی زندگی میں ہی حج بیت اللہ کے موقع پر 10ھ کو چادروں سے غلاف تیار کیا گیا اور اس پر چڑھایا گیا تو یہ بھی سنت رسولؐ قرار پایا۔اس لیے ان کی یہ بات بالکل غلط ہے بلکہ باعث گناہ بھی ہے۔لیکن وہ بالکل اسلامی تعلیمات کو فراموش نہیں کرتیں بلکہ وہ مساوات کا درس بہت زیادہ دیتی ہیں اور اس چیز کی قائل نظر آتی ہیں کہ اسلام میں کسی گورے کو کالے پر اور امیر کو غریب پر فضیلت حاصل نہیں ہے۔لکھتی ہیں۔

۱۔ امیر خانم بحوالہ سابقہ ص ۴۸۵

''اے بارالٰہی تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا میرے اس گھر کو پاک صاف کر، نمازیوں کے لیے جو کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا سجدہ کر کے یا رکوع کر کے نماز پڑھتے ہیں یعنی ان سب طریقوں میں سے کوئی بھی طریقہ ایک خدا کے سامنے کھڑے ہو کر سینے پر ہاتھ باندھ کر یا کھلے چھوڑ کر خواہ گھٹنوں پر جھک کر خواہ سجدہ میں گر کر خواہ بیٹھ کر ان کے طواف کے لے اس گھر کا دروازہ کھلا رکھ۔ اے خدا آج تیرے گھر کا اصل دروازہ بند کر دیا ہوا اور اونچا کر دیا ہوا ہے۔ انسانی پہنچ سے باہر اس کی سونے کی سیڑھی اس دن لگائی جاتی ہے جس دن بادشاہ تشریف لاتے ہیں۔ حالانکہ میرے نزدیک شاہ و گدا ایک ہیں۔'' (۱)

یہاں انہوں نے دلی جذبات کی عکاسی اسطرح کی ہے کہ ہر انسان محسوس کرتا ہے کہ واقعی یہ دروازہ کبھی بند نہیں ہونا چاہیے اور ہم بھی امیر خانم جیسے دکھ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مکہ، مدینہ اور جدہ سے واپس آتے ہوئے فلسفہ زندگی کو کچھ یوں لکھتی ہیں۔

''جب انسان بن گیا تو رات کا خاتمہ دن کا آغاز ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا صبح صادق کا سہانا وقت، نہ رات سیاہی نہ ہی دھوپ جیسی۔ تیز روشنی انسان دو چیزوں کا مجموعہ حیوانیت خاتمہ کی حد پر اور انسانیت کا ابھی پہلا قدم بس دونوں مفارقت کے قریب لیکن ابھی جدا نہیں ہوئیں۔ ابھی دونوں ملی ہوئی ہیں۔'' (۲)

آخر میں انہوں نے پسندیدہ نظمیں بھی شامل کی ہیں۔

ان عقائد و نظریات کے علاوہ جو چیز اس سفرنامے کو مقبول بناتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ سفرنامہ نہ صرف پندرہ ماہ کی آپ بیتی ہے بلکہ ان کا مشاہدہ ہے کہ جو جیسا نظر آتا ہے۔ اسے من و عن بیان کرنے کی صلاحیت نے بھی اسے دلچسپ بنا دیا ہے۔ کیونکہ ان کا اسلوب خوبصورت ہے۔ اور منظر میں اور بیان میں رنگ آمیزی کرنا جانتی ہیں وہ جانتی ہیں کہ بہت سی چیزوں میں سے کس منظر کو منتخب کر کے عمل لفظوں کے ذریعے یوں کشید کیا جائے کہ منظر میں جان پڑ جائے۔ مثلاً

۱۔ امیر خانم بحوالہ سابقہ ص ۶۲۵
۲۔ ایضاً ص ۴۹۰

لندن کے بارے میں ان کا اسلوب بیان دیکھیے ۔

'' جدھر نظر کرو وہ بے شمار چمک دار ستارے، آسمان سے اتر کر زمین بوس ہو گئے تھے۔ اب زمین آسمان سے بھی زیادہ ستاروں سے بھری دمک رہی تھی۔ دن کے وقت بادلوں کے آسمان کے سینہ پر تیر کر سمندر کو آسمان بنا دیا تھا۔ اب لندن کی بستیوں نے لندن کی سرزمین کو آسمان پر چڑھا دیا تھا۔ پہلے سمندر پر آسمان کا شک تھا اب سمندر کی جگہ زمین نے لے لی تھی''۔ (۱)

امیر خانم کی خوبی یہ ہے کہ وہ بے رنگ حقیقت کو بھی خوش رنگ بنا دیتی ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس حقیقت نگاری نے ان کے سفرنامے کو بہت طویل کر دیا اور طوالت کسی بھی صنف کا ہنر نہیں ہے۔ مجموعی طور پر یہ سفرنامہ بہتر منظر نگاری اور سلوب بیان کے لحاظ سے منفرد ہے۔

۱۔ امیر خانم بحوالہ سابقہ ص ۳۲

بیگم تاج یسین (آسڑیلیا کی جھلک)

سفر نامہ لکھنا اب جدید دور کے تقاضوں میں اسطرح شامل ہوگیا ہے کہ اگر کوئی باہر کے ملک جائے اور واپس پر سفر نامہ نہ لکھے تو کوئی جانتا ہی نہیں کہ دیار غیر کا سفر کر کے آیا ہے۔ اس لیے بھی بطور سند سفر نامہ لکھنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔ سفر نامہ ایک ایسا فن ہے کہ جس میں قوت مشاہدہ کے ساتھ ساتھ جز و تماشا ہونا ضروری ہے تا کہ زندگی کے تمام تر مسائل کو جز و ادب بنایا جاسکے۔

بیگم تاج یسین علی خان کا سفر نامہ آسٹریلیا کی بھرپور اور مکمل عکاسی کرتا ہے۔ اس سفر نامے کا مقدمہ نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے وہ لکھتے ہیں۔

> ''مسز یسین علی خان کا سفر نامہ مختلف امور کا خزانہ ہے۔ اس میں آثار قدیمہ، مشہور مقامات کی تفصیل بھی ہے اور سماجی معاشرتی صنعتی امور کا انکشاف بھی ہوتا ہے۔ کھیل تفریح کے امور بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ مناظر قدرت اور مصنوعی تفریح کے مقامات کی صراحت بھی اس سفر نامہ کے مطالعہ سے آپ کو آسٹریلیا کے مشہور مقامات کی تاریخ، آثار قدیمہ کا تذکرہ تفریح اور دلچسپ مقامات کا حال مناظر قدرت اور دیکھنے کی عجائبات کی تفصیل کے ساتھ آسٹریلیاں والوں کی سماجی معاشرتی، اخلاقی، تجارتی اور نفسیاتی سیرت اور کردار کا بھی انکشاف ہوگا۔ ان کے رہنے سہنے، کھانے پینے، ملنے جلنے کی صراحت واضح ہوگی۔ آسٹریلیا کے سفر کرنے والوں کے لیے بہترین رہنمائی اور رہبری ہوگی۔ بہ الفاظ مختصر اس کو معلومات آفرین سفر نامہ کہنا چاہیے۔ جس سے ہر قسم کی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔ تاریخی ہو یا معاشرتی، صنعتی ہو یا تجارتی، سماجی ہو یا تفریحی ہو غرض ہر قسم کے معلومات کا یہ حامل ہے اور ہر نقطہ نظر کی شخصیت کے لے معلومات کا بیش بہا خزانہ بنا ہوا ہے''۔ (۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سفر نامہ واقعی خاصے کی چیز ہے اور ہم بیگم تاج کی ذکاوت فہم اور تخیل کی

۱۔ نصیر الدین ہاشمی، آسٹریلیا کی جھلک (مقدمہ) بیگم تاج یسین الہدی بک ایجنسی حیدر آباد ص ۴

بلندی کا اندازہ آغاز سے ہی کر لیتے ہیں اور بڑی تنقیدی نگاہ سے اس میں تاریخی، جغرافیائی، تمدنی اور سماجی حالات کی تلاش شروع کر دیتے ہیں تا کہ نصیرالدین صاحب کے اس بیان کی تصدیق ہو جائے۔

آسٹریلیا ایک ایسا ملک ہے کہ جس پر بہت کم سفر نامے منظر عام پر آئے اور جو آئے ان میں بھی قیام اتنے کم عرصہ کا تھا کہ مشاہدہ کی بجائے مطالعہ اور گہری نظر کی بجائے طائرانہ نظر کا رنگ نظر آتا ہے۔ اس لیے جب محترمہ تاج یسین علی خان سفر نامہ ''آسٹریلیا کی جھلک'' شائع ہوا تو اسے خاصا پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور پڑھا گیا کیونکہ انہوں نے آسٹریلیا کے لوگوں کے درمیان رہ کر ان کی تہذیب وثقافت کو دیکھا پرکھا، جانچا اور پھر اس کو سفر نامے میں بیان کیا۔ ان کے بیان میں سادگی، سلامت اور فکری گہرائی نظر آتی ہے۔

ان کے آسٹریلیا جانے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے خاوند جو ریلوے میں انجینئر تھے اور سرکاری طور پر تقریباً چار ماہ رہے وہ اپنے خاوند کے ساتھ گئیں اور اس دوران انہوں نے آسٹریلیا کے مشہور تاریخی مقامات اور تفریح گاہوں کی سیر کی۔ اس کا حال احوال انہوں نے اس سفر نامے میں درج کیا ہے۔

ان کے خاوند نے تو حکومت کے تعان سے مختلف ریلوے کی ورکشاپوں اور دیگر جدید عمارات کو حکومت کے تعاون سے دیکھا۔ مگر بیگم تاج سیر و تفریح کے نقطہ نظر سے آسٹریلیا کا دورہ کیا۔ جس سے نہ صرف وہاں کے سماجی حالات اور ان کے تاریخ کے اصناف کی کچھ جھلکیاں نظر آئیں۔ بلکہ آسٹریلیا کے باشندوں کی اندرون خانہ دلچسپیاں ہیں وہ بھی منظر عام پر آئیں۔

آسٹریلیا کے بارے میں لکھتی ہیں۔

> ''یہیں سے کھانے پینے کا سب سامان ہر ایک جہاز لے جاتا ہے۔ جو کئی مہنیوں کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ہمارا جہاز بھی تین دن کے لیے یہاں اسی لیے ٹھہرا تھا کہ اتنا سامان لے لے جو اسے یورپ جا کر واپس آنے تک کے لیے کافی ہو سکے۔ پھر تجارت کی غرض سے جو جہاز غذائی چیزیں یہاں پہنچاتے وہ جدا ہیں۔ اس سے آسٹریلیا کی غذائی بہتات کا کچھ اندازہوہا ہو سکتا ہے''۔ (۱)

یہ سفر نامہ ایک خاتون کی اس دلچسپی کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ عورت گھر میں رہ کر گھر کی ہر چیز سے واقف ہوتی ہے اور یہی ان کے سفر نامے میں بھی نظر آتی ہے۔ اگر چہ کوئی بھی سفر نامہ مکمل طور پر غلطیوں سے پاک نہیں

۱۔ بیگم تاج یسین خان، آسٹریلیا کی جھلک ص ۳۷

ہوتا لیکن اس سفرنامے میں خوبیاں زیادہ ہیں۔ اس لیے یہ زیادہ شہرت حاصل کر گیا۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

'' اس دور میں آسٹریلیا کے بہت سے آثار اہل ہند کے لیے نادر یافت تھے۔ تاج یسین علی نے نظر کی جس گہرائی سے آسٹریلیا کے خدوخال، طبعی حالات، تاریخی آثار، سماجی، معاشرتی اور تجارتی حالات اور سیر و تفریح کا مرقع فراہم کیا ہے۔ ایسی نظر بہت سے مرد سیاحوں کے ہاں بھی نظر نہیں آتی۔ انہوں نے انوکھے اور نادر واقعات بیان کرنے اور آسٹریلیا کا تعارف باانداز دگر کرانے کی کوشش کی ہے''۔ (۱)

بیگم تاج نے احساسات، رہن سہن اور اظہار بیان کی اپنی مخصوص طرز کی بنا پر اپنے بیان کو نہ صرف نسوانی رنگ دیا ہے بلکہ انہوں نے عمیق مشاہدے سے پھلوں کے رس سے لیکر کپڑوں کی خریداری اور پھر نوجوان نسل کا اخلاقی تجزیہ بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ اور کسی ادیب کا اسلوب نہ صرف اس کی شخصیت کے پوشیدہ پہلوؤں کا عکاس ہوتا ہے بلکہ اس کی شخصیت کا گہرا رشتہ بھی اسی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور سادگی بیان سے بھی بعض اوقات تخلیق کے رنگ بکھر کر سامنے آجاتے ہیں لکھتی ہیں۔

'' آسٹریلیا کا خاص میوہ پیاش فروٹ Passion Fruit خریدا۔ بالکل لغو میوہ ہے۔ حیدرآباد میں جو بادام، پھل ملتے ہیں بالکل اسی وضع اور رنگ کا پھل ہوتا ہے اور چھوٹے چھوٹے بیج بھرے ہوئے ہیں۔ مزہ بھی خراب اور بہت ترش ہوتا ہے''۔ (۲)

عموماً یورپ کے ممالک میں نوجوان لڑکیاں، گوری رنگت کی بجائے سانولی رنگت کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔ پیرس اور لندن میں تو یہ رواج عام ہے کہ لڑکیاں سانولے لڑکوں پر جان دیتی ہیں۔ لیکن آسٹریلیا میں یہ چیز دیکھنے کو نہیں ملی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو بہت اعلیٰ سمجھتے ہیں اور کالوں کو ہمیشہ انہوں نے دوسرے درجے کے شہری اور کمتر قرار دیا ہے۔ ان کی یہ ازلی و ابدی نفرت ان کے دل سے نہیں نکل سکی۔ تاج صاحبہ لکھتی ہیں کہ۔

'' کالی نسلوں کو حقیر سمجھنے کا مرض یورپ میں پہلے بھی زیادہ تر صرف انگلینڈ میں تھا جو اب بہت کچھ کم ہو گیا ہے لیکن دوسرے ممالک میں ہمیشہ ہمیں انسان سمجھا جاتا رہا۔ البتہ آسٹریلیا کے لوگ خواہ مخواہ جو ہم پر فوقیت جتاتے ہیں اس کے متعلق میری حقیر

۱۔ ڈاکٹر انور سدید، بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۳۱

۲۔ بیگم تاج یاسین بحوالہ سابقہ ص۔ ۴۵

رائے براہ مہربانی آپ آج سے لکھ رکھیں کہ بہت جلد اس کا خمیازہ بھگتیں گے اور اتنا نقصان اٹھائیں گے کہ تاریخ اسے بھلا نہ سکے گی''۔ (۱)

عورت اور توہم پرستی لازم وملزوم ہیں۔ خاتون پڑھی لکھی بھی ہو تو بھی تواہم کا شکار ہو جاتی ہے۔ آدم اسٹریٹ میں جہاں ائرینسن بارریجن کی طرز زندگی دکھائی گئی ہے۔

'' لباس کے جنجال سے یہ لوگ قطعی آزاد تھے۔ مرنے والوں کا سوگ بہت اہتمام سے منایا جاتا تھا۔ خصوصاً بیوہ پر شوہر کی موت لازم کر دیتی تھی کہ ایک سال تک روز رویا چیخا کرے۔ کسی سے بے ضرورت بات چیت نہ کرے۔ جسم پر سفید مٹی تھوپا کرے اور چھوٹی چھوٹی ہڈیاں جمع کر کے اپنے بالوں میں گوندھ لے۔ یہ لوگ جادو ٹونے کے بہت قائل تھے۔ ہر ایک معاملے میں ارواح سے مدد مانگتے اور بیماریوں کا علاج بھی جادو کے ذریعے زیادہ تر کیا جاتا تھا''۔ (۲)

دست قدرت نے انہیں بہت خوشحالی عطا کی ہے۔ خورد ونوش کی فروانی ہے اور چیزیں اتنی خالص اور اچھے خاصے سستے داموں فراہم ہوتی ہیں۔ اس سفرنامے میں بیگم تاج نے اس آزاد منش لوگوں کا ذکر کیا ہے اور تاریخی، سماجی، معاشرتی اور تجارتی حالات کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ اس معاشرے کے لوگ اس بات سے بے فکر ہیں کہ کل کیا ہوگا۔ جو ہے وہ آج ہے۔ کل کی فکر میں گھلتے نہیں ہیں۔ بلکہ کچھ لوگ تو خاصے قناعت پسند ہیں۔ یہ سفر آسٹریلیا سے متعلق ایسی جھلک دکھاتا ہے کہ جس میں شاید ایک مرد عرصہ دراز تک کار رہنے کے باوجود اس کو محسوس نہ کر سکتا مثلاً

'' یہاں اپر کلاس کے دماغ ہی نہیں ملتے۔ کسی کو نوکری کی پرواہ ہے نہ مزدوروں کی خواہش۔ جہاں دیکھیئے ہوٹلوں اور ریستوران پر بورڈ لگے ہیں کہ ویٹرس کی ضرورت ہے۔ خانگی نوکر تو یہاں ملنا بے حد مشکل ہے۔ سرکاری نوکریوں کے لیے ایسی کڑی شرطیں ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ پراک میں یا سڑکوں کے کنارے بنچوں پر نوجوان مرد اور عورتیں بیٹھے ہیں یا لیٹے ہیں۔ اخبار بینی ہو رہی ہے۔ اپنی فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کسی کو فوراً روپے کی ضرورت ہوئی وہ کسی دکان یا

۱۔ بیگم تاج یسین بحوالہ سابقہ ص ۸۴

۲۔ ایضاً ص ۱۴۰

ہوٹل میں چلا گیا کھانے کے وقت ایپرن باندھ کر لوگوں کو کھانا کھلا دیا۔ ڈیڑھ دو پاؤنڈ لے کر چلتا بنا''۔ (۱)

گھر کے معاشی حالات ہوں یا مردوں کی بے کاری، عورت اس میں سے گذرتی ہے اور اس کرب کو محسوس بھی کرتی ہے۔ اگر مرد بے کار ہو تو عورت کے لیے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ وہ روز مرتی ہے اور روز بچوں کے لیے ایک نئے جذبے سے پھر جاگ اٹھتی ہے لیکن اس قطرہ قطرہ زہر کو پی کر وہ باطنی طور پر مردہ ہو جاتی ہے اور پھر ایک دن اس معاشرے کی چکی میں پس پس کر وہ صبر کی اندھیر نگری میں سو جاتی ہے اور عورت کے حساس ہونے کی وجہ سے یا ممتا کے کرب کی وجہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ وہاں بھی قبر کے عذاب کو تو برداشت کر لیتی ہو گی لیکن بچوں کی بھوک اور بچوں کی آنکھوں کے ٹوٹتے سپنے شاید اس سے وہاں بھی برداشت نہ ہو سکتے ہوں۔

اس کرب کو محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ عورت میں ایک اور خوبی بھی پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے حسن سے بے پرواہ نظر نہیں آتی بلکہ عمر کے ہر دور میں سجنے سنورنے کا شوق دنیا کی ہر خاتون کو ہے۔ کیونکہ انوکھا منفرد اور خوبصورت لگنا نہ صرف عورت کی کمزوری ہے بلکہ اولین ترجیح بھی ہے۔ جس کو وہ اپنے اپنے وسائل کے مطابق اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔ اور عمر کے ہر دور میں کم عمر نظر آنا یہ تو وہ حقیقت کہ جس کو جھٹلانا ناممکن ہے۔ بیگم تاج لکھتی ہیں کہ خاتون ہونے کے ناطے سفید بالوں کی فکر تھی۔ آسٹریلیا میں ایک خاتون کے بارے میں سنا تھا کہ وہ بالوں کے بارے میں اچھی رائے دیتی ہیں۔

'' اگر قبل از وقت بال سفید ہو جائیں تو ان کا کیا علاج ہے۔ وہ ہنس کر آگے بڑھی اور میرے بالوں کو قریب سے دیکھ کر کہا میری بچی کہاں ہیں سفید بال مجھے تو ایک بھی نظر نہیں آتا میں نے کہا اتنے تو نہیں کہ نظر آئیں مگر تھوڑے ضرور ہیں اوز میرے خاندان میں سفیدی جوانی کے ساتھ شروع ہو جاتی ہے'' (۲)

اس سفرنامے میں بیگم تاج کی شخصیت کی پرتیں بھی آہستہ آہستہ کھلتی ہیں۔ ایک جگہ رقمطراز ہیں کہ جہاز پر انہیں ایک بٹوہ ملا جس میں مختلف قیمتی چیزیں ہیں۔ وہ یہ بٹوہ اس کے مالک کو واپس کرنا چاہتی ہیں کہ یہ ان کے خیال میں نیکی کے زمرے میں ہے۔ اس لیے وہ اس نیکی کا صلہ خدا سے مانگتی ہیں۔

۱۔ بیگم تاج یسین بحوالہ سابقہ ص ۶۸

۲۔ ایضاً ص ۱۹۵

''خدا اگر چاہے تو سب کچھ ممکن ہے۔ صبح ان باتوں کا مجھے بالکل خیال ہی نہیں تھا لیکن اب جبکہ ڈھائی تولہ کی لاکٹ میرے ہاتھ میں تھی تو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی کھڑا ہنس رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے لیجیئے بیگم صاحبہ آپ کی نیکی کا بدلہ۔ میں کانپ اٹھی اور ہاتھ پیر سرد ہو گئے۔ اس وقت زمین بھی پھٹ جاتی اور میں اسمیں سما جاتی تو کیا قدرت کی نگاہوں سے چھپ سکتی''۔ (۱)

دیکھیئے کہ کتنے خوبصورت طریقے سے تاج یسین علی نے اپنے من میں ایک حریص مسلمان کی طرح اللہ سے نیکی کا صلہ مانگا اور جب مل گیا تو اپنے تیئں بے حد پشیمان ہیں اور اللہ کی ہی نگاہوں سے چھپنا چاہتی ہیں۔ اسی میں سادگی بھی ہے اور معصومیت بھی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ہر شخص کچھ اس طرح کا خواہش مند ہوتا ہے۔

ان کی شخصیت کا ایک اور رنگ یوں ہمارے سامنے آتا ہے کہ جب وہ سر درد میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور یہ سر درد انہیں ہندوستان چھوڑنے کے بعد پہلی مرتبہ ہوا۔ یہ اعصابی درد تھا اور مختلف وجوہات سے شروع ہوتا تھا لکھتی ہیں۔

''ہر چوتھے آٹھویں دن سخت تکلیف دیتا ہے کبھی تکان سے کبھی رنج وفکر سے اور کبھی ہاضمے کی خرابی یا کھانے اور سونے میں اوقات کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے''۔ (۲)

بیگم تاج یسین کا مطالعہ اتنا گہرا اور وسیع ہے کہ وہ تاریخ کو بھی فراموش نہیں کرتیں اور جغرافیئے کو بھی مدنظر رکھتی ہیں۔ مثلاً آسٹریلیا کے سات حصوں کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ اخبارات میں اشتہارات کی اہمیت اور طریقہ کار کے بارے میں بھی تبصرہ کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ Hasting Cares، گرم حمام اور لڑائی جھگڑوں کے بارے میں بھی تنقید کرتی ہوئی سفرنامہ مکمل کرتی ہیں۔ زندگی کے دکھ سکھ سب ان کے سامنے ہیں اور ہر ایک تصویر کیمرے کی طرح اتارتی ہیں اور پھر نظروں میں جذب کر کے دل ودماغ سے تبصرہ کرتی ہیں کہ تعصب کی عینک کے بغیر جو رائے دی جائے وہ یقیناً جاندار ہوتی ہے اور بے لاگ بھی۔

اس سفرنامے میں طنز ومزاح کی چاشنی بھی ہے۔ جس نے اس کو دلچسپ بنا دیا ہے اور قاری پر تبصرہ گراں بھی نہیں گزرتا اور وہ حقیقت تک رسائی بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اس میں پاکستان کے ٹریڈ کمشنر اور ان کے پاکستانی کا بھی ذکر ہے۔ جن کے ساتھ بیگم تاج کے اور ان کے خاوند کے دوستانہ مراسم ہو گئے تھے۔ وہ ان کے اور ان کے اہل خانہ کے اخلاق کی بے حد تعریف وتوصیف کرتی ہیں۔

۱۔ بیگم تاج یسین بحوالہ سابقہ ص ۲۵۲

۲۔ ایضاً ص ۵۱

آسٹریلیا میں دیگر خوبصورتی کے علاوہ پھولوں کی بھی بہت فروانی ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی موقعے پر دوسرے کو پھول پیش کرتا ہے کیونکہ حسن مناظر کو ان پھولوں کی خوبصورتی اور بڑھا دیتی ہے اور پھول تو نشانی ہیں پیار کی، محبت کی، ملاپ کی خوشبو کی زندگی کی۔

''آسٹریلیا کی اکثر باتیں نرالی ہیں مگر یہاں کے پھول لاجواب ہوتے ہیں لیکن اس ہوٹل کے باغ میں پڑی رکابیوں کے برابر پائینیر دیکھ کر میں تو حیراں رہ گئی۔۔۔۔۔۔ ہوٹل کے منیجر نے جب دیکھا کہ میں پھولوں کی دیوانی ہوں تو دوڑ کر اس نے قینچی لی اور جلدی جلدی بہت سے پھول کاٹ کر مجھے دے دیئے۔ مارے خوشی کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے''۔(۱)

آنسو تو آنے ہی تھے۔ ہمارے ہاں تو کوئی بغیر قیمت کے مسکراہٹ کے پھول نچھاور نہیں کرتا۔ کجا کوئی اصلی پھول بغیر معاوضے کے دے۔ اس سفرنامے میں اگر بیگم تاج کے اسلوب کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے اسلوب میں روانی اور رعنائی بھی ہے۔ جو اثر آفرینی کا کام دیتی ہے۔ انہوں نے ان دیکھی حقیقت کی بجائے آنکھوں دیکھی چیزیں بیان کرنے کی کاوش کی ہے۔ اس لحاظ سے سفرنامے کی قدر و قیمت جداگانہ ہے اور لذت بھی اس سفرنامے کا جزو ہے جس نے اس کو زندگی آمیز بنا دیا ہے۔

لیکن ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس میں کچھ خامیاں بھی پائی جاتی ہیں کہ اس سفرنامے میں املا کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے کچھ تو کتابت کی غلطیاں ہیں اور کچھ اردو زبان پر دسترس نہ ہونے کی وجہ سے کچھ متروک الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے اور سفرنامے کے آخر میں اغلاط نامہ بھی لگایا گیا ہے مگر پھر بھی بہت سے غلطیاں اس کے علاوہ ہیں اور کچھ جملے ادھورے اور نامکمل ھی ہیں جو کہ ناگوار گزرتے ہیں۔

سفرنامے کے مقدمے میں نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں۔

''اس سفرنامہ میں کہیں آپ افسانہ کی سی دلکشی پائیں گے تو کہیں واقعہ نگاری اور مرقع نگاری کے جوہر نظر آئیں گے۔ کہیں مزاحیہ انداز سے تبسم کی دنیا میں چلے جائیں گے تو کہیں شوخی رنگینی اور لطافت کے ساتھ پاکیزہ خیالات کی فروانی

۱۔ بیگم تاج یسین بحوالہ سابقہ ص ۶۹

چلے گی۔ کہیں عبرت کا سبق ملے گا تو کہیں طنز کے نشتر چلیں گے۔ غرضیکہ یہ سفر نامہ بحیثیت مجموعی قابل داد اور لائق تحسین ہے''۔ (۱)

یہ سفر نامہ شائع ہونے سے پہلے رسالہ شہاب میں قسط وار شائع ہوا۔ مجموعی طور پر یہ ایک اہم اور مربوط سفر نامہ ہے جس میں آسٹریلیا کے لوگوں کے بارے میں وسیع معلومات ملتی ہیں۔

۱۔ نصیر الدین ہاشمی بحوالہ سابقہ ص ۹

مہرالنساء صاحبہ (ہمارا سفرو سرگزشت)

ہمارا سفرسرگزشت مہر النساء صاحبہ کی انگلستان اور امریکہ کے سفر کی روداد ہے۔ یہ کتاب ذاتی ڈائری کی شکل میں ہے۔ یہ کتاب اس سفر نامہ کی روداد ہے جو مہرالنساء نے اپنے شوہر ڈاکٹر آفتاب حسین صاحب کے ساتھ امریکہ میں مزید طبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا اور مہرالنساء نے کچھ وقت بطور نرس کام کیا۔ ڈاکٹر آفتاب حسین کا داخلہ U.S.A میں Mercy Hospital Contanchgo میں منظور ہو چکا تھا اور مہرالنساء کو اڈانبرا کے دواخانوں میں Nusing Course میں داخلہ مل گیا تھا۔ ان کا یہ سفرنامہ شادی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ خود مہرالنساء لکھتی ہیں۔

> ''یہ سفرنامہ میں نے اپنی ہم عمر ہندوستانی بہنوں کے لیے لکھا ہے اور اردو انگریزی کے میل ملاپ کا نمونہ ہے۔ اس کو اپنے دادا حضرت نواب ارسطو یار جنگ مرحوم ڈاکٹر عبدالحسین صاحب کے اسم گرامی سے معنون کرتی ہوں''۔(۱)

اس سفرنامے میں انہوں نے ہر وہ واقعہ بیان کر دیا جو دوران سفر یا قیام میں ان کے ساتھ پیش آیا۔ حتی کہ ایام زچگی اپنی بیٹی کی پیدائش اور پھر کس طرح سے چند ہفتوں کے بچے سے لیکر سال سے زیادہ تک کے بچوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے اور پھر پیدائش کے وقت کن کن مراحل اور تکالیف سے گذری اور پھر کارڈز تھے تحائف اور پھولوں تک بھی ذکر ہے یعنی ہر نجی مصروفیات سے لیکر خانگی اور خانگی سے لیکر اپنے پیشہ ورانہ زندگی کا حال احوال بھی درج ہے۔

اپنے دوران سفر دو ماہ اور بیس (بلیس) دن قاہرہ، اڈنبرا اور گلاسکو میں قیام کیا۔ اس کا احوال بھی درج ہے۔ لکھتی ہیں۔ عدن (قاہرہ میں میوزیم ہے۔

> ''یہ بہت بہت بڑا میوزیم ہے۔ اس میں تین ہزار سال قدیم زمانے کے محفوظ کردہ لاشے مومیائی (Mummies) تھے۔ رنگین تصاویر (Paintings) تھیں۔ ملبوسات (Clothings) اور زیورات (Jeweleres) تک تھے''۔ (۲)

۱۔ مہرالنساء ہمارا سفرو سرگزشت ارسطو اکیڈمی حیدرآباد دکن ۱۹۵۶ ص ۲

۲۔ ایضاً ص ۷

ہرانسان کا تجربہ، مشاہدہ، جذبہ اوراحساس بالکل دوسرے انسان سے مختلف ہے۔ مکمل احساس کو قاری کے دل و دماغ میں منتقل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ہر سیاح اپنی شخصیت کے ہر گوشے کو ہر ممکن طریقے سے سامنے لاکر اپنے علم اور مشاہدے کا اظہار کرنا چاہیے۔ انسان دوستی، خلوص، سچائی اور بیان کی گرمی نہ صرف اسلوب میں تاثیر پیدا کر دیتی ہے بلکہ بیان کو زیادہ باثر بھی بناتا ہے۔ مہرالنساء صاحبہ Historical Places گئیں تو وہاں قدیم زمانے کا ایک Fort تھا وہاں ایک قید خانہ (Prison) تھا۔ اس کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''پہلے زمانے کی سزاؤں کے طریقے دکھائے گئے ہیں۔ کسی کو گرم تیل کے کڑھاؤ میں ڈال رہے ہیں، کسی بے چارے کے جوڑ بند توڑے جا رہے ہیں۔ کسی بیکس کے دونوں پاؤں گرفت میں لائے گئے ہیں۔ چیرنے کے لیے کسی بے بس کو کولھو میں بٹھایا گیا ہے۔ گھمانے کے واسطے کسی کی آنکھیں باہر نکل آئی ہیں تو کسی کی زبان بہرحال طرح طرح کے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ ہر ایک شکل Figure، ہر ایک مجسمہ Statue دیکھ کر دیکھنے والا دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ ایسے ہولناک مناظر ہیں کہ رات کے وقت کوئی دیکھ لے تو ہیبت کھا جائے۔ دن بھر دیکھنے اور گھومتے رہے پھر بھی بہت سی چیزیں دیکھنے کی نہیں دیکھیں۔ (۱)

مادام تساؤ کے موم خانہ یا نمائش خانہ کے بارے میں بڑی دلچسپی سے اظہار خیال کرتی ہیں۔ اگرچہ اس دلچسپی میں کہیں کہیں حیرت بھی ہے لیکن بیان کو جذبے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے جمالیاتی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

''یہ موم (Wax) کے پتلوں (Statues) کا بہترین میوزیم پرانے زمانے سے موجودہ زمانے تک ہر ممتاز شخصیت کا مجسمہ اس میں ہو بہو اصلی نظر آتا ہے۔ بادشاہ، ملکہ، امیر، وزیر، ادیب، شاعر غرض تمام مشاہیر اپنے اصلی شکل و روپ میں جلوہ گر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مجسموں (Statues) میں روح پھونک دی جائے تو یہ چلنے پھرنے لگیں گے۔ قد قامت، ناک نقشہ، تل، مسے یعنی پوری پوری علامتیں نمایاں کی گئی ہیں۔ لباس میں تک فرق نہیں آنے دیا''۔ (۲)

۱۔ مہرالنساء بحوالہ سابقہ ص ۲۲
۲۔ ایضاً ص ۲۳

مہرالنساء نے وہاں کی تاریخی عمارات کا مطالعہ بڑے غور سے کیا ہے۔ اور امپائر اسٹیٹ بلڈنگ، مجسمہ آزادی، چٹیا ٹاؤن، راک فیلر بلڈنگ، موسیقی ہال، سب کے بارے میں بڑی تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ انہوں نے وہاں ے اشتہار رنگارنگ روشنی آن پر چمکتے ہوئے حروف اور خاص طور پر دوربین میں رات کی سیر کا لطف اس تمام کو نہ صرف وہ خود دلچسپی سے لکھتی ہیں بلکہ قاری کے ذہن کو بھی اس میں دلچسپی لینے پر مجبور کرتی ہیں۔

عمارت اقوام متحدہ کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

''ہم نے اس بلڈنگ کے قریب پہنچ کر دیکھا کہ بالکل نئی طرز پر بنائی گئی ہے یعنی تمام آئینہ کی ہے۔ اس کے بیرونی حصوں پر اردگرد سب ملکوں کے جھنڈے نظر آتے ہیں۔ آہینہ کی ہونے کے باوجود اس خوبصورت بلڈنگ میں وسعت بھی بہت دیکھی یہاں اقوام متحدہ کے اجلاس(International Meetings) ہوتے رہتے ہیں۔ تمام اقوام Nations کے پیچیدہ مسائل کا حل یہیں پیش کیا جاتا ہے''۔ (۱)

سفرنامے کو طویل کرنے کے لیے یہاں کی نرسوں کے ساتھ پارٹی میں شامل ڈاکٹروں کے نام بھی تفصیلاً لکھے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ غیر ضروری تھا۔ بہرحال اس سے شفا خانے میں کام ان کی کارکردگی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ڈیوٹی ٹائم کھانے کی تفصیل مریضوں کو کھانا دینا، ان کے لیے پھول لانا، بستروں کی حالت اور صحت یاب ہونے کے بعد Bed کی صفائی اور چادر تک بدلنے کے تمام مراحل کو بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک بیوی اور خاتون خانہ بھی ہیں کہ جس کو گھر ہی نہیں گھرداری بھی عزیز ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں اور بہت سی جگہوں کا ذکر ہوتا ہے وہاں خاتون مہرالنساء گھر کو نہیں بھولتی لکھتی ہیں۔

''سامان کی خریداری میں ایک گونہ مزہ محسوس ہوتا ہے۔ Radio خریدا۔ Iron لے آئی اور Stove کے دام چکائے۔ مختلف قسم کے متعدد برتنوں کی قیمت ادا کی۔ خانہ داری کا سلیقہ اپنا رنگ جمانے لگا۔ قرینے سے ایک ایک چیز چننے لگی۔ چھٹی کا دن آتا تو کباب اور ایسے ہی مزے دار چیزیں بنایا کرتی خود کھاتی، ڈاکٹر صاحب کو کھلاتی غرض پرکیف زمانہ تھا''۔ (۲)

۱۔ مہرالنساء بحوالہ سابقہ ص ۱۴

۲۔ ایضاً " ص ۱۹

کرسمس

کرسمس یہاں کی زندگی میں بالکل ویسی ہی اہمیت کا حامل ہے کہ جیسے ہمارے ہاں مسلمانوں میں عید منائی جاتی ہے۔ بالکل ویسا ہی جوش خروش یہاں کی عوام میں کرسمس کے موقعے پر پایا جاتا ہے۔ اس مشاہدے کی روشنی میں انہوں نے معاشرے کو بہت قریب سے دیکھا اور اس زندگی کی ترجمانی کی۔ ان کے انداز بیاں میں شگفتگی ہے کہ یہاں دلچسپ بھی ہو گیا ہے اور مجسم بھی۔

'' بڑے دن کا ۲۵ نومبر اور ۲۵ دسمبر کا درمیانہ زمانہ کرسمس کی تیاریوں کا ہے۔ Decoration کا شاید ہی کوئی ایسا طریقہ ہوگا۔ جسے اس تقریب میں برتا نہ جاتا ہو۔ Presents کا بطور خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ Stores خوب سجائے جاتے ہیں۔ Santa Claus بنائے جاتے ہیں۔ حسین حسین الفاظ جمع کر دوں تو کیا Chrismas Trees کی بہاریں میں دکھا ہی نہیں سکتی۔ البتہ کہہ سکتی ہوں ۔ بہار ہی بہار ہے۔ بہار ہی بہار ہے۔ شاہراہوں کی رنگا رنگ زوردار روشنی کے مقابل میں ستاروں کی جھلملاتی قندیلیں اور بھی مدھم پڑ جاتی ہیں۔ یہ سب Dolars کا بے پایاں نور کا ظہور ہے''۔ (۱)

کپڑوں کی دھلائی کے بارے میں ان کو جو تجربہ یہاں آ کر ہوا وہ ان کے لئے انوکھا تجربہ تھا۔ مشاہدات، کیفیات کو بدل دیتے ہیں۔ یہی چیز ہمیں ان کے سفرنامے میں ملتی ہے۔

'' ایک بہت بڑا مشین تھا۔ جس میں تمام .Y.W.C.A کی Loundry ہوتی تھی۔ اور ایک چھوٹا سا مشین صرف لڑکیوں سے مخصوص تھا۔ جو لڑکی چاہتی اس میں کپڑے دھو سکتی۔ ایک Quarto (Z.E) ڈال دیں تو پورے کپڑوں کو یہ مشین دھو بھی دیتا۔ نچوڑ دیتا۔ یہ دھلے ہوئے Drier میں ڈال دیئے جائیں تو تھوڑی دیر میں خشک بھی ہو جاتے۔ اس کے بعد استری بھی کر لی جا سکتی کیونکہ استری کا سامان وہیں موجود رہتا۔ بہر حال گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو جاتا۔ محنت اتنی کم گویا کی ہی نہیں۔ ہر طریق کار پسندیدہ معلوم ہوا''۔ (۲)

یہاں ایک خاص برائی جو تقریباً سارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے اور اسے ختم کرنا ناممکن ہے کیونکہ جسے ہم بے حیائی سمجھتے ہیں مغربی لوگ اسے فیشن قرار دیتے ہیں اور اپنی ظاہری خوبصورتی کو چھپانے کی کوشش

۱۔ مہرالنساء بحوالہ سابقہ ص ۵۹

۲۔ ایضاً ص ۱۰۰

نہیں کرتے کیونہ امریکہ میں روایات اوراخلاقیات کا پاس رکھنا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ یہاں سب کچھ ڈالر ہے جوکماتے ہیں خرچ کردیتے ہیں۔زندگی کا کوئی اعلی اور خاص مقصدان کے ہاں نہیں ہے۔ یہ اوران کی معاشرتی زندگی بالکل Business بن کے رہ گئی ہے۔ اس سفر کی کیفیات فرض منصبی اوُرزمرہ کے معمولات میں ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اس میں ذات کولوگوں کی نسبت زیادہ مرکزی رکھا گیا ہے۔ اس لیے زیادہ تر وہی معلومات دی گئی ہیں۔جن میں ان کا تعلق تھا لیکن یہ سب شائستہ اسلوب کا کمال ہے۔کہ وہ اشیاء اشخاص ماحول اورمسائل پرنظر ڈالتی ہیں۔ہمیں بتاتی ہیں تو ہم ان کے ہمسفر بن جاتے ہیں۔مثلا یہاں کے ملبوسات بھی ان کی نظر سے نہیں بچ سکے۔

''یہاں کے بعض ملبوسات ایسے ہیں جن کا پہننا نہ پہننے کے موافق ہے۔خاص کر موسم گرما کالباس تو یہ!! موسم گرما کی پوشاک جتنی بے ڈھنگی ہوتی ہے۔فصل سرما کا ملبوس اتنا ہی آرام دہ اور خوشنما ہوتا ہے۔ اس رت میں کوٹ، Glove، Scraff، Heat اور Socks عموماً استعمال کرتے ہیں۔انہیں چیزوں سے ہم بھی سردی کا کفر توڑ رہے تھے۔ ایسے آرام دہی خوبصورت لباس کی تعریف کون نہیں کرے گا۔ اچھی چیز کہیں کی بھی ہو بہرحال اچھی ہے''۔ (۱)

آخر میں انہوں نے Baby Record ، ڈاکٹروں کے نام Baby Development Records اور Visitors کی تفصیل بھی درج کی ہے۔ جوانتہائی غیرمناسب معلوم ہوتی ہے۔

مہرالنساء صاحبہ اپنی بیٹی نورا کے ہمراہ واپس آجاتی ہیں اور یہاں ان کا بڑا پرتپاک استقبال کیا جاتا ہے۔

مجموعی طور پرمہرالنساء کا سفرنامہ اگراس میں اتنی غیرمناسب اورغیر متوقع انگریزی الفاظ کا استعمال نہ ہوتا تو زیادہ بہتر ثابت ہوسکتا ہے۔بہرحال یہ خوشحال گھرانے کی لڑکی کا سفرنامہ ہے۔ جس کواس نے وقت کے استعمال کے لیے لکھا۔

۱۔ مہرالنساء بحوالہ سابقہ ص ۱۱۳

بیگم عطیہ وجیہ الدین (آسڑیلیا اور اس کے لوگ)

اس سفرنامے کو ہم اگر معلوماتی سفرنامہ کہیں تو زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں سفرنامے والی خصوصیات کم ہیں اور بیانیہ انداز کی بجائے معلوماتی انداز زیادہ پایا جاتا ہے۔ ہر ملک کے باشندوں کی خصوصیات اس علاقے کی آب وہوا، تہذیب و معاشرت اور معاشیات کے مطابق ہوتی ہیں۔ کسی ملک اور اس میں بسنے والے لوگوں کی رہائش اور عادات و فصائل ہی کی وجہ سے کوئی خطہ اسقدر منفرد مقام حاصل کر لیتا ہے کہ وہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ مثلاً بیگم عطیہ لکھتی ہیں۔

> '' آسٹریلیا کے باشندے کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انگریزیت کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور یہ ایک عجیب بات کہ روزگار کے نئے ماحول اور آب وہوا کے فرق نے قومی خصوصیتوں کو اسقدر جلد بدل کر نئے سانچے میں ڈھال دیا ہے''۔ (۱)

دوسری چیز جو کسی قوم و ملک کو منفرد مقام دلاتی ہے وہ اس خطے کی آب وہوا کہ بہت زیادہ گرمی اور بہت زیادہ سردی بھی بعض اوقات سیاحوں کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بن جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں کی معاشی حالت کہ کیا وہ امراء کے لیے سامان فراہم کر سکتے ہیں کہ وہاں جا کر موسموں کے تغیر و تبدل ان پر اثر انداز نہ ہوں۔

بیگم عطیہ وجیح الدین اس کا ذکر یوں کرتی ہیں کہ یہاں کے لوگ دراصل اپنے اصولوں کی وجہ سے اسلام سے نزدیک تر ہیں۔

> '' اسٹریلوی باشندوں نے امیر غریب کی تمیز مٹانے کے ساتھ ہی انسان کی ذاتی خوبیوں مثلاً سوچ بچار اور ذاتی قابلیت کو اور زیادہ اجاگر کر دیا''۔ (۲)

بیگم عطیہ آسٹریلیا اور اس کے لوگ میں صرف لوگوں کا جائزہ نہیں لیتیں بلکہ اردگرد کے ماحول کا تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے بھی تجزیہ کرتی ہیں۔ کیونکہ کسی ملک کے پہاڑ اور وہاں پر موجود معدنیات، دریا اور

۱۔ بیگم عطیہ وجیہ الدین آسٹریلیا اور اسکے لوگ اکادمی پنجاب لاہور ۱۹۵۸ ص ۱۰

۲۔ ایضاً ص ۱۳

سمندر بھی اپنے اندر نہ صرف کشش بلکہ معلومات کا خزانہ رکھتے ہیں۔

''آسٹریلیا کی پہاڑیاں عموماً چھوٹی ہیں۔ سب سے اونچی پہاڑی سات ہزار فٹ سے کچھ بلند ہے۔ دریاؤں میں سب سے بڑا دریا پانچ سو میل لمبا ہے۔ ان دریاؤں میں پانی بارش سے چڑھ جاتا ہے لیکن اس کے بعد اتنا اتر جاتا ہے کہ پھر یہ دریا کشتی رانی کے لئے استعمال نہیں ہو سکتے۔ گرمیوں میں بہت سے دریا سوکھ جاتے ہیں۔ اور ان کا پانی سمندر تک بھی نہیں پہنچ پاتا۔ ان میں سے بعض دلدلوں اور جھیلوں میں غائب ہو جاتے ہیں''۔ (۱)

زندگی کا دارومدار جہاں دریاؤں پر ہوتا ہے وہاں پر فصلوں اور چراگاہوں پر بھی ہوتا ہے تاکہ انسان وہاں سے خوراک حاصل کر سکے اور کسی ملک کی آبادی اور ترقی کا راز صرف اس میں ہوتا ہے کہ وہاں پر زندگی کی سہولیات کتنی ہیں۔ رقبے کے لحاظ سے آبادی کبھی زیادہ نہیں ہوتی۔ جب تک زندگی کو بہتر گزارنے کے مواقع نہ تلاش کیئے جائیں۔ عطیہ آسٹریلیا کی آبادی کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''اس وقت رقبے کے حساب سے آبادی کی نسبت قریباً سوا تین آدمی فی میل ہے۔ زیادہ تر آبادکار انگریز ہیں جو باوجود ایک نئی حب وطن کے اپنے پرانے دھن سے بھی رشتہ جوڑتے ہوئے ہیں۔ ان کے بعد کہیں کہیں دوسرے یورپین ملک بھی ہیں۔ مثلاً محنتی جرمن، زندہ دل فرانسیسی، سکندے نیویا اور سوئٹزرلینڈ کے مہاجر جو ایک دو نسلوں تک تو اپنی الگ قومیت قائم رکھتے ہیں لیکن اس کے بعد عوام میں جذب ہو جاتے ہیں''۔ (۲)

سیاح جب گھر کے پر سکون سے نکل کر جنگلوں اور ویرانوں کی راہ لیتا ہے تو اسے اپنا گھر وطن اور ماں جائے بہت یاد آتے ہیں تو جنگل کی تلاش اسے اپنے من میں گرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

''آسٹریلیاں کے پہاڑی جنگل کسی مہیب گورستان کی طرح دہشت ناک بھید بھرے اور پتھرائے ہوئے ہیں۔ ان کی تنہائی، ویرانگی کی حد تک منحوس ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تاریک درسے کوئی یاس انگیز اور غم ناک کہانی دبائے بیٹھے ہیں۔ ان

۱۔ بیگم عطیہ وجیہ الدین بحوالہ سابقہ ص ۱۹

۲۔ ایضاً // ص ۲۰

کے سایوں میں کوئی نازک جذبہ پرورش نہیں پا سکتا۔ دوسرے ملکوں میں رخصت
ہونے والے سال کا جب ماتم ہوتا ہے تو ان جنگلوں میں پتوں کی بارش ہو جاتی ہے۔ لیکن
آسٹریلیا کے جنگلوں میں کوئی پتے نہیں گرتے۔ بند ہوائیں چٹانوں میں سے چیختی ہوئی
گزرتی ہیں۔ اداس درختوں کی چھالیں اکھڑ اکھڑ کر کھڑ کھڑاتی ہیں۔ ان پہاڑیوں کے
حیوان بھی عجیب وغریب اور آسیبی صورتوں کے ہیں''۔ (۱)

اس سفرنامے میں دلچسپی کے عناصر کم سے کم ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بیگم عطیہ صاحبہ نے آسٹریلیا کے بارے میں کوئی تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ جس میں یہاں کے جانوروں، دریاؤں، پہاڑوں، باغوں اور قانون کے بارے میں اتنی تفصیل درج ہے کہ کہیں سے بھی احساس نہیں ہوتا کہ مصنفہ نے خود جا کر ان سب چیزوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آسٹریلیا کے بارے میں عام معلومات کی کتابیں اکھٹی کر کے یہ سفر مرتب کیا گیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتی ہیں۔

'' آسٹریلیا چھ ریاستوں میں بٹا ہوا ہے۔ نیو ساؤتھ ویلز، تسمانیا، مغربی آسٹریلیا،
جنوبی آسٹریلیا، وکٹوریہ اور کوئنز لینڈ ان ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے مرکزی
سینٹ میں ہر ریاست کے نمائندے ایک جتنے ہوتے ہیں''۔ (۲)

اس کے ساتھ ساتھ یہاں کی قانون سازی کے اختیارات گورنر جنرل اور ریاستوں کے گورنر وغیرہ کے بارے میں معلومات اور مرد ہو یا عورت پارلیمنٹ کا ممبر کس طرح بن سکتا ہے۔ یہاں کی اہم معدنی پیداوار کوئلہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چاندی، تانبہ، سیسہ، لوہا، قلعی، پھٹکری اور پتھر و جواہرات بھی دستیاب ہیں۔ پرانے شہر، عمومی آبادی، بندرگاہیں، ساحل غرض کہ ہر لحاظ سے آسٹریلیا کے بارے میں معلومات درج ہیں۔

'' سڈنی کے ساحل سے پاراماٹا تک پندرہ میل کی ریلوے لائن آسٹریلیا میں سب
سے پرانی لائن ہے۔ یہ شہر سڈنی کی طرح ترقی نہیں کر سکا لیکن اس کے خوبصورت
باغات اور سنگتروں کے کنج دیکھنے کے قابل ہیں۔ تھوڑے ہی فاصلے پر دریائے
ہاکس بری کے کنارے ونڈسرا اور رچمنڈ کی آبادیاں ہیں۔ اس کے پیچھے بلیو
مونٹین ہے۔ جس پر لوگوں نے خوبصورت بنگلے بنا رکھے ہیں۔ کوٹومبا، بلیک ہیتھ
اور مونٹ وکٹوریہ کے نزدیک خوبصورت آبشاریں ہیں۔ (۳)

۱۔ بیگم عطیہ وجیہ الدین بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۵
۲۔ ایضاً " ص۔ ۳۹
۳۔ ایضا " ص۔ ۴۲

خوبصورت آبشاریں، بلند و بالا چوٹیاں، جھیل کنارے، پھلوں سے لدے باغات یہ کس قدر نظارے ہیں اور انسانی دل و دماغ پر کتنے خوش کن اثرات مرتب کرتے ہیں کہ انسان پاگل ہو جاتا ہے اور بے اختیار پکارتا ہوا یہ کہتا ہے۔ ہم اپنے رب کی کس کس نعمت کا شکر ادا کریں کہ اس رب کریم نے ہم پر بے شمار عنایتیں اور نوازشیں کی ہیں جو کہ ان گنت اور بے حساب ہیں۔ موسموں کی رنگینی اور رتوں کا بدلنا یہ بھی عطیہ خداوندی ہے۔

آب و ہوا اٹلی سے ملتی جلتی ہے۔ گرمیوں کے دن تھوڑے اور سردیوں کے زیادہ ہوتے ہیں۔ بیشتر علاقہ بنجر ہے۔ جس میں کوئی پہاڑ دو ہزار فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہے۔ جنگلوں میں اچھی قسم کی لکڑی پائی جاتی ہے۔ جنوب مغربی حصے میں زمین زرخیز ہے۔ جہاں اناج پھل اور سبزیاں خاصی مقدار میں پیدا کی جاتی ہیں۔ آسٹریلیا کی عمومی زندگی بھی ان کی نگاہ سے نہیں بچ سکی۔ اور خاتون ہونے کے ناطے خالصتاً نسائی انداز میں ٹھنڈے، گرم موسموں کے انتظام کا جائزہ لیا گیا ہے۔

> ''دہکتی ہوئی آگ، انگیٹھی اور ٹھنڈی ہوا کو روکنے والے پردوں کی بجائے اس کے مکان میں دھوپ سے بچاؤ کا انتظام ہوگا اور وہ بھی اسطرح کہ خنک ہوا کے جھونکوں کا گزر بھی ہو سکے۔ آسٹریلیا کے وسطی اور شمالی حصوں میں جالی کی مسہری بھی ضرور ہوگی۔ ہر گھر میں برف رکھنے کا ایک صندوق ہوگا کیونکہ اس کے بغیر نہ ٹھنڈا پانی میسر ہوگا اور نہ مکھن ٹھوس حالت میں رہ سکے گا۔ دودھ والے کی گاڑی کی طرف برف کی گاڑی بھی ہر روز بلا ناغہ ہر گھر میں برف تقسیم کرتی ہے۔ آسٹریلیا میں کوئی گھر اس وقت تک رہنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا جب تک اس میں فوارہ والا غسل خانہ نہ ہو۔ (۱)

انسان دنیا کے کسی بھی خطے میں رہتا ہو۔ اس کا آپس میں پیار محبت اور انسانی ہمدردی کا سلوک ہی اس کو ایک دوسرے کے نزدیک لاتا ہے اور یہ جذبہ انسان کے اندر ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا کیونکہ اس خطہ ارضی میں انسان جتنا بھی امیر ہو۔ اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔ آپس میں میل ملاپ سے اپنے آپکو الگ نہیں رکھ سکتا۔ یہ چیز آسٹریلیا میں ہمیں خاص طور پر بڑے خوبصورت انداز میں نظر آتی ہے۔ ''جھاڑی'' جو آسٹریلیا کا ایک خوبصورت علاقہ ہے۔ اس کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''جھاڑی کی سماجی زندگی کی بنیاد آپس کی ہمدردی اور امداد پر قائم ہے۔ لوگ

۱۔ بیگم عطیہ وجیہ الدین بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۴

ایک دوسرے کے لیے ایسی خدمات بھی انجام دیتے ہیں جس کا تصور بھی کسی دوسری سماج میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ ایک ایک دوسرے پر پورا بھروسا کرتے ہیں اور اس بھروسے کو پوری طرح نباہا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کا بچہ گم ہو جائے تو سارے کا سارا علاقہ کئی کئی دن تک اس کی تلاش میں مصروف رہتا ہے۔ یا مثلاً اگر آپ سارے کے سارے ملک کی سیر کرنا چاہیں تو ایک پیسہ خرچ کیئے بغیر بھی کر سکتے ہیں۔ جھاڑی کی محنت بھری زندگی میں بعض دفعہ فضول جھگڑے اور دشمنیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں لیکن تکلیف اور نقصان کے مواقع پر ایسی دشمنی کو بھلا دیا جاتا ہے اور دشمن بھی ایک دوسرے کی امداد پر تیار ہو جاتے ہیں۔ جھاڑی کی مہمان نوازی اجنبی اور شناسا میں کوئی تمیز نہیں کرتی۔ (۱)

عورت کی سرشت میں شامل ہے کہ وہ عورت سے دشمنی بھی آخری حدوں تک کرتی ہے اور اسے مظلوم بھی سمجھتی ہے۔شاید اس کی وجہ وہ ازلی وابدی احساس کمتری یا ظلم ہے جو مرد عورت پر روا رکھتا ہے اور اس ہمدردی میں وہ صدیوں اور میلوں کے فاصلے ختم کر کے صرف اور صرف دل کے دروازے کھولتی ہے۔ جہاں وہ عورت کو رحم کی نظر سے دیکھتی ہے۔ مثلاً

''جھاڑی کا ہر باشندہ یہی کہتا ہے کہ عورت کے لئے یہ سرزمین موزوں نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ شادی بھی کر لیتا ہے اور اسی سرزمین میں گھر کو آباد کرتا ہے۔ یہاں کی زندگی مرد کے مقابلے میں عورت پر زیادہ اثر ڈالتی ہے۔ سب سے پہلے سورج کی تپش سے اس کے گالوں کی تازگی رخصت ہو جاتی ہے اور ان کا رنگ زردی مائل ہو جاتا ہے''۔ (۲)

عورت کی صرف نظر ہی دل فریب نہیں ہوتی۔ اس کا تجربہ، مشاہدہ، مطالعہ اور حافظہ بھی خوبصورت ہوتا ہے۔ وہ مردوں کی نسبت انتہاء کی گہرائی تک جانا پسند کرتی ہے اور کچھ آج کا مرد عورت کی وجہ سے زیادہ سہل پسند ہو گیا ہے۔ وہ سفر میں راجہ اندر بننا اور اپنی تعریف وتوصیف کرنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ لیکن عورت نظروں سے بچنے کے لئے چیزوں اور ماحول کے اندر تک چلی جاتی ہے۔ یوں اس کا سفرنامہ بہترین صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔

۱۔ بیگم عطیہ وجیہ الدین بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۴۔ ۹۵

۲۔ ایضاً ص۔ ۹۵

امت القدیر (کراچی سے چاٹ گام تک)

یہ سفرنامہ امت القدیر نے کراچی سے چاٹ گام تک کے سفری حالات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔اور اگر تنقیدی لحاظ سے دیکھا جائے تو بعض واقعات محض زیب داستان کے لئے لکھے گئے ہیں۔تا کہ خوف کے عناصر میں ان کی بہادری کو سند عطا کی جائے لیکن یہ سفرنامہ معلوماتی بھی ہے اور جہاز کے بار بار خراب ہونے کی داستان بھی لیے ہوئے ہے۔ایک سو اڑتالیس صفحات پر پھیلا ہوا یہ سفرنامہ کہ جس کا یہ حصہ عزیزوں اور رشتہ داروں کی یاد کا بھی عنصر لیے ہوئے ہے۔اس جہاز کے چیف انجینیئر ان کے بیٹے خالد تھے۔

اس سفرنامے میں قاری کو ہندوستان اور خاص طور پر بنگلہ دیش چٹا گانگ اور ڈھاکہ کی بندرگاہوں کے ساتھ خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہونے کے سامان بھی ملتے ہیں۔اور گہرے پانیوں کے ان باسیوں کے سمندر جیسے گہرے دل اور کھلی بانہوں سے استقبال کرنے کا لطف بھی ملتا ہے۔لیکن رشتے داروں کے وہ تذکرے جو صرف بڑائی کی خاطر بیان کیے گئے ہیں اور بہت طویل ہیں بعض جگہ گراں بھی گذرتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

> ''امت القدیدر نے سفرنامہ کراچی سے چاٹ گام تک میں اس سفر کی ہولناک روداد پیش کی۔لیکن مصنفہ پر ایسا خوف طاری ہے کہ وہ اپنی مہم جوئی کے باوجود اس سے لطف اندوز نہیں ہوسکیں۔چنانچہ یہ روداد سفر کم اور روداد غم زیادہ نظر آتی ہے۔اس پر مستزاد وہ غیر متعلقہ معلومات ہیں جن کا سفر کے ساتھ کوئی تعلق نظر نہیں آتا اور کہیں کہیں تو یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ سفرنامے میں خوف کے عناصر بڑھانے کے لیے زیب داستان سے بھی کام لیا گیا ہے''(۱)

لیکن اس سفرنامے میں سفر کی روداد نرم رو وجدان خیز لہروں کی طرح سے ہے جو اٹھتی ہے تو دھیان کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور فکر ونظر کے کئی بند دریچوں کو بہت رسان کے ساتھ کھول کر محسوسات میں ہلکی ہلکی ارتعاش پیدا کر دیتی ہے کہ قاری اس سحر انگیز فضا میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔آغاز میں سفر کی تیاری کا ذکر اس انداز میں کرتی ہیں کہ پند و نصائح کو بھی ہلے پھلکے انداز میں یوں بیان کرتی ہے کہ گراں نہیں گزرتی۔

۱۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۴۹

''ہاں یہ صحیح سنگار اور زینت عورت کے لیے ہے اسی پر زیب دیتا ہے مگر غیرت مند زندگی میں اسی حد تک داخل ہو کہ بوالہوس نامحرمی نظروں کا نشانہ اسکی نمائش نہ بن سکے۔ وقار انسانیت کے شیشے پر بیہودہ نگاہوں کی ضرب سے بال نہ آسکے بدقماش زبانیں آوازے نہ کسیں''۔ (۱)

لیکن اس سفرنامے میں نصیحت ہی نہیں بلکہ موسم کا حال بحری جہاز کی رفتار لہروں کی روانی سمندر کی طغیانی ہم سفروں کی دلچسپیاں سفر کوفت ذہنی بے چینی و پریشانی سب کا احوال بھی درج ہے لیکن بیان سادہ اور دلچسپ ہے۔

''صبح اٹھی تو حیرت کی انتہا نہ تھی اللہ میرے سونے سے قبل جہاز جس طرح اڑیل ٹٹو کی شان سے روٹھا کھڑا تھا ویسا ہی بے حس وحرکت پایا خوب وضعداری تھی ماننا پڑا''۔ (۲)

کتنے منفرد انداز میں جہاز کے نہ ٹھیک ہونے کی داستان بیان کردی ہے۔ لیکن راستے کی پریشانیاں اور ان کے تدارک کے مراحل کام کرنے والے عملے کے معمولات مشکل حالات میں بھی سست کاری ہر بات دلچسپ انداز میں بیان کرتی ہیں۔ خوبصورت تشبیہوں اور ~~استعاوں~~ استعاروں سے اپنے بیان کو رنگین ہی نہیں دلچسپ بھی بنادیتی ہیں۔

''مثلاً شب کی ساحرہ نے اپنا افسوں ڈالدیا اور میں نیند کے جادو میں سما گئی''۔ (۳)

ان کے خوبصورت بیان سے نہ صرف ماحول کی لطافت بڑھ جاتی ہے بلکہ اس سے قاری کے ذھن میں نقش معلوم بن جاتا ہے اور اس ماحول میں اپنے آپ کو چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔ اور تصور کی آنکھ سے اس کو دل میں اتارتا ہے اور انداز نثر میں بھی ایسا ہے کہ آزاد کی طرح معلوم ہوتا ہے جیسے کہ شاعری کررہی ہیں۔

''اٹھی تو جہاز چلتا ہوا معلوم ہو۔ مگر اسی سبک رفتاری سے جیسے کوئی مہوش نازنین بتاشوں پر نازک خرامی فرمارہی ہو نام کو بھی جنبش نہ تھی۔ میں لکھنے بیٹھی ہوں نہ ہاتھوں میں لغزش ہے اور نہ قلم میں لرزش ہے ~~اور نہ قلم میں لغزش ہے~~۔ میرے بے تکان کاغذ پر قلم بھاگتا چلا جارہا ہے''۔ (۴)

بحری جہاز کا سفر ایک ایسا سفر ہے۔ کہ جس میں مسافرنت نئے تجربوں سے دوچار ہوتا ہے۔ جہاز نے

۱۔ امت القدیر کراچی سے چاٹ گام تک ص۔ ۳

۲۔ ایضاً " ص۔ ۴۹

۳۔ ایضا " ص۔ ۶۸

۴۔ ایضاً " ص۔ ۶۹

کراچی سے چٹا گانگ کا سفر دو ماہ کے عرصے میں کیا۔ اور اس دوران اس جہاز کے کارکن محنت و جفاکشی سے جہاز کو ٹھیک کرنے میں مصروف رہے اور وہ اس دوران میں کن کن حالات سے دوچار ہوئے۔ وہ اس تمام صورت حال کی منظر کشی بے حد دلکش پیرائے میں بیان کرتی ہیں۔

''اللہ کے فضل سے ہماری تندری روز افزوں ترقی پذیر ہے۔ مرجھائے ہوئے چہرے کی بد زیب جھریوں پر پیتہ در پیتہ شادابیت کی نمو ہے ملگجی ملگجی سی مٹیالی جلد پر سرخی نکھر رہی ہے بال پہلے سے کچھ زیادہ ہی سرمئی رنگت اختیار کرتے جارہے ہیں۔ بزرگی جیسے عظیم وقار سے اکتا کر جو بہنیں کالا کولا کی مدد لیتی ہیں۔ میرے تجربے کی رائے ہے کچھ دنوں کے لیے بحری سفر پر نکل جائیں کیسا بے ضر نسخہ ہے بال سیاہ کرنے کا بلکہ ایک پنتھ دو کاج۔ سیر کی سیر اور تجدید جوانی بھی''۔(۱)

سفر کے دوران طمانیت اور تازگی ذھن و دل پر اپنے اثرات دکھاتی ہے سمندر کی زوردار و ٹھنڈی ہوائیں طوفانی لہریں جہاز کے ساتھ شوخیاں اور اٹکھیلیاں کرتی جاتی ہیں۔ موسم کی بدلتی ہوئی صورتیں اور اہالیان سفر پر انکے اثرات کبھی اطمینان اور کبھی پریشانی کا سامنا ہے ایسے میں آپس میں تبادلہ خیال کرتے ہوئے جو مشاورت اور دل کو تسکین پہنچانے کی باتیں بڑے خوبصورت اور دل کش پیرائے میں بیان کی ہیں۔ بلکہ کہیں کہیں تو ہمت اور توانائی کے ساتھ آگے بڑھنے کا درس یوں دیتی ہیں کہ اس انداز بیان سے ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔

''دریا کے صعوبت کے شناور کیا ہمت کے بغیر کہیں پار اترتے ہیں۔ سمجھ لو اگر ہمت ڈوب گئی تو ایک جہاں ڈوب گیا اگر ہمتیں سلامت ہیں اور ہم انہیں مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں تو خود بخود ڈوبے ہوئے جہاز ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ جیت ہار اور ہار جیت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ مگر خیر و شر لایعنی سے ہو جائیں''۔(۲)

زندگی کی صبح و شام بدلتے ہوئے رنگوں کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ انسان مختلف قسم کی جذباتی کیفیات سے دوچار ہوتا رہتا ہے کبھی غصہ و غم کبھی بیزاری اور کبھی متنفر ہونے کی کیفیات اور کبھی سب سے بچھڑنے کا دکھ یہ سب انسان کے اندر اور باہر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔

۱۔ امۃ القدیر بحوالہ سابقہ ص ۷۷
۲۔ ایضاً " ص ۱۰۴

''ایک وقت ایسا بھی آیا اجل کا غضبناک طوفان ٹھاٹھیں مارتا آرہا تھا۔ ہاں ہماری نگاہوں کے سامنے تیزی سے انکی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ موت کی لہروں میں چھپتے جا رہے تھے اور ہم خاموش دیکھ رہے تھے یہ بھی نہ پوچھا۔ بتاؤ متین وہ کہاں ہیں۔ اس واقعے کی یاد نے دل اور بھی تہ و بالا کر دیا''۔(۱)

امت القدیر منظر نگاری میں کمال رکھتی ہیں لیکن ان کی منظر نگاری ظاہری آرائش اور ملمع نگاری سے پاک ہے۔ سمندر کا تاثر عام حالت میں بھی وجدانی قسم کا ہوتا ہے پھر موسم حسین ہو تو اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

''سمندر پر بارش کی پھوار سے جو منظر ہے کیا بیان ہو قلم ترجمانی سے اور دماغ تشبیہ سے عاجز ہے آپ کے تصور پر چھوڑا۔ سنا ہے اس بادوباراں کا سلسلہ چٹگام تک چلے گا لیجیے اب تو بارش نے کچھ اور ہاتھ پاؤں نکالے ہیں سوئے کھل گئے سب شیشے چڑھا دیے گئے کمرے اندھیرے ہونے لگے لائٹ کا سوال کیا بجلی تو فیل ہے شیشوں پر پانی چھا گیا ہے۔ دھندلے ہو گئے ہیں مگر میں لکھے جا رہی ہوں جب تک لکھ سکوں جہاں تک نظر کام کرے فضاؤں کی بلندیوں سے لیکر سطح وسمندر تک سپیرے کی لڑیوں کی طرح نقاب چھائی ہوئی ہے''۔(۲)

انسان معاملات وتعلقات اور عقائد ونظریات کی قباحتوں پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ کسی واقعہ کا ذکر کرتی ہیں تو یوں مکالمات اور کیفیات کو پیش کرتی ہیں کہ واقعہ آنکھوں کے آگے گھوم جاتا ہے۔ بیشتر مقامات پر یونہی حسب حال مکالمہ بندی سے واقعات کا لطف دوبالا کر دیتا ہے۔

''ایک گوش برآواز بیرے کو اشارے سے بلایا اور لڑکے کا نام بتا کر کہا انھیں بلا لاؤ۔ وہ سر تسلیم خم کرتے ہوئے فی الفور چلا گیا انھیں آج انجن روم دیکھنے کا شوق چرایا تھا کسی کا بوائلر سوٹ مانگ کر لینا اور آگ وظلمت کے غار میں اتر گئے بیرا ڈھونڈتا ڈھونڈتا انھیں دوزخ سے بھی آخر پکڑ لایا وہ لڑکا بھونچکا سا دور کھڑا تھا یہ انداز نظر اور معصومانہ گردش نگاہی کا طرز بڑا پیارا لگا میں نے کہا کل سے نظر نہیں آئے کہاں تھے تم آہستہ سے کہا کوئی خاص مصروفیت تو نہ تھی اس لیے نہیں آیا آپکی مصروفیت میں ہرج ہوتا''۔(۳)

۱۔ امت القدیر بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۳۲
۲۔ ایضاً " ص۔ ۱۷۵
۳۔ ایضاً " ص۔ ۳۰۹

اس سفرنامے میں اسلوب بیان کے بھی بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اسلوب ادبی چاشنی اور اردو بول چال کی مخصوص حلاوت سے مزین ہے جس سے سفرنامہ پڑھتے ہوئے کہیں بھی بوجھل پن کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ چھوٹی چھوٹی روزمرہ کی باتیں بڑے بانکپن سے ہلکے پھلکے انداز میں بیان کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے طرز اظہار میں ایک شستہ تہذیبی مزاج کی حامل حسین اور شائستہ خاتون کی شخصیت جھلکتی ہے اور ان کے ہاں عام روزمرہ کا انداز چلتا ہے بات سے بات پیدا کرنے کے طریقے نے اور ان کی طبیعت کی شگفتگی مل جل کر متحرک منظرنگاری سامنے لائے ہیں اور اس نسائی قلم کی بے ساختگی اسے دلچسپ تر بنا دیتی ہے۔

وہ سفر کے دوران ہمہ قسم کے بیانات کی روداد یوں بیان کرتی ہے۔ کہ ہر پہلو پر ان کا تبصرہ مکمل اور جامع معلوم ہوتا ہے۔ وہ پڑھنے والوں کی طبع نازک کو ملحوظ رکھتی ہیں ہر بات لفظوں کے اس دلفریب پیکر میں ادا کرتی ہیں کہ بظاہر ذراسی معمولی بات بھی زبان اور تخیل کو ذائقہ اور لطف دے جاتی ہے۔

> ''جہاز۔۔۔کیا بتاؤں۔۔۔۔وہی چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سواب بھی ہے نئی بات تو صرف یہ ہے کہ پانی ختم ہوگیا ہے نہ انسانوں کے لیے اور نہ بوائیلر کے لیے مگر اب یہ فکر اور ذمہ داری سفید پوش افسروں کی ہے۔ وہ بہت متردد نظر آتے ہیں۔ دوسری خبر یہ ہے کہ سب سے بڑے انجن کا پائپ پھٹ گیا ہے سیمنٹ وغیرہ سے لڑیاں جوڑیاں جارہی ہیں مرہم پٹی ہورہی ہے۔۔۔۔۔سند باد جہازی سے کچھ کم ہم جہازیوں کی مہمات نہیں ہیں''۔(۱)

مجموعی طور پر یہ سفرنامہ خوف اور دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے ہے۔ اگرچہ یہ سفرنامہ حدیث ودیگراں سے بھرپور ہے اور اس میں کہیں کہیں تسلسل کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن انداز بیان چونکہ دلچسپ ہے اس لیے اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ واپسی کی روداد بہت مختصر ہے جو صرف بیس صفحات پر مشتمل ہے۔

اس سفر کا ہر ہچکولہ ان کے اندر یہ خوف پیدا کر دیتا ہے کہ اب نجانے اگلی منزل پر جہاز پہنچے گا یا نہیں۔ موت کے مہیب اور نزدیک سائے کھلے پانیوں پر اور بھی ہولناکی پیدا کرتے ہیں۔ اور یوں لگتا ہے کہ موت کا خوف ان کی رگوں میں اتر گیا ہے۔ اور خوف سے نہ صرف ان کی آنکھیں کھلی ہیں بلکہ جسم کے بال بھی کھڑے ہیں۔ اور یہ سفر خاص طور پر خوفناک اس لیے ہوجاتا ہے کہ بیان میں خوف کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر یہ سفر انجانے دیسوں پانیوں پر سفر کرتے ہوئے نت نئے تجربات سے بھی آشنا کرواتا ہے اور اختتام سفر بھی دلچسپ ہے۔

۱۔ امت القدیر   بحوالہ سابقہ   ص۔ ۱۰۲

اختر ریاض الدین (سات سمندر پار)

بیگم اختر ریاض الدین اردو ادب کی خواتین سفر نامہ نگاروں میں ایک روشن باب کی طرح ہیں۔ ان کے سفر ناموں کو بہت پذیرائی ملی۔ ان کے سفر نامے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے مظہر ہیں۔

بیگم اختر ریاض الدین ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۸ کو کلکتہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام فیاض حسین تھا۔ وہ ایک کاروباری آدمی تھے اور نشاط تھیٹر کے مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ والدہ روایتی قسم کی پٹھان اور خوبصورت عورت تھیں۔ خود اختر ریاض الدین بہنوں میں چوتھے نمبر پر ہیں۔ اردو سفر نامہ نگاروں میں ایک مشہور خوبصورت اور منفرد مقام کی حامل خاتون ہیں۔ ان کے سفر نامے ان کی قادر الکلامی شگفتہ اسلوب اور گہرے معاشرتی شعور کے مظہر ہیں۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی لکھتے ہیں ؛۔

> ''بیگم اختر ریاض الدین'' نہ صرف باشعور ہیں بلکہ ایک حساس ذہن کی بھی مالک ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی بات کہنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے۔ ان کی تخلیقی اور جبلی قوت نے ان سے یہ سفر نامے لکھوا لیے ہیں۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی تحریر کو محض تفریحات یا دلچسپی تک محدود نہیں رکھتیں۔ وہ باتوں باتوں میں نشتر بھی چبھوتی چلی جاتی ہیں''۔ (۱)

اختر ریاض الدین نے اپنے سفر نامے میں محض تجربات اور احساسات ہی بیان نہیں کیے تاریخ وسیاست ونفسیات ومعیشت غرض انسانی زندگی کے سبھی پہلوؤں کے بارے میں معنی خیز تفصیلات شامل ہیں۔ ان کے سفر نامے نازک احساسات کے بیان کے ساتھ ساتھ شوخی وشگفتگی ودلربائی اور دلفریبی کی داستان رقم کرتے ہیں۔ ان کے انداز بیان میں سلاست وسادگی کے ساتھ فکر ونظر کی گہرائی بھی ہے۔ بیگم صاحبہ کے سفر نامے نسائی حسن وشوخی کے بہترین مرقعے ہیں۔ کیونکہ ان کا انداز بیان پُر فراخ اور منفرد ہے۔ جو انہیں ایک صاحب اسلوب سفر نامہ نگار بناتا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر حسرت کاسگجوی بیسویں صدی میں اردو ادب اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۸۸ ص ۵۶

ڈاکٹر انور سدید اس بارے میں لکھتے ہیں۔

''اختر ریاض الدین نے سفرنامے کو ایک ایسی صنف ادب بنا دیا جس میں مشاہدہ سامنے کے منظر کو اور اس منظر میں پوشیدہ تاریخ کو ہی پیش نہیں کرتا بلکہ اسپر سفرنامہ نگار اپنے سیاسی سماجی اور تہذیبی ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔۔۔۔۔۔اختر ریاض الدین نے دنیا کو بازیچہ اطفال سمجھ کر دیکھا اور اس پر ایک شوخ اور کھلنڈرا سا تاثر ثبت کر دیا اور یہ سب کچھ اس فطری انداز میں ہوا کہ منظر کے کیف وسحر زدہ ہو کر قاری کے تصورات بھی درخشاں ہو گئے''۔(۱)

سات سمندر پار بیگم اختر ریاض الدین کا وہ سفرنامہ ہے جسے سفرناموں میں بہت پذیرائی ملی اس میں انہوں نے مشاہدے کو دل میں اتارنے اور اسے پروقار انداز میں بیان کرنے کی کاوش کی ہے۔اور روزمرہ زندگی کے مطالعے میں گہری دلچسپی لی ہے۔اور یہاں کے شہروں کے حسن اور قبح کو فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔انہوں نے اس میں ٹوکیو و ماسکو ولینن گراڈ وقاہرہ ولندن اور نیویارک کا ذکر کیا ہے۔اس سفرنامے کا انتساب تحریک امداد باہمی کے نام ہے کہ جن کی وجہ سے یہ منظرنامہ پایہ تکمیل تک پہنچا۔اس کا تعارف صلاح الدین احمد ایڈیٹر ادبی دنیا لاہور کے حوالے سے ہے وہ لکھتے ہیں۔

''فکروفن کی دنیا میں کبھی کبھی جو ہلکے ہلکے زمزمے آتے ہیں وہ بعض دفعہ بطن گیتی سے انجانے عجائب ونوادر برآمد کر کے اپنی یادگار چھوڑ جاتے ہیں زیرنظر تالیف ایک ایسے زمزمے کی یادگار ہے کہ اس کی کارفرمائی سے پہلے اس امر کے قطعا کوئی آثار نہیں تھے کہ ایک بالکل نئی فنکار کے افکار تازہ واحساسات لطیفہ ہمارے ادب میں داخل ہوتے ہی اس کی فضا پر چھا جائیں گے اور ایک ایسا ارتعاش جمیل ولطیف پیدا کر دیں گے جو ایک عرصہ دراز تک ہمارے تصورات کو لرزاتا اور ہمارے دلوں کے تار ہلاتا رہے گا''۔(۲)

بیگم اختر ریاض الدین محققانہ ذھن کی مالک خاتون ہیں جن کی نظر میں وسعت ذھن میں کشادگی وسیع مطالعہ ادب سے محبت اور قلم میں طاقت ہے۔وہ ان خوبیوں سمیت ادب کے میدان میں وارد ہوئیں اور پھر دنیا کے سفرنامہ پر ایسا چھائی ہیں کہ صرف سفرنامہ کو بام عروج پر پہنچانے اور خاص وعام میں مقبول بنانے میں ان کا حصہ بہت زیادہ ہے اردو سفرنامے کے قارئین یا محقق اس نام کو نظرانداز نہیں کر سکتے ہیں۔سات سمندر پار

۱۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص ۲۸۴

۲۔ صلاح الدین احمد سات سمندر پار (تعارف) حمایت اسلام پریس لاہور ۱۹۶۳ ص ۷

میں وہ سب سے پہلے ٹوکیو کا تعارف کرواتی ہیں۔

''جاپانی قوم آفتاب پرست بحر پرست جنگ پرست اور شہنشائیت پرست رہی ہے۔صدیوں کی ظلمت اور جنگ جوفتنہ پرور سرداروں کی مخاصمت کے بعد ۱۸۸۸ میں بادشاھت کے عہد جدید کا آغاز ہوا جاپان کی صنعتی ترقی اسی عہد سے شروع ہوئی ہے اور جاپان سرعت کے ساتھ رنگ جدید میں رنگا جاتا ہے''۔(۱)

صرف یہی نہیں ٹوکیو میں مذہب سیاست تعصّبات معیشت انسانی زندگی کے باہمی تعلق تاریخ جاپانی عورت اور جاپانی مرد کی صحت رہائش اور طوائف تک کا ذکر بڑی دلچسپی اور تفصیل سے کرتی ہیں بیگم اختر کا مشاہدہ دل کی اتھاہ گہرائیوں تک محسوس کیا جاسکتا ہے۔اور بیان میں کشش بھی ہے یہی وجہ ہے کہ قاری ان کے ساتھ سفر کرتا ہے۔وہ بیان اور منظر دونوں میں جان ڈالنے کا فن جانتی ہیں۔وہ جاپان کی زندگی کو ناقدرانہ نگاہ سے پرکھتی ہیں جاپانی خواتین کی صحت بہت اچھی ہوتی ہے جاپان صرف مردوں کا ملک نظر آتا ہے وہ یہاں کے مذہب اور اخلاق پر بھرپور تبصرہ کرتی ہیں کہتی ہیں۔

''عیسائی مذہب اس ملک میں اس لیے عام نہ ہوسکا کہ پادریوں نے اعلان کر دیا کہ نجات صرف ان کو ملے گی جو عیسائی ہوں گے کوئی جاپانی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ جنت میں چلا جائے اور اس کا باپ دادا دوزخ میں سڑتے رہیں کیوں کہ وہ عیسائی نہیں تھے۔چنانچہ عیسائیت سے زیادہ یہودی مذہب کی طرف لوگ راغب ہورہے ہیں یہودی ذرا زیادہ فراخ ذہنیت اور فراخ فلسفہ رکھتے ہیں علاوہ ازیں عیسائی پادری مذہب اور اخلاق کو مخلوط کر دیتے ہیں اور اہل جاپان مذہب کو اتنا قریب نہیں لانا چاہتے کہ وہ ان کی اخلاقی زندگی پر اثر انداز ہو''۔(۲)

اس طرح وہ جاپان کی اخلاقی اور سماجی زندگی پر بھرپور نگاہ ڈالتی ہیں کیوں کہ وہ دنیا کو غیر جانبدارانہ انداز میں دیکھتی ہیں۔اس لیے ان کا سفر گراں نہیں گزرتا وہ جاپان کا کوئی تھیٹر گیسٹ خانے سرائیں ہوٹل زبان رات کی رنگینیاں پھولوں کے ہار پھولوں کو سجانے کے طریقے سے لیکر یہاں کی تاریخ تک بیان کرتی ہیں لکھتی ہیں۔

۱۔ اختر ریاض الدین   سات سمندر پار   حمایت اسلام پریس لاہور ۱۹۶۳   ص ۳۰

۲۔ ایضاً   ص ۳۶

’’جاپان کو پہلی جنگ عظیم کے بعد مشرق کا جنٹلمین یعنی سب سے مہذب ملک قرار دیا گیا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کا ظالم ترین قصاب ٹھہرایا گیا ان دونوں مبالغوں کے درمیان کچھ گنجائش ہے۔ اور غور سے تاریخ کے اوراق ویرائے جائیں تو شاید دونوں بیانات سچ ہوں یہ قوم جنگجو اور جنگ پرست ہے اور ہمیشہ اس کی نظر ہمسایہ کی ملکیت پر رہتی ہے جو ظلم وتشدد سفا کیاں اس نے چین برما ہانگ کانگ اور کوریا میں کی میں ان کا حال پڑھنے اور سننے سے انسانی تہذیب لرز جاتی ہے اس کے بر عکس روزانہ زندگی کے دوران میں نہایت بااخلاق اور شیریں مزاج ہے‘‘۔(۱)

بیگم اختر ریاض الدین کا تعلق دھلی کے علمی اور ادبی گھرانے سے تھا چنانچہ ادب کا افق انہیں اپنی قلم کی جولانی کے لیے واملا ان کے انداز میں بے ساختہ پن بھی ہے اور اسلوب پر گرفت بھی وہ اپنے خیالات اور مشاہدہ کو یکجا کر کے بڑی خوبصورتی سے بیان کرنے کا فن جانتی ہیں۔ جاپانی قوم بے حد محنتی قوم ہے اس کے بارے میں لکھتی ہیں اور کیا خوب لکھتی ہیں۔

’’ایک انگریز مزاح نگار لکھتا ہے کہ میں رات کو ایک شبینہ کلب کی رنگین محفل میں بیٹھا تھا پریاں نیم برہنہ رقص کر رہی تھیں میں نے مسکراتے مسکراتے اپنی سرشار نظریں دو جاپانی پر ڈالیں تو وہ عینکیں لگائے بہت غور خوض سے برہنہ ناچ کا جائزہ لے رہے تھے ایک تو کچھ نوٹ بھی رکھتا جار ہا تھا میں یہ منظر دیکھ کر کانپ گیا میرا دم گھٹا یہ کلب ہے یا تجربہ گاہ۔ باہر نکل کر میں اپنے جاپانی دوست سے کہا۔تمھاری قوم میں ایک چیز کی سخت کمی ہے اور وہ ہے بامذاق حس ظریفانہ تو اس دوست نے فوراً اپنی چھوٹی سی نوٹ بک نکال کر لکھا ورزش بذلہ سنجی صبح آٹھ بجے‘‘۔(۲)

بیگم اختر کے یہاں میں ایک طرف خیال کی رنگینی وشوخی ہے وہاں نسوانی حسن کے دلکش نمونے جملوں کی نزاکت اور جوانی کی دلربائی بھی ہے جس نے ان کے سفرنامے کو نیا آہنگ بخشا ہے۔

’’جاپانی عورت چاہے کتنی ہی میم بنتی جار ہی ہو جس وقت وہ منہ کھولتی ہے تو اس کی آواز کے ساتھ مشرقیت شروع ہو جاتی ہے ہمارے شاعروں کی تخیلی شیریں دھنیں

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۴۰۔۴۱

۲۔ ایضاً ص ۴۷۔۴۸

وہیں لباس مجاز میں آئی ہیں وہ بولتی کیا ہیں کہ منہ سے رس ٹپکتا ہے اور ہمارے مردوں کے منہ سے پانی یہ انکی نسوانیت پر جی جان سے فدا ہیں جب ان شریں دہن عورتوں کے سامنے آواز نکالتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کمرے کے شیشے چیخ گئے''۔(۱)

یہ سفرنامے نہ صرف ان کو شہرت کے بام عروج تک پہنچانے کا باعث بنے بلکہ پڑھنے والوں کو ایک نئی اواز اور نیا انداز بھی سننے اور پڑھنے کو ملا جس سے قارئین ان کے گرویدہ ہو گئے۔اس سفرنامے نے اُس تشنگی کو بھی ختم کیا جو مرد حضرات باوجود اچھا سفرنامہ نگار ہونے کے بھی ختم نہ کر سکے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

''اختر ریاض الدین نے تیزابیت کو ہلکے اور لطیف مزاح میں اسطرح لپیٹا ہے کہ قاری ان کے تاثر کی شدت میں شامل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ان کی نگارش گوہریں جس کی تحسین مولانا صلاح الدین احمد نے بھی کی ہے مزاح کی اس شائستگی سے ہی مرتب ہوئی ہے انہوں نے سفر کے تاثر کو جس خوبصورت انداز میں مفرد جملوں میں منتقل کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اختر ریاض حقیقت کے ابھرے کناروں کو بیضوی صورت میں ڈھالنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے چنانچہ انہوں نے زندگی اور اخلاقیات کے بوجھل نکات کو بھی لطافت سے پیش کیا ہے سفرنامہ ان کے نزدیک محض سیر ہی نہیں بلکہ سماج سدھار کا ایک وسیلہ بھی ہے''۔(۲)

ایک اور فنی کمال ان کا یہ ہے کہ وہ غیر ضروری طوالت سے گریز کرتی ہیں اور فلیش بیک کی تکنیک اپنا کر مانی کی فتوحات اور شکست کا تذکرہ چند سطروں میں بڑی آسانی سے بیان کر دیتی ہیں ان کی تصانیف اپنے اندر عجیب دلکشی نئی زندگی کا سحر چھپائے ہوئے ہیں اس سحر نے ان کی تحریروں کو ایک کرشمہ بنا دیا ہے۔بیگم اختر ریاض الدین اور کرنل محمد خان نے صرف سفرنامہ کو زعفران زار بلکہ سدابہار بنانے میں بڑی محنت کی ہے اور اس کا نتیجہ یہ کہ اردو ادب میں سفرنامہ آج کسی دوسری صنف سے پیچھے نہیں بلکہ اس کی قدر و اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔

دوسرا باب ماسکو اس سفرنامے کا طویل ترین حصہ ہے پاکستان کی امریکہ نواز حکومتیں اور سامراج سے رشتہ جوڑنے والے نوکر شاہی جس طرح اس صدی کے پانچویں اور چھٹے عشرے میں اور پھر اب روس کے بارے میں مغربی ذرائع و ابلاغ کا تعصب اس تناظر میں بیگم صاحبہ کا نہایت و جرأت مندانہ اقدام ہے کہ انہوں

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۲۰

۲۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص ۲۸۸

نے بعض ناپسندیدہ شخصیات کے لیے بعض مقامات پر ستائشی اور ہمدردی کا لب ولہجہ اختیار کیا ہے جو کہ انتہائی غیر معمولی اقدام میں شمار ہوتا ہے روسی معاشرے اس کے نظام کے بارے میں ان کے بیانات زمانے اور حکومت کی مخصوص نزاکتیں کو بالائے طاق رکھ کر بڑی جسارت سے بیان کیا ہے۔ لکھتی ہیں۔

صدیوں کے برفانی اور سیاسی طوفان ومصائب برداشت کر کر کے یہ قوم ٹھوس ہو گئی ہے ان بازوؤں میں خون منجمد ہو کے لوہا بن گیا ہے ایک حیرت کی بات یہ بھی دیکھی کہ پاسپورٹ دیکھنے میں روسی افسروں نے دیر نہیں لگائی اور مرا سامان نہ کھولا نہ چھوا یورپ کے کئی شہروں میں سامان کھولنا پڑتا ہے ایشیا میں تو کئی جگہ پوری جانچ پڑتال ہوتی ہے لیکن یہاں پر کسٹم کے منکر نکیروں نے کوئی سوال جواب نہیں کیے روسی جب ایک دفعہ فیصلہ کرلیں کہ کس معاملے میں ڈھیل دینی ہے تو پوری ڈھیل دیتے ہیں۔''(۱)

بیگم اختر ریاض الدین کے انداز میں نظر کی دلفریبی اور فکر کی گہرائی ہے وہ جہاں جاتی ہیں وہاں کے بسنے والے انسانوں کے احساسات کے ساتھ ساتھ فکری وجذباتی ترجیحات کا بھی جائزہ لیتی ہیں لکھتی ہیں۔''

''ماسکو میں لاکھ روپیہ کی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک لعنت سے پاک ہے جس کا نام کوکوکولا ہے۔ یہ ملعون شربت یہ فرفزی ہیم قاتل ہمارے غریب ملک کا قومی مشروب بنتا جارہا ہے اس ملک سے دودھ چھٹا لسی چھٹی، انگریز نے چائے نازل کی امریکن نے کوکولا انا للہ۔ خیر صاحب یہ بوتل ہڑپہ سے ہونولوتک اور آگرے سے بنا گہرہ تک ہردوکان ومکان میں نظر آتی ہے اس سے کہیں مضر نہیں اگر ہے تو ماسکو میں۔''(۲)

صرف یہی نہیں بلکہ وہ علم وادب اور فنون لطیفہ سے جھلکتی ہوئی حقیقت پسندی کے بارے میں برملا اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں لفظوں کو اس کی اول سطح کے مطابق سچائی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں جس کے اثرات ثمر آور ہوتے ہیں لکھتی ہیں۔

''جو غیر مصالحانہ حقیقت پسندی آپ کو روسی ادب میں ملتی ہے وہی آپ کو روسی کینوس پر نظر آتی ہے باریک سے باریک تفصیل بھی فطرت کے اتنی قریب رکھی جاتی

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۵۵

۲۔ ایضاً ص ۷۵

ہے کہ معلوم ہوتا ہے مصوری نہیں فوٹو گرافی ہے اس پر جدید آرٹ چونک تلملا جاتا ہے اور احتجاج کرتا ہے کہ مصوری فوٹو گرافی نہیں ہے بقول جدید فنکاروں کے وہ چاند ہی کیا جو دکھائی دے چاند عوام کو گول روپیہ معلوم ہوتا ہے شاعر کو چوکور زردی اور مصور کو قرمزی تکون ۔ آخر نظر نظر ہے بشر بشر ہے فنکار کا پیمانہ ایرے غیرے کا فیتہ یا ریاضی کا فٹا تیس برس کا ترازو الگ نے باٹ الگ شاعرانہ صداقت اور مادی حقیقت کا ایک دوسرے سے کوئی علاقہ نہیں ۔'' (۱)

بیگم اختر ریاض الدین روسی نظام پر تنقید کرتے ہیں ۔

''آزادی رائے نہ ہونے کی وجہ سے اخبارات صرف حکومت کے قصیدہ خواں ہیں اور اس کی خارجی یا اندرونی پالیسی پر کوئی نکتہ چینی نہیں کر سکتے پریس کا گلا گھونٹنا عوام کی نبضیں کاٹ دینے کے برابر ہے عوام بزریعہ پریس جب تک اظہار خیالات کرتے رہیں ان کو سیاسی دمہ یا جذباتی حبس نہیں ہوتا یہ ننھا سا نفسیاتی نکتہ واللہ اعلم حکمران کب سیکھیں گے''۔ (۲)

ادب اور سماج کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ادب اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہیں ہو سکتا ہے ادب منظر نامہ ہوتا ہے وقت کا حالات کا اور واقعات کا اور سب سے بڑھ کر ادبی روایات کا اختر ریاض الدین روسی قوم کے ذوق مطالعہ کے بارے میں لکھتی ہیں ۔

''روسی لگ کتابوں کے بہت بھوکے ہوتے ہیں سال بھر میں ساری دنیا میں شائع ہونے والی کتابوں کی سب سے بڑی تعداد روس میں شائع ہوتی ہے روس میں ۲۱۳ پبلشنگ ہاؤس ہیں جو ایک سو بائیس زبانوں میں کتابیں چھاپتے ہیں'' (۳)

وہ ان کے شوق مطالعہ سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہیں ۔ اور ان کے معیار امتحان سے بھی کہ یہ قوم محنتی ہے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا نہیں بلکہ کچھ کرنا چاہتی ہے اور ایسا کہ جو یادگار ہو ۔ کیونکہ یہ قوم ماہرین ہیں اور جب کوئی زبان سیکھتے ہیں تو اس عرق ریزی کے ساتھ کہ اہل زبان کو بھی مات کر دیتے ہیں ۔

ان کا شمار دور جدید کے ان سفر نامہ نگاروں میں ہوتا ہے کہ ان کے فکری شعور نے تاریخ کو نہ صرف سفر نامے میں نیا مقام دیا ہے بلکہ ادب و تاریخ کو اس طرح ساتھ لیکر چلتی ہیں کہ تاریخ کی معلومات بھی ان کے سفر نامے میں ادب کی چاشنی کے رنگ میں رنگی نظر آتی ہیں انہوں نے اپنے سفر نامے کو دھنک کے خوبصورت رنگوں

۱۔ اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۸۸

۲۔ ایضاً ص ۸۰

۳۔ ایضاً ص ۹۸

سے مزین کیا ہے اور زندگی کے بے شمار پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے۔ ان کے عمدہ اور سلجھے ہوئے انداز نے ان کی اہمیت کو قلم وا کر دیا ہے۔

''اس قوم کی تاریخ پر سرسری نظر دوڑا کر یہ اندازہ ہوا کہ اس قوم سے زیادہ تیرہ بخت قوم صفحہ ہستی پر کبھی نمودار نہیں ہوئی اس کے مظلوم عوام نے کبھی عدل و مساوات امن و اطمینان نہیں دیکھا تاریخ میں کوئی ملک ایسا نہیں جس کی رعایا نے تاریک دور کے بعد زریں عہد نہ دیکھے ہوں قوموں کی داستان نصیب و کردار کا ایک تصادم رہا ہے کبھی اقبال بلند کبھی پست۔ آواگون کے چکر کی طرح کبھی موت کبھی زیست ہندوستان کے باشندوں نے اگر نادر اور تیمور کی ہلاکتیں دیکھیں تو سمراٹھ اشوک چندر گپت شیر شاہ سوری فیروز شاہ تغلق کے فراخ زمانے اور عہد اکبری اور جہانگیری بھی دیکھے انگلستانیوں نے ملکہ الزبتھ اور وکٹوریہ کے سنہری دور دیکھے لیکن روسی عوام نے کبھی آزادی اور تاریخ اقبال نہ دیکھی اس کے شہنشاہوں نے معرکہ آرا جنگیں جیتیں پر جلال قصر اور قلعے بنائے گئے گرجے کھڑے کیے خزانے بھرے لیکن رعیت محکوم اور محروم ہی رہی۔'' (۱)

اب سفرنامے وقتی تاثر کے حامل نہیں رہے بلکہ ایک خاصے کی چیز بن گئے ہیں جن کا نقش ہمیشہ قارئین کے ذہن پر رہتا ہے۔

اگلا باب لینن گراڈ کے بارے میں ہے لینن گراڈ روسی تاریخ اور تہذیب کے ایک اور رخ کو ضم دیتا ہے جو روس کے ظلم و ستم اور مذہب کے نام پر بننے والے لافانی شاہکاروں کی تفصیل سے مزین ہے لینن گراڈ روس کی دل ہے اور اس کے ماضی اور حال کی تہذیب اور تمدن کا گہوارہ ہے اسے روس کا دراسود کہا جاتا ہے اور اہل نظر اسے حسن کا مرکز و محور قرار دیتے ہیں۔ لیکن پچھلی اور بوڑھی نسل لینن گراڈ کو ابھی تک پیٹرز برگ کہتی ہے ماسکو والے لینن گراڈ کو رنگین بیوہ کہتے ہیں۔ بیگم اختر ریاض الدین لینن گراڈ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''لینن گراڈ کی تاریخ درحقیقت پیٹر اعظم کی تاریخ ہے اور ایک کا ذکر کرنا اور دوسرے کا نہ کرنا گویا جسم و روح کا جدا کرنا ہے پیٹر اعظم لینن گراڈ کا خالق بھی تھا اور روح رواں بھی یہ سات فٹ لمبا لحیم شحیم شہنشاہ مطلق ایک بے رحم ترقی پسند اور متلون مزاج شخصیت کا مالک تھا اس کی ہمہ رنگی ضرب المثل بن چکی ہے گونا گوں فنون کے جن اسی نے تابع کر رکھے تھے جس علم پر ہاتھ ڈالتا تھا اسے پوری طرح قابو کر

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۱۲۱۔۱۲۲

کے چھوڑتا تھا اس دیوزادے نے اپنی سیاستدانی اور فہم وذکا اور حیوانی طاقت سے دنیائے قدیم کی جہالت اور پسماندگی کے تاریک غاروں سے اپنی وحشی قوم کو باہر نکال کر اٹھارویں صدی کے قرب جدید سے آشنا کیا اور اپنی ۴۲ سالہ حکومت میں روس کو ایک موڈرن طاقت ثابت کر کے تاریخ یورپ کا رخ پلٹ دیا۔'' (۱)

بیگم اختر ریاض الدین کی اپنے سفرنامے پر گرفت مضبوط ہے کیونکہ کبھی وہ قاری کو ماسکو لے جاتی ہیں اور کبھی جاپان کی جدید ترقی سے آشنا کرواتی ہیں اور کبھی لینن گراڈ کی تاریخ پر تبصرہ کرتی ہیں لیکن اس میں انہوں نے مشاہدوں اور تجربوں سے ایک حقیقی دنیا سے آشنا کروایا ہے جو اگر پہنچ سے دور ہے لیکن تخیل سے نزدیک ہے اور لطف کے سامان فراہم کرنا سفرنامہ نگار کے لیے ضروری ہے وہ عوامی زندگی کے مسائل سے طبقہ خاص کے مسائل تک بڑی آسانی اور روانی سے بیان کرنے کا فن جانتی ہیں۔ اگرچہ وہ جہاں بھی گئیں کسی سفیر یا انھی سوسائٹی کے لوگوں کی مہمان رہیں اور انہیں ہر وہ سہولتیں میسر رہیں جو اس قسم کے مہمانوں کو میسر ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ عملی زندگی سے زیادہ دور نہیں رہیں بلکہ حرکت اور عمل ان کے سفرنامے کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ اسی چیز نے ان کی تحریر میں دلکشی اور جاذبیت پیدا کر دی ہے وہ جزیات کو کل کے ساتھ پیش کرنے کے فن سے آشنا ہیں۔ اختر ریاض الدین چھوٹے چھوٹے جملوں میں وسیع کائنات سمیٹ لیتی ہیں ان کے سفرناموں کی ایک اور خصوصیت ان کی نسوانیت بھی ہے ان کی تشبیہات بھی نسوانی رنگ ڈھنگ لیے ہوئے ہیں خاتون خانہ ہونے کی وجہ سے ان کی نظر گھر داری اور باورچی خانے تک ضرور جاتی ہے۔

> '' جاپانی کھانا عموماً دیکھنے میں عمدہ اور سننے میں اس سے بھی اچھا ہوتا ہے ہر ڈش کی سجاوٹ الگ ہوتی ہے اور کھانے چٹخارے لے لے کر سڑ پے مار مار کھائے جاتے ہیں اور دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ با آواز بلند داد دی جا رہی ہے سنا ہے کہ اچھے دستر خواں پر گل واؤدی کا اچار بھی ہوتا ہے یہ سب امیروں کے کھانے ہیں عوام اور پیشہ ور تو ابلے چاول اور کچی مچھلی پر ہی پلتے ہیں۔'' (۲)

بیگم اختر اپنے سفرنامے میں کراچی سے نیپلز تک ذکر بھی کرتی ہیں یہاں ان کا اسلوب انتہائی رومانوی رنگ لیے ہوئے ہے وہ ہر فقرے پر جملے اور ہر لفظ میں ایک برقی رو دوڑ دیتی ہیں وہ تخلیقی فضا تخلیق نہیں کرتی

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۱۳۵

۲۔ ایضاً ص ۳۰

بلکہ نظروں کو آس منظر سے یوں کر دیتی ہیں کہ یعنی منظر صرف آخر ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں اور یوں منظر متحرک ہو کر خود بولنے لگتا ہے۔ مثلاً

''قدرت کے تین عنصر یہاں ملکر کامل ہوئے۔ اب آسمان اور میری لازوال روح نے سمندر کو گہرائی دی نیلی آسمانی بھاپوں کو ملائم تری دی۔ لہروں کو شوخ حرکت' بے کراں سعید جھاگوں کو پاکی 'مدوجزر کو لچک' ساری کائنات کو ذوق زیست' ہر لہر ایک ننھے سے بھڑکتے آتش فشاں کی مانند اڈتی پھٹتی اور میرے خوابوں کی طرح روشنیوں میں تحلیل ہو جاتی زمانہ رفتہ کی تمام شاعری وجنوں میرے آنے کی پیشین گوئی میرے بعد آنے والا تمام عشق ونغمہ میری گونج میری جھنجھاہٹ میری روح سمندر کی روح پر غالب تھی''۔ (۱)

بیگم اختر کے بیان میں بناوٹ نام کو نہیں وہ ہر فقرے اور ہر جملے کا ہر محل استعمال جانتی ہیں۔

''سورج اپنے عنابی اوج میں افروزاں سخاوت کے لنگر بانٹ رہا تھا اس نے اپنی روشنیوں کے بند توڑ دیے اور اپنی کرنوں کا اذن عام کر دیا اس کی تیز حدت میں سمندر بھی تیز حرکت میں آ گیا معلوم ہوتا تھا کہ ہزار ہا بلوری فانوس چیخ چیخ کر پانی میں کرچی کرچی ہو رہے ہیں ان پانیوں میں کتنے نقش بنتے اور بگڑتے گویا کوئی بے چین مصور واٹر کلرز میں لطیف عظمتیں بے اعتنائی سے کھینچے اور پھر مٹا دے''۔ (۲)

بیگم اختر کو زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنے کا شوق ہے قدرتی مناظر سے انہیں والہانہ عشق ہے پرانی تہذیب کو وہ مسترد نہیں کرتیں بلکہ جدید وقدیم کا حسین سنگم پیدا کر دیتی ہیں وہ قاری کے ذہن کا امتحان لیتی ہیں اور ضمیر پر کچو کے لگانا فرض اولین سمجھتی ہیں لیکن وہ باشعور سفرنامہ نگار ہیں وہ مقصدیت کو فن پر غالب نہیں آنے دیتیں بلکہ سفرنامے کے مقصد کو مدنظر رکھتی ہیں کہ اس کا مقصد سیر وتفریح ہے اور اسی تخلیقی قوت نے ان کے سفرنامے کو خشک نہیں ہونے دیا وہ اصل بات کو بھی بعض اوقات اشاروں کنایوں میں کر جاتی ہیں جو گراں نہ گزرے اور نشتر بھی نہ چبھونے وہ اپنی تحریر میں نہ زاھد خشک ہیں نہ رند بلکہ وعظ وتبلیغ کی بجائے محض تفریحات کے ذریعے اپنی بات زیادہ مناسب اور بہتر طریقے سے کرنے کے فن سے آشنا ہیں۔ کیونکہ سفرنامے کوئی ٹھوس علمی چیز نہیں ہوتے اس میں ہلکے پھلکے انداز میں قاری کے علم میں اضافہ کرنا اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ کی خاص نظریے کی پرچار ہوتا ہے لیکن بعض اوقات وہ عام انداز میں ان نظریات کو سمجھ ہی نہیں سکتا جس طرح وہ ہلکے پھلکے

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۱۴۴

۲۔ ایضاً ص ۱۵۹

اندازمیں جان لیتا ہے۔کہتی ہیں۔

''ان پانیوں میں خداؤں کی طاقتیں ہیں کتنے سورجوں نے راج راجے کتنے چاندوں نے چاندنیاں منائیں کتنے معاشرے ابھرے اور گہنائے لیکن اس کی لازمان اور لامکان روایتوں میں کوئی فرق نہ آیا یہ موت پر حاوی زیست پر غالب یہ حیات سفر کی اندرونی خواہشات یہ خدانے معبود خالق کائنات کی ابدیت کا ایک حاوی مظاہرہ۔'' (۱)

'' کتنے خوبصورت طریقے سمندر کی لامحدود وسعتوں کو بیان کر دیا ہے۔اور فنا و بقا کے سلسلے کو بھی اور ہمیشہ رہنے والی ذات کو بھی کراچی سے نیسپلز تک ان کی تخلیقی قوت کا شاہکار ہے۔

کچھ ورق انہوں نے قاہرہ کے بارے میں بھی لکھے ہیں قاہرہ جو قدیم و جدید تہذیب کا سنگم ہے اور اس کی عمر چار ہزار سال قبل از مسیح کی ہے دریائے نیل کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''دریائے نیل تاریخ کی سیر گاہ۔مصر کی زراعت اس نے سیزر کی فوجیں قلوپطرہ کے جشن محبت دیکھے ہیں توتخ امون کے غضب وستم اور بنی اسرائیل کے الم وعظم یوسف کا حسن زلیخا کے ناز دیکھے ہیں یہ نپولین کی آماجگاہ مشرق اور مارک انتھونی کی کر بلائے عشق یہ مؤرخوں کا تخیل اور شاعروں کا خواب کیا یہ دریائے نیل ہے ایک چھوٹی سی گدی اور جس کے ایک مخملیں اور نقرئی قہقہے دوسری طرف سنسان غربت یہ حقیر نالہ تاریخی نیل کا مضحکہ لگ رہا تھا''۔(۲)

آخری حصہ لندن اور نیو یارک کے بارے میں ہے وہ لندن اور نیو یارک کا تعارف کچھ اس طرح کرواتی ہیں۔

''دوجداگانہ شخصیتیں ہیں رنگت جدا مسافت جدا چال جدا سال جدا غذا جدا تعلیم جدا اقدار جدا معبود جدا ایک دارالحکومت ہے اور ایک دارالتجارت۔'' (۳)

یہ آخری تین مضامین ان تاثرات کی جھلکیاں ہیں جو انہوں نے بہت کم عرصے میں محسوس کی ہیں بہر حال تاثرات اچھے ہیں۔بیگم اختر ریاض الدین کی تحریروں میں مزاحیہ الفاظ جملوں اور واقعات سے

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۱۶۶۔
۲۔ ایضاً " ص ۱۶۸۔
۳۔ ایضاً " ص ۱۷۲۔

بے تکلفی کی فضا پیدا کرنے کا فن بھی ہے اور ان کے انداز میں ساختگی پائی جاتی ہے وہ لہجے میں بے تکلفی پیدا کر نیکے فن سے آشنا ہیں وہ طنز و اور مزاح کو ہر جگہ اپنے مزاج کا حصہ بنا کر پیش کرتی ہیں اور ہر موقع کی مناسبت سے انداز میں نازک اور لطیف فرق بھی پیدا کر لیتی ہیں شگفتہ لہجے میں تبصرہ کرتی ہیں اور تلخی سے گریز کرتی ہیں بلکہ کبھی کبھی شگفتگی کو برقرار رکھنے کے لیے تحریف نگاری سے کام لیتی ہیں ان کے ہاں لفظی مزاح کے عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

''غسل خانہ اتنا صاف وشفاف کہ قدم رکھنے کی بجائے اسکے قدم لینے کو دل چاہے۔'' (۱)

''ایک جاپانی گلدان چننے میں زیادہ وقت لگتا ہے اور دلہن چننے میں کم۔'' (۲)

''لیکن ان کے دیوتا شاید اونچا سنتے ہیں اگر چہ جب بھی سنتے ہیں پورا سنتے ہیں اور جو مانگو وہی دیتے ہیں ہمارے دیوتاؤں کی طرح سنی ان سنی نہیں کرتے۔'' (۳)

جہاں سب ایک ہی حماقت کر رہے ہوں وہاں تنہا ادراک ایک مضحکہ خیز عجوبہ لگتا ہے۔ (۴)

مجموعی طور پر ان کے سفر ناموں میں مشرق و مغرب کا حسین امتزاج نکل آتا ہے ان کی معلومات عام سفر نامہ نگاروں سے بدرجہا بہتر ہیں انکے اسلوب میں برجستگی بھی ہے اور صداقت بھی۔ ایک حساس سفر نامہ نگار کی طرح انہوں نے ذہانت اور شعور کے ساتھ وہ سب کچھ پیش کیا جو دیکھا اور محسوس کیا ان کی تشبیہات اور استعارے لطیف ہیں وہ جز و تماشا ہو کر تہذیب و تمدن کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ زندگی پوری طرح منعکس ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

سفر نامے کا فن شخصیت اور ماحول حقائق واقعات اور اسلوب نگارش سے مکمل ہوتا ہے اختر ریاض الدین کے سفر نامے میں یہ تینوں چیزیں نظر آتی ہیں۔ ندرت بیان کے لحاظ سے اور نسائی انداز میں بھی گہری ادبیت موجود ہے مثلاً جب وہ ماسکو جا رہی تھیں لوگوں نے ان کو ڈرایا کہ وہ دشمن ملک میں سیر کے لیے کیوں جا رہی ہیں ۔تمہارے پیچھے جاسوس لگے رہیں گے تو جواب دیتی ہیں۔

''عورت کو تعاقب بہت پسند ہے وہ بھی جب اور لوگ اس کا کریں، دوسرے بولے اتنی ظالم سردی پڑتی ہے کہ ناک کان جھڑ جاتے ہیں میں بولی میری ناک اتنی لمبی ہے کہ ذرا سی اگر جھڑ گئی تو کوئی مضائقہ نہیں یہ کوئی قلوپطرہ کی ناک تو ہے نہیں جس

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۱۷۲

۲۔ ایضاً // ص ۱۶۳

۳۔ ایضاً // ص ۱۵۵

۴۔ ایضاً // ص ۱۵۳

کی کمی بیشی سے تاریخ نیا رخ بدل دے''۔(۴)

''بیگم اختر ریاض الدین کائنات میں بکھرے مظاہر اور نظر آنے والی سبھی چیزوں کا جزئیات سمیت مطالعہ کرتی ہیں انور سدید لکھتے ہیں۔

''انہوں نے ماسکو پیرس لندن اور دوسرے شہروں کو قریب سے دیکھا اور اپنا تاثر خالص نسائی رویئے سے پیش کر دیا انہوں نے بہت سی ایسی جزئیات کو سمیٹا ہے جن پر دوسرے سیاحوں کی نظر بھی نہیں پڑتی ہے''۔(۱)

بہرحال بیگم اختر ریاض الدین نے سفرنامے کو دنیائے ادب میں ایک نئے روپ میں پیش کیا ان کے سفرنامے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص ۵۲

بیگم اختر ریاض الدین (دھنک پر قدم)

بیگم اختر ریاض الدین نے دو سفر نامے لکھے پہلا سات سمندر پار جس میں دنیا کے چھ بڑے شہروں کا ذکر کیا۔ دوسرا سفر نامہ دھنک پر قدم ہے۔ ان دو سفر ناموں نے مصنفہ کو سفر نامے کی صنف میں بام عروج تک پہنچایا اور اردو سفر نامے کے قارئین ایک نئی آواز اور نئے انداز سے روشناس ہوئے۔ سات سمندر پار کے برعکس اس سفر نامے میں تعارف دیباچہ اور کسی حوصلہ افزاء قسم کی تحریر یا تعارفی حوالہ کا شامل نہ کرنا مصنفہ کی ایک طرف مقبولیت اور دوسری طرف ان کی خود اعتمادی کا مظہر ہے۔ لیکن اعتزار کے نام سے جو اپنی تحریر کے تعارف کے طور کے پر لکھا گیا ہے اور اس ایک ورق میں بظاہر تو انکساری لیکن حقیقت میں اپنے تعلقات انگریزی زبان پر دسترس اردو ادب سے نا آشنائی اپنی اہمیت دعوت ناموں کا ذکر اور پھر اپنے والد صاحب کی علمیت کا بھی ذکر ہے لکھتی ہیں۔

> ''جب ان کو میری پہلی کتاب کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے بلوا بھیجا اور کہا صاحبزادی اس ملک میں اردو چین سے اپنی موت آپ مر رہی ہے تم اس کے آخری وقت میں اس کی مٹی پلید نہ کرو اس طنز کے نتیجہ میں دوسری کتاب حاضر ہے ضد میں انسان کیا کیا حرکتیں نہیں کر بیٹھتا۔'' (۱)

اس میں ان کا احساس مقبولیت اور آئندہ تخلیقی اور تنقیدی عزائم ظاہر ہوتے ہیں۔ دھنک پر قدم مکمل اور کامیاب روداد سفر ہے تاہم اسم میں ہوائی کے بارے میں بڑی خوبصورت معلومات دی ہیں۔ نسائی انداز اور شگفتہ انداز تحریر نے اس بیان کو رنگین اور مخمور بنا دیا ہے۔

> ''دنیا کے حسین سفر ہمیشہ مجھ پر مسلط رہے یہ ایک اور سہی کچھ اتنے لمبے ہوائی سفر کا ڈر کچھ ایک صاحبہ نے ڈرایا کہ ٹوکیو سے سونس لولو تک نیچے بحرالکاہل ہوتا ہے اور اوپر خدا کہیں زمین کا ذرا سا ٹکڑا بھی ڈھارس کے لیے دکھائی نہیں دیتا۔'' (۲)

بیگم اختر ریاض الدین کا بیان اگرچہ اپنے بارے میں انکشاف اور دوسری فتح مندی کا تذکرہ ہے لیکن

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین دھنک پر قدم ادارہ فروغ اردو لاہور جولائی ۱۹۶۹ ص ۷

۲۔ ایضاً ص ۹

ان کا انداز بیان ہوائی پہنچ کر یہاں کے استقبال سے لے کر گھر بار کی صفائی اور کھانے پکانے تک ایسا ہے جس میں ہر جگہ وہ بہت زیادہ موجود ہیں تاہم وہ دوران سیاحت اپنے اردگرد کے مناظر کو بھی فراموش نہیں کرتی ہیں مثلاً سپر مارکیٹ کی تفصیل کچھ اس طرح بیان کرتی ہیں ہوائی کے بارے میں ابتدا کچھ یوں کرتی ہیں۔

''ہوائی بھی خداوند عظیم اور اس کے نائب انسان کی مشترکہ سازش کا ایک جاذب نظر نمونہ ہے''۔ (۱)

ایک اور جگہ رقمطراز ہیں۔

''اگر کوئی مجھ سے کہے کہ ایک لفظ میں ان جزائر کی حقیقت بیان کرو تو میں کہوں گی ملائم ان کا آسمان ملائم ان کا آفتاب ملائم ان کی ہوائیں ملائم ان کی موجیں ملائم انکے برگ وگیاہ ملائم ایسے کچے کچے ہرے ہرے مرغزار کہ دل چاہتا ہے کھیرے ککڑی کی طرح سب کچھ کچر کچر کر چبا جاؤ۔'' (۲)

وہ ہوائی کے مذہب و تاریخ ہوائی کے جزیروں وہاں کی جدی یادگاروں عجائب گھروں کھیلوں کاروباری مصروفیات و اقسام پھلوں و کھیتوں میں کام کرنے والے چین جاپان کوریا فلپائن کے لاکھوں مزدوروں کے بارے بڑی تفصیل سے لکھتی ہیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ کائنات میں بکھرے ہوئی ہر فطرت اور دوران سفر نظر آنے والی اشیاء کو بھی خالص نسائی انداز میں دیکھتی ہیں ایسی نسائی انداز نظر اور نسائی مزاج کی وجہ سے ان کا سفرنامہ دلچسپ بن گیا ہے۔ ورنہ یہ سفرنامہ کم اور تاریخ زیادہ محسوس ہوتا۔ بیگم صاحبہ نے میاں بیوی کے سماجی تعلقات سے جو جو شگفتگی پیدا کی ہے ۔ وہ عام سفرناموں میں کم نظر آتی ہے اس کے ساتھ ساتھ موسیقی اور رقص ہوائی کی سیاسی و سماجی نظام اور اس زمین پر رہنے والے انسانوں کی ثقافت و معاشرت و احساسات و جذبات اور عورت اور مرد کے باہمی تعلقات پر معاشرے کی فکری اور جذباتی توجیحات بہت دلچسپ انداز میں پیش کی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہوائی کے ذکر کے ساتھ ساتھ وہ پاکستان کے اصل حکمران طبقے کے بارے میں جب نادر بیان جاری کرتی ہیں تو ایک طرف تو میاں کی تعریف و توصیف اور ان کے مقام و مرتبے کا اندازہ ہو جاتا ہے اور دوسری طرف ان سی ایس پی افسروں کی ذہنیت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے کیوں کہ ان کے میاں بھی وہاں سینئر سکالر کی حیثیت سے گئے تھے۔

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۱۴

۲۔ ایضاً ص ۳۱۔۳۲

''اب ایک سی ایس پی کے لیے سنئیر سکالر بننا بہت آسان ہے سینئرتو وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا جہاں تک مجھے یاد ہے اسے کبھی بچپن میں بھی غلطی سے کسی نے جونیئر نہیں کہا اب رہا سکالر تو سی ایس پی کا بلا لگتے ہی وہ عالم بھی بن جاتا ہے ضلع کی ہر کتاب اسی کا پیش لفظ ہوتا ہے کالج کے کانووکیشن پر وہ عالمانہ تقریر جھاڑتا ہے اس کے فتوے پر نکاح ٹوٹتے اور جڑتے ہیں۔'' (۱)

مصنفہ چونکہ معلّمہ ہیں اس لیے امریکی عورت عزت تنخواہ اور سہولتیں سب کو موازنے کی نظر سے دیکھتی ہیں خاص طور پر پروفیسر صاحبان کا ذکر کرتی ہیں لکھتی ہیں۔

''علم اور معلم کے لیے ہمارے معاشرے نے جو جگہ رکھی ہے اس لحاظ سے پالتو جانوروں کے بعد ایک دم پروفیسر صاحبان کا خیال آیا' میں نے خود تیرہ سال یہ اعزاز حاصل کیا ہے' کہاں ہمارے ملک کے دریدہ حال سہمے ہوئے بوکھلائے ہوئے استاد جو دونوں ہاتھوں سے کبھی اپنی عزت سنبھالتے ہیں اور کبھی اپنی سائیکل کہاں اوکلہ کے پروفیسر جو ہفتے میں ایک لیکچر دے کر دو ہزار ڈالر' دس ہزار روپیہ سرکاری خرچ سے' کما لیتے ہیں اور پھر بھی کام زیادہ تنخواہ کم کا واویلا مچاتے ہیں خیر ہوائی میں پروفیسروں کے گھر دیکھے گھر کیا حسن سے بھرپور عیش کدے ہیں ہوائی کے پھیلی ہوئی سبز گھنی پہاڑیوں میں اور دور جہاں کا ابھی مشکل سے جاتے ان کے خانگی خواب آویزاں ہیں۔'' (۲)

ہوائی کے پھولوں کا ذکر ان کی خوشبو محسوس کرنے کی حد تک دلچسپ اور فطری انداز میں کیا ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے چاروں طرف موتیا اور چنبیلی کی خوشبو رچی بس گئی ہو۔حتی کہ پھلوں کا رس محسوس ہوتا ہے اور ان کی تازگی بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔

دوسرا باب لندن کے عنوان سے ہے۔اور اس کے تعارف میں انہوں نے ماضی سے حال تک لے کر تمام لندن پر مختصر لیکن جامع تبصرہ کیا ہے بلکہ چند لفظوں اور جملوں کی مدد سے تاریخ ادب تہذیب معاشرت سیاست سیاحت تجارت غرض ہر چیز کا احاطہ کر دیا ہے خوبصورت انداز میں لکھتی ہیں۔

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۱۷

۲۔ ایضاً ص ۳۵

''لندن! کیا شے ہے یہ پیچیدہ پر اسرار'' یہ کونسی دھواں مارا بارش زدہ نیم تاریک شہر یہ مغربی معاشرت کا دھڑکتا ہوا دل اس کے فنون کی آن وعصمت'' اس لندن کو کن الفاظ میں بیان کروں کن حاشیوں میں پابند کروں اس کے ساتھ بچپن سے ہزاروں یادیں وابستہ ہیں کس لندن کا ذکر کروں۔'' (۱)

لندن سے ملاقات کا حال جو کہ تین قسطوں پر مشتمل ہے اس کو بھی عجیب انداز میں بیان کرتی ہیں۔

''میری لندن سے ملاقات صرف تین بار ہوئی پہلی دفعہ محض ایک سیاح کی حیثیت سے دوسری دفعہ ایک مانوس شہری کی مانند اور آخری بار ایک عاشق دیرینہ کی طرح۔'' (۲)

لندن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہاں انسان دیوانہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ موسیقی ناچ گھر لیکچر مباحثے برٹش کونسل کی ممبر شپ لائبریریوں میں کتابیں فیشن اور فیشن زدہ لوگ ان کے انواع اقسام کی چیزوں کو دیکھ کر انسان کی سمجھ کام نہیں کرتی کہ وہ کیا کرے کیونکہ برطانوی قوم کا رنگ ڈھنگ جو انہیں حیران کر دیتا ہے وہ کچھ یوں ہے۔

''لندن جا کر ایک بات سمجھ میں نہ آئی کہ وہ برطانوی قوم جو ہندوستان میں دو صدی رہ کر بھی مرچ مصالحوں سے پرہیز کرتی ہے ہند کو آزادی دیتے ہی اس قدر دیسی کھانے کی متوالی کیسے ہوگئی لندن میں اپنا کھانے پکانے کو جی نہیں چاہتا کہ چنے سے قورمے پلاؤ کی مہک آتی ہے ہماری غذا کی کلچر نے وہاں چین کو بھی مات دیدی ساٹھ سے اوپر سودیشی ریستوران ہر وقت کھچا کھچ'' زیادہ تر سفید فام باشندوں سے ''بھرے ہوتے ہیں جن میں بنگالی خانساماں اپنے کمالات دکھاتے ہیں۔'' (۳)

''بہر حال لندن کا موسم کے رنگ گیت کارخانوں تاریخی عمارات اور پھلوں کی نمائش تک کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کرتی ہیں۔ آزادی اظہار کا اصل روپ انہوں نے یہاں دیکھا یہاں اظہار رائے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ حسن وآس کی رعنائی اور ننھے ننھے کلیسا کا بھی ذکر ہے لیکن اختر ریاض الدین کے مطابق جہاں حسن اور آس کے جلوے خود خدائی کی دعوت دے رہے ہوں وہاں تو قدرتی حسن ہی خدائی کو ثابت کرتا ہے لکھتی ہیں۔

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۵۱
۲۔ ایضاً ص ۵۳
۳۔ ایضاً ص ۶۷

''جو جگہ یزداں کل کا عیاں عکس ہو جس کے ہر رخ سے خداداد حسن کی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں وہاں اندھیرے گرجے میں لاکر لوگوں کو کیا بتاتا کہ خدا بھی ہے۔''(۱)

آخری حصہ لندن کا ستمبر ۱۹۶۵ کی جنگ کا ہے۔اور اس حصے میں شگفتگی سے زیادہ تفکر غالب ہے اور بعض جگہ جملوں میں بہت گہرائی پائی جاتی ہے۔مثلاً''ہم ہر اس قدر کے علمبردار ہیں جن پر برطانیہ ایمان رکھتا ہے۔''

یا

''یہ لندن جو مرا جذباتی جنون تھا اس لندن میں کچھ کرنے کو دل نہ چاہے تو ہائیڈ پارک کے گھنے درختوں کے نیچے بیٹھ جاؤں اور سوچوں کہ اللہ یہ جنگی اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔''(۲)

تاہم لندن سے جذباتی وابستگی اور عاشق دیرینہ کا دعوی کرنے کے باوجود بیگم اختر نے لندن کے بازار میں ہوائی جیسا لطف نہیں اٹھایا بلکہ اظہار تاسف نظر آتا ہے۔کچھ حصے میں ہندوستان کے بارے میں کچھ طنزیہ گفتگو ہے۔جوان کی دلی نفرت کو ظاہر کرتا ہے۔

تیسرا باب لاطینی امریکہ کی سرزمین میکسیکو کے حالات پر مشتمل ہے میکسیکو جو قومی کھیل بل فائٹنگ کی بدولت مشہور و معروف ہے۔ان کو لاطینی امریکہ دیکھنے کی خواہش تھی اس لیے لکھتی ہیں۔

''امریکہ کی امارت اور سرد مہری کے بعد میکسیکو اور بھی مانوس اور نیم مشرقی معلوم ہوا ہے''۔ (۳)

میکسیکو سٹی ہر عہد اور ہر حکمران کے بعد قابل دید اور خوبصورت رہا ہے حتی کہ ہسپانوی فاتح کورتے نے اسے قرار دیا۔ یہاں تاریخ اور جدید بیک وقت سانس لیتے ہیں۔بیگم اختر نے یہاں کے حسن کا تجزیہ بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

''عورتوں میں حسن جہاں بھی نظر آئے سمجھ لیجیے یہ ہسپانوی خون کا اثر ہے جہاں چپٹی ناک چندھی آنکھ یا سپاٹ پیشانی نظر آئے تو سمجھو انڈین رگ پٹھے غالب آگئے ہیں ویسے شدھ خون کہیں نہیں ہے ہماری طرح نسلی سلاد ہے کوئی کسی کھیت کی مولی کوئی کسی کھیت کی نہ خالص ہسپانوی نہ خالص انڈین سب ہیں ہماری رگوں میں بھی کہیں ترکی کہیں تاتاری کہیں ایرانی کہیں عربی کہیں چینی کہیں دراوڑی کہیں آریائی خون بہ رہا

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۷۸

۲۔ ایضاً ص ۷۹

۳۔ ایضاً ص ۴

ہے ہمارا تجربہ کرتے کرتے ماہر علم بشر خود سکون حاصل کرنے کے لیے پاگل خانے
میں گھس جاتے ہیں۔'' (۱)

بازاروں دستکاریوں ملبوسات اور کشیدہ کاری کے بارے میں خامی ہے۔ پروفیسر ہونے کی وجہ سے میکسیکو کے طلبا و طالبات ان کی سہولیات کا ذکر بھی بڑے خوبصورت انداز میں کرتی ہیں صرف یہی نہیں بلکہ میکسیکو قوم کے توہمات عقائد امریکی سامراج کے ساتھ ان کے رویے لوگوں کی سائیکی متعین کرنے کی کوشش بڑی فنکارانہ انداز پر مبنی ہے۔ بیگم اختر میکسیکو کی زندگی کے شوخ اور بانکے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتی بلکہ بڑے دلچسپ انداز میں بیان کرتی ہیں۔

میکسیکو کے بعد سان فرانسکو کا حال ہے اس کی پسندیدگی کی وجہ یہ ہے۔

''سان فرانسکو ایک شہر نہیں شخصیت ہے اور اس شخصیت کا مخصوص پہلو انفرادیت ہے امریکہ میں شمال سے جنوب تک ایک بیزار کن یکسانیت نظر آتی ہے یہاں ایک تنوع ہے اس کے جغرافیے میں، تنوع معاشرے میں تنوع، شہری خدوخال میں جدت باشندوں میں ہمہ گیر اختلاف یہ امریکہ ہے بھی اور نہیں بھی اس شہر نے امریکہ کی لاج رکھ لی ہے یہ جتنا نیو یارک کی فضا سے دور ہوتا جاتا ہے اتنا ہی انسانیت کے قریب تر آتا جاتا ہے انسان کی طرح یہ بھی ایک وقت میں سب کچھ دیکھ چکا ہے فراخ دل یہودی صفت حسن غلیظ روش تاریک کبھی ہنگامہ خیز کبھی خاموش بیک وقت تخلیقی اور انحطاطی متعصب مگر پھر بھی روادار اس کی کون تشریح کرے۔'' (۲)

یہ مختصر ہے لیکن تاریخی ثقافتی معلوماتی معاشرتی تہذیبی کے علاوہ یہاں کے مسلمانوں کا بھی ذکر ہے گولڈن گیٹ کا ذکر یوں کرتی ہیں۔

''اس شہر کا اصلی ہیرو میں تو بھول ہی گئی جس کی وجہ سے سان فرانسکو عالم میں تشہیر پا چکا ہے وہ ہے گولڈن گیٹ برج اس طلائی پل کے فوٹو ہر موسم میں دھوپ کے ہر گھٹتے بڑھتے لمحے میں ہر زاویے سے اترتے ہیں۔'' (۳)

اگلا باب نیو یارک کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں اختر ریاض الدین صاحبہ نے آغاز ہی سے ائیر ہوسٹس اور خاوند کے حوالے سے تعریف و توصیف شروع کر دی ہے لیکن بیان دلچسپ ہے مثلاً

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۸۸
۲۔ ایضاً ص ۱۲۳
۳۔ ایضاً ص ۱۳۲

''میرے میاں جب کچھ ہو جاتے ہیں تو میری طرف نہیں دیکھتے کیونکہ میری ہنسی چھوت کی بیماری کی طرح اُن کو لگے تو پھر وہ خود رکتے نہیں اتنا ہنستے ہیں کہ اچھو لگ جاتا ہے اور میں اپنی ہنسی بھول کر ان کی پیٹھ پر دھمو کے دیتی ہوں۔'' (۱)

لیکن نیویارک بیگم ریاض کو پسند نہیں ہے ۔جس والہانہ انداز میں باقی سفرنامہ نگار خواتین اس کا ذکر کرتی ہیں یہاں کی خوبصورتی سے لے کر شاپنگ تک وہ انداز ان کے ہاں نظر نہیں آتا بلکہ ۱۹۶۵ کی جنگ کی وجہ سے ان کا انداز زیادہ ہی قابل نفرت انگیز اور تنقیدی ہے ۔مثلاً

''نیویارک ایک بے سروپا دیو ہے ۔ یہاں پہنچتے ہی انسان بوکھلا جاتا ہے یہاں سب کچھ ہوسکتا ہے اور کچھ بھی نہیں ہوسکتا یہ شہر ہم جیسے انسانوں کے لیے بنا ہی نہیں یہاں تجارتی مشینیں کاروباری کارندے اشتہاری پرزے اور سیاسی بہروپیے رہتے ہیں یہاں پارک ایونیو کی کثیر امارت ففتھ ایونیو کی جلوہ گریاں اور ہارکم کی حبشی محرومیاں بستی ہیں ۔اسکے ہزاروں باسیوں نے کبھی سورج کی شکل نہیں دیکھی وہ زیرزمین ٹرین سے آتے زیرزمین دفتروں میں کام کیا وہیں کھایا پیا اور وہیں سے شام کو لوٹ گئے اس نیویارک کی نسلی کھچڑی کا یہ کہنا ہے کہ یہاں روم سے زیادہ اطالوی رہتے ہیں کیویز سے زیادہ روسی ڈبلن سے زیادہ آئرش اسرائیل سے زیادہ یہودی اور سین اوان SAN JUAN سے زیادہ پورٹورکن مقیم ہیں اس شہر کی امریکی زبان کا بادشاہی انگلش سے مطلق کوئی تعلق نہیں۔'' (۲)

''اس شہر کے نقاد بھی انوکھے ہیں نہ امارت سنبھالی جائے نہ غربت ۔اس شہر کے میئر لنڈ سے کا کہنا ہے کہ نیویارک کو پیٹر پین کومپلیکس Peter Pancomplex ہے یہ پختگی سے کتراتا ہے۔'' (۳)

اختر ریاض صاحبہ نے نیویارک کو ایک مسافر کی آنکھ اور دل سے دیکھا نہیں جانچا پرکھا بلکہ ان کی ناپسندیدگی ان کے بیان پر اس طرح غالب رہی ہے کہ تعصب کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے بلکہ بعض بیانات میں تو تلخی اور جھنجھلاہٹ نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ یہاں کی تہذیب و ثقافت غربت گندگی قتل و غارت

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۱۳۴

۲۔ ایضاً ص ۱۳۶

۳۔ ایضاً ص ۱۳۹

اور مکھیوں تک کا ذکر کرتی ہیں تا کہ اندازہ ہو جائے کہ وہ نیو یارک جس کا تصور ہم یا اپنے دل میں بسا کے پھر رہے ہیں وہ ایسا نہیں اور کچھ ان کا مقصد اتنی تفصیل بیان کرنے کا یہ بھی تھا کہ پہلے سفر نامے میں انہوں نے جو تشنگی چھوڑی تھی اس کو بھی پورا کرنا مقصود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستان اور بھارت کے درمیان فاصلے بڑھانے لوگوں اور ان قوتوں اور ان کے طرز عمل کے بارے میں یوں اظہار کرتی ہیں کہ

''یو۔این۔او تو بالکل ڈھکوسلہ بن کر رہ گیا ہے اسے امریکی خارجی پالیسی کا دایاں بازو کہا جائے تو بہتر ہو گا عمل کے وقت اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں انصاف کے وقت آواز بیٹھ جاتی ہے مجھے تو اس کی زیست کا صرف ایک جواز ملتا ہے اور وہ یہ کمزور قوموں کی ناک رکھنے کے لیے یہ اچھا بہانہ بن سکتا ہے جب غریب پٹنے لگے تو یہی کہتا ہے کہ کوتوال روک رہا ہے ورنہ میں ابھی اور مارتا''۔(۱)

نیو یارک میں وقت بھاگتا ہے اور اس وقت کے بھاگنے سے ہر شخص کا سانس پھولا ہوا ہے کیونکہ پورا امریکی معاشرہ جرم برائے جرم نہیں بلکہ جرم برائے لذت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے پوری نسل والدین پاوری جوان سب پریشان ہیں کیونکہ دولت کی ان کے پاس کمی نہیں اخلاقیات سے عاری ہیں اللہ تعالی نے ان کو مال و دولت دے کر آزمایا ہے۔

ایک بات جو بیگم ریاض الدین کو متنفر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ نیو یارک میں انہوں نے امریکی خواتین کی حالت بیان کرتی ہیں۔ تو ان سے دکھ ہمدردی اور رشک تمام قسم کے جزبات کا اظہار ہوتا ہے۔

''امریکی عورت کا دنیا میں جواب نہیں۔ نسلی اخلاط کے خمیر سے اٹھی ہوئی یہ عورت بہت حسین ہے صحت مند ہے اور ہر فن مولا ہے۔ مردوں کو اس عورت کے خلاف شکایات ہیں کہ وہ بہک گئی ہے امریکہ کی روایتی خانگی پاک دامنی پر بٹہ ہے خاندان امن پر سایہ ہے تیرہ چودہ سال کی عمر ہی سے یہ آزادی چکھ لیتی ہے وغیرہ وغیرہ ۔لیکن یہ الزامات نہ صرف یورپی عورتوں پر عائد ہو سکتے ہیں بلکہ ایشیائی ملکوں کی کئی عورتوں پر بھی البتہ بوڑھی امریکن عورتوں کا وظیفہ دنیا سے نرالا ہے یہ طبقہ امریکہ کی کثیر دولت کا بڑا حصہ دار ہے کیونکہ یہ زیادہ تر بیوہ عورتوں پر مشتمل ہے امریکی مرد جب کما کما کر تھک جاتا ہے تو چل بستا ہے اور یہ نقرئی زلفوں والی ساٹھ ستر سالہ امیر زادیاں دنیا کی سیر کی نکل کھڑی ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔امریکہ کی معمر خاتون کی

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۱۴۵

نئی زندگی ساٹھ سال کے بعد شروع ہوتی ہے۔ بہر حال مجھے امریکی عورت سے محبت متعصّبانہ حد تک محبت ہے کیونکہ یہ عورت سیماب کی طرح بے چین زندگی سے بھرپور علم اور خلوص سے سرشار اپنے دل میں دنیا بلکہ سارے آفاق سے عشق رکھتی ہے۔(۱)

کتنا جاندار مکمل اور جامع تبصرہ ہے عورت کی زندگی اور اس کے شب و روز کے بارے میں ساری امریکی عورتیں متحرک تصویر کی طرح سامنے آ جاتی ہیں۔''

اگلا باب ہونگ کونگ کے بارے میں ہے۔ یہاں پچھلا باب میاں کے تبصرے سے رنگین تھا وہاں یہ باب اپنی یادوں سے مزین ہے کیونکہ محترمہ کو مرنے سے پہلے ہونگ کونگ کے دیکھنے کی خواہش بڑی دلچسپ ہے لیکن اس دلچسپی کی وجہ سے ان کا تجربہ بڑا زبردست ہے۔ مثلاً ہونگ کونگ کے لوگوں کے بارے میں لکھتی ہیں ۔کہ یہاں پانچ قسم کے باشندے ہیں۔ ایک سیاح دوسری قسم ماہ عسل منانے والوں کی ہے۔ تیسری قسم بیرونی اخبارات کے نامہ نگاروں کی چوتھی قسم اصل نسل باشندے ہیں یا پانچویں قسم طوائفوں کی ہے۔

ہونگ کے دو رخ ہیں ایک طرف بلند کاخ زریں اور عظیم بارگاہیں اور دوسری طرف غریب مہاجروں کی اداس بستیاں۔ ہونگ کونگ کی ایک اور چیز کے لیے مشہور ہے اور وہ ہیں مشرق بعید کے طعام خانے یہاں پر آپ برمی انڈونیشن جاپانی کورین ہر قسم کے کھانے کھا سکتے ہیں چینی ریستوران تو خیر ہر وقت بھرے رہتے ہیں مجھے چینی دسترخواں سے خاص انس ہے اور کچھ برا بھلا پکا لیتی ہوں میں نے چینی غذا یورپ میں کھائی امریکہ میں کھائی جاپان میں کھائی اور بمبئی میں کراچی اور لاہور میں اکثر کھائی اپنے دیس کے چینی کھانے میں مزہ تو ہے لیکن خلوص نہیں۔

الغرض بیگم اختر ریاض الدین نے نہایت پختہ کاری سے یہ سفرنامہ تحریر کیا ہے۔ اس کی وجہ ان کا تجربہ اور زبان پر عبور بھی ہے اور سفر کا شوق بھی ان کے سفرنامے کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین بحوالہ سابقہ ص ۱۵۵۔۱۵۶

۲۔ ایضاً ص ۱۶۸

نسرین بانو اکرم (الکویت)

''الکویت محترمہ نسرین بانو اکرم کا سفرنامہ ہے جس میں انہوں نے کویت کے بارے میں اور اپنی ذاتی پسند و ناپسند کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ خاص طور پر اس سفرنامے میں کویت کے حکمرانوں کی مدح سرائی بہت زیادہ ہے یہ سفرنامہ آپ بیتی کا بھی رنگ لیے ہوئے ہے انہوں نے جو کچھ دیکھا اسے من وعن بیان کردیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وسعت نظر کی کمی خاصی محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفرنامے میں معلوماتی انداز نہیں ہے۔ کیونکہ نسرین بانو صاحبہ نے تہذیب و معاشرت کو نظر انداز کر کے چند مخصوص چیزوں اور مخصوص گھرانوں کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ سفرنامے کا فن تاریخ نہیں ہے کہ جس میں بادشاہوں کے حالات زندگی اور انکی فتح و ناکامی کا ذکر ہو۔ سفرنامہ عام آدمی کو نظر انداز نہیں کر سکتا لیکن نسرین بانو نے ایسا کیا یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے سفرنامے میں خاص چیزوں کا ذکر اور تفصیل نظر آتی ہے۔ عمومی مشاہدے کی کمی ہے۔ سفرنامے کے آغاز میں لکھتی ہیں ;۔

> ''الکویت میرے ان جذبات کا آئینہ دار ہے جو میں نے کویت کے محسوس کیے میں یقین سے نہیں کہہ سکتی ہوں کہ میں اپنے تاثرات کو من وعن لکھنے میں کامیاب ہوسکی ہوں یا نہیں کیونکہ الکویت لکھتے وقت اکثر میں یہ محسوس کیا کرتی تھی کہ میں اپنے تاثرات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے سے قاصر ہوں اور بعض اوقات تو میں بے بس ہو کر قلم ہاتھ سے رکھ دیا کرتی تھی۔'' (۱)

''محترمہ نسرین بانو کے خیالات تو اسی قسم کے ہیں کہ میں اپنے تاثرات میں کامیاب نہیں ہوتی لیکن اسی سفرنامے کے دیباچے میں میاں محمد رفیع لکھتے ہیں ;۔

> ''میرے خیال کے مطابق مس نسرین نے الکویت میں عوام کے لیے نہایت دل چسپ انداز میں انتہائی مفید اور جامع معلومات بہم پہنچائی ہیں جس کے لیے انہیں مبارک باد کا مستحق سمجھتا ہوں۔'' (۲)

کویت ایک مختصر سا خطہ ہے جو الگ سفرنامے کا متحمل تو نہیں ہوسکتا تھا لیکن یہ ان کا ذہن جمال اور تلاش

۱۔ نسرین بانو اکرم الکویت (پیش لفظ) اردو پریس لاہور ۱۹۶۳ ص ۶۶

۲۔ میاں محمد رفیع دیباچہ الکویت ص ۷

بسیار کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اس میں سے بھی رنگین اور خوبصورت واقعات تلاش کرتے ہیں۔ کویت ایک اسلامی ملک ہے اور چند دیگر اسلامی ممالک مثلاً عراق ایران اور سعودی عرب کی طرح یہ خطہ بھی تیل کی دولت سے مالا مال ہے اور اسی تیل کی بدولت یہاں کے حکمران اور عوام نہ صرف خوشحال ہیں بلکہ بہت سی جدید سہولیات سے بھی مالا مال ہیں۔ کیونکہ حکمران طبقے نے نہ صرف خود آسائشات حاصل کی ہیں بلکہ عوام الناس کو بھی اس سے فائدہ پہنچایا ہے۔ نسرین بانو نے کویت کو نسائی رنگ سے دیکھا یہی وجہ ہے کہ انکے اکثر بیانات میں نسائی رنگ غالب ہے مثلاً لکھتی ہیں۔

> ''کہ وہ وہاں پر مقیم قائم صاحب کے گھر گئیں تو وہاں کا نقشہ کچھ یوں تھا۔ پاکستانی یا ہندوستانی انداز میں بے شمار چیزیں تھیں جن میں ساتھ کوڑا کرکٹ بھی تھا گھر کیا تھا بس مرغی کا ڈربہ لگ رہا تھا۔ یہ دوسری بری عادت ہے جو کثرت سے ہمارے ملک میں پائی جاتی ہے فضول اور بے ضرورت چیزوں سے گھر بھرا پڑا ہوگا مگر ضرورت کے وقت کوئی چیز نہ ملے گی۔''(۱)

نسرین بانو نے اس سفر میں کویت کے ہسپتالوں کے نام ڈسپنسریوں کی تعداد اور یہاں کے ہسپتال کا ماحول تک لکھ دیا ہے۔ کویت کے مذہب کے بارے میں یوں لکھتی ہیں۔

> ''کویت میں مذہب حقیقی معنوں میں موجود ہے کویت کے امیر کو خدا نے انسانی ہمدردی سے لبریز دل عطا فرمایا ہے اور امیر خدا کا نائب ہوتا ہے اس لیے نیکی کی وسعت کے لیے امیر کویت کو اگر وہ چاہیں تو اسلام کی خدمت کرنے کے لیے علاقہ سلجھے ہوئے تعلیم یافتہ نوجوان غیر ممالک بھیجنا چاہیے''۔(۲)

کویت جو ایک صحرا کی مانند تھا اب وہاں تیل کی وجہ سے آہستہ آہستہ ترقی ہوگئی ہے کہ جدید سہولیات سے آراستہ یہ شہر قدیم خطے سے بہت مختلف نظر آتا ہے اور اب سائنس کی ترقی کے آثار یہاں بہت زیادہ ہیں ریڈیو اسٹیشن کے بعد اب وہاں کویت میں ٹیلی ویژن بھی شروع ہو چکا ہے اگرچہ شروع ہوئے صرف ایک سال ہوا ہے لیکن مختلف ملکوں کے ڈائریکٹر آرٹسٹوں کے ساتھ مل کر اسے بہتر بنانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ یہ کویت کا ایک بے حد ترقی یافتہ قدم تھا کیونکہ بعض بڑے مشہور ملکوں میں ابھی تک ٹیلی ویژن شروع نہیں ہوسکا حالانکہ اکثر ملکوں میں تو یہ ایک بات پرانی ہوکر رہ گئی ہے اس وجہ سے کویت کا ٹیلی ویژن اسٹیشن خاص قابل تعریف مقام تھا۔

۱۔ نسرین بانو اکرم بحوالہ سابقہ ص ۲۳۵

۲۔ ایضاً ص ۱۲۶

۳

دراصل آرٹسٹ انسان کے اندر رہتا ہے۔ ڈائریکٹر کی محنت سے ایک ناتجربہ کار دنیا کا سب سے بڑا ایکٹر بن سکتا ہے کیونکہ انسان بذات خود ایک بڑی تخلیق ہے۔

کویت ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں کے نوجوان بہت محنتی ہیں لیکن حقیقت پسند بھی ہیں کہ وہ دن رات اس کاوش میں ہیں کہ کسطرح ملک کے حالات کو بہتر بنایا جا سکتا ہے اور ملکی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہتے ہیں۔ کویت میں نوجوان نسل کی اصلاح کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور ان کے مستقبل کے لئے خاص لائحہ عمل بھی تیار کیا جاتا ہے۔ کویت میں کسی بچے کو راہ راست پر لانے کے لئے جو سزا دی جاتی ہے وہ اس بچے کے لیے بے حد کٹھن ہوتی ہے۔ ایسی سزا پا کر وہ بچہ پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک دن جو بچہ شرارت کرتا ہے۔ دوسرے روز اسکول میں نہیں آنے دیا جاتا اور یہ سزا اس بچے کے لئے مار پیٹ، گالی گلوچ کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کویت کی ترقی کا راز کچھ یوں بیان کرتی ہیں۔

> ”کویت کے لوگ کسی کی مخالفت کرنا پسند ہی نہیں کرتے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے۔ امیر کویت بے حد شریف اور نیک دل انسان ہیں اور جب حکومت کی باگ دوڑ ایک منصف مزاج اور رحم دل انسان کے ہاتھ میں ہو تو ایسی حکومت انسان کے حق میں رحمت ہوگی“۔ (۱)

نسرین بانو نے کویت کے عام رنگ کو نسائی رنگ سے دلکش بنا دیا ہے۔ مثلاً یہ خاتون جب ہوش سنبھالتی ہے تو گھر کی خواہش اس کی سجاوٹ، دیکھ بھال، اس کو بنانے اور اس کے مراحل سے نہ گزرنے کے باوجود گزرتی ہے اور پھر فطری اور ازلی خواہش کہ گھر خوبصورت رنگوں سے مزین ہو کہ اس سے اس کا ذوق وشوق ہی نہیں سلیقہ شعاری کا بھی اندازہ ہوتا کہ آنے والے اس کے انتخاب کی داد دے سکیں۔

ایک خاتون ہونے کے ناطے انہوں نے کویت کی عمارات کا ذکر ان رنگوں سمیت کیا ہے کہ جہاں شاید مرد حضرات اگر ذکر کرتے تو اس کی مضبوطی کی تعریف و توصیف کرتے۔ انہوں نے مکینوں کے رنگ و رخسار کا ہی نہیں بلکہ بڑی خوبصورتی سے پائیداری اور عمارت بنانے کے عمل کا ذکر بھی کرتی ہیں۔

> ”کویت کی بڑی بڑی عمارتیں کچھ ایسے مختلف رنگوں سے بنائی گئی ہیں۔ کہ ان کا قوس قزح جیسا انداز نظروں کو بے حد بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ریت خاصی

۱۔ نسرین بانو اکرم بحوالہ سابقہ ص ۱۳۱

ناپائیدار ہوتی ہے اور ریتلی زمین پر عمارت بنانا بے حد محنت کا کام ہے۔ وہاں دوران قیام دو تین حادثے ہوئے کہ پوری عمارت گر پڑی ہے۔ مگر پھر بھی وہاں گھومتے پھرتے مجھے ڈر نہیں لگا۔ ویسے بھی مشرق اپنے قسم قسم کے رنگوں کی وجہ سے مشہور ہے''۔ (۱)

درآمد اور برآمد خواتین کے شعبے نہیں ہیں لیکن حیرت ہے کہ نسرین بانو صاحبہ نے نہ صرف ان کی درآمدات کا ذکر کیا ہے بلکہ ۱۹۶۰ کے اعداد و شمار درج کر کے وہاں کی تجارتی پالیسی کی وضاحت کی ہے بلکہ ان تمام حکومتی اقدامات کا جائزہ لیا ہے کہ جو حکومت اپنے ملک کی بہتری کے لئے کر رہی ہے۔ اور ان تمام اقدامات کا ذکر ایک بہترین تاجر کے ذہن سے کیا ہے جو سٹاک ایکسچینج کی صورت حال کو بہتر طور پر سمجھتا ہو۔

سڑکوں اور راستوں کے علاوہ نسرین بانو صاحبہ نے ایک اور اہم مسئلے کی بھی نشان دہی کی ہے کہ پانی وہ ضرورت ہے کہ جس کے بغیر کوئی چرند پرند زندہ نہیں رہ سکتا ہے اور زندگی کی بقا کے لئے اور افزائش نسل و فصل کے لیے بھی پانی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

صحرا میں پانی مل جانا آب حیات کی طرح ہے کہ جب خشک لبوں اور مرجھائی آنکھوں میں زندگی پانی کو دیکھ کر دوبارہ انگڑائی لیکر جاگ اٹھتی ہے۔ جب نسرین بانو کویت میں تھیں تو انہی دنوں دنیا کا سب سے بڑا سمندری پانی صاف کرنے ولا پروجیکٹ دیکھا۔ عراق سے جنگ کے بعد کویت کے پاس پینے کے لیے میٹھا پانی نہیں تھا۔ اس لیے وہ مصر سے ہزاروں روپے خرچ کر کے پینے کا پانی منگواتا تھا اور اس طرح بہت سی دولت پانی حاصل کرنے میں خرچ ہو جاتی تھی لیکن پھر اللہ نے ان کی سن لی اور ان کی سرزمین سے ہی میٹھے پانی کا چشمہ نکل آیا جو ان کی ضروریات کو اگلے پندرہ سال تک پوری کر سکتا تھا۔

'' خدا کی خدائی میں دیر ہے اندھیر نہیں اور آخر ایک دن صحرا کے سینے سے میٹھے پانی کا چشمہ نہ نکلا۔ اس سرزمین کے رہنے والے پانی کو ترستے تھے۔ جہاں کہیں بھی پانی کے لیے زمین کھودی جاتی وہیں تیل پایا جاتا۔ آخر ایک دن کویتی خوشی سے ناچ اٹھے۔ سارے کویت میں مسرت کی لہر دوڑ گئی کہ قدرت نے آخر ان کے صبر کے صلے میں پانی کا چشمہ جو پندرہ برس تک کویت کی ضروریات کو پورا کر سکتا تھا پیدا کر دیا''۔ (۲)

اس سفرنامے میں نسرین بانو اپنے بچپن کو بھی یاد کرتی ہیں۔ کہ جس میں جھوٹ، ریا اور مکاری کی

۱۔ نسرین بانو اکرم بحوالہ سابقہ ص ۲۴

۲۔ ایضاً ص ۵۳

بجائے صرف اور صرف پیار ہوتا ہے۔ دنیا والے دلوں میں زہر بھر دیتے ہیں۔ ورنہ دل میں مرکز محور محبت ہے۔ یہاں ایک ایسے گھرانے کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ جس کے سربراہ مسٹر عبدالباری ہیں۔ وہ وہاں ان کی مسز سے بھی ملیں اور ایک خاتون خانہ کی سیاست ادب اور فلسفہ و تاریخ سے دلچسپی دیکھ کر از حد حیران ہوئیں کہ یہ برقعہ پوش خواتین بھی تعلیم میں کسی ترقی یافتہ ملک سے کسی طور بھی کم نہیں ہیں۔ وہ ان کی ذاتی لائبریری میں جاتی ہیں تو دیکھتی ہیں۔

''میں حیرت سے فلسفے کی موٹی موٹی کتابیں دیکھ رہی تھی یہ نہ صرف فلسفہ، تاریخ، سیاست، ادب، آرٹ کی کتب کا ذخیرہ اکھٹا کیا ہوا ہے اور میں نے کسی کتاب کے متعلق کوئی بات کی تو مسز باری فوراً الف سے یائے تک چند لفظوں میں کتاب کا لب لباب بتاتی گئیں۔'' (۱)

اس کے ساتھ کویت میں مذہب اور دیگر مساجد کے احوال سے انہیں خاصی دلچسپی ہے اور وہ اس کا ذکر بھی بڑی خوبصورتی سے کرتی ہے جو ان کے مشاہدے اور دلچسپی دونوں کا مظہر ہے۔

''خوبصورت اور عمدہ قسم کی مسجدیں جا بجا موجود ہیں۔ علماء اور مذہب کے رہنما خود بھی رحم و کرم اور نرم دلی کا مجسمہ ہوتے ہیں۔ ان مسجدوں میں خوش الحان اذان کی آواز گونجتی ہے۔ جس سے صحرا کے سینے میں صدیوں پرانی داستانیں زندہ ہو جاتی ہیں۔ آج بھی کویت میں مساوات کا اسلامی سبق زندہ ہے۔ آج بھی ایک منسٹر اور ایک کلرک میں یا ایک شیخ اور ایک معمولی کویتی کے درمیان مساوات نظر آتی ہے۔ (۲)

پھر وہ تاریخ کے اوراق پر روشنی ڈالتی ہیں اور حضرت عمر فاروقؓ کے دور کو یاد کرتی ہیں کہ اس دور رفتہ کی یاد کویت میں جا کر تازہ ہو جاتی ہے۔ خاتون ہونے کے باوجود نسرین بانو جغرافیے کا حال بھی بتاتی ہیں اور تاریخ کے اوراق بھی پلٹتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمہ صفت ہیں لیکن ان مشاہدہ پسند کی چیزوں کے بارے میں ہے۔ مثلاً وہ کویت کے رقبے کے بارے میں کچھ یوں رقمطراز ہیں۔

''کویت کا حقیقتاً تمام تر علاقہ تقریباً ۹۰۳۷۵ مربع میل ہے۔ یہ تمام علاقہ گورنمنٹ کویت کے ماتحت ہے۔ البتہ حقیقتاً جنوب کا کچھ علاقہ سعودی عرب کی حکومت کے ماتحت ہے۔ یہ علاقہ تقریباً ۳۰۵۶۲ مربع میل ہے۔ کویت کا بیشتر علاقہ صحرائی ہے''۔ (۳)

۱۔ نسرین بانو اکرم بحوالہ سابقہ ص ۲۰۲
۲۔ ایضاً ص ۶۷
۳۔ ایضاً ص ۷۵

"حکومت کویت کی ملکیت میں کچھ جزیرے بھی ہیں جن میں Bubian Island سب سے بڑا ہے۔ اس کے علاوہ بھی چند ایک ہیں۔ مثلاً Miskan اور Um Kubber Kouhat Annamel '' ام انامل'' کافی مشہور ہیں۔" (۱)

اس قسم کی معلومات عموماً نسوانی سفرناموں میں نہیں ملتی لیکن نسرین صاحبہ نے اپنے اس سفرنامے میں تاریخی، جغرافیائی، معاشی اور خاص معاشرتی صورت حال کا نقشہ بڑی خوبصورتی سے کھینچا ہے۔ حتیٰ کہ بارشوں اور ان کے اثرات کا بھی خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

لیکن اس سفرنامے میں بیانیہ انداز کی بجائے آپ بیتی کا عنصر لیے ہوئے ہے۔ کیونکہ وہ سفرنامے کے لوازمات کو تو پوری طرح نہیں ہاں البتہ اپنے سفر کے تاثرات کو پوری طرح منعکس کرنے میں کامیاب رہی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے غیر ضروری واقعات کہ جن کا تعلق سفرنامے سے نہیں ہے ان کو بھی تحریر کر دیا ہے اور ان کا یہ سفر ذات کا سفر محسوس ہوتا ہے۔

اسلوب کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی خاص انداز نظر نہیں آتا ہے کیونکہ متنوع موضوعات کے لحاظ سے اسلوب جس خاص انداز کا متقاضی تھا وہ اس میں کم نظر آتا ہے۔ انسانی جذبات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ تحریر فرماتی ہیں کہ مشرق اور کویت میں جو بات مجھے مشترک نظر آئی کہ ان علاقوں میں خواتین بہت قابل توجہ ہیں ۔ اور ان کی ہر ہر حرکت پر نظر رکھنا فرض اولین سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ مغرب میں اس چیز کو بالکل پسند نہیں کیا جاتا لیکن ہمارے پاکستان اور کویت میں خواتین عجیب کشمکش کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جب وہ مجبوراً بھی گھر سے نکلتی ہیں تو ہزاروں سوالیہ اور گھورتی ہوئی نظریں ایک شکاری کی طرح اس کا تعاقب کریں گی۔

> '' نہ صرف کویت میں بلکہ مشرق میں یہ مرض کثرت سے پایا جاتا ہے۔ جس کے علاج کے متعلق ہمارے معاشرے نے ابھی سوچنا گوارا ہی نہیں کیا۔ آپ کسی جگہ سے بھی گزر جائیں خواہ آپ دنیا کی بدترین صورت عورت ہی کیوں نہ ہوں مگر راہ چلتے ہوئے لوگ آپ کو دیکھنا فرض اولین سمجھیں گے۔ اور نہ صرف ایک دفعہ بلکہ جب تک آپ نظر آتی رہیں گی وہ سب مڑ مڑ کے آپ کو دیکھتے رہیں گے اور دیکھنے میں بھی ایک دوسرے سے باری لے جانے کی کوشش کریں گے''۔ (۲)

۱۔ نسرین بانو اکرم بحوالہ سابقہ ص ۱۱۳
۲۔ ایضاً ص ۶۳

کویت شہر نسرین بانو کو بہت پسند آیا وہ اس کی بہت تعریف وتوصیف کرتی ہیں کہ سمندر کی گود میں لپٹا ہوا ایک نہایت خوبصورت اور صاف ستھرا شہر ہے اور خصوصاً رات کے وقت کسی پرستان کی طرح پراسرار اور جگمگا تا ہوا نظر آتا ہے۔ شیخ صباح سے کویت کے بارے میں کہتی ہیں۔

''کویت ملکہ شب یعنی رات کی رانی ہے اور مجھے رات کے وقت کویت جتنا پسند آیا ہے۔ کبھی کوئی ملک اتنا پسند نہیں ہوا۔ یہ کویت کے متعلق میرا دلی اظہار ہے۔'' (۱)

اور یوں یہ سفر ذات کے سفر سے شروع ہو کر ذاتی پسند پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن کویت کے بارے میں خاصی معلومات فراہم کرتا ہے۔

۱۔ نسرین بانو اکرم بحوالہ سابقہ ص ۱۴۳

قرۃ العین حیدر (جہان دیگر)

قرۃ العین حیدر کا سفر نامہ امریکہ '' جہان دیگر'' کے نام سے شائع ہوا ہے وہ امریکہ میں نئی دنیا کے مناظر سے خود آ گاہی حاصل کرتی ہیں اور تجربات و مشاہدات کا ایسا جہاں سمیٹی ہیں جن میں عبرت، تجسس، دلچسپی، تضاد، اونچ نیچ کے علاوہ مختلف طبقوں کا مشاہدہ ومطالعہ بھی ہے۔ وہ مختلف رسموں، تہواروں، فاتحوں اور شکست خوردہ بادشاہوں کا تعارف بھی کرواتی ہیں اور وجوہات بھی بتاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے عام مصنفین سے ہٹ کر کہ جو اپنی کتاب کی تزئین و آرائش کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے ادیبوں کی آرا سے اور ایک اچھا سا پیش لفظ جو کہ تعریف سے بھر پور ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو منوانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن قرۃ العین حیدر نے عام مصنفین سے الگ اپنے لئے نئی راہ نکالی ہے اور پیش لفظ خود لکھا ہے جو ان کی خود اعتمادی کی دلیل ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے خاندان کا تعارف کرایا ہے۔ جس میں اگرچہ انہوں نے عاجزی سے کام لیکر خود کو اکیلا کچھ نہیں منوایا بلکہ سب کے ساتھ پروان چڑھ کر اپنے قلمی و ذہنی سفر کی روداد لکھی ہے لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے خاندان میں نہ صرف روایات کا اثر باقی ہے بلکہ علمیت اور قابلیت بھی ان کے در کی داسی ہے۔ علاوہ ازیں اعلیٰ تعلیم کی خاطر ان کے خاندان کے افراد باہر کے مختلف ممالک میں قیام پذیر ہیں۔

یہ سفر نامہ امریکہ کے بارے میں ہے۔ اپنے خیالات، احساسات اور جذبات دوسروں تک پہنچانا اور سفر کے تجربات ومشاہدات میں قارئین کو شریک سفر کرنا ہی عام مسافر کو سیاح یا ادیب بناتا ہے۔ آج کا سفر نامہ نگار بہت باشعور ہے۔ اب وہ جدید تعلیم سے ایسی معلومات فراہم کرتا ہے کہ محرک تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ آج کا سفر نامہ جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔

قرۃ العین حیدر باشعور سفر نامہ نگار ہیں۔ جو دوران سفر مشاہدے کے ساتھ ذہن کے دروازے بھی کھلے رکھنے کی قائل ہیں۔ اسطرح اشیاء کے ظاہری پہلو کے ساتھ باطنی پہلوؤں پر بھی نظر ڈالتا ہے۔

انور سدید لکھتے ہیں۔

'' ان کی منفرد خوبی یہ ہے کہ وہ سفر نامے کے موجود ہیں ناموجود کو بھی زندہ کر دیتی

ہیں اور زندگی کے حقیقی گھمسان سے اتنی دانش تلاش کر لاتی ہے کہ ان کے سامنے ایک بڑی لائبریری بھی حقیقی نظر آنے لگتی ہے۔ ایک ناول نگار کی حیثیت میں وہ سفر کے دوران زندگی کی معمولی جزئیات کو بھی توجہ سے دیکھتی اور انہیں ایک ماہرانہ افسانہ نگار کی طرح سفرنامے کی بنت میں شامل کر دیتی ہیں۔''(۱)

سفر کی جانب روانہ ہوتے ہی ایک تو وہ رنگ و نسل کے امتیاز کو ختم کر کے صرف یہ جانتی ہیں کہ ارض و سماوات کا مالک رب العالمین ہے اور دوسرے باب میں وہ اندلس کے آخری شاہ کی شکست کا حال ان کی آخری قسط کے ذکر کے ساتھ کرتی ہیں لکھتی ہیں۔

''جب سورج ڈوب رہا تھا، غرناطہ میں لوگ دوڑے، کچھ نے تثلیث کو پکارا، کچھ نے محمد کو۔ قرآن یہاں سے چلا گیا، صلیب آ گئی، گرجاؤں میں گھنٹیاں بجیں، الحمراء کے میناروں سے ہلال نوچ کر پھینک دیئے گئے۔ ایک بادشاہ ظفر مند آتا ہے۔ ایک سلطان روتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔ گریہ کناں اپنی سفید داڑھی نوچتا نوحہ زنا ہے۔ الوداع غرناطہ، الوداع بے مثال شہر، رخصت اے مسخر جہاں۔''(۲)

قرۃ العین ایک ایسی ادیبہ ہیں کہ ان کا مطالعہ مذہب تاریخ، سیاست، تہذیب غرض کہ اپنی قوم یا غیر اقوام ہر طرح سے ان کا مطالعہ قابل تعریف و تحسین ہے۔ صرف یہی نہیں وہ جہاں جاتی ہیں۔ وہاں کی سر زمین اور مذاہب کا بڑا گہرا مشاہدہ و مطالعہ تاریخی پس منظر میں کرتی ہیں اور وہاں اس عیسائیت میں پیدا ہونے والی فرقہ بندی کھیتولک اور پروٹسٹنٹ مذہب کے بارے میں بڑی تفصیل بیان کی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ شکاگو ائر پورٹ کے متعلق لکھا ہے کہ دنیا کا مصروف ترین ائر پورٹ ہے اور یہاں کی تہذیب، معاشرت، مذہب اور خوبصورتی کا ذکر کیا ہے۔ امریکہ میں بزرگوں کی زندہ دلی ان کے پیشے حتیٰ کہ موسیقی سے دلچسپی اور مغربی مفکرین کے لئے اپنی صلاحیتوں کو ایک سنجیدہ پروفیشنل کے طور پر سمجھنا ان کے لئے بڑا ہی حیرت انگیز تھا۔

امریکہ کو اگر کسی قوم نے مسحور کیا ہے تو وہ چین اور جاپان کے لوگ ہیں۔ لیکن امریکہ ان کی ترقی کے باوجود امریکہ ہے کیونکہ سپر پاور ہے۔ اور اس کی یہ شان و شوکت اس کے شہروں کے نام سے بھی نظر آتی ہے۔

۱۔ انور سدید بحوالہ سابقہ ص ۱۰

۲۔ قرۃ العین حیدر جہان دیگر مکتبہ اردو ادب لاہور۔ س۔ن ص ۱۶

''امریکہ کی ہر ریاست ایک تخلص بھی رکھتی ہے۔ مثلاً ارمی زونا، گرینڈ کینس اسٹیٹ، ارکنسو، برین مواقع کی سرزمین، کیلی فورنیا، گارڈن اسٹیٹ، ڈیلاویرہ ڈائمنڈ اسٹیٹ، .... گارڈین اسٹیٹ نیو یارک' ایمپائر اسٹیٹ (ایمپائر یعنی اول) ٹیکسس تنہا ستارہ، واشنگٹن، سدابہاوغیرہ ''(۱)

یہ ظاہر کرتا ہے کہ امریکہ کی ہر State کے دو نام ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر ان کو پسند کیا جاتا ہے۔ ''قرۃ العین حیدر امریکی تہذیب وتمدن سے خاصی مرعوب نظر آتی ہیں جس کی مثال پورے سفرنامے میں جابجا نظر آتی ہے۔ مثلاً

''شدید انفرادیت پرستی اور دوسرے شخص کی Privacy کا احترام اور اپنے کام سے کام رکھنا۔ مغربی تہذیب کی خصوصیت ہے اور شدید خود اعتمادی بقول شخصے ہر امریکن مجسم منشور آزادی بنا ہوتا ہے۔''(۲)

اس سفرنامے میں ایک اور اہم پوائنٹ یہ ہے کہ جب یہ سفرنامہ لکھا گیا۔ اس وقت ایران میں انقلاب کا دور دورہ تھا۔ جب خمینی نے شاہ ایران کی حکومت کو ختم کر کے پردے اور اسلام کا پابند لوگوں کو بنایا۔ اس سے امریکن اور باقی قومیں ایرانیوں سے نفرت کرنے لگیں اور اسلام کو ایک ایسا مذہب متعارف کروایا جو بہت سخت سزائیں دینے والا مذہب ہے۔ یہاں قرۃ العین حیدر نے گہرے معاشرتی شعور کے ساتھ تقابل وتجربہ کیا ہے کہ باہر کے ممالک میں آخر دیگر مذاہب کی کتابیں تو فروخت ہوں لیکن اسلام کے بارے میں اتنی غلط رائے کیوں قائم ہے۔ ان کی اسی بے باکی اور بولڈنس کو عموماً پسند نہیں کیا جاتا۔

یہ سفرنامہ اس کے ساتھ ساتھ قرۃ العین حیدر کی قوت مطالعہ اور قوت مشاہدہ کا امین بھی ہے کہ انہوں نے امریکہ میں تاریخی، تہذیبی ترقی کے ساتھ ساتھ مذہب کے بارے میں عقائد ونظریات کا مطالعہ بھی تحقیقی نقطہ نظر سے کیا ہے۔ اور یہی ان کا اسلوب کی ندرت اور خوبصورتی ہے کہ وہ بیک وقت کئی مناظر کی اشیاء اور کئی اشخاص کا مطالعہ کرتی ہیں۔

''یونیورسٹی کے ایک آڈی ٹوریم میں اسلام میں عورتوں کا درجہ پر لیکچر دیتے ہوئے محسوس ہوا کہ سامعین کے لئے اسلام بھی ایک دوسرے کے کترنے کی چیز تھی یہ

۱۔ قرۃ العین بحوالہ سابقہ ص ۶۵

۲۔ ایضاً " ص ۶۸

موضوع اس وقت ڈاکٹر فورڈ اور ڈاکٹر فلیمنگ نے اسلامی ممالک میں انتہا پسندانہ مذھبیت کی لہر کو مدنظر تجویز کیا تھا۔ ''جرم'' چار شادیاں ''پردہ''، مسلم عورتوں کی کمتر حیثیت وغیرہ تمام تصورات اور سعودی عرب اور ایران کے موجودہ حالات کے مناظر میں ایک پیچیدہ اور نازک موضوع تھا۔ (۱)

اس موضوع کے بارے میں بتا کر قرۃ العین دراصل اس نازک صورت حال کی عکاسی کرنا چاہتی ہیں۔ جب آیت اللہ خمینی نے روائتی پردے کو رائج کیا اور لوگوں نے اسے انتقامی کاروائی تصور کیا اور شاہ کے جرائم کی تحقیق کے بارے میں ان کی آرا کو تفصیلاً بیان کرنا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور اہم موضوع کہ جو اتنے سال گزرنے کے باوجود بھی سنگین ہے وہ ہے کالوں کا مسئلہ۔ لاس اینجلس میں ۶۵ ء میں نسلی فساد ہوئے تھے اور اس میں گوروں کا ہاتھ ہے وہ ہمیشہ کالوں کو بدنام کرتے ہیں۔ قرۃ العین لکھتی ہیں۔

> ''امریکہ میں کالوں کا مسئلہ یقیناً اب بھی موجود ہے۔ جرائم پیشہ زیادہ تر نفو وہی ہیں۔ افلاس زدہ محلوں میں وہی رہتے ہیں۔ بیروزگاروں کا سرکاری وظیفہ زیادہ تر ان ہی کو ملتا ہے۔ گوریوں کے مقابلے چھ فیصدی زیادہ تر کالی لڑکیاں بن بیاہی مائیں ہیں۔'' (۲)

قرۃ العین حیدر نے اپنے سفرنامے میں نفسیاتی مشاہدہ خلوص اور فکر وفن کے نئے تجربے سے کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے سفرنامے میں وسعت، جامعیت اور نیرنگی ہے۔ تکنیک کی ندرت پسندی اور اسلوب کا تخلیقی الگ ان کے سفرنامے میں نمایاں ہے۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بعض مقامات میں نثر میں شاعری کی گئی ہو۔

> ''اتنی خوبصورت سہانی، دلچسپ، مسرت بخش، فرحت انگیز دنیا اور چند انسانوں کو چند انسان سیاست کے نام پر پھانسی دے کر گولی سے اڑا کر، بم پھینک کر، خنجر جھونک کر اس رنگ وجود سے معدوم کر دیتے ہیں۔ آخر کیوں؟'' (۳)

ناول ہو یا افسانہ یا سفرنامہ اگر ایک نئی سوچ نئی راہ اور نئے سفرنامے کھولتے ہوئے ختم ہو جائے تو قاری کے اندر کچھ کرنے کا جذبہ کچھ سوچنے کی امنگ اور کچھ کرنے کی ہمت ابھرتی ہے۔ یہی قرۃ العین حیدر کے

۱۔ قرۃ العین بحوالہ سابقہ ص ۱۴۵
۲۔ ایضاً ص ۱۳۴
۳۔ ایضاً ص ۱۹۹

سفرنامے کے سفرنامے کا انجام ہے۔ ان کا سفرنامہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے قول پر ختم ہوتا ہے۔

''حیرت کی بات ہے کہ جب اللہ ہمارا اور صرف ہمارا تھا تو اس نے خلافت عباسیہ کا وارث ہلاکو اور اندلس کا مالک ازابلا اور فرڈی ننڈ کو کیوں بنایا۔ اور مغلوں کا تاج کوئن وکٹوریہ کے سر پر کیوں رکھ دیا۔ مشرقی یورپ سے ہمارے آثار کیوں مٹا دیئے روس میں اسلام پر............ اور پھر کمیونسٹوں کو کیوں غالب کیا وغیرہ وغیرہ۔''(۱)

قرۃ العین کے سفرنامے کا یہ اختتام سوچ کی ایک نئی راہ کھولتا ہے اور سیاح کی تاریخ سے واقفیت کے علاوہ اس کی اندرونی آنکھ کے واہ ہونے کا بھی غماز ہے۔

۱۔ قرۃ العین حیدر بحوالہ سابقہ ص ۱۸۹

باب چهارم

۱۹۷۱ سے تا حال کے سفر نامے

۱) ش فرخ : نئی دنیا پرانی دنیا
۲) بلقیس ظفر : مسافتیں کیسی
۳) بشریٰ رحمٰن : براہ راست
۴) نجمہ افتخار راجہ : میرے بھی سفرنامے
۵) پروین عاطف : کرن، تتلی، بگولے
۶) کوثر جمال : چینی منگولوں کے شہر میں
۷) تابندہ بتول : شالیمار سے تاج محل تک
۸) نجمہ افتخار راجہ : سایونارا
۹) بشریٰ رحمٰن : ٹک ٹک دیدم ٹوکیو
۱۰) بیگم سلمیٰ اعوان : یہ میرا بلتستان
۱۱) سائرہ ہاشمی : کیمرج اور کیمرج
۱۲) نوشابہ نرگس : سفر کہانی

۱۳) کوکب خواجہ	:	نی ہاؤ
۱۴) ڈاکٹر فرخندہ جالی	:	گرین کارڈ
۱۵) ڈاکٹر فرخندہ جالی	:	کریڈٹ کارڈ
۱۶) ڈاکٹر فرخندہ جالی	:	پرایا سفر
۱۷) بلقیس ریاض	:	بحر ظلمات سے آگے
۱۸) پروین عاطف	:	پڑ واسنی
۱۹) سلمیٰ اعوان	:	میرا گلگت وہنزہ
۲۰) نیلم احمد بشیر	:	نیلا ان نیپال
۲۱) رضیہ فصیح احمد	:	دو تھے مسافر
۲۲) ذکیہ ارشد	:	سورج کے ساتھ ساتھ
۲۳) ثریا حفیظ الرحمٰن	:	جس دیس میں گنگا بہتی ہے
۲۴) خالدہ ادیب	:	سفرنامہ ہند
۲۵) رضیہ فصیح احمد	:	سیر کر دنیا کی
۲۶) کشور ناہید	:	آجاؤ افریقہ

ش فرخ (نئی دنیا پرانی دنیا)

روایات بدلتی ہیں تو معاشرے کے بندھن بھی ٹوٹ جاتے ہیں اور افراد بکھر جاتے ہیں۔ پھر معاشرے کی ازسرنوتعمیر کے لئے زندگی کے لئے زندہ رہنے کے لئے اسی شکست وریخت کے ساتھ نئی دنیا تشکیل پاتی ہے جو اگرچہ پرانی قدروں کو فراموش نہیں کرتی ہے لیکن نئی دنیا میں مدغم ہونے کی بے پناہ صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ انسانی عظمت اور فکر کی بلندی اسی اصول پر گامزن ہے۔

ش فرخ صاحبہ کا سفر نامہ ''نئی دنیا پرانی دنیا'' امریکہ کی نئی اور پرانی دنیا کی فضاؤں سے روشناس کرواتا ہے۔ اس سفرنامے کا پیش لفظ ''رضیہ فصیح احمد'' نے لکھا ہے۔ لکھتی ہیں۔

> ''سفر نامے میں سفر اور نئی نئی جگہیں پلاٹ اور سسپنس کا نعم البدل ہوتی ہیں۔ کردار اور فضا سلیقے سے ہو تو سفر نامہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔ مس فرخ کا سفر نامہ شروع سے آخر تک دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ زبان و بیان شگفتہ ہے۔ کہیں کہیں مسکراہٹ بھی نمودار ہوتی ہے''۔ (۱)

انسان کی ابتدائی زندگی سے لیکر آج کے ماڈرن دور تک اگر جائزہ لیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ زندگی ایک طرف تو نام ہے عقل وشعور کا لیکن دوسری طرف اس میں جذبہ تخیل، محبت، ہجر، فراق جیسے جذبات بھی لازم ہیں کہ زندگی کبھی ایک رخ سے ایک زاویئے سے دیکھنے سے واضح نہیں ہوتی۔ زندگی کی تمام جہتیں اس کے تمام پرت اس وقت ہی کھل کر سامنے آتے ہیں۔ جب انسان دل و دماغ کی پکار پر دھیان دے مس ش فرخ کا سفر نامہ اس بات کی مکمل دلیل ہے کہ انہوں نے امریکہ کو دونوں پہلوؤں سے کھلی آنکھ سے دیکھا، پرکھا اور جانچا۔ اس کے بعد انہوں نے یہاں کی سیاسی، سماجی، گھریلو، معاسی، معاشرتی زندگی اور تاریخ کے اوراق کو سفر نامے کے قالب میں یوں ڈھالا کہ ہمارے تعبیر اپنے تصورات کی عملی تصویر کو سامنے رکھتا ہے۔ اپنا نصب العین بناتا ہے۔

۱۔ رضیہ فصیح احمد، پیش لفظ (نئی دنیا پرانی دنیا) از ش فرخ۔ ادارہ ادبیات کراچی ۱۹۷۶ ص۔ ۱۰

مسّ فرخ کے بیان میں پس پردہ سوز و ساز، آرزو اور احساس دردمندی میں موجود ہے۔ ان کا سفرنامہ ایسی سوچ کا حامل ہے جو قدم قدم پر انہیں نئی صورت حال سے دوچار کر دیتا ہے۔ وہ امریکیوں کی داستانیں جمع ہی نہیں کرتی۔ ان کو ہر زاویہ نظر سے دیکھتی ہیں اور تجربہ کرتی ہیں۔ امریکہ میں وہاں کی روشنیوں کی طرح زندگی ہر جگہ روشن اور چمک دار نہیں ہے بلکہ اس روشنی میں جو تاریکی ہے وہ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک میں نظر نہیں آتی ہے۔ حد درجہ مفلوک الحالی اور افلاس نے یہاں بھی ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ جنہیں دکھانا وہ ضروری سمجھتی ہیں لیکن اس میں بھی اصلاحی پہلو پایا جاتا ہے۔ لکھتی ہیں:-

''امریکی کا کردار اپنے وسیع اور کشادہ ماحول اور ایسی قدرتی وراثت کی پیداوار ہے جو متنوع بھی ہے اور پیچیدہ بھی''۔ (۱)

ش فرخ صاحبہ کے مزاج کی معصومیت نے فکر ونظر کو بلندی عطا کی ہے وہ اپنے سفرنامے میں تجزیہ نگاری میں اتنی محویت کا مظاہرہ کرتی ہیں کہ احساس ہوتا ہے کہ ایک کہنہ مشق سیاح کی طرح انہوں نے تجزیہ اور تبصرہ میں سماجی اور سیاسی زاویوں کو مدنظر رکھا ہے۔ وہ عام روش سے ہٹ کر سوچتی ہیں اور محسوس کرتی ہیں۔ ان کا سفر زندگی کا ایک حسین مرقع ہے کہ جس میں درد وغم کے ساتھ ساتھ فرحت بخش اور لطافت آگیں کیفیات بھی ملتی ہیں اور قاری پر بھی تاریخ کے دھندلے اوراق کو پلٹتے ہوئے خود فراموشی کی کفیت طاری ہو جاتی ہے۔

''امریکی کی زندگی سے جذبات رومان اور اقدار قسم کے الفاظ خارج ہو گئے ہیں۔ جذبات نے عمل کی صورت اختیار کر لی ہے''۔ (۲)

انگلینڈ کی سرزمین کے بارے میں ش فرخ صاحبہ کا خیال ہے کہ یہاں سے اگر انگلینڈ کی کنسٹری سائیڈ کو نکال دیا جائے تو صرف زرد چہرے اور مٹیالی عمارتیں بچ جاتی ہیں۔ عورت دنیا کے کسی خطے کی ہوں پر خطے کا امن لاجواب ہوتا ہے۔ عورت کے حسن کو مرد ستائش بھری نگاہوں بلکہ مسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے لیکن عورت دوسری عورت کے حسن کو تنقیدی نظروں سے دیکھتی ہے۔ اس لئے ش فرخ کہتی ہیں۔

''ولایت کا کوئی کمال ہو یا نہ ہو یہاں کی عورت بڑے عرصے تک جوان رہتی ہے بلکہ یہاں کی ہوا ہی ایسی ہے کہ دیسی عورتوں پر بھی آپ آ جاتی ہے''۔ (۳)

۱۔ ش فرخ (نئی دنیا پرانی دنیا) ادارہ ادبیات کراچی ۱۹۷۶ ص۔ ۱۰
۲۔ ایضاً ؍؍ ص۔ ۲۱
۳۔ ایضاً ؍؍ ص۔ ۲۲

مادام تساؤ کے عجائب گھر کے بارے میں بھی تفصیلی حال بیان کرتی ہیں اور ان تمام شخصیات کہ جن کے مجسمے یہاں موجود ہیں۔ ان کے نام اور ان کے علاقوں تک کی پہچان کرواتی ہیں۔ یُوں تاریخ اور ادب ساتھ ساتھ چلتے ہوئے معلومات کا وسیع زخیرہ اپنے قاری کے لیے جمع کر لیتے ہیں بلکہ اکثر سیاحوں کی طرح ان کے دل سے اپنے وطن اور اپنے لوگوں کا خیال دل سے نہیں نکلتا۔ وہ امریکن لوگوں کا تجزیہ اپنے خطے سے کچھ یوں کرتی ہیں۔

''جس طرح لاہوری شام کے وقت مال پر ٹہلنے نکلتے ہیں یا لبرٹی مارکیٹ میں آئس کریم کھانے جاتے ہیں۔ کراچی والے طارق روڈ پر مٹرگشت کرتے ہیں۔ نیو یارک والے یہ وقت ٹائم اسکوائر میں گزارتے ہیں''۔ (۱)

~~ش فرخ صاحبہ~~ رائل شیکسپیئر تھیٹر جو ۱۹۷۹ میں قائم ہوا تھا اس میں آگ لگ گئی اور مجسمے وغیرہ سب جل کر خاک ہو گئے۔ وہ شیکسپیئر کے بارے میں خاصا تفصیل سے لکھتی ہیں۔ حتی کہ اس کی والدین کی گھریلو زندگی کے بارے میں کہ وہ کبھی پرسکون نہ تھی کیوں کہ شیکسپیئر کا والد ایک اجڈ بیوپاری تھا۔ اس کے مقابلے میں میری اردن اس کی بیوی امیر گھرانے کی بیٹی تھی۔ اس کے لیے اپنے شوہر کے مزاج کے مطابق مطابقت پیدا کرنا مشکل تھا اور وہ اکثر اس بات پر کڑھتی تھی لیکن خود شیکسپیئر کو بھی زندگی نے خاص سکھ نہیں دیئے۔ اس طرح امریکہ کا ہر روپ ایک مکمل اور متحرک تصویر کے ساتھ جلوہ گر ہو گیا اور ہم ش فرخ کے مشاہدے کے قائل ہو جاتے ہیں کہ زندگی کو انہوں نے اتنا قریب سے دیکھا کہ یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ امریکہ کے قالب میں ڈھل گئی ہیں اور امریکی زندگی کے سیاہ اور روشن پہلوان کے سامنے عیاں ہو گئے ہیں۔ اور وہ بھی اس جراح کی طرح کہ جو آپریشن اس امید پر کرتا ہے کہ مریض کی زندگی بچ جائے نہ کہ اسے تکلیف دینے کے لئے تو ش فرح صاحبہ نے بھی امریکہ کو بھرپور توانائی کے ساتھ اس کی نئی اور پرانی تصویریں کھینچ دی ہے کہ صدیوں کا سفر پل میں طے ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ہم مس فرخ کے ساتھ چلنے پر مجبور ہیں کہ انہوں نے امریکہ کی زندگی کو بیان ہی نہیں کیا بلکہ اس میں سچے اور کھرے رنگ بھر دیئے ہیں کہ اس سفرنامے میں ہمیں قوس قزح کے رنگوں کا حسین امتزاج نظر آتا ہے کہ جس کا ہر رنگ ہی خوبصورت ہے اور اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

۱۔ ش فرخ (نئی دنیا پرانی دنیا) ادارہ ادبیات کراچی ۱۹۷۶ ص۔ ۴۰۸

''ش فرخ کے سفرنامے نئی دنیا ، پرانی دنیا میں ایک فطری سیاح کی جستجو ۔ بے پایاں غیر معمولی نظر آتی ہے وہ زندگی کی نعمتوں اور قدرت کی بوقلمونیوں پر محبت کی نظر ڈالتی اور قاری کو خوش مزاجی سے نئی فضاؤں سے متعارف کراتی ہیں ۔ انہوں نے خاتون ہونے کے ناطے امریکہ کے ایسے گوشوں تک رسائی حاصل کی ہے جہاں تک مرد سیاح بھی نہیں پہنچ سکتے اور بعض مقامات پر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کولمبس کو دوبارہ دریافت کرلیا ہے''۔ (۱)

اہم بات یہ ہے کہ اس سفرنامے میں حسن سراپا بھی ہے اور تہذیب نظر بھی ہے۔ انہوں نے زندگی کے نظریات کو واضح کرنے کے لئے بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کیا ہے لیکن زندگی کو اس کے اصل رنگ میں منعکس کیا ہے۔ اسی وجہ سے زیادہ جاذب توجہ سفرنامہ بن گیا ہے۔

سب سے انوکھی اور مزیدار صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ ہر جگہ پر پہنچ کر اس کے معیاری وقت کے مطابق اپنی گھڑی کی سویاں بار بار بدلتی ہیں تو عجیب قسم کی احساس کمتری بھی ان کے اندر جنم لیتی ہے۔

'' پاکستان سے کیلیفورنیا تک تیرہ گھنٹے پیچھے کی۔ کراچی سے لندن پانچ گھنٹے، نیویارک پانچ گھنٹے اور پیچھے ، نیویارک سے ڈینوز (کوریڈو) وقت دو گھنٹے اور پیچھے پھر ڈینور سے سان فرانسسکو ایک گھنٹہ اور کم اس کے بعد سان فرانسسکو آٹھ گھنٹے اور نیویارک کے مطابق پانچ گھنٹے آگے کردیا۔ کراچی تک پہنچے پہنچے بیس سال پیچھے چلی جاؤں گی۔ کیونکہ ذہنی ترقی اور فکری پرواز کے لحاظ سے ہم برطانیہ سے دس سال اور برطانیہ امریکہ سے دس سال پیچھے ہے''۔ (۲)

کتنے اعلیٰ پیرائے میں ش فرخ صاحبہ نے اپنی پسماندگی اور امریکہ کی ترقی کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے یورپی اقوام کے فکری، ذہنی، تہذیبی میلانات تک رسائی حاصل کرنے کی کاوش کی ہے۔ وہ اپنے تجربات سے یورپی اقوام کی اقدار کو زندگی آموز تصویروں میں یوں منعکس کرتی ہیں کہ اسی مشاہدے میں فکری ارتقاء بھی نظر آتا ہے اور تہذیب نظر بھی لکھتی ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص۔ ۴۰۸

۲۔ ش فرخ بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۷۱

''ہم جو اپنی صدیوں پرانی تہذیب وثقافت کے خزینوں کو سنبھال سنبھال کر سینت سینت کر رکھتے آئے ہیں ۔ہمیں اپنی روایات پرستی کے چکر نے باہر نہیں نکلنے دیا۔ ہم پلٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں کہ ہمارا ماضی کہاں ہے ۔سمجھتے سوچتے رہے ہیں کہ گزرنے والا کل کیا کچھ لے گیا۔ کیا کچھ دے گیا۔ امریکی کو یہ بھی پرواہ نہیں کہ اس کے لیے آج کا دن کیا کچھ سمیٹ لایا ہے وہ آنے والے کل کی طرف دیکھتا ہے''۔ (۱)

ش فرخ نے ولیم اور میریوں کی محبت کا قصہ دل میں اترنے والے انداز میں پیش کیا ہے کہ ہم اس کی منظر نگاری کو نہ صرف متحرک دیکھتے ہیں بلکہ اس کرب کو بھی محسوس کرتے ہیں جو دوسروں نے محسوس کیا اور بالکل یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ واقعہ ابھی ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا ہو۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ عورت اپنی نسائیت کی وجہ سے ہر دکھ کو اپنا دکھ محسوس کرتی ہے اور محبت کی ناکامی یہ تو اتنا بڑا دکھ ہے کہ ہ اس دکھ کو مرد سیاح بیان تو خیر کرتا مگر ہوسکتا ہے اس کے لئے محسوس کرنا اور اس کرب میں گزرنا ناممکن ہوتا ہے کیونکہ مرد ٹھہرا ہرجائی اور بھنورا صفت اور عورت کسی بھی خطے کی ہو، وفا کی دیوی اور محبت کی داسی ہے۔ وہ محبت کو چھوڑنے کی بجائے محبت میں جل مرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ ش فرخ صاحبہ لکھتی ہیں۔

''ان کی آنکھ کھلی تو ولیم نہ صرف مر چکا تھا بلکہ لاش تک غائب تھی وہ چیختی ہے۔ میں پوچھتی ہوں وہ کہاں ہے، وہ کہاں گیا وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی ۔تمہیں علم ہے انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا وہ میری ملکیت چھین کر گئے ہیں۔ وہ میرا تھا۔ میں ۳۰ سال تک اس سے محبت کرتی رہی جب وہ جانے لگا تو میں اسے خدا حافظ بھی نہ کہہ سکی''۔ (۲)

محبت کے علاوہ عورت دنیا کے کسی خطے میں بھی ہو ظلم برداشت کرنا اور بوجھ اٹھانا اس کی قسمت میں لکھا جاچکا ہے۔ اندرونی طور پر وہ تخلیق کا بوجھ اٹھاتی ہے اور بیرونی طور پر گھربار ہی کا نہیں بلکہ مرد کے ہر روپ کا بوجھ وہ زخمی روح کے ساتھ برداشت کرتی ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گی تو اسے مار دیا جائے گا اور مرنا بھی

۱۔ ش فرخ بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۷۰

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۱۰

وہ چاہتی نہیں ہے۔ اس لیے وہ ننگے پاؤں زندگی کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ پاؤں ہی فگار نہیں۔ روح کے زخموں سے خون رس رس کر آنکھوں سے جوئے خوں کی ندیاں بہا رہا ہے۔ لیکن وہ شوریدہ سر بغیر سوچے سمجھے جلتی بلتی دوپہروں میں زندگی کا ہمسفر بننے کی تگ و دو میں مصروف ہے کہ شاید کہیں خود زندگی کو اس پر رحم آ جائے لیکن یہ ناممکن ہے۔

''امریکی عورت بھی ایشیائی عورت کی طرح پسماندہ تھی۔ وہ بھی گھر میں پڑی رہتی تھی۔ بیدار ہوئی تو اسے بھی منزل پانے کے لئے انہی راستوں سے گزرنا پڑا۔ انہی دشوار گھاٹیوں کے اوپر سے پھلانگنا پڑا۔ وہی دھول چھاننی پڑی۔ جس سے ایشیائی عورت دوچار ہے''۔(۱)

امریکہ کے ایک پہلو کا ذکر انہوں نے بڑے کرب سے کیا ہے کہ امریکہ میں جرائم پھیلنے لگے تو اس کے انسداد کے لئے مختلف فلمیں بنائی گئیں تا کہ مختلف کرداروں مثلاً کو جیک یا آئرن سائیڈ کے ذریعے بچوں کو بتایا جائے کہ جرم کیوں ہوتے ہیں اور ان سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔

امریکی معاشرے میں اب شاعری، فلم، لٹریچر، اخبار، میگزین ہر جگہ عورت کے کولہے، چھاتیاں ننگی ٹانگیں ان عناصر کی پبلسٹی کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ پرانی دنیا کا مرد اس لحاظ سے فرق تھا کہ عورت اس کے اعصاب پر سوار تھی مگر وہ اس کے چہرے کو پھول آنکھوں کو جھیل سے مشابہت دیتا تھا مگر اب یہ معاشرہ جنس زدہ معاشرہ ہے لکھتی ہیں۔

''امریکی ماہرین عمرانیات اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ امریکی معاشرہ کئی لحاظ سے شہوانی اور جنسی معاشرہ بن چکا ہے۔ اس کا یہ رجحان شوریدہ سری اور گمراہی کا عجیب امتزاج ہے۔ جب مستقبل میں امریکہ کے بڑے شہروں، نیویارک اور لاس اینجلز کے کھنڈرات کی کھدائی کی جائے گی تو اس کے آثار قدیمہ میں ایسے بے شمار نشانات ملیں جن میں عورت کی ٹانگیں اور اس کے سینے نمایاں ہونگے۔ مستقبل کا مؤرخ امریکہ کی تاریخ لکھتے وقت امریکی معاشرے میں نسوانی جسم کے خدوخال کے استحصال کا ذکر ضرور کرے گا''۔ (۲)

ش فرخ کا مشاہدہ قوی اور ان کا بیان دلچسپ اور اظہار خیال بڑا جاندار اور مکمل ہے۔ نیویارک کی عمارتوں کے بارے میں اظہار خیال کرتی ہیں۔

۱۔ ش فرخ بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۳۷

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۲۹

''یہاں کی عمارتیں آسمان کو یومیہ نہیں دیتیں۔ اسے اپنے نام
Sky Scrappers کی رعائیت سے کھرچتی ہوئی نظر آتی ہیں''۔ (۱)

اس سفر نامے میں واقعے کو ہی تجربہ بنانے کے بعد اسے صحت اور صداقت سے پیش کرنے کی پوری کاوش کی گئی ہے۔ چنانچہ اسے تجرباتی نوعیت کا سفر نامہ بنا دیا ہے۔ اس سفر نامے میں جھوٹ اور خیال آرائی کم ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے نیو یارک کی زندگی کا تجزیہ بڑی خوبصورتی سے اور حقیقی رنگ مین کیا ہے۔

''نیو یارک کو سمجھنے کے لیے نیو یارکی کو سمجھنا ضروری ہے۔ نیو یارکی دنیا کی خاص اصناف میں سے ایک ہے۔ یہ وہ فرد ہے جسے فطرت نے نہیں بنایا۔ اس پر موسم کی گرمی سردی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کا موسم وہ ہے جو اس کے کمرے کے اندر کا ہوتا ہے۔ وہ ایئر کنڈیشنر کی بدولت یا ہیٹنگ کا مرہون منت ہے۔ وہ چاندنی یا دھوپ سے واقف نہیں۔ وہ ہر کام بجلی کی روشنی میں کرتا ہے''۔ (۲)

یعنی زندگی یہاں اپنے تمام رنگوں کو کھو دیتی ہے۔ وہاں صرف ایک رنگ رہ جاتا ہے اور وہ ہے عمل جس پر موجودہ امریکی معاشرے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اب ان کا ہر کا مقصد کے تابع ہے۔ اس سفر نامے میں امریکیوں کی زندگی کے چھپے ہوئے روپ سامنے آتے ہیں۔ بعض جگہ حیرت ہوتی ہے اور اکثر جگہ ملال ہوتا ہے کہ امریکی اب جذبات سے یوں خالی ہو گئے ہیں کہ ان کے دلوں پر مشینوں کی حکومت ہے اور احساس مروت ان میں سے نکل ہی نہیں گیا بلکہ ختم ہو گیا ہے اور اب وہ چیز کا نظارہ اس طرح سے کرتے ہیں کہ جیسے ایک روبوٹ جذبات و احساسات کے بغیر صرف اور صرف کام کرتا ہے۔ جذبات کی دنیا سے کہیں دور کا بھی واسطہ نظر نہیں آتا ہے۔ اب وہ ہر احساس سے عاری ہے۔ سوائے اپنے ذاتی مقصد کی لگن کے کہتی ہیں۔

''نیو یارکی کے جسم میں ایک جواری کی روح بھری ہوئی ہے۔ وہ خدشات مول لیتا ہے۔ داؤ لگاتا ہے مگر مادہ پرست نہیں ہے۔ ابھرنے کا متمنی ہے۔ بے تحاشا سرگرم اور فعال ہے۔ بے پناہ محنت کرتا ہے مگر مقدر پر یقین رکھتا ہے''۔ (۳)

مقدر کا سکندر تو پھر کوئی کوئی ہوتا ہے۔ اس لیے امریکی ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا نہیں ہے بلکہ وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ کرنے کے سرگرم عمل ہے۔ چاہے اس کے لیے اسے اپنی زندگی ہی کیوں نہ داؤ پر لگانی پڑے لیکن وہ سب کچھ آج کرنا چاہتا ہے۔ اس کی زندگی میں کل نہیں ہے جو کچھ ہے آج ہے اور بس اس سے آگے

۱۔ ش فرخ بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۵۹

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۶۴

۳۔ ایضاً ص۔ ۲۷۱

کچھ نہیں ہے۔ش فرخ کا مشاہدہ بصیرت افروز ہے۔ آخر میں سب شہروں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

> ''نیو یارک میں بہت وسعتیں اور رفعتیں تھیں ۔ ڈینوز میں یہاں کی نسبت زیادہ سکون تھا۔ سان فرانسسکو اس سے شہر سے کہیں دلکش ہے۔ لاس اینجلز میں بے شمار دلچسپیاں ہیں لیکن لندن سے رخصت ہوتے وقت یہ شدید آرزو تھی کہ یہاں پھر بھی آؤں گی''۔ (۱)

ش فرخ صاحبہ نے اس سفرنامے میں پھولوں کے ساتھ کانٹے سمیٹ لیئے ہیں اور تلخ وشرین ذائقے کا یہ سفرنامہ امریکی زندگی کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔

۱۔ ش فرخ بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۰۳

بلقیس ظفر (مسافتیں کیسی)

بلقیس ظفر کا یہ سفر نامہ لبنان کی خانہ جنگی کے بارے میں ہے۔ جہاں ان کے شوہر پاکستانی سفارت خانے میں سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور بلقیس ظفر ان کے ساتھ لبنان مقیم تھیں۔

انہوں نے اس قیام وسفر کو تخلیقی تجربہ بنا کر معلومات اور واقعات کا دلچسپ واقعہ بنا دیا ہے ان کا یہ سفر خود اختیاری نہیں ہے لیکن اس میں انہوں نے بیروت کے حالات زمانہ امن اور دوران جنگ کی تصویر کشی کچھ اس انداز میں کی ہے کہ تمام منظر اپنی بھر پور ہولنا کی کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتی ہے کیونکہ اچانک اسرائیل کے حملے نے بلقیس ظفر اور سفارت خانے میں مقیم لوگوں کو جس اذیت سے دو چار کیا وطن سے دوری اور بے بسی کی انداز میں بڑے مئوثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔

سفر نامے کے ابتدائی حصے میں جنگ سے پہلے کا بیروت پوری دلکشی سمیت اپنی تمام تر رنگینیوں اور دلچسپیوں کا مظہر نظر آتا ہے۔ ہنستے مسکراتے بے قرار اپنے آپ میں مگن خوبصورت دلکش اور رنگین پیراہن میں لیتے ہوئے لوگ آنکھوں میں سپنوں کی جوت جگائے نئی زندگی کی طرف رواں دواں ہر دم جواں نظر آتے ہیں۔ بلقیس ظفر کی نظر بہت گہری ہے۔ وہ لبنان کے موسموں سے لیکر یہاں کے تہواروں رہن سہن خوراک ولباس اقتصادیات ہر چیز پر تبصرہ کرتی ہیں۔ انہوں نے شہروں اور لوگوں کے تاثرات کو تازگی ورعنائی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ ہر گوشے کے لوگ تہذیب و ماضی حال دکھ سکھ رنج وملال ہجر وفراق ان کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ وہ انسانوں کا مشاہدہ گہرائی سے نہیں کرتی ہیں۔ وہ ان کی آنکھوں سے دل تک کا سفر کرتی ہے۔ ان کی مثال عام سیاح جیسی نہیں ہیں جو گھر سے صرف لکھنے کے لیے نکلتا ہے۔ وہ سفر کو مشاہدہ مطالعہ اور تجربہ کی بھٹی سے گزار کر بیان کرنے کا فن جانتی ہیں۔ سیاحت ان کے فن کی معراج ہے۔ وہ تلخ وترش کا ذائقہ ہی نہیں جانتی وہ ٹھنڈے میٹھے پانیوں کا رس بھی پیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سفر دکھ سکھ کے موسموں کا مرقع ہے کہ جہاں ہر موسم اپنے اندر ایک نیا رنگ اور نیا جذبہ لیکر آنے والے موسم کا استقبال کرتا ہے ان کے ہاں کوئی بھی موسم ٹھہر نہیں جاتا بلکہ اپنا گہرا تاثر دینے کے باوجود بھی اگلے موسم کے لیے جگہ چھوڑ جاتا ہے۔ لبنان کے بارے میں

لکھتی ہیں۔

''عجیب قوم ہے موت کی آغوش میں ایک بہار آفرین زندگی گزار رہی ہے ہر آنے والا لمحہ گولیاں برسا سکتا ہے۔اس وقت یہ لوگ قبر کی طرح کی نزدیکی جگہ میں پناہ لے لیں گے مطلع صاف ہونے پر پھر وہی مصروفیات شاپنگ اور قہقہے۔۔۔آنسو اور تبسم روشنی اور تاریکی عیش اور خوف دل پانی کا چشمہ اور شعلہ جانسوز یہ ہے لبنان''۔ (۱)

بلقیس نے صرف لبنان کی جنگ کے ہولناک واقعات ہی تحریر نہیں کئے بلکہ قرآنی آیات اور تاریخی حوالہ جات کا ذکر لبنانی تہذیب و معاشرت کے پس منظر میں یوں بیان کیا ہے کہ ان تمام حوالہ جات کے باوجود سفر نامہ قطعاً ثقیل محسوس نہیں ہوتا بلکہ ہم ان کی علمیت کے قائل ہوتے جاتے ہیں۔ وہ کائنات کو ایک نئے زوایہ سے دیکھنے کی کاوش کرتی ہیں۔ اور قاری کو تاریخ کے جھروکوں کی سیر کرواتی ہیں۔ خاص طور پر اسلامی حوالہ جات اور قرآن مقدس کی آیات کا وہ ترجمہ جو انہوں نے انسان کی تباہی و بربادی کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ بہت متاثر کن ہے۔ پھر لبنان جیسی ارض مقدس جو پیغمبروں کی جائے پیدائش ہے اس کا ذکر تاریخی حوالوں سے کرتی ہیں کہ جیسے وہ تاریخ کی بہت بڑی محقق ہوں۔ لکھتی ہیں۔

''پیغمبروں کا یہ مولد یہ قدیم شہر دنیا کے سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز تھا۔ یہی وہ مقام بھی ہے جہاں حضرت یونس کو مچھلی نے اگل دیا تھا یہاں ایک نہر الکلب ہے جس کے کنارے تاریخ بھری پڑی ہے یہاں کے اکثر شہروں کے نام ابھی تک قدیم زمانے کے ہیں۔ یہاں پر عباسیوں کی حکومت بھی رہی ہے یہ صلیبی جنگوں کا مرکز بھی رہا ہے پھر مملوکوں نے صلیبیوں کو نکال کر یہاں حکومت کر لی اس کے بعد ۱۹۱۸ تک یہ ترکوں کے زیر نگین رہا آخر ۱۹۴۳ میں یہ مکمل طور پر غیر ملکی تسلط سے آزاد ہو گیا اور یہاں لبنانیوں کی اپنی حکومت قائم ہوئی تا آنکہ ۱۹۷۵ میں یہ ملک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا۔'' (۲)

تاریخ کے ساتھ ساتھ زندگی کے نشیب فراز کے بارے میں ان کا نقطہ نظر بڑا حقیقت پسندانہ ہے اور شاید ایک خاتون ہونے کے ناطے وہ حساس بھی زیادہ ہیں۔ وہ ان معصوم چیزوں کی بے بسی کو بھی محسوس کرتی ہیں کہ جنگی رنگت کو جنگ کی ہولناکی نے جلی ہوئی لکڑی اور جسم دھواں کھائی ہوئی دیوار کی طرح سیاہ کر دیا

۱۔ بلقیس ظفر مسافتیں کیسی، جنگ پرنٹنگ پریس لاہور ۱۹۸۲ ص۔ ۱۶

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۴

ہے۔اور زندگی کے سارے رنگ اسی فلک تلے بسنے والے اپنے ہی جیسے لوگوں نے ان کے لیے اجنبی کر دیے۔
عورت شاید ہمیشہ سے حسن و بدصورتی کو ماپنے کا پیمانہ مرد سے الگ رکھتی ہے۔وہ چہروں سے اندر کا حال اور دیکھنے سے پہچاننے کا گر مرد کی نسبت بہتر جانتی ہے یا شاید عورت وہ کچھ بھی محسوس کرنے کا ہنر جانتی ہے جو مرد کے نزدیک غیر اہم ہے۔یا عورت کے دل پر جو گزرتی ہے وہ مرد کے دل تک جاتی ہی نہیں اس لیئے ہمیشہ سے دکھ درد اذیت ہجر و فراق خوبصورتی بدصورتی کو جس طرح عورت نے محسوس کیا مرد اس کوچے کا مسافر ہی نہیں تو بیان کیا کرے گا۔یہی وجہ ہے کہ ان چیزوں کی اذیت اور دلوں کی ویرانی کا حال جس طرح بلقیس ظفر نے محسوس کیا ہے شاید ہی کوئی مرد اسے محسوس کر سکے۔

فتح و شکست کا سفر اگر چہ ظاہری طور پر مرد کر سکتا ہے۔لیکن ان دونوں کیفیات کو عورت جس طرح محسوس کرتی ہے اس کا انداز ہی کچھ اور ہوتا ہے۔لبنان کی سیاسی زندگی میں بشیر حمائیل کی کامیابی سے موت تک سفر میں انہوں نے زندگی کی کتنی ہی حقیقتوں کو بیان اور بے نقاب کیا ہے لکھتی ہیں۔

> ''شام کی اس تاریکی میں مجھے وہ حشر ساماں مناظر یاد آرہے ہیں ۔۔۔۔ایک جب بشیر حمائیل صدر منتخب ہوئے تھے لوگوں نے جشن منانے کی حد کر دی کچھ لوگ تو حدوں کو بھی پار کر گئے ۔۔۔پھر پندرہ ستمبر آیا۔۔۔جب بشیر حمائیل قتل کر دیے گئے تب ان کے مداحوں کا سوگوار ہجوم ٹی۔وی پر دیکھا۔اتنے ہی لوگ تھے اتنے ہی پھول تھے جتنے انتخاب پر دیکھے گئے مگر وہ لوگ خنداں تھے وہ پھول فاتح لیڈر کے گلے کی زینت تھے یہ اس کے تابوت پر پڑے تھے ۔۔۔۔سیاہ لباس میں ملبوس ۔۔۔۔وہ زندگی اور موت خوشی اور ماتم۔۔۔دونوں کتنی عبرتناک کتنی حقیقتیں ہیں دونوں متوازن چلتی ہیں زندگی کے دھارے کو بتاتی اور کاٹتی ہوئی۔'' (۱)

مسافتیں کیسی میں بلقیس ظفر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تخلیقی فرض کو خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔انہوں نے معاشرے کو جس رنگ میں دیکھا ہے اس کی نہایت جامع اور حقیقی تصویر پیش کر دی ہے۔وہ ماحول نگاری اور معاشرے کی عکاسی کے لیے نہ بیانیہ انداز اختیار کرتی ہیں اور نہ جذباتی بلکہ منظر کو متحرک پیش کرنے کے فن سے

۱۔ بلقیس ظفر بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۳۰

آشنا ہیں۔ خارجی منظر نگاری میں انہوں نے ماحول کی جزئیات نگاری کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔
بلقیس ظفر ابھی پوری طرح بیروت سے آشنا بھی نہ ہوئیں تھی کہ جنگ چھڑ گئی اسرائیل کے حملے نے پورے بیروت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ایک سفیر کی بیوی کی حیثیت سے چونکہ وہ اس منظر سے غائب نہیں ہوسکتیں تھی اس لیے خاموش تماشائی بن کر سارے واقعات کو ڈائری میں نوٹ کرتی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ سفر نامے میں واقعات کی بازگشت ان کی تحریر میں شدت پیدا کر دیتی ہے ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں۔

''اس میں خانہ جنگی کی خبریں اور اس کے اثرات کا نقش زیادہ نمایاں ہے کیفیات سفر بہت کم ہیں۔ بلقیس ظفر کا بیانیہ چاکلیٹ کی طرح لذیذ ہے لیکن اس کا تاثر بے حد کڑوا ہے انہوں نے نظر کو کم اور خبر کو زیادہ اہمیت دی ہے مجموعی طور پر ان کی تصنیف پر سفر نامے کا گمان نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک پورا تاثر ہے جسے ہوٹل کی کھڑکی سے دیکھا گیا ہے اور نقوش مجسم پورے تاثر میں محفوظ کر لیے گئے ہیں۔'' (۱)

لیکن اس کے باوجود بلقیس ظفر ایک حساس خاتون ہیں اور یہ حساسیت ان کے اسلوب اور انداز بیان دونوں میں نمایاں ہیں خاص طور عورت کی فطری ہمدردی اور کسی چیز کی تہ تک پہنچ کر اس کو پرکھنے کی لگن ان کے اس سفر نامے میں نمایاں ہے۔ انسانیت کا ثبوت یہ ہے۔ کہ انہیں لبنانی نوجوان لڑکی اور لڑکوں کے جھلستے چہرے ناپسند ہیں وہ زندگی کی رعنائیاں اور خوشیاں ایک ماتا کی طرح ان کے چہرے پر بکھری ہوئی دیکھنا چاہتیں ہیں جس طرح ایک ماں اپنے بچے کی تکلیف پر تڑپ اٹھتی ہے اس طرح بلقیس ظفر بھی بیروت کے نوجوانوں کو کرب میں دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہیں اور خدا سے دعا کرتی ہیں کہ انہیں جلد اس سے نجات دلائے۔

یہودیوں کی مسلمانوں کے خلاف اس جنگ کی ایک لحہ لحہ ان کے لیے ایک ایک صدی کی طرح گذرتا ہے انہوں نے ان تمام کربناک لحوں کی داستان کو قارئین کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔ یاداشت کی اس بازیافت نے ان کے سفر نامے کو مشاہدات اور تجربات کی روشنی سے ہم کنار کیا ہے۔

۱۔ انور سدید بحوالہ سابقہ ص۔ ۴۳۴

بشریٰ رحمن (براہ راست)

بشریٰ رحمٰن کا نام ادب میں ایک روشن مینار کی طرح ہے کہ جس کی کرنوں سے روشنی حاصل کرتے ہیں بشریٰ ہمہ جہت خاتون ہیں ناول نگاری کالم نگاری سفر نامہ نگاری اور پھر سیاست کے حوالے اب ان کی پہچان خاص ہیں۔

خاندانی پس منظر بھی ان سب میں کام کرتا ہے۔ والد صاحب بہاولپور کے جانے پہچانے حکیم عبدالرشید تھے۔ والدہ بھی بلند پایہ شاعرہ تھیں ان کے عارفانہ کلام کے دو مجموعے ''دعائے نیم شبی'' اور سحر آگاہی منظر عام پر آئے پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق ہونے کی وجہ سے بشریٰ نے پنجاب یونیورسٹی سے جرنلزم میں ڈگری حاصل کی۔ ان کی شادی سول انجینئر عبدالرحمٰن سے انجام پائی ان کے چار لڑکے ہیں۔ اب تک ۲۱ کتابیں لکھ چکی ہیں۔ اور نوائے وقت کا کالم چادر اور چار دیواری ان کے روشن دماغ اور اعلیٰ تعلیمی صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ عورت ہونے کے باوجود ان کی حالات حاضرہ پر کس قدر گہری نظر ہے۔ سراپا مشرقیت اور حسن وفا کے ساتھ حیا ان کی شخصیت کا خاصا ہیں بلکہ دوپٹے اوڑھنے سے ان کی شخصیت زیادہ جاذب نظر اور قابل توجہ بن جاتی ہیں آنکھوں میں چمک اور شرارت کے ساتھ ساتھ غلافی آنکھوں میں ذہانت اور کچھ کرنے کی لگن نمایاں نظر آتی ہے۔ والدین کی تربیت، بہتر ماحول، خاوند کی حوصلہ افزائی سے ان کی شخصیت کی پرتیں کھلی اور وقت کے ساتھ ان میں نکھار پیدا ہو گیا۔

براہ راست بشریٰ کا پہلا سفر نامہ ہے۔ جس نے ان کو ناول نگار خاتون سے سفر نامہ نگار خاتون کی صف میں لا کھڑا کیا اس میں انہوں نے یورپی ممالک کی تاریخی تہذیبی جغرافیائی اور معاشرتی معلومات ایک اچھے محقق کی طرح پہنچائی ہیں۔ ابتدا میں ادا جعفری کا سفر درج ہے لیکن یہ سفر نامہ بغیر کسی دیباچے اور تعارف کے ہے۔ اس میں خاص دلچسپی کی بات پاکستان کے مشہور و معروف کارٹونسٹ جاوید اقبال کے بنائے پانچ ابواب کے آغاز میں مزاحیہ کارٹون ہیں جو آغاز ہی میں اس باب کے مضمون پر روشنی ڈالتے ہیں۔

خاص طور پر امریکہ اور کسٹم کے بارے میں جاوید کارٹون اور پھر بشریٰ رحمٰن کا ان جگہوں پر اپنے

مخصوص انداز میں دوپٹہ لیے ہوئے ہونا اس چیز کی عکاسی کرتا ہے کہ بشریٰ کو امریکہ میں تمام تر ترقی کے باوجود ہر جگہ مشرقی تہذیب ہی برتر نظر آتی ہے۔ وہ مشرق و مغرب کے تضادات سے یہ حقیقت باور کراتی ہیں کہ جو کچھ اپنے وطن میں ہے کہیں نہیں ہے۔ انور سدید لکھتے ہیں۔

''بشریٰ رحمٰن نے سفر نامہ براہ راست میں روم پیرس کینیڈا اور برطانیہ امریکہ کی تہذیبی اور سماجی زندگی پیش کی ہے۔ لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ انہیں ہر جگہ اپنی مشرقی تہذیب برتر نظر آئی اور تضادات تہذیب سے یہ حقیقت باور کرائی کہ اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے اس سفر نامے میں مشاہدات سفر بشریٰ رحمٰن کی تار نظر سے بندھتے چلے گئے اور انہوں نے جمال سفر کو اس طرح سمیٹا کہ جب چاہا نظر جھکا کر دیکھ لیا۔۔۔۔۔ براہ راست ان کا نظر جھکانے اور کی دید و بازیافت ہی کا عمل ہے۔'' (۱)

لیکن اس عظمت کے باوجود ہمارے مشہور سفر نامہ نگار مستنصر حسین تارڑ کی طرح بشریٰ رحمٰن بھی نرگسیت کا شکار نظر آتی ہیں بلکہ سفر نامے کا زیادہ تر حصہ ان کے اس تاثر کی وجہ سے کہ وہ جگہ جگہ اپنے بارے میں شعوری طور پر بات کرنے میں کوشاں نظر آتی ہیں کا شکار رہے۔ یوں بعض اوقات سفر نامہ ان کی ذات کا حصہ بنتا نظر آتا ہے۔ یہ نرگسیت مختلف جگہوں پر ان کے ساتھ سفر کرتی ہے۔

یہی نہیں بلکہ حد سے بڑھی ہوئی خود ستائشی انہیں اطالوی بزرگ کی زبان سے اپنے آپ کو دل چسپ خاتون کہلوانے پر مجبور کر دیتی ہے اور کہیں اپنی شان بڑھانے کی کوشش میں اپنے آپ کو ملکہ عالیہ تصور کرنا یا جہاز پر مسلسل قلم ہاتھ میں ہے لکھنے میں مصروف رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خواہاں ہیں کہ کوئی ان سے پوچھے کہ تم ایسا کیوں کر رہی ہو یا تم کون ہو۔ اور کیا لکھ رہی ہو۔ دوران سفر ساتھی خاتون ان سے پوچھتی ہیں۔

''کہ آپ کون ہیں اور کیا لکھ رہی ہیں تو

ہم کون ہیں۔۔۔۔

ایک دم ہم فضاؤں سے بھی اونچے اڑنے لگے جی میں آیا کہ دیں۔''

''بی بی تو کیا جانے ہم کون ہیں ہم اقلیم قلم کے شہنشاہ تخیل کے جہان کے پناہ ۔۔۔الفاظ کے سوداگر۔۔۔۔معانی کے پروفیسر ۔۔۔۔۔خوابوں کے

۱۔ انور سدید بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۷۲

جادوگر۔۔۔ محاوروں کے شہہ زوراور۔۔۔گفتار کے غازی ہیں۔ (۱)

کس خوبصورتی سے وہ اپنی تعریف وتوصیف میں کوشاں ہیں۔یہی نہیں بلکہ ان کا تخیل کبھی انہیں ملکہ عالیہ اور کبھی شفیق ماں اور کبھی فرض شناس بیوی کے روپ میں پیش کرتا ہے۔اس۔خامی کے باوجود ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کوطن کی مٹی سے شب وروز اور لوگوں سے محبت ہے وہ جہاں کہیں بھی امریکن تہذیب وتمدن کا مقابلہ کرتی ہیں انہیں اپنی مٹی اور اپنے وطن کی خوشبو سوندھی معلوم ہوتی ہے جو پیرس کی خوشبوؤں سے کہیں زیادہ معطراور بہتر ہے۔

بشریٰ اگر چہ اس سفر نامے میں لاشعوری طور پر اگر چہ انگریزوں کے ڈسپلن اور ترقی سے متاثر بلکہ مرعوب نظر آتی ہیں مگر شعوری طور پر وہ انگریزوں کا تذکرہ غیر مناسب الفاظ میں کرتی ہیں مثلاً ایک جگہ جب میز بان ٹرے اٹھائے ان کی جانب آتی ہے تو ان خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔

''وہی چائے اور برگر۔۔۔ برگر تو خیر ہم کھا پی نہیں سکتے اور کالی کڑوی چائے پینا بھی ہمارے بس کا روگ نہ تھا۔کیونکہ ہمیں گوری عورت اچھی نہیں لگتی مگر گوری چائے بہت اچھی لگتی ہے۔'' (۲)

اس سے ایک طرف تو ان کی انگریزوں سے نفرت اور دوسری طرف عورت کی وہ ازلی وابدی رقابت نظر آتی ہے جو عورت کو عورت سے ہے۔

معنوی طور پر بشریٰ کا سفرنامہ جذبے تخیل مشاہدے اور مطالعے کا حسین سنگم ہے۔انہوں نے یہ سفر ذوق وشوق اور دل کی تسکین اور سکون قلب کے لیے کیا اس لیے ہر نیا منظر اور نیا تجربہ تحیر میں تبدیل ہوگیا۔یہی وجہ ہے امریکی معاشرے کی خوبیوں کے ساتھ پاکستان کی سماجی برائیوں کا ذکر بھی کرتی ہیں۔مثلاً ملاوٹ ہمارے ہاں وہ اکسیر ہے کہ جس کے بغیر دولت مند ہونا اگر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔جو جتنی زیادہ ملاوٹ کے طریقے جانتا ہے وہ اتنا ہی باشعور اور خوش قسمت اور عقل مند ہے۔امریکہ میں بشریٰ کا مکالمہ دیکھیئے۔

''آخر آپ لوگ ہر چیز میں ملاوٹ کیوں نہیں کرتے۔

ملاوٹ۔۔۔انہوں نے آنکھیں گھمائیں۔۔۔

اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کیسے کی جاتی ہے۔

۱۔ بشریٰ رحمٰن براہ راست ، ادارہ وطن دوست لاہور ۱۹۸۳ ص۔ ۲۷۱

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۹۵

واہ واہ آپ لوگ بڑے سیانے ہیں اور ساری دنیا کے تانے بنتے ہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ ملاوٹ ایک بزنس سیکرٹ ہے مثلاً آٹے میں لکڑی کا برادہ ملا دیں چینی میں سوجی یا ریت ملا دیں سیاہ زیرے میں سونف کی چھلکے ملا دیں سرخ مرچوں میں جو مرضی پیس کر ملا دیں صرف لال رنگ کر دیں نمک میں میدہ ملا دیں۔۔۔۔آخر آپ محنت سے کیوں جان چراتے ہیں یہ منافع خوری کی آسان ترکیبیں ہیں۔'' (۱)

اس طویل پیراگراف میں بشریٰ کا وہ کرب دکھ اور پشیمانی بولتی ہے جو ہم مسلمان ہونے کے باوجود کرتے ہیں اور دیگر اقوام غیر مسلم ہونے کے باوجود زیادہ با اصول اور ایمان دار ہیں۔

بشریٰ کے اسلوب میں نسائی رنگ چھوٹے چھوٹے فقروں میں یوں ڈھل گیا کہ جیسے قلم سے چنگاری پھوٹ رہی ہو جس میں طنز بھی اور گہرے کرب کا احساس بھی جو ایک مشرقی عورت ہی محسوس کر سکتی ہے مغرب اس سے انجان ہے اور مرد کسی بھی خطے کا اس اذیت سے ناواقف ہے۔

''عرب جو سلوک اپنی موٹر کے ساتھ کرتے ہیں پاکستانی وہی سلوک اپنی بیوی کے ساتھ کرتے ہیں۔'' (۲)

بعض جگہ ان کا اسلوب ایک فقرے اور ایک لفظ سے وہ مصنوعی رنگ بھر دیتا ہے کہ بڑے بڑے جملوں میں بھی ادا کرنا مشکل ہے۔مثلاً اوپر آسمان ہے پرانے ہمسائے کی طرح نظریں جمائے کھڑا ہے۔نیچے زمین ہے نئی سہیلی کی طرح انجان سی ہے''۔ (۳)

ان فقروں کا سفر نامے سے تعلق ہونا ہو لیکن لفظوں کا استعمال موقع محل کے مطابق ہے یا پھر فراک اور فراق کے لفظ سے کیسا حسن پیدا کیا ہے۔

ایک موقعے پر جب جہاز کے تمام مسافر سوار ہو جاتے ہیں تو انہیں اپنے میاں کی یاد آتی ہے۔کہ وہ بھی اس طرح ہونے میں تین سیکنڈ لگاتے ہیں صرف یہ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

میاں اب سو جاؤ۔۔۔

اور ہم پوچھ رہے تھے۔

میاں میں کیسے سوؤں ۔۔۔ (۴)

دراصل یہ وہ نسائی رنگ ہے جو بشریٰ کو عام سفر نامہ خاتون نگاروں سے الگ اور منفرد مقام بخشتا ہے کہ

۱۔ بشریٰ رحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۰۳
۲۔ ایضاً ص ۔ ۵۲
۳۔ ایضاً ص۔ ۱۸ ۔ ۱۹
۴۔ ایضاً ص۔ ۱۹

سفر میں بھی گھر کی یاد اور پھر یاد کے ساتھ ساتھ وہ کرب اور اذیت جو صرف عورت کا حصہ ہے مرد اس سے غافل ہی نہیں بلکہ نابلد ہے کیونکہ دنیا بھر کی یادیں اور تکالیف کو یاد کرنے کا ٹھکانہ ایک ہی تو ہے اور وہ عورت کا بستر ہے کہ جہاں مرد تو آسودگی کے ساتھ محو خواب ہو جاتا ہے اور اس کے پہلو میں لیٹی عورت اس کے خراٹوں کی آواز میں اپنی نازک سوچ کو کرچی کرچی ہوتا ہوا دیکھ کر سوچتی ہے کہ اے رب العزت مجھے اسی دن کے لیے پیدا کیا تھا ۔کہ جسم تھکن سے چور چور ہونے کے باوجود روح کے کرب کی وجہ سے میں ایک لمحہ بھی آسودگی حاصل نہیں کر سکتی اور یہی سوچ اسے مرد سفر نامہ نگاروں سے الگ کرتی ہے کہ مرد تو دیار غیر میں بھی اور کچھ نہیں تو آنکھیں سینک ہی لیتا۔ نادر تشبیہات کا استعمال بھی بڑی خوبی اور موقع محل کے مطابق براہ راست میں موجود ہے۔

''بس شام کو پہلو میں ایک لڑکی نما چیز کا ہونا ضروری ہے ۔لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ ہو، کمر میں بازو ہوں اور یوں چل رہے ہوں جیسے کچ بٹنا دی جوڑی۔'' (۱)

ان تشبیہات اور رباعیات لفظی میں خاصا نسائی رنگ جھلکتا ہے لیکن ان کے سفر نامے کی ایک خامی بھی ہے کہ وہ امریکہ اور دیگر شہروں کی سیر تاریخ تمدن اور کلچر کا ذکر بڑے احسن انداز میں کرتی ہیں لیکن کہیں بھی زمانے کا تعین نہیں کرتیں کہ وہ کب اور کس سال دیار غیر کی خاک چھاننے گھر سے نکل کھڑی ہوئیں ۔خاتون ہونے کے ناطے ان کی توجہ کا مرکز بازار شاپنگ سنٹر یا پھر مختلف طبقہ فکر کی گھریلو قسم کی خواتین ہیں۔

یہ سفر نامہ ڈائری کی تکنیک میں لکھا گیا اس لیے اس میں مشاہدات اور احساسات کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔مجموعی طور پر یہ سفر نامہ خاصہ دل چسپ اور دل آویز ہے۔

۱۔ بشریٰ رحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۱۹

نجمہ افتخار راجہ (میرے بھی سفر نامے)

نجمہ افتخار صاحبہ کا یہ سفر نامہ ''میرے بھی سفر نامے'' ان کا پہلا سفر نامہ ہے۔ وہ پڑھی لکھی گھریلو خاتون ہیں انہوں نے اپنے نیورو سرجن شوہر کے ہمراہ مختلف ممالک کی سیاحت سے لطف اٹھایا۔ ~~میرے بھی سفر نامے ہیں~~ پیرس میں منعقد ہونے والی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں اپنے شوہر کے ہمراہ شرکت کی اور اس کے ساتھ لندن فرانس امریکہ میں مختلف مقامات کی سیر کی۔ ان تمام واقعات کو انتہائی سادہ اور گھریلو زبان میں لکھا گیا ہے۔ لیکن ان کا سفر نامہ اس لحاظ سے دلچسپ اور مختلف ہے کہ عام سفر نامہ نگاروں کی طرح انہوں نے اس میں تصنع و بناوٹ کی بجائے جو کچھ دیکھا اسے سادگی کے بیان کر دیا ہے۔ اس سادگی نے ان کی روداد سفر کو اتنا دلکش بنا دیا ہے کہ قاری نامحسوس طریقے سے نجمہ کے ساتھ سفر نامہ کرنے اور ان مقامات کو تصور کی آنکھ سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ان کا سفر نامہ قدیم و جدید کا سنگم ہے۔ کیونکہ سفر نامہ نگار قدیم زمانے کو آنکھوں کے سامنے عیاں کرنے کے ساتھ ساتھ زمانہ حال پر بھی نظر رکھتا ہے۔ نجمہ اپنے سفر نامے میں بہترین عکاس اور کامیاب نباض نظر آتی ہیں ان کا سفر نامہ معلوماتی بھی ہے اور دنیاوی رنگینیوں کو بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر اسدار یب لکھتے ہیں۔

> ''طویل یادداشتوں کا یہ سفر جس خوبصورتی اور سادگی سے انہوں نے بیان کیا وہ ہمارے ادب میں قابل قدر اضافہ ہے نجمہ افتخار کی تحریروں میں ایک سادہ دل اور صاف باطن ادیب کی تمام تر باطنی صداقتیں نمایاں نظر آتی ہیں انہوں نے اپنے سیر وسفر میں زندگی کو جس طرح برتا اور وہاں کے لوگوں کو جیسا دیکھا ان سب نظائر کی ایک ایسی سچی صاف اور نمایاں تصویریں کھینچ کر ہمیں دکھائیں جو ہر طرح کی رنگ آمیزی اور مصنوعی آرائش سے مبرا ہیں۔'' (۱)

ڈاکٹر اسد کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا بیانیہ غیر فطری نہیں کیونکہ لفظوں کا استعمال وہ آرائش وزیبائش کی بجائے مشاہدات کے بیان کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اس سفر نامے میں نجمہ ایک عام عورت کی طرح ملتان سے ڈیگال تک کے سفر میں ہی ایک سلیقہ مند خاتون کی طرح کفایت شعاری اور کنجوسی کا درس پلو سے

۱۔ ڈاکٹر اسدار یب میرے بھی سفر نامے (دیباچہ) مکتبہ اہل قلم ملتان ۱۹۸۸ ص۔ ۹

باندھے ہوئے امریکہ کولمبواور پیرس تک کا سفر کرتی اور مختلف مراکز کا معائنہ کرتی چلی جاتی ہیں مثلاً وہ لکھتی ہیں۔

''انسان تو انسان ہی ہے چاہے وہ پیرس میں ہو یا لاہور میں ہو دوپہر کا وقت بھوک زوروں پر اور پیاس سے برا حال ۔۔۔۔۔۔افتخار اٹھے اور ڈھونڈ کر کہیں سے دو کوک اٹھالائے ۔۔۔۔۔میں نے پی تو لی لیکن جب معلوم ہوا کہ افتخار اس چھوٹی بوتل کے لیے ساڑھے پانچ فرانک خرچ کر آئے ہیں تو تقریباً سولہ روپے میں کوک پی کر پیاس کچھ اور بڑھ گئی۔'' (۱)

عورت جو کہ حسیات کا مرکز ہے تمام رشتے داریوں کا بوجھ اس طرح نبھانے کا فن جانتی ہے کہ اس کے سلیقے سے ہی زندگی کی گاڑی چلتی ہے ورنہ مرد تو یہاں چاہے گیئر بدل کر تمام رشتے ناطوں کو کچی کلی کی طرح توڑ دے۔لندن ایئر پورٹ پر جب نجمہ کا تایازاد بھائی مرتضیٰ انہیں لینے نہیں آتا تو وہ پریشان سے زیادہ پشیمان ہوتی ہیں۔کیونکہ سفر پہ نکلیں تو دل اور جذبے نہیں بدل جاتے اور نجمہ کے سامنے انا کا مسئلہ تھا اور وہ بھی خاوند کے سامنے اس سفرنامے میں معلومات اور ماضی سے ریلیشن شپ کو لفظوں پہ کمال دسترس کی مدد سے بیان کیا ہے۔وہ یہاں کے بڑے بڑے سٹور مشہور گراؤنڈ کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتاتی ہیں۔کہیں کہیں ان کے انداز میں نہ صرف امریکی معاشرے پر طنز کی کاٹ نظر آتی ہے بلکہ اپنے شوہر کو بھی وہ اس لپیٹ میں لے آتی ہیں۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کو مرعوب نگاہوں کی بجائے تنقیدی نگاہ سے دیکھتی اور پرکھتی ہیں۔

''ہمارے دائیں ہاتھ ایک نازک اندام حسینہ ہاتھ میں چھوٹے سے کتے کی زنجیر تھامے چلی جارہی تھی دوسرے ہاتھ میں ان کے آئس کریم تھی جو وہ ایک دفعہ خود کھاتی اور دوسری دفعہ اپنے پیارے کتے کے منہ میں ڈال دیتی میں نے برا سا منہ بنا کر کہا دیکھئے ایک ہم ہیں کہ انسان کو بھی نہ دیں میرے میاں نے جواب دیا انسان کو یہ بھی نہیں دیتے کتوں پر ہی مہربان ہیں۔'' (۲)

نجمہ افتخار کا انداز معلوماتی تو ہے ہی کیونکہ وہ خود پہلی مرتبہ ان چیزوں کو دیکھی ہیں اس لیے وہ اپنے قاری کو بھی اس میں شریک کرتی ہیں لیکن تاریخی بھی ہے۔مادام تساؤ کی پیدائش سے لیکر ان کے مومی پتلوں کے بارے میں تمام تفصیل بیان کرتی اور کہیں برطانیہ کے شہر دریائے ٹائین اور اس کے پل اور سرنگ بھی ان کے مشاہدہ اور مطالعہ سے نہ بچ سکا۔

۱۔ نجمہ افتخار راجہ میرے بھی سفرنامے ص۔ ۱۵

۲۔ ایضاً ص ۔ ۳۱

وطن کی محبت ہر محبّ وطن کا طرہ امتیاز ہے اور وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا نجمہ بھی جب امریکہ کے تفریحی مقامات کو دیکھتی ہیں تو اس کا مقابلہ وطن کے خوبصورت نظاروں سے کرتی ہیں مثلا ایک ڈسٹرکٹ دیکھ کر فرماتی ہیں

> ''ہمارا مری ہمارا سوات اور ہمارا کاغان وہ بھی تو یہی سب کچھ ہے صرف ان لوگوں کے پاس وسائل زیادہ ہیں یہ لوگ ہماری نسبت زیادہ منظّم ہیں اور نسبتاً زیادہ ایماندار یعنی کام کرتے ہیں تو پھر ایمانداری سے تفریح کرتے ہیں تو پورے انصاف کیساتھ بہر حال وہ وقت دور نہیں جب ہم بھی انہی قوموں کی طرح ترقی کی دوڑ میں آگے نکل جائیں گے۔'' (۱)

عورت دنیا کے کسی دیس کی ہو کہیں چلی جائے اس کے دل میں ممتا کے جذبات کو ختم کرنا ناممکن ہے۔ ممتا کا جذبہ اس وقت ہی زیادہ جوش مارتا ہے جب ماں بچوں سے دور ہو۔

کولمبس کے دیس پیرس میں جب نجمہ کے میاں ایک فارم پر کر رہے تھے تو ان کی نظریں پاکستانی نوجوان لڑکوں پر پڑی جو تعلیم سے بے بہرا ہے یا ور نیو یارک کام تلاش کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ نجمہ لکھتی ہیں۔

> ''شکل سے تینوں شریف قسم کے بھگوڑے نظر آتے تھے اللہ جانے کن حالات کے تحت بچے گھر جیسی جنت کو ٹھکرا دیتے ہیں جانے کن رکاوٹوں کو مد مقابل پا کر سیدھی راہ سے بھٹک جاتے ہیں خدا کرے ہم سب کے بچے سیدھی راہ پر چلتے رہیں اور یہ سمجھنے لگیں کہ اپنے ملک میں محنت کرنے کو عار نہ جانیں اور نہ لوگ محنت کرنے والوں کو کمتر سمجھیں ـــــــ یہ نوجوان اپنے ملک کو اپنے خون سے سینچیں اور اپنے ماں باپ کے زیر سایہ ان کی دعاؤں سے مستفید ہوں میں نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی۔'' (۲)

نجمہ کا یہ ممتا بھرا اور حب الوطنی کا رنگ لیے ہوئے انداز صرف دوسروں کے لیے ہی نہیں ہے وہ خود بھی اپنے وطن کی دال روٹی اور پرانی کھٹارہ گاڑی کو وہاں کے ہیلی کاپٹر پر ترجیح دیتی ہیں۔ کیونکہ جب ان کے دوست ڈاکٹر ظفر خان ان کو بتاتے ہیں کہ یہاں نیورو سرجن کے پاس ہیلی کاپٹر ہیں اور آپ کے پاس گیارہ سال پرانی مزدا ہے۔ تو بڑے اطمینان اور صوفیانہ انداز میں جواب دیتی ہیں کہ یہاں صرف نفس مطمئنہ ہی ایسا

۱۔ نجمہ افتخار راجہ بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۱

۲۔ ایضاً ص ۔ ۱۰۱

جواب دے سکتا ہے ورنہ نفس امارہ کی خواہشات کا تو سلسلہ لا متناہی ہے۔ لکھتی ہیں۔

''ہمارے پاس گیارہ سال پرانی مزدا ہے اور کبھی ہیلی کاپٹر کی ضرورت محسوس نہیں کی جس دن ہمیں ہیلی کاپٹر کی ضرورت بڑھی تو ہم بھی یہاں آ جائیں گے لیکن آپ ہمارے لیے دعا کیجیے گا کہ ہمیں ہیلی کاپٹر کی ضرورت محسوس نہ ہو ۔۔۔۔۔۔ کیونکہ جو کشش اپنے وطن میں اپنے شہر اور اس کے گلی کوچوں میں ہے وہ بھلا ہیلی کاپٹر میں کہاں اللہ نہ کرے کہ ہم یہاں ہیلی کاپٹر کی تلاش میں آن پہنچیں میں نے صدق دل سے دعا کی''۔(۱)

سفر کے راستے دورانیے مقامات اور انسان ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن سفر نامہ نگار اپنے زوایہ نگار اسلوب بیان سے اپنے سفرنامے کو منفرد بناتے ہیں۔ نجمہ کے بارے ڈاکٹر انور سدید کا بیان ایک قابل قدر اور مستند رائے کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ انور سدید اردو ادب کا ایک روشن مینار ہیں کہ جن کی کرنیں آنیوالے ادیبوں کے لیے مشعل راہ ہیں وہ لکھتے ہیں۔

''نجمہ افتخار راجہ کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ بیرونی ممالک کے سفر کے دوران اشیاء مظاہر شخصیات اور زندگی کی نسائی زاویوں سے دیکھیں گی لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے حقیقت کو سمجھنے کے لیے اپنی دونوں آنکھوں کو بھی بیدار رکھا اور داخل کی تیسری آنکھ کو بھی بند نہیں ہونے دیا۔۔۔۔۔لندن کے مناظر میں انہوں نے اپنے آپکو گم نہیں ہونے دیا دیار غیر میں یوں گھومتی دکھائی دیتی ہیں جیسے اپنے گھر میں چل رہی ہوں اور اپنے قبیلے میں سانس لے رہی ہوں۔'' (۲)

نجمہ کے سفرنامے میں اسلوب کا تنوع اور مشاہدے کی گہرائی نظر آتی ہے۔

حسین سحر ان کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''اور ان کے اسلوب تحریر کا حسن یہ ہے کہ یہ سادہ اور رواں ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی تکلف اور تصنع نہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے سفر نامے پڑھتے ہوئے کبھی آنکھوں کے سامنے بے اختیار دھنک کے سات رنگ لہراتے نظر آتے ہیں اور کبھی اردگرد سدا بہار پھولوں کی خوشبو تیرتی محسوس ہوتی ہے۔'' (۳)

۱۔ نجمہ افتخار راجہ   بحوالہ سابقہ   ص۔ ۱۵۲

۲۔ ڈاکٹر انور سدید   میرے بھی سفرنامے   (بیک ٹائٹل)

۳۔ حسین سحر   میرے بھی سفرنامے   (بیک ٹائٹل)

نجمہ کی لفظوں پر دسترس کمال کی ہے۔ وہ اپنا مدعا کم مگر بڑے تاثیر الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔ مثلا

''سالوں پرانا وعدہ اور برسوں پرانا شوق پورا ہونے کو تھا آخر کار ہم نے بھی رخت سفر باندھ لیا دنیا دیکھنے کی لگن میرے دل میں بہت پرانی تھی لیکن یہ پیمان اپنی جگہ کہ اگر کبھی وطن عزیز سے باہر قدم نکالا تو باعزت طور پر انسان اس سنہری زمین سے دور ہو تو کسی مقصد کی خاطر حصول علم کی خاطر یا سیاحت کی غرض سے وگرنہ تو اپنے ملک کی سوکھی روٹی بھی ہمیں سونے کے نوالے سے زیادہ پسند تھی چنانچہ اللہ تعالی نے مدد کی تو میاں بھی ہم خیال ملے۔'' (1)

سالوں کا سفر برسوں کا شوق اور جوانی کا زمانہ وہ چند لفظوں میں بڑی سرعت سے طے کر جاتی ہیں اور وہ بھی چند لفظوں کی مدد سے جو طبع نازک پر نہ تو گراں گزرتے ہیں اور نہ ہی ثقیل محسوس ہوتے ہیں۔

دیباچہ میں مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں۔

''بیگم راجہ ایک ایسی زبان لکھتی ہیں جس کا ذائقہ ان زمینوں کا نہیں جن سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں بلکہ اس میں پنجاب کی سرزمین کی چاشنی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔'' (۲)

یہ سفرنامہ ایک کامیاب سفرنامہ ہے کیونکہ واپسی پر سیاح کی طرح جو کہ گھر سے صرف دیار غیر دیکھنے نکلتا ہے لیکن واپسی پر اداسیاں سمیٹے جب لوٹتا ہے۔ تو اس کے ساتھ تحائف کا وزن اس کے سامان سے دوگنا ہوتا ہے۔ کیونکہ دیار غیر میں تو محبتوں کا سیلاب اپنوں کے لیے ہوتا ہے اور پھر ایک ماں جو بچوں کو چھوڑ کر جاتی ہے تو اس کا دل تو چاہتا ہے کہ سارا جہاں ہی اپنے بچوں کے لیے خریدے۔ تو یہی حال نجمہ کا ہے وہ واپسی پر اپنا کھلا سوٹ کیس صرف بچوں کی محبت کی وجہ سے برداشت کرتی ہے۔

۱۔ نجمہ افتخار راجہ بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۱

۲۔ مستنصر حسین تارڑ دیباچہ میرے بھی سفرنامے

پروین عاطف (کرن تتلی بگولے)

آج کل ایک عام سی بات چل نکلی ہے کہ جو اچھا افسانہ نگار ہے وہ سفرنامہ نگار بھی ہے یا یوں کہیے کہ آج کل ادب میں سفرناموں کا موسم کچھ اسطرح عروج پر ہے کہ ادیب کامیاب سفرنامہ نگار بننے کی کاوش میں مصروف ہے۔

پروین عاطف کا سفرنامہ کرن تتلی بگولے کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے بنکاک منیلا ہانگ کانگ کی سیر نگر ٹوکیو کیلاش اور نیروبی کے شہروں کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ سرورق پر قدرت اللہ شہاب مستنصر حسین تارڑ بانو قدسیہ اور ممتاز مفتی کی آرا شامل ہیں۔ جنہوں نے ان کے سفرنامے کو کئی جہتوں سے اہم اور قابل قدر بنا دیا ہے

ان کے نزدیک سفر کتھارسس کا ذریعہ اور ایک ہنگامہ خیز تجربہ ہے۔

ایک عام سی لڑکی پنو کو پروین عاطف بنانے میں اگر چہ خداداد صلاحیت کا بھی ہاتھ ہے لیکن زیادہ حصہ ان کے بھائی شیر احمد جو پرائڈ آف پرفامنس یافتہ ادیب ہیں اور جرنلسٹ ہیں اور انکا تعلق مساوات اور فرنٹیئر پوسٹ سے ہے۔ پروین نے ان کی وجہ سے ادب اور سیاست دونوں میں قدم رکھا۔ ان کی شادی ہاکی فیڈریشن کے صدر بریگیڈیئر عاطف سے ہوئی جن کی زندگی تین چیزوں کے درمیان گزری ہے والدہ، فوج اور ہاکی جب ان کے خاوند کو ۱۹۷۱ کی جنگ میں تین سال کی سزا ہوئی تو پروین کو اظہار کی خواہش ہوئی اور اس شوق کی پروان چڑھانے میں اشفاق احمد بانو قدسیہ اور ممتاز مفتی کا بڑا ہاتھ ہے بلکہ بقول بریگیڈیئر عاطف ممتاز مفتی نے ان کو احساس دلایا کہ ان کی افسانے میں بڑی جان ہے۔ پروین خود بھی خواتین ہاکی ٹیم کی نمائندگی کر چکی ہیں اور کئی ممالک کی سیر بھی کر چکی ہیں۔

ان کے سفرنامے ڈرائینگ روم کی نسبت مشاہدے اور مطالعے کے مرہون منت ہیں۔ وہ ممتاز مفتی کو اپنا استاد مانتی ہیں لیکن وہ اپنے آپکو ان کا استاد نہیں مانتے کیونکہ بقول ان کے پروین ان سے بہتر لکھتی ہیں۔

پروین ایک جدید ذہن کی حامل جدید نقطہ نظر اور وسیع سوچ کی مالک خاتون ہیں سفر کے دوران انہیں کائنات کے مختلف رنگوں اور مختلف لوگوں کی تہذیبوں اور یورپ کی جدید ترقی سے واسطہ پڑا۔ اور وہ اس تمام کا

مقابلہ پاکستان کی تعلیمی تہذیبی لحاظ سے مقابلہ کرتی ہیں تو انہیں بڑے گہرے دکھ کا احساس ہوتا ہے کہ پاکستانی قوم تعلیمی لحاظ سے کتنی بیک ورڈ قوم ہے۔لیکن اب اخلاقی لحاظ سے بھی وہ پست ہوتی جارہی ہے۔

''ہمارے ہاں کے فراوانی مارے گھرانوں کے چشم وچراغ بھی ایسے آورش سجائے پھرتے ہیں زہر لگتی ہے پرانی کار پرانا ٹی وی سیٹ وی سی آر فریج پرانی ماں پرانی بیوی پرانی بہن پرانا گھر پتا نہیں ان کی خواہشوں سے مجھے اپنی تضحیک کا احساس کیوں ہوتا ہے۔'' (۱)

دراصل یہ وہ نسائی رنگ ہے کہ جس نے پروین عاطف کے اسلوب کو جدت عطا کی ہے۔ان کی سوچ میں جو گہرا دکھ اور جذب کرنے کی صلاحیت ہے وہ انہیں دوسری خواتین قلمکار سے منفرد مقام عطا کرتی ہے۔کیونکہ پاکستانی معاشرے کے عام رواجوں کو اس انداز میں بیان کرنا کہ کسی معاشرے کے تضادات کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ بھی بخوبی ہو جائے مشکل امر ہے لیکن پروین اس فن سے بخوبی واقف ہیں کہ کہاں کس چیز کو کیسے بیان کرنا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار افسانوں کی طرح بیان سے زندہ ہو جاتے ہیں۔

اس لیے ممتاز مفتی نے لکھا ہے۔کہ

''پروین عاطف ہر واقعہ اور کردار کو اپنی نظر سے دیکھتی اور اپنے الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔'' (۲)

ان کا انداز اگر چہ حقیقت کا رنگ لیے ہوئے ہے مگر تلخ ہے لیکن ان کا رویہ معذرت خواہانہ کبھی نہیں ہوا وہ حقیقت کو عریاں کرتی چلی جاتی ہیں۔اور اس چیز سے قطعاً خوف زدہ نہیں ہیں کہ ان پر عریاں اظہار کی وجہ سے عصمت چغتائی یا واجدہ تبسم ہونے کا لیبل لگ جائے گا وہ پاکستانی مرد اور عورت کی تفریق اپنے انداز میں یوں کرتی ہیں۔

''یہاں رات کے وقت اکیلی لڑکی کا گھومنا عجیب نہیں سمجھا جاتا معاشرہ مکمل طور پر مخلوط ہے عورت ہم لوگوں کی طرح ان کے اعصاب پر سوار نہیں رہتی لڑکیاں عموماً گھومتی پھرتی ہیں۔'' (۳)

عورت ہونے کی وجہ سے جو درد وکرب عورت کی تذلیل کا وہ محسوس کرتی ہیں وہ کوئی اور سفر نامہ نگار یا تبصرہ نگار نہیں کرسکتا کیونکہ مرد عورت کی تذلیل سے تسکین حاصل کرتا ہے جب عورت تضحیک وسبکی محسوس کرتی

۱۔ پروین عاطف، کرن تتلی بگولے، جنگ پرنٹنگ پریس لاہور ص۔ ۱۰۰

۲۔ ممتاز مفتی دیباچہ کرن تتلی بگولے۔

۳۔ پروین عاطف بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۴

ہے۔ وہ یہاں کے نائٹ کلبوں میں بکنے والی نوجوان لڑکیوں کو دیکھ جس کرب سے گزرتی ہیں وہ کوئی حساس اور دردمند دل رکھنے والی عورت ہی کے جذبات کی ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ پروین جیسی ماڈرن عورت بھی عورت کی سر بازار نیلامی سے آنکھوں کے گوشوں کو بھیگا ہوا محسوس کرتی ہے۔ اور انہیں اس واقعے سے اپنے وطن میں ہونے والا نواب پور کا واقعہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اور وہ کھلی آنکھ دکھتے دل بھیگی آنکھوں اور کھولتے ہوئے دماغ کے ساتھ عورت بازار کا ذکر یوں کرتی ہیں۔

''اس رات بنکاک کے اس وسیع وعریض بازار میں کسی کا کوئی چہرہ نہ تھا کوئی ذہن نہیں تھا کوئی روح نہیں تھی صرف جسم تھے، ننگے جسم، بھوکے جسم، چپ جسم، بولتے جسم، مشتاق جسم، بیزار جسم، بس جسم ہی جسم عورت کے جسم کی اتنی بڑی اکبری منڈی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہاں کی عورت اس بھولے بھالے کلچر میں غلاظت ڈالنے والے مغرب کی ترقی یافتہ تہذیب ہے ڈالر کی چاہت نے اگر اسے جسم یوں کھلتے بندوں چھابڑی میں لگانے پر مجبور کر دیا ہے تو ڈالرز زندہ باد۔'' (۱)

بنکاک کو دنیا کی بہترین اور سب سے بڑی ہیرامنڈی کا لقب دیا ہے کہ جہاں روحانی خوبصورتی کی بجائے جسمانی خوبصورتی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ رات بھر جسموں کی تجارت کرنے والے صبح بدھا کے قدموں میں گر کر روحانیت کے مظہر بن جاتے ہیں جسم کو روح سے الگ کر کے بدھا کے سنگھاسن پر بٹھا کر امن کرشنا کے سنہرے رنگ بکھیرنا بنکاک کا ہی کام ہے۔ کیونکہ قصائی کے پھٹے کے نیچے بیٹھنے والے کتے کی آنکھوں میں گوشت کو دیکھ کر وہ ہوس نہیں جاگتی یا جو مرد عورت کو دیکھ کر اپنی آنکھ میں بسا لیتا ہے۔

پروین کا مشاہدہ گہرا اور نظر میں وسعت ہے وہ چیز اور مقام دونوں کی تہہ تک جانے کی کوشش کرتی ہیں اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ وہ ایک بہترین مرقع نگار اور منفرد محقق ہیں۔ بنکاک کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''دراصل بنکاک نہ شہر ایک ہے نہ کلچر ایک ہے آپ اس کے ارد گرد گھوم کر آیئے اس کا ایک ہزار بازو پوری زندگی آپ کے ارد گرد جکڑا رہے گا مغرب و مشرق کے ان گنت شہر دیکھ ڈالے ہیں کھیروں کھیروں کبھی نہیں بکھری۔'' (۲)

تجرباتی اور تقابلی عمل سفر کو بامعنی بنا دیتا ہے اور اس پر انسانیت کا حامل ہو تو سفرنامے کو چار چاند لگ

۱۔ پروین عاطف بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۵

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۰۷

جاتے ہیں۔ پروین جہاں بھی گئی ہیں وہاں کا موازنہ پاکستان کے ساتھ کرتی ہیں۔ چونکہ وہ خود سیر کرنے کے لیے نکلی ہیں اس لیے پاکستان کے خوبصورت اور تفریحی مقام انہیں شدت سے یاد آتے ہیں۔ مثلاً

''دکھ تو اس بات کا تھا کہ ہمارا تھائی لینڈ فلپائن وغیرہ ایسے ممالک سے بھی ہوا جن کی معیشت کا پورا ڈھانچہ ٹورزم پر کھڑا تھا نگری نگری چرچے ہیں بس وہی بساند مارا کراچی والا سمندر اور پائن اور ناریل کے درخت لینڈ سکیپ میں سے کوئی بجلیاں نہیں لپکیں اور اپنے ہاں سوات اور کالام میں پانیوں کی پھلوں کی مہک وہاں سے چلے آنے کے بعد بھی مدتوں ایک Essence بن کر زندگی میں رچی بسی رہتی ہے فرق صرف والی وارثوں کا ہے۔ وہاں کی حکومتیں سگھڑ سگھڑ والیوں کی طرح اپنے آنگن کی نوک پلک یوں سنوار کے رکھتی ہیں کہ آنکھیں دیکھتی رہ جائے ہماری طرح اپنے گھر کو رنڈی کا ڈیرا کوئی نہیں سمجھتا۔'' (۱)

یہاں پروین حکومت پر نشتر زنی بھی کرتی ہیں۔ اور تقابلی فضا بھی پیدا کرتی ہیں لیکن یہ فضا گراں نہیں گزرتی پروین حقیقت کو اپنے مشاہدے کے اندر یوں جذب کر لیتی ہیں کہ قاری بھی اس میں دلچسپی لینا شروع ہو جاتا ہے۔

پروین ایک Beach پر جاتی ہیں تو دلکش منظر نگاری کرتی ہیں۔

''وہ ساحل بھی عجیب تھا حد نگاہ تک نیلگوں پانی کی کھلیاں لہلہا رہی تھیں اور پشت پر سرمئی رنگ کا سلسلہ کوہ حفاظتی دیوار کی طرح کھڑا تھا۔ اللہ میاں کے ہنر بھی سمجھ سے باہر ہوتے ہیں لگتا تھا مائیکل اینجیلو کو عبدالرحمٰن چغتائی کو ایک ہی صف میں بٹھا دیا ہے۔'' (۲)

پروین اپنی نظریاتی وابستگی کا اظہار بھی سود و زیاں کا خیال کیے بغیر کھلے دل اور صاف الفاظ میں کرتی ہیں۔ مثلاً مارشل لاء کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''مارشل لاء سے تو ساری قوم مطمئن ہے اب تو کوڑے اور ٹکٹکیاں بھی پہلے سے کم ہوتی جارہی ہیں۔ بالخصوص ہمارے اخباروں میں اکثر لکھا ہوتا ہے کہ مارشل لاء نے قوم کے دن پھیر دیے ہم جیسے جاہل بھوکے ننگے ملکوں کو جمہوریت راس نہیں آتی ہمارے لیڈر

۱۔ پروین عاطف بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۵۷

۲۔ ایضاً ص۔ ۸۲

بے چارے کچھ نہیں جانتے انگریزی سکولوں کے پڑھے ہوئے۔'' (۱)

پروین پاکستانی معاشرت پر گہرا طنز کرتی ہیں اور عوام کی بے حسی اور ان کی سیاسی وابستگیوں کا ذکر کرتی ہیں۔ اور وقت کے ساتھ کیسے بدل جاتی ہیں۔ وہ ذومعنی فقروں میں پاکستانی قوم کی بے حسی کی دھجیاں بکھیر دیتی ہیں۔ ان کے اسلوب میں ان کے نسائی رنگ کے ساتھ ساتھ عورت کا وہ ازلی دبدی دکھ بھی بولتا ہے جو ہے تنہائی کا۔ کہ کبھی عورت دس بچوں اور خاوند کے درمیان بیٹھ کر سوچتی ہے۔ کہ کہیں تو وہ جنم دینے والی ماں کے گھر میں بوجھ اور بیگانگی کا احساس لیے ہوئے تھی اور کبھی وہ جوان اولاد کے درمیان بوجھ بنی ایک در سے دوسرے در کی محتاج ہوتی ہے پروین کا مشاہدہ زندگی کے دکھوں کا نزدیکی مشاہدہ ہے۔ اگر چہ کبھی کبھی وہ اس میں نسائیت سے دور چلی جاتی ہیں۔ اور ان کا بیان عورت کے اندر کی دلکشی کو ختم کر دیتا ہے۔ کہ جہاں تصویر کائنات کا رنگ وجود زن سے بنتا ہے۔ یا پھر پروین منفرد ہونے کی کوشش میں ایسے دوہرے پن کا شکار نظر آتی ہے۔ مثلا

> ''سونے روپے کی جوت الحمد للہ جی میں کبھی نہیں جاگی سونے سے لدی پھندی عورتیں مجھے بچپن سے ہی (بانجھاتی) کا احساس دلاتی ہیں یا مرد کی ناجائز کمائی کے اشتہار کا۔ میں نے تو برسوں پہلے دلہن بنتے وقت بھی روایت سے بغاوت کر کے بھابھی کے ادھار زیوروں سے اپنی سج دھج کی تھی۔'' (۲)

مزید لکھتی ہیں۔

> ''اگر میرے پاس میری پاکستانی بہنوں کی طرح سونے کا چوڑا ہوتا تو میں بھی ٹوکیو میں کسی فائیو سٹار ہوٹل والے کو دیتی اور کہتی کہ بھیا ایک عدد گرم بستر اور گوشت روٹی کے بدلے یہ سب تمہارا۔'' (۳)

یہاں پروین کا بیان تضاد کا شکار نظر آتا تھا کہ ایک طرف سونے سے نفرت اور دوسری نہ ہونے کا پچھتاوا۔

یہ سفر نامہ پروین نے اپنے بیٹے اور بھانجے کیساتھ کیا۔ جوان بیٹے کے ساتھ بشریٰ رحمان کی طرح وہ خودنمائی کا شکار تو نہیں نظر آتیں لیکن وہ ہر ماں کی طرح اپنی اولاد کو ہیرو سے کمتر نہیں دیکھتی۔ انہوں نے اپنے

۱۔ پروین عاطف بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۳۳

۲۔ ایضا '' ص۔ ۴۰

۳۔ ایضا '' ص۔ ۹۸

بیٹوں کے تذکرے میں ایک انداز اختیار کرتی ہیں۔

''میرے بیٹے بھی اس شہزادے سے کم نہ تھے جس کے پیچھے نفرتیسی جان دینے کو تیار تھی۔'' (۱)

یا پھر سعید کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''سعید دور سے آ رہا ہو تو راجہ داہر کا درباری پہلوان یا کوئی راجہ رسالو لگتا ہے مقابلے پر آئے تو کشتوں کے پشتے لگا دے زور سے آوے کہے تو بڑے بڑے زور آور چکنا چور ہو جائیں۔'' (۲)

مجموعی طور پر یہ سفر نامہ ایک منفرد اسلوب گہرے مشاہدے اور عمیق نظروں کا حامل ہے۔ پروین کی رسائی عام زندگی کے ساتھ ساتھ عبادت گاہوں، ہیرا منڈیوں، ثقافتی شو بازاروں کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتی ہیں۔لیکن پروین کا ممتا بھرا انداز ہر ماں کے دل کی آواز معلوم ہوتا ہے۔کہ وہ دیس میں اپنے گھر کی فضا اور اپنے بچوں کو یاد کر کے اداس ہو جاتی ہیں۔

''جانے میرے گھر میں دن کا کون سا پہر ہوگا شاید شام کے سائے گہرے ہو چکے ہوں میری بڑی بیٹی گل اناٹمی (Anatamy) کی کتاب پر جھکی ڈاکٹری کے امتحان کی تیاری کر رہی ہوگی در جہان والی چارلس ڈنر کا کوئی ناول لے کر کسی کونے میں قالین پر الٹی لیٹی ہوگی۔۔۔۔چھوٹا وہ شاید میری جاپانی کار کے ہارن کا منتظر ہو اسے میرے جسم میں سن سے کچھ ہوا اپنے آپ سے ایک دم نفرت ہوگئی پٹھے اکڑنے لگے کیسی بے حس ماں ہوں میں وہ جن کو میری قربت کی ہر لحہ ضرورت رہتی ہے ان سے دور رہ کر میں نے انہیں محروم کیا ہے۔'' (۳)

لیکن ماں ممتا کے جذبات کے ساتھ ساتھ وہ ترقی کرتی ہوئی عورت خواہ وہ دنیا کے کسی کونے کسی خطے میں ہو بڑا فخر محسوس کرتی ہیں۔

''جاپانی ریل میں لڑکیاں تو بالکل ہی کٹاریں تھیں نازک بدن زندگی کے سرور سے مندی مندی آنکھیں چکنے سفید رخساروں پر کھلی (Honey suckle) کی نرمی عشق پیچاں کی بیل کی طرح لہراتی اٹھکیلیاں کرتی کرتی آ رہی تھیں اور جا رہی تھیں۔۔۔۔۔لیکن یہ سب ہیروشیما کے بعد کے کلچر اور اس قوم کی تباہی کے

۱۔ پروین عاطف بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۳۱

۲۔ ایضاً // ص۔ ۱۳۳

۳۔ ایضاً // ص۔ ۹۴۔ ۹۵

خلاف اجتماعی جنگ کا نتیجہ تھا کہ جاپانی عورت کو مردوں کے پیچھے غلامانہ انداز میں سر جھکا کر چلنے والی بندگی کی تصویر بننا قبول نہیں میں نے تھوڑے عرصے میں بھانپ لیا تھا خود اعتمادی اس کے انگ انگ سے پھوٹ کر کہہ رہی تھی ہم خود مختار ہیں اس زندہ قوم کی بیٹیاں ہیں جو ایشیا میں ہونے کے باوجود مغرب کو پیچھے چھوڑے جا رہی ہیں۔'' (۱)

مجموعی لحاظ سے یہ ایک خوبصورت معلوماتی انداز رکھنے والا سفر نامہ ہے۔

۱۔ پروین عاطف بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۴

کوثر جمال (چینی منگولوں کے شہر میں)

ہر سفر نامہ نگار دنیا کی وسعتوں اور زندگی کی رنگارنگی کو اپنے مخصوص انداز میں دیکھنے اور پھر اس کو بیان کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ وہ دنیا کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا اور قاری کو نئی جہتوں سے روشناس کراتا ہے۔

احوال ذات سے لے کر امور کائنات تک تمام چیزوں کو تحقیقی اور تنقیدی نظروں سے دیکھنا اور لوگوں کے احوال کا مطالعہ کرنا اور زندگی کے تلخ وشیریں سب کو اسی طرح دیکھنا جیسی کہ وہ ہیں۔لیکن ہر سفر نامہ نگار اپنے گھر سے زندگی کے اس وسیع تجربے کو کسی مقصد کے تحت نوک قلم تک لاتا ہے اور اپنے جذبہ وتخیل کی آمیزش سے اکتساب لذت سے نہ صرف لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ شریک سفر بھی ہو جاتا ہے اور شریک سفر کرتا بھی ہے۔سفر نامے میں عورت کا نسائی انداز ایسا تھا کہ مرد سفر نامہ نگاروں نے اس کے الگ وجود کو تسلیم نہیں کیا لیکن اس کے باوجود وہ تنوع کا باعث بنی اور اپنا ایک منفرد مقام سفر نامے میں بتایا۔کوثر جمال کا سفر نامہ ''چینی منگولوں کے شہر میں'' ایک ایسے سفر کی کہانی ہے کہ جس میں چین کا تعارف مترجم کا محتاج نہیں کیونکہ اس سے مشاہدہ محدود ہو جاتا ہے۔کوثر جمال لکھتی ہیں۔

> ''چینی منگولوں کے شہر میں'' یہ سارا سفر انسانوں سے شروع ہو کر انسانوں پر ختم ہوتا ہے۔ اس سفر نامے میں میرے مدنظر چین کی سیاسیات اور معاشیت نہیں نہ ہی اس کی ترقی کی داستان رقم کرنا۔ میرا مقصد ہے۔ میں مشہور جگہوں اور علاقوں میں بھی زیادہ دلچسپی نہیں لیتی۔ میری تحریر کا مرکز ومحور چینی انسان اور اس کی زندگی کے کئی رنگ ہیں۔ ان کرداروں کے پیچھے البتہ چین ہی چین ہے۔ وہ چین جو اس سے پہلے آپ نے شاید نہیں دیکھا۔ یہ سفر کہانی کچھ ایسے انسانوں کی کہانی ہے۔ جس میں ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں دلچسپیاں مسائل اور خواب بند ہیں۔ ادب میں حقیقت نگاری کے مسلک پر یقین رکھتے ہوئے میں اچھے بڑے ہر قسم کے کرداروں کو صفحہ قرطاس پر لانے کی قائل ہوں کہ جہاں تک قلم کار کے فکر ونظر کی صحت متاثر نہ ہو۔ (۱)

۱۔ کوثر جمال چینی منگولوں کے شہر میں جنوری پہلی کیشنز راولپنڈی ۱۹۷۷ ص۔ ۹

کوثر جمال کا سارا سفر نامہ چین کی نوجوان نسل کے بارے میں ہے اور وہ چین میں اندرونی منگولیا جب جاتی ہیں تو وہاں جشن بہاراں کا سماں ہے۔ چین کا ہر نوجوان اپنے ملک کو چار جدید کاریوں "Four Modernizations" سے سجانے کے لئے تیز رفتار جدو جہد کر رہے ہیں۔ کوثر جمال چینی عبادت گاہوں کے بارے میں اپنے تاثرات یوں قلمبند کرتی ہیں۔

''چین میں مذہب کو ماننے والے زیادہ تر عمر رسیدہ لوگ ہیں۔ عمر رسیدہ لوگ پرانے وقتوں سے پیار کرنے والے زندگی کی ڈھلتی شام میں کسی نئی صبح کی امید کے سہارے خداؤں اور دیوتاؤں کو پوجنے والے فنا سے خوفزدہ یہ انسان کسی ابد کی تلاش میں ہمیشہ سے یونہی سرگرداں۔ (۱)

عورت ہونے کے ناطے کوثر صاحب نہ صرف کھانوں کی تفصیل بتاتی ہیں بلکہ ان کی رنگ و شکل کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتی ہیں۔ مرد کو کھانا دیکھ کر صرف بھوک یاد رہتی ہے۔ عورت کو کھانا دیکھ کر اس کی ترکیب معلوم کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ جب کوثر پائے جنگ کے گھر جاتی ہیں تو وہاں پر ان کی تواضع مختلف اقسام کے کھانوں سے ہوتی ہے۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

> ''کھانوں میں بھنا گوشت تلا ہوا گوشت، روسٹ کیا ہوا گوشت، مرغ کا شوربہ اور نہ جانے کون کون سے الم غلم منگول کھانے تھے مگر جس ڈش نے میری توجہ کھینچی اور روح تک فنا کر دی وہ تھی۔ ''بال سبزی کا شوربہ'' بال سبزی کیا بس بال ہو ہوئے، بڑے بڑے بالوں کے گچھے اس کے شوربے میں تیر رہے تھے اور یہ اس تقریب کی خاص ڈش تھی جسے سب سے پہلے مہمان خصوصی نے نوش فرمانا تھا۔ ابھی میں اس بلائے ناگہانی کا صحیح طرح نظارہ بھی نہ کر پائی تھی کہ امی نے ایک بڑا سا گچھا میرے پیالے میں ڈال دیا۔ اچانک پائے چنگ کھلکھلا کے ہنس دی۔ اس نے غالباً میرے رنگ بدلتے چہرے کو پڑھ لیا تھا۔ ارے یہ بال نہیں ہیں۔ بلکہ بال نما سبزی ہے۔ انتہائی لذیذ تم کھا کر دیکھو۔ (۲)

منگول اپنی روایات کا خاص خیال رکھتے ہیں اور ان کو بڑے پر جوش انداز میں مناتے ہیں۔ چینی کیلنڈر کے مطابق نیا سال جشن بہار سے ہی شروع ہوتا ہے اور اسے جشن نوروز کا تہوار بھی کہا جاتا ہے۔ چینی

۱۔ کوثر جمال بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۸

۲۔ ایضاً ص۔ ۳۹

قمری کیلنڈر کے مطابق یہ جشن وسط جنوری اور وسط فروری کے عرصے میں گھومتا ہے۔ یہ لوگ اس وقت جشن بہار منا لیتے ہیں۔ جب ابھی درخت ٹنڈ منڈ اور برف سے ڈھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ تہوار جنوبی چین سے شروع ہوتا ہے۔ کوثر جمال لکھتی ہیں۔

''شمال چین میں اس کڑاکے کی سردی کے باوجود چینی لوگوں کے جشن کی دھوم دھام میں کوئی فرق نہیں آتا۔ رات بھر آتش بازی ہوتی ہے۔ پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں۔ گھروں میں طرح طرح کے پکوان بنتے ہیں۔ دوسرے شہروں میں پڑھنے والے طالب علم اور کام کرنے والے افراد بھی اپنے گھروں اور آبائی مسکنوں کا رخ کرتے ہیں۔ اور یوں سال میں کم از کم اس ایک تہوار کے موقع پر تمام گھرانے کے افراد یکجا ہوتے ہیں۔ چینیوں کے اس ایک تہوار کو ہمارے ہاں کی عید اور شب برات کا مرکب سمجھ لیجئے''۔ (۱)

ہر قوم اپنے اپنے قومی اور مذہبی تہواروں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی کیونکہ اگر تاریخ وثقافت کو فراموش کر دیا جائے تو قومیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ہر زندہ قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان کی یاد پورے جوش وجذبے سے تازہ رکھیں تاکہ آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتی رہے۔ کوثر جمال چینیوں کے معمولات کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''چھٹیاں ہوسکتے ہیں طلباء اپنے اپنے گھروں اور شہروں کو سدھارنے اور غیر ملکی طلباء کے لیے یہ وقت جنوبی چین کی سیر کے لئے بہترین ہوتا ہے۔ چین کے انتہائی جنوب میں واقع شہر کینٹن کا دروازہ ہانگ کانگ میں کھلتا ہے اور جوان خواہ کسی بھے خطے سے کیوں نہ ہوں۔ ان کے لیے ہانگ کانگ کے پررونق بازاروں اور رنگین راتوں میں بڑی کشش ہوتی ہے''۔ (۲)

چین ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ اور اس میں یہ ترقی بہت کم عرصے میں حاصل کی ہے اور یہ سب ایک انقلاب کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ اس انقلاب کو لفظ ثقافتی انقلاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ زبردست تاریخی اہمیت کا حامل انقلاب ہے۔ کوثر جمال کی رائے اس انقلاب کے بارے میں یہ ہے کہ۔

'' ۱۹۴۴ء تا ۱۹۷۶ کے ثقافتی انقلاب میں چین کی ترقی کی رفتار رک گئی۔ بے شمار اہل قلم اور کتابوں سے محبت کرنے والے اس کی بھینٹ چڑھے۔ طلباء

۱۔ کوثر جمال بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۸

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۹

پڑھائی سے دور نکل گئے۔ چین کی معاشی، صنعتی، ثقافتی تعلیمی اور سیاسی زندگی زبر دست بحران کے بھنور میں پھنس گئی۔ شہری معاشرے کی ہر چیز الٹ پلٹ ہوگئی مگر ایک بات یہ ہوئی کہ ثقافتی انقلاب کی تیز سیاسی آندھی نے لوگوں میں شور تقسیم کیا۔ آج چینی سماج اور شہری طبقہ جس جوش وخروش سے قومی تعمیر کے کاموں میں مصروف ہے۔ یہ بھی ایک طرح سے ثقافتی انقلاب کے عمل کا ردعمل ہے۔عمل شدید تھا۔ ردعمل بھی بہت شدید ہے۔ ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ ثقافتی انقلاب کے مقاصد صحیح تھے۔ لیکن انکو حاصل کرنے کے لیے فیوڈل شادنزم کی روح سے عمل کیا گیا۔ یہ نقطہ، لفظ و نظر بہت حد تک درست ہے''۔ (۱)

منگول قوم کی جدوجہد رہائش، سیاسی انتظام، تاریخ اور آباواجداد کو بھی فراموش نہیں کیا گیا بلکہ ان تمام کی داستان بڑے خوبصورت طریقے سے بیان کی گئی ہے کہ گراں بھی نہ گذرے اور دل میں بھی اترتی چلے۔ منگول قوم شاندار ماضی رکھتی ہے اور انہوں نے آزادی حاصل کرنے کے لئے بہت جدوجہد کی۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج یہ قوم باعزت زندگی گزار رہی ہے۔کوئی بھی قوم جب اپنے ماضی کو فراموش کر دیتی ہے تو مستقبل میں مقام ومرتبہ بنانے کے قابل نہیں ہوتی ہے۔ وہی تو ہیں ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوئی ہیں جو قابل فخر ماضی رکھتی ہیں اور محنت سے بھر پور حال منگول قوم اس میں کامیاب وکامران ہے۔

منگول قوم کے اس تاریخی انقلاب کے بارے میں وہ یوں رائے دیتی ہیں۔

''تیرھویں صدی عیسوی میں منگولوں نے ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ جسے ہماری چینی تاریخ میں یونین بادشاہت (Yaan Dynasty) کہا جاتا ہے۔ یہ عظیم سلطنت ایک سو سال سے بھی کم عرصہ حکومت کرسکی۔ اس عہد میں چین میں مختلف دستکاریوں کے فن نے بہت ترقی کی دستکاروں کے یہ فن پارے یونین بادشاہوں کے محلات کی تزئین وآرائش کے کام آتے تھے مگر دوسری طرف یونین بادشاہوں نے عوام اور دوسری قوموں پر بہت ظلم ڈھائے تھے۔ ان کی زمینوں اور مویشیوں پر زبردستی قبضہ کرلیا جاتا تھا۔ معاشرے کو چار طبقے میں تقسیم کیا گیا تھا۔

۱۔ کوثر جمال بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۰۔ ۱۱

منگول قوم سب سے اونچے طبقے میں شمار ہوتی تھی۔ ان تمام زیادتیوں کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ یہ عظیم سلطنت ایک صدی سے کم عرصے میں ختم ہوگئی اور دوسرا یہ ہوا کہ بعد میں آنے والے حکمرانوں نے بدلے میں بیچارے منگول عوام کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا۔ خصوصاً آخری چینی بادشاہت جو مانچو قوم کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے دور میں ہماری زمین ہم پر تنگ کر دی گئی۔ ہمارا قتل عام ہوتا رہا۔۔۔۔ ان سارے مظالم کے جواب میں منگول عوام نے دوسری قوموں کے غریب لوگوں کے ساتھ مل کر آزادی کی جنگ لڑی۔ انہوں نے ایک ملک کو آزاد کرانے کی جنگ لڑی۔ (۱)

منگول قوم کی اکثریت گیاہستانوں میں اپنے مویشیوں کے ریوڑ کے ساتھ خانہ بدوش کی زندگی گزارتی ہے۔ جہاں کہیں سبزہ و پانی ملتا ہے۔ قیام کر لیتے ہیں۔ لیکن اب ترقی کی طرف بھی بڑھ رہے ہیں اور یونیورسٹی اور دیگر سہولیات کی وجہ سے اب ہر اس منگول پڑھ کر بڑے عہدوں پر فائز ہیں بلکہ تعلیمی اداروں اور سرکاری محکموں میں ان کا کوٹہ مقرر ہے۔ چین میں انیسوی صدی کے آغاز میں انگریزوں اور دوسری مغربی قوموں کے آنے کے بعد وہاں کا کلچر بھی یہاں پہنچا تھا اور یہ کسی بھی سرزمین اور اسکے بسنے والوں کی خاصیت ہوتی ہے کہ وہ ہر نئی چیز کو اپنا لیتے ہیں اور تہذیبی دھارے تو ہمیشہ سے اوپر سے نیچے کی طرف بہتے ہیں۔ نوجوان نسل ڈسکو ڈانس کرتی ہے اور اپنے روایتی رقص واثر سے ناآشنا ہے۔

> ''ڈسکو ڈانس کی اس خوبی سے کسے انکار ہے کہ یہ دنیا میں جہاں بھی گیا وہاں کے لوگوں نے اسے اپنے اپنے انداز میں اپنا لیا مجھے پیکنگ کی کچھ پارٹیاں یاد آئیں پاکستانیوں کا بھنگڑا نما ڈسکو ڈانس افریقی نوجوانوں کا ہر میوزک پر بلاتخصیص وہی ڈانس جو وہ ریگے میوزک پر کرتے ہیں چینیوں کا ڈانس کچھ ان کے روایتی مارشل آرٹ سے مشابہ غرض کسی جنرل سٹور میں رکھی چیزوں سے زیادہ ورائٹی تو ڈسکو ڈانس کے مختلف طریقوں میں ہوگی۔'' (۲)

چین میں قدیم وجدید کا حسین سنگم نظر آتا ہے۔ بعض چیزیں متروک ہونے کے باوجود ساتھ ساتھ چل

۱۔ کوثر جمال بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۴

۲۔ ایضاً ،، ص۔ ۷۷

رہی ہیں ۔ جسے وائز موسیقی کہ جس کو ابھی تک چین میں کچھ طبقے فراموش نہیں کر سکے ۔ کیونکہ یہ وائز موسیقی دھیمی دھیمی سی ان کے مزاج سے میل کھاتی ہے اور اس کی مدھم دھنوں پر ہر کوئی رقص کر سکتا ہے اور گراں بھی نہیں گزرتا۔

اس طرح سے فیشن کا حال ہے کہ چینی خواتین اپنے مخصوص لباس میں نظر آتی ہیں اور نئی نسل اس فیشن کو اپنائے ہوئے نظر آتی ہے جو مغربی ممالک میں اب تقریباً متروک ہو چکا ہے۔

''فیشن مغرب میں متروک ہو چکے ہیں انہیں یہاں اپنایا جا رہا ہے چنانچہ فی الوقت یہاں کے فیشن کے دلدادہ نوجوان بڑے فخر اور شوق سے بیل باٹم پہنتے ہیں۔'' (۱)

ہمارے مرد سفر نامہ نگاروں یا خواتین ان میں مقابلہ کرنے یا یاد کرنے کا رجحان بہت پایا جاتا ہے وہ ہر منظر اور ہر تقریب کے قلابے یوں اپنے وطن سے ملاتے ہیں کہ اس کے بغیر وہ اپنی بات پوری کرنے کے فن سے ناآشنا ہیں ۔ مثلاً جشن نوروز ان کا خوشی کا تہوار ہے اس رات میں لوگوں کے جذبات و احساسات کی عکاسی کچھ یوں بیان کی گئی ہے۔

''رات بارہ بجے تمام شہر پٹاخوں کے شور سے گونج اٹھا یہ اس آتش بازی کا کلائمکس تھا جو گذشتہ کئی دنوں سے جاری تھی مجھے بستر پر لیٹے لیٹے پٹاخوں کے شور نے اپنے دیس کے گلی کوچوں میں پہنچا دیا۔ جہاں شب برات کے تہوار پر فضا میں آتش بازی کا یہی شور یہی بو باس بھی ہوتی ہے دنیا بھر کے مختلف وقتوں میں مختلف ناموں کے تہوار مناتے ہیں ۔ لیکن یہ خوشیاں منانے کا انداز کتنا ایک سا ہوتا ہے اپنے فطری خصائص تھے یہ رونا، ہنسنا، کھانا پینا جذبوں کی رنگا رنگ پہچان ہے یہ ازل وابدی انسان ہمیشہ ہر جگہ ایک سا رہا ہے ایک سا ہے کیا یونہی ایک سا رہے گا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں دھرتی کی بیٹی ہوں مجھے اپنا لامحدود وسعتوں میں تحیل ہوتا ہوا محسوس ہوا جشن نوروز کی اس رات میرا دل یہ تمام خوبصورت زندگی بخش احساسات لیے کروڑوں چینی عوام کے دلوں کے ساتھ ساتھ دھڑک رہا تھا جشن منا رہا تھا۔۔۔۔کل جو رات گزری وہ شب برات تھی آج جو دن طلوع ہوا وہ عید ہے۔'' (۲)

یہاں کے لوگ جشن نوروز میں ساری رات سموسے بناتے ہیں اور دن کو ان سموسوں سے مہمانوں کے

ا۔ کوثر جمال بحوالہ سابقہ ص۔ ۴۱

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۶

تواضع کرتے ہیں۔ان سموسوں کو چینی میں 'چیاؤز' کہتے ہیں۔لیکن مہمان کا استقبال یہ پٹاخے بجا کر کرتے ہیں۔اور ایک دوسرے کو مبارک باد بھی دیتے ہیں یہاں پر جشن کے روز بال سبزی جس چینی نام ''خامائے'' ہے اس کی شکل بالوں میں ہے۔ اس لیے اس کو بال سبزی کہا جاتا ہے۔دوسرا اس کا مطلب ''دولتمندی'' ہے چنانچہ یہ سبزی ''دولتمندی'' کی علامت کے طور پر بھی پکائی جاتی ہے لیکن یہ بے انتہا لذیذ ہے اور مرغ کے شوربے میں پکتی ہے۔

اگر چہ اس سفرنامے میں کوثر جمال نے منظر نگاری بھی خوبصورت انداز میں کی ہے۔اس منظر نگاری میں نسائی رنگ غالب ہے۔ یہاں منظر نگاری اور ماحول کی عکاسی یکجا ہو گئے ہیں۔

> ''ہال کمرہ دیکھتے ہیں بالکل بھی ہال کمرہ نہ لگتا تھا۔بہر حال یہ غالباً گھر کے دوسرے تمام کمروں سے بڑا تھا۔ عام دنوں میں یہ کمرہ گھر کے مالک اور مالکہ کے بیڈروم کا کام دیتا ہے مگر آج بچوں نے ماں باپ کا سامان دوسرے کمروں میں پھینک کر اسے جائے تفریح بنا لیا تھا۔کمرے کی چاروں دیواروں کے ساتھ ساتھ بیٹھنے کے لئے صوفے اور کرسیاں رکھی گئی تھیں جس دروازے سے انٹرنس ہوتی تھی اس کے قریب ہی ایک بڑی چیز پر کھانے اور پی کا سامان وافر مقدار میں رکھا گیا تھا۔ کمرے میں جلتی بجھی روشنیوں کا انتظام کر کے منتظمین نے اپنے بھاگوں جدید رقص گاہوں کی سی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی تھی''۔ (۱)

ایک رات کوثر جمال چین کے محبوب وزیر اعظم آنجہانی جواین لائی کی لے پالک بیٹی اور اور اندرون منگولیا کے گلوکار لاسورنگ سے ملنے گئی تو اس کا حال کچھ یوں بیان کرتی ہے۔

> ''تین کمروں پر مشتمل اس مختصر اور سادہ سے فلیٹ میں چینی عوام کے محبوب وزیر اعظم آنجہانی چویان لائی کی لے پالک بیٹی اور اندرون منگولیا کے مقبول ترین گلوکار لاسورمنگ کا قیام ہے۔ڈرائنگ روم میں میری نظر بک شیلف کی طرف گئی۔جس میں دھری پچھتر فیصد کتابیں یا تو خود چواین لائی کی تحریر کردہ نہیں ہیں یا پھر ان کے بارے میں دوسروں کی لکھی ہوئی کتابیں تھیں۔ چو پنگ مپین اور لاسورنگ کی مادام چواین لائی کے ساتھ کھینچی بہت سی تصویریں

۱۔ کوثر جمال بحوالہ سابقہ ص۔ ۴۱

دیواروں پر آویزاں تھیں پھر کچھ تصویریں وہ تھیں جا لاسور ونگ نے جاپان، فرانس اور افریقی ممالک کے دوروں میں وہاں کے مشہور فنکاروں کے ساتھ کھنچوائیں۔ (۱)

یہاں یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ ہمارے ہاں کی طرح زندگی خواہ بادشاہ کی ہو یا غریب کی شاہانہ انداز نظر نہیں آتا۔ یعنی چین میں رہن سہن اور عام طرز زندگی میں زیادہ فرق نہیں یا طبقاتی نظام نہیں ہے۔

۱۔ کوثر جمال بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۰۱

تابندہ بتول (شالیمار سے تاج محل تک)

سفر نامہ زندگی کے دامن میں حسن لطافت کشش اور تجسس بھر دیتا ہے۔ اس میں حسن لطافت اور حسن بیان کی دلکشی ہوتی ہے۔ سفر نامہ زندگی کو سمجھتے برتنے اور آگے بڑھنے کی منزل سے روشناس کراتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ان دیکھے راستوں اور انجانے دیسوں سے واقفیت حاصل کرنے کا ذریعہ سفر اور پھر سفر نامہ نگار کا بیان ہے کہ اسے کتنا جاذب نظر بناتا ہے۔

یہ سفر نامہ تابندہ بتول صاحبہ کا ہندوستان کا سفر نامہ ہے۔ آغاز میں تابندہ بتول لکھتی ہیں۔

''شالیمار سے تاج محل تک اس بھارتی سفر کی روداد ہے جو میں نے ۱۲ اپریل ۱۹۸۷ سے ۱۷ اپریل ۱۹۸۷ء تک کیا یہ میرا پہلا غیر ملکی سفر ہے۔ چونکہ یہ سفر میں نے ایم۔اے اردو کے مقالے کی تکمیل کے لیے کیا تھا۔ اس لیے یہ میری پہلی باقاعدہ نثری کاوش ہے''۔ (۱)

اس کے بعد ڈاکٹر آصف سہیل صاحب نے سخن ہائے گفتنی میں کافی تعریف کی ہے کہ یہ ایسا سفر نامہ ہے جس میں اگر ایک طالب علمانہ نقطہ نظر ہے لیکن اس کے باوجود تاریخ اور ادب کے سنگم سے ایک حسین اسلوب نے جنم لیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کاوش کو بھی سراہا گیا کہ اگر طالب علم واقعی تحقیق کرنا چاہتا ہے تو اس کے پاس محققانہ ذہن اور بنیادی ماخذات تک رسائی کے لیے ایسی ہی کوشش ضروری ہے۔

تابندہ صاحبہ نے اس میں آغاز سے ان تمام مشکلات کا ذکر کیا ہے جو ہندوستان جاتے ہوئے انہیں درپیش ہوئی اور وہ کس کس طرح سے ان تمام مراحل سے خیر و خوبی سے گزریں۔ بہر حال پاکستان سے ہندوستان تک کا یہ سفر نامہ دلچسپ بھی ہے اور نام بھی قابل توجہ ہے کہ دو تاریخی اور رومانوی جگہوں کے نام سے یہ سفر نامہ منسوب ہے۔ جو دونوں مسلمانوں کی یادگاریں ہیں اور نہایت عظیم اور پرشکوہ۔

تابندہ بتول جب شہر دہلی کا نظارہ ہوائی جہاز کی کھڑکی سے کرتی ہیں تو لکھتی ہیں۔

''میں فضا سے قطب مینار کا نظارہ کرنا چاہتی تھی اور جہاز نے جونہی غوطہ لیا۔

۱۔ تابندہ بتول شالیمار سے تاج محل تک مکتبہ آرٹ پریس لاہور ۱۹۸۸ ص۔ ۳

قطب مینار میری نگاہوں کے سامنے آ گیا اور یوں میں نے دہلی کے بلند ترین مینار کو فضا کی بلندیوں سے پہلی مرتبہ مشاہدے کی آنکھ سے دیکھا۔ دل و دماغ مسحور ہو گئے۔ دلی شہر دیکھتے ہی میر تقی میر کا یہ قطعہ بند یاد آ گیا''۔

''کیا بود و باش پوچھو ہو یورپ کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دل جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے تاراج کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے'' (۱)

بہت خوبصورت انداز سے شاعری کے ایک خوبصورت بند کے ساتھ دلی کے اجڑنے بسنے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کر دیا ہے۔ دلی کے نام کے بارے میں پوری تاریخی معلومات فراہم کرتی ہیں۔

''یہ دلی مختلف زمانوں میں مختلف ناموں سے آباد ہوتی رہی اور اجڑتی رہی۔ جہاں تک مسلم ادوار کا تعلق ہے۔ اس شہر کی بنیاد کبھی سری کے نام سے رکھی گئی۔ جب وہ شہر اجڑ گیا تو پھر فیروز آباد کے نام سے یہ بستی آباد ہوئی۔ فیروز آباد تاریخ کے اوراق پر تو موجود رہا لیکن یہ ہنستا لپتا شہر اس لیے اجڑا کہ اس کی بنیادوں پر ایک نئے شہر دین پناہ کی دیواریں بلند ہوسکیں۔ دین پناہ برباد ہوا تو تغلق آباد کے نام سے از سرنو اسے بسایا گیا۔ پھر شاہجہان آباد ''سرول'' فیروز شاہ کوٹلہ اسی شہر کے مختلف نام ہوئے۔ آثار الصنادید میں سرسید احمد خان مرحوم نے دہلی کی وجہ سے وجہ تسمیہ کچھ یوں بیان کی کہ اندر پرست زمانہ قدیم سے منوچ کے راجاؤں کے تابع چلا آ رہا تھا۔ قنوج کے ایک راجا دہلو اندر پرست نے اپنے نام سے ایک شہر دہلو بسایا جو بعد میں دہلی کے نام سے مشہور ہوا۔ (۲)

۱۔ تابندہ بتول بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۴

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۵

تابندہ صاحبہ نے حقیقت کو مشاہدہ کے ساتھ اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ منظر میں کھو کر اپنی حیرت میں قاری کو بھی شریک کر لیتی ہیں۔ وہ منظر پر محض اچٹتی ہوئی نظر نہیں ڈالتیں بلکہ منظر کی تمام جزئیات کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اشیاء اور مظاہر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔

''ہم اردو زبان کے پہلے غزل گو شاعر جناب امیر خسرو کے حضور حاضر ہوئے۔ پھولوں کی چادر نذر کی۔ فاتحہ پڑھی اور پھر محبوب اسی حضرت نظام الدین اولیا کے دروازے پر عقیدت کے پھول نچھاور کیے جس وقت میں خواجہ کے روضہ پر فاتحہ پڑھ رہی تھی۔ اس وقت عجیب ذہنی اور قلبی کیفیت تھی کہ روح کو بالیدگی دل کو تڑپ اور نگاہ کو سکون مل رہا تھا اور محبوب الٰہی کا یہ سفر برابر قلب وجگر کو گرما رہا تھا۔ نظام الدین حیادار کہ گوید بندہ شآ ہم۔ ولیکن عنبر او را کمینہ یک گدا باشد'' (۱)

وہ دلفریب مناظر کے ساتھ ایسی رعنائیاں بھر دیتی ہیں کہ تقابل کی فضا بھی قاری کو گراں ہیں۔ گذرتی اور یوں منظر کے ساتھ ساتھ منفرد تصویر کشی ایسے کلچر کو بیان کرتی ہے جو صدیوں کی پیداور ہے۔ وہ نہ صرف مصروف شہروں کی تہذیبی و تاریخی اہمیت سے واقف ہیں بلکہ جو گہرا اثر ان پر فوری پڑتا ہے وہ ان کو بھی بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

وہ نہ صرف اس تاثر کو محسوس کرتی ہیں بلکہ قاری کو اس تجربہ اور مشاہدہ میں یوں شریک کر لیتی ہیں کہ وہ ادب کا حصہ بن کر قاری کو انسپائر بھی کرتا ہے۔ دراصل ہندوستان کا کلچر ایک ایسا کلچر ہے کہ جو صدیوں تک پاکستان کا حصہ رہا ہے اور اس کے گہرے اور انمٹ نقوش آج بھی نہ صرف ہماری تہذیب وثقافت پر کنداں ہیں بلکہ ہمارے دل ودماغ میں بھی نقش ہیں اور ہماری روایات کے ساتھ پیوست ہو کر رہ گئے ہیں۔ سب سے بڑھ کر ہماری جذباتی وابستگی نئی نسل تک ہمارے اسلاف کے کارہائے نمایاں تک مستقل ہو رہی ہے اور یہ روحانی جذبہ صیقل اسی وقت ہوتا ہے جب روح وقلب کا تعلق محبوب الٰہی سے ہو اور پوری شدتوں سے ہو۔ اسی سفر کے دوران ان کی ملاقات مالک رام عظیم ادیب اور محقق سے ہوتی ہے اور وہ ان سے ملاقات کا حال کچھ یوں تحریر فرماتی ہیں۔

''مالک رام نے ایم۔اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا اور پنجاب یونیورسٹی لاء

۱۔ تابندہ بتول بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۵

کالج لاہور سے ایل ایل ۔ بی کی ڈگری حاصل کی ۔گفتگو کے دوران بار بار وہ پھالیہ کا اپنے اساتذہ کا اور مسلمان ہندو یگانگت کا ذکر کرتے رہے کہ ان کے ماضی میں ایسی محبتوں کے گہرے بندھن تھے جنہیں وہ اسی برس پورے کرنے کے بعد بھی بھول نہیں پائے ۔ مالک رام نے یہ بھی بتایا کہ ۱۹۵۸ء میں انہیں پاکستان میں ایک ایسی کانفرنس کا دعوت نامہ ملا جو اسلام کے موضوع پر منعقدہ ہو رہی تھی''۔ (۱)

تابندہ نے وہاں کی عام زندگی کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ وہ پارکوں سے گذریں یا سائیکل رکشے پر بیٹھیں وہ عوامی بس میں ہوں یا آٹو رکشہ پر ہر چیز کو اس کی جزئیات سمیت پرکھنے کا طریقہ ان کے ہاں نظر آتا ہے۔

'' دہلی میں بس سروس کا یہ انتظام خوب ہے کہ سواریاں عقبی دروازے سے داخل ہوتی ہیں اور اپنے اپنے اسٹاپ پر ڈرائیور کے ساتھ والے دروازے سے اترتی جاتی ہیں۔ باقاعدہ قطار میں سواریاں کھڑی ہوئی ہیں۔ٹکٹ بھی آسانی سے مل جاتا ہے۔ کہ کنڈکٹر عقبی دروازے کے ساتھ ہی براجمان ہوتا ہے''۔ (۲)

انسانی زندگی اور اس کی خوشیوں کا دار و مدار کسی ایک چیز پر ختم نہیں ہے کہیں کروڑوں حاصل کرنے کے بعد زندگی اتنی بے چین و بے کیف رہتی ہے اور کہیں زندگی سکون بخش ہے۔مکئی کے ایک بھٹے پر اور چائے کی پیالی پر یہ زندگی تضادات میں کہ جیسے اللہ جس حال میں بھی خوش رکھے اور یہ صرف اس کی نظر کرم اور نظر عنایت ہے کہ وہ کہاں تصدیق حال ہوتا ہے اور کہاں تکذیب حال کرتا ہے۔ لیکن مومن ہمیشہ ترجیح جب اسی کو دیتا ہے اور یہی اس کی پہچان ہے۔

''لکھنو شہر دریائے گومتی کے کنارے آباد ہے اور دہلی سے تقریباً ۳۹۰ کلو میٹر جنوب مشرق میں واقع ہے۔ فیض آباد کے بعد نوابین اودھ نے لکھنو کو اپنا پایہ تخت قرار دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ لکھنو کا پہلا حصہ لکھ دراصل لچھمن کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ لچھمن ٹیلا لکھنو کی ایک مشہور جگہ ہے۔ جہاں ایک خدا رسیدہ بزرگ حضرت شاہ پیر محمد کا مزار ہے۔ جنہیں حضرت شاہ مینا بھی کہتے ہیں۔ یوں تو لکھنو میں وکٹوریہ پارک رومی دروازہ پرانے قلعے اور اورنگ زیب کی تعمیر کرائی ہوئی مسجد بھی ہے لیکن لکھنو کی شان دراصل آصف الدولہ کے بڑے امام باڑے کے دم سے ہے۔قصر باغ اپنی

۱۔ تابندہ بتول بحوالہ سابقہ ص۔ ۴۰

۲۔ ایضاً ص۔ ۴۶

رنگین اینٹوں اور نقش و نگار کے سبب قابل دید ہے''۔ (1)

اردو زبان کے بارے میں بھی تابندہ بتول نہ نہ صرف تاریخی لحاظ سے بلکہ ادبی لحاظ سے بھی مکمل اور جامع معلومات فراہم کی ہیں لکھتی ہیں۔

''ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی۔نشو ونما دکن میں پائی تعلیم و تربیت دہلی میں حاصل کی۔لیکن تہذیب وسلیقہ لکھنو میں سیکھا۔ محاورات کی نزاکت الفاظ کی تراش خراش اور اصول وقواعد کی وضع وتالیف کا جو اہم کام گزشتہ دوصدیوں میں ہی انجام پایا اس کا اثر ہے کہ اس نے بول سے بڑھ کر زبان کا درجہ پایا۔'' (۲)

''تابندہ بتول پاکستانی اور وہ بھی اسلامی قوانین کی پابند عورت ہیں جو محرم اور نا محرم کے فرق کو مدنظر رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستان میں اس چیز کو نا پسند کرتی ہیں کہ'' دوران سفر میں یہ بات انتہائی تکلیف دہ تھی کہ مرد اور عورتیں ایک ہی سیٹ پر بلا حیل و حجت بیٹھ جاتے ہیں۔حالانکہ پاکستانی معاشرے میں یہ امر معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستانی معاشرہ ذات پات کا معاشرہ ہونے کے باوجو غاصا آزاد ہے اور دوران سفر مرد وعورت کی کوئی تخصیص نہیں۔بس میں سفر کے دوران میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ سیٹوں کے درمیان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے پیچھے بلا جھجک کھڑے ہو جاتے ہیں،،۔ (۳)

عورت میں جو نسائی پن پایا جاتا ہے وہ چھوٹی عمر سے ہی شروع ہو جاتا ہے اور مرد کی نسبت اس کی نظر کھانے پینے کی اشیاء کے ذائقے تک ہی نہیں بلکہ ترکیب وپیش کش تک ہوتی ہے۔ مالک رام کے گھر جب تابندہ بتول کھانا کھاتی ہیں تو لکھتی ہیں۔

''نہار کا وقت ہو گیا۔میز پر کھانا چن دیا گیا۔جس میں چنے کی بھاجی کڑھی مرغ، چاول اور سلاد قرینے سے رکھتے تھے۔ پانچ آدمی یعنی مالک رام صاحب ان کی زوجہ اور بیٹی اروا کہ میزبان تھے اور ہم یعنی میں اور میرے ابو کہ مہمان تھے۔کھانا نوش جان کرنے لگے۔ شیرینی کے طور پر خربوزہ تھا کھانا تمام ہوا تو پھر کمرے میں بیٹھے چائے کا دور چلا۔ اب ہم نے یہ سوچ کر کہ بیمار کو آرام کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔اجازت چاہی،،۔ (۴)

۱۔ تابندہ بتول بحوالہ سابقہ ص۔ ۷۱
۲۔ ایضاً " ص۔ ۷۹
۳۔ ایضاً " ص۔ ۴۶
۴۔ ایضاً " ص۔ ۸۹

ایک اچھا ادیب سفرنامے میں تقابل و تجزیہ کی فضا قائم کر کے اپنے وطن کی بہت سی حقیقتوں کو عریاں کیا ہے یہ اس کے گہرے معاشرتی شعور کا مظہر ہے۔ تابندہ صاحبہ اس سفرنامے کو تخلیقی تجربے سے دوچار کر کے تازگی و رعنائی عطا کرتی ہیں۔ مغل عمارات اسلامی تاریخ کا اہم باب ہیں۔ اور ہر مسلمان سیاح کے لیے خاص طور پر جاذب نظر اور قابل توجہ ہوتی ہیں۔ یہی چیز ہمیں تابندہ بتول کے سفرنامے میں نظر آتی ہے لکھتی ہیں۔

''مسجد اپنی ساخت اور تعمیر کے اعتبار سے بادشاہی مسجد لاہور سے مختلف بھی ہے اور خوبصورت بھی لیکن مرور زمانہ نے اس کے حسن کو گہنا دیا ہے۔ رقبہ میں یہ بادشاہی مسجد لاہور سے کم ہے۔ نقش و نگار دیدنی ہے۔ جامع مسجد فریادی ہے کہ کوئی میرے حسن کا پرسان حال نہیں۔ مسجد کے غم خوار غم روزگار کے لیے دن بھر مصروف عمل رہے۔ اس کی توجہ جامع مسجد کے حسن کو برقرار رکھنے کی طرف کیونکہ مبذول ہو سکتی ہے۔ اس کے بالکل برعکس لاہور کی بادشاہی مسجد ببانگ دھلی یہ اعلان کر رہی ہے کہ زمانے کی نیرنگیاں، ادورا کی سختیاں اور موسموں کے تغیر و تبدل کی شکست کا اگر منظر دیکھنا ہے تو میری گلکاری تزئین اور حفاظت کو دیکھ لو کہ میں ایک زندہ قوم کے حصے میں آئی ہوں۔ جنہیں غم روزگار کے ساتھ ساتھ مری خدمت و حفاظت کا بھی اتنا ہی خیال ہے جتنا اپنے ایقان و ایمان کا''۔ (۱)

ایک سیاح جب غیر ممالک کی سیاحت اختیار کرتا ہے تو وطن کی فضائیں بھی اس کے ہمراہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاح فوراً موازنہ کرتا ہے اور اس کی نگہ واقعہ شناس ہر بات کو نرالے انداز میں پیش کر کے اس کی اہمیت کو بڑھا دیتی ہے۔

اسلوب بیان کے لحاظ سے بھی تابندہ بتول کا سفرنامہ معیاری ہے۔ اور تاریخی معلومات اور ادبی بیانات کے حوالے سے بھی مستند حوالے اس میں پائے جاتے ہیں۔ اور قارئین کی دلچسپی کے سامان تاریخ ادب اور سیاسی نقطہ نظر سے بھی خاصے مواد کا حامل سفرنامہ ہے۔ اسلوب بیان کے مختلف نمونے۔

''پی آئی اے کے مہمانداروں نے نشتوں سے پیوستہ میزوں کو جدا کرنا شروع کر دیا اور پھر ہلکا رسا ظہرانہ ایک ایک مسافر کے روبرو پیش کیا گیا۔ جب ظہرانہ نوش جا چکا

۱۔ تابندہ بتول بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۶

تو حسب خواہش چائے یا کافی سے تواضع کی گئی۔ میں چائے کے آخری گھونٹ کا لطف لے رہی تھی اور قطب مینار کا نظارہ کر رہی تھی کہ چند لمحوں کے بعد فضا کی بلندیاں زمین کی پہنائیوں کے قریب ہوگئیں اور جہاز لمحہ لمحہ زمین سے اپنا رشتہ جوڑنے لگا''۔ (۱)

تابندہ بتول کے لفظوں کو معنوی لحاظ سے پورے کمال و جمال سے استعمال کرتی ہیں۔

مجموعی لحاظ سے اگر سفرنامے کا تجزیہ کیا جائے تو یہ ایک مختصر مگر جامع سفرنامہ ہے جو کہ حقیقت نگاری پر مبنی ہے۔

۱۔ تابندہ بتول بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۴۔ ۲۵

نجمہ افتخار راجہ (سایو نارا)

نجمہ افتخار راجہ کا یہ سفر نامہ جاپان کے بارے میں ہے۔ یہ ان کا دوسرا سفر نامہ ہے۔ اس میں انکی بیان کی سادگی اور مشاہدے کی گہرائی نظر آتی ہے۔ یہ سفر نامہ ان کے پورے گھرانے کا بھی سفر نامہ ہے اور اس میں وہ اپنے پرانے شوق سفر کی تاریخ یاد کرتی ہیں اور یہ شوق اپنے نیورو سرجن ڈاکٹر سے شادی کرنے کے بعد پورا ہوا۔ یہ مشرق کا سفر نامہ ہے۔

یہ سفر نامہ زندگی کی حسین، خوبصورت، دلچسپ، نمایاں، کھری، سچی اور دلکش تصویریں لیے ہوئے ہے۔ وہ ہر چیز کا مشاہدہ یوں کرتی ہیں کہ جیسے گھر کی مالکن گھر میں داخل ہوتے ہوئے ہر چیز کا بغور جائزہ لیتی ہے کہ آج نوکروں نے کام صحیح کام کیا ہے یا نہیں لیکن یہ جانچ پرکھ سطحی نہیں بلکہ بڑی کامیاب اور دوررس ہے۔ ان کی نظر ایک حساس فنکار کی نظر ہے۔

یہ سفر نامہ بنکاک، تھائی لینڈ اور جاپان کا سفر نامہ ہے۔ خاتون ہونے کے ناطے وہ جاپان کی گھریلو زندگی اور ان کے طور اطوار کا مطالعہ کرتی ہیں اور ان کا ذکر بڑی محبت سے کرتی ہیں۔ وہ جاپانی تہذیب وثقافت اور روایات کو زیادہ شوق سے دیکھتی اور لطف اندوز ہوتی ہیں۔ سیاحت کا سچا ذوق رکھتی ہیں۔ اس لیے ان کو جیتی جاگتی زندگی سے دلچسپی ہے۔ روایات سے محبت کرنے والے لوگ انہیں پسند ہیں۔

سایونارا کا انتساب ان کے میاں اور بچوں کے نام ہے۔ اور یہ انتساب خالص مشرقی عورت کی جذباتی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ جو ہر جگہ ہر رشتے کو خوش کرنے کی ناکام کوشش میں بعض اوقات پاگلوں کی سی حرکتوں اور خواہش کا اظہار کرتی ہیں۔

ممتا کا جذبہ ایک ایسا لافانی اور آفاقی جذبہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک اس میں کمی نہیں آئی۔ اس سفر نامے میں ممتا کا رنگ کچھ زیادہ ہی چڑھا ہوا ہے۔ کیونکہ بچوں کی بیماری میں ماں زیادہ ہی حساس ہو جاتی ہے۔

"میرے میاں نے ایک سال پہلے ہی کئی ہزار ین میری رجسٹریشن کے بھجوا دیے تھے۔

اب کبھی وہ مجھے جاپان کی خوبصورتی سے اور کبھی میری فیس ضائع ہو جانے کے خوف سے رام کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جس ادا سے وقتاً فوقتاً مجھے پوچھتے کیا آپ بھی جا رہی ہیں؟ یا منا مجھے ڈبڈبائی آنکھوں سے کہتی مما آپ جائیں کوئی بات نہیں اور پھر فوراً ہی منہ پھیر لیتی تو میں جاپان جانے کے خیال سے توبہ کر لیتی''۔ (۱)

یہ ممتا کے جذبات ہی ہو سکتے ہیں۔ بھلا ایسا ممکن ہے کہ ایک باپ اس طرح سوچے صرف ماں ہی ایسی قربانی کا مجموعہ ہوتی ہے کہ اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر بھی بچوں کی خوشیاں جوگن کی طرح تلاش کرتی ہے۔ ماں صرف ماں ہوتی ہے لیکن اولاد اپنی خواہشات کے اظہار کے لیے کسی قسم کے لحاظ یا ضرورت کی پابند نہیں ہوتی مثلاً

''لو بھئی دو روز بعد ہماری روانگی ہے۔ یہ ہماری والی بات پر سب کی آنکھوں میں شک یقین میں بدل گیا۔ مجھے تو پہلے ہی پتا تھا مما ضرور جائیں گی۔ طمہ میری بڑی اور لاڈلی ہونے کے ناطے تھوڑی سخت گیر ہے۔ اس کی آواز میں رعب کے ساتھ غصہ بھی تھا''۔ (۲)

نسوانی نقطۂ نظر کے مطابق پہلی تخلیق تو دنیا کے ہر خطے میں عزیز ہوتی ہے۔ لیکن مشرقی نقطہ نظر ہے کہ ہر ماں کے کلیجے پر پہلوٹی کی اولاد کا ہاتھ زیادہ پڑتا ہے۔ لہذا انجمہ نے بچوں کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ رشتے ناطے بھی عجیب چیز ہیں۔ نجمہ لکھتی ہیں۔

''میری اکلوتی نند حسب سابق ڈیرہ غازیخان سے ہمیں خدا حافظ کہنے کو آئی تھیں۔ میں کچھ کھسیانی سی تھی ویسے بھی ہر ایک کو اپنے متعلق صحیح فہمی ہے اور مجھے ڈر تھا کہ عزیز ان یہ نہ سمجھ لیں میں زبردستی افتخار کے گلے کا ہار ہونا چاہتی تھی (جاپان کے سفر میں زندگی کے سفر میں نہیں) بہرحال انہوں نے بڑے پیار سے ہم سب کو امام ضامن باندھ کر قرآن شریف کے سائے تلے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا''۔ (۳)

اس دنیا میں مرد رشتوں کا دعویٰ تو بہت کرتا ہے لیکن رشتوں کی نزاکتوں سے اس حد تک مرد آگاہ ہو جائیں تو عورتوں کی بے وقعتی کا دکھ نہ مٹ جائے۔ یہ تو تھا آغاز سفر نامہ کو نجمہ صاحبہ کن کن حالات سے دوچار ہو کر جاپان کے سفر پر گئیں۔ لیکن جب وہ سفر پر روانہ ہوئیں تو وہاں جا کر کھلی آنکھ اور محققانہ ذھن کے ساتھ جاپان کا مطالعہ کیا۔ وہ صرف سیاح ہی نہیں بلکہ تاریخ داں بھی ہیں۔ وہ شہروں کا احوال ان کے تاریخی

۱۔ نجمہ افتخار راجہ سایونارا بیکن بکس ملتان ۱۹۸۹ ص۔ ۱۵

۲۔ ایضاً ،، ص۔ ۱۶۔ ۱۷

۳۔ ایضاً ،، ص۔ ۱۹

پس منظر کے ساتھ بیان کرتی ہیں مثلاً تھائی لینڈ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''تھائی لینڈ مرکب ہے تھائی اور سیام کا یعنی نئی اور پرانی تہذیب کا۔شہروں کی بڑی بڑی سر بہ فلک عمارات اور پرانے موانتی مندروں کا بڑا حسین امتزاج ہے۔ پرانی اقدار اور نئی روشنی کا۔ (۱)

نجمہ کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز کا سرسری جائزہ نہیں بلکہ گہری اور عمیق نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لیتی ہیں۔ اسطرح سے جاپان کے بارے میں بڑی خوبصورت معلومات فراہم کرتی ہیں۔

''جاپان چڑھتے سورج کی سرزمین ہے۔ اصل نام نپن (Nippon) ہے۔ لیکن مغربی اقوام بلکہ باقی تمام دنیا میں جاپان کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ ہم جسے چڑھتے سورج کی زمین کہتے ہیں۔ دراصل وہ مغرب کے دیئے ہوئے نام (Land of Risig Sun) کا ہی ترجمہ ہے کہ شاید مغرب والوں کو جنہیں خود سورج ذرا کم کم ہی نصیب ہوتا ہے۔سورج کا چڑھنا بہت بھاتا ہوگا''۔ (۲)

نجمہ نے زندگی کے مشاہدے کو اخلاقی، سیاسی، معاشی اور تاریخی لحاظ سے برتا ہے۔ وہ اپنے تخیل فکر اور تجربات کی بدولت بے شمار چیزوں کا عکس کرداروں میں تلاش کر لیتی ہیں۔ یہ کردار ان کے پیدا کردہ نہیں ہوتے بلکہ معاشرے میں تحلیل ہوتے ہوئے وہ کردار ہیں کہ جن کی بدولت زندگی نئے رنگ و آھنگ کے ساتھ جنم لیتی ہے۔

محمد علی صدیقی اس بارے میں لکھتے ہیں۔

''جاپان ایشیا کا ایسا ملک ہے جو صنعتی میدان میں کئی ممالک کو پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ بڑی خواہش تھی کہ کوئی ایسی کتاب پڑھنے کو ملے جو اعداد و شمار سے مرعوب نہ کرے بلکہ یہ بتائے کہ لوگ کیسے ہیں۔ دانش جدید کے بارے میں نہیں بلکہ مشرق کے اس عظیم ملک کے انسانوں کی نرم نگاہی سے آشنا کرے۔صرف طلوع تہذیب کا حال نہ ہو بلکہ آج کی تہذیبی ثقافتی اور انسانی تعلقات کا حال بتائے''۔ (۳)

نجمہ افتخار نے محمد علی صدیقی کی اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے نہ صرف شہروں کے بارے میں لکھا ہے بلکہ

۱۔ نجمہ افتخار راجہ بحوالہ سابقہ ص۔ ۷۹

۲۔ ایضاً // ص۔۹۳۔ ۹۴

۳۔ محمد علی صدیقی، فلپ ، سایونارا

وہ یہاں کے مندروں اور بدھا کا حال بھی بڑی تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ پمل کور میں سیر کرتے ہوئے وہ گوتم بدھ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

'' یہاں سامنے گوتم بدھ کا مجسمہ تھا۔ جو کمر کے بل لیٹا اپنی کہنی زمین پر لگائے اور ہاتھ سر پر رکھتے دکھایا گیا تھا۔ اسے سونے لارڈ بڈھا کا آخری انداز قرار دیا۔ اس مجسمے کو ریکلائنگ بدھا اور اسی مناسبت سے پومند کو ریکلائینگ بدھا Reclining Buddah کا مندر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مجسمہ چھیالیس میٹر لمبا اور پندرہ میٹر اونچا ہے اور دوسرا سب سے بڑا مجسمہ گردانا جاتا ہے''۔ (۱)

نجمہ افتخار کو منظر نگاری ہو یا حقیقت کا مشاہدہ وہ قاری کو اس طرح اس میں شریک کر لیتی ہیں وہ بھی اس کی تمام جزئیات اور تاریخی پس منظر سمیت جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ خاص طور پر وہاں کے عقائد و نظریات کے بارے میں بڑی تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔

''ہاتھی یوں تو ہر جگہ ہی طاقت کا نشان سمجھا جاتا ہے لیکن تھائی لینڈ میں ہاتھیوں کے غول کے غول پائے جاتے ہیں اور سفید ہاتھی بھی ملتا ہے جو باقی خطہ ارض میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ بادشاہ کے اصطبل میں ہمیشہ ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد رہی ہے اور پہل کے سیام کے قدیم جھنڈے پر بھی ہاتھی کی تصویر تھی۔ ۱۹۱۷ کے بعد جھنڈے کا ڈیزائن بدل دیا گیا لیکن ہاتھیوں کی اہمیت میں کمی نہ آئی''۔ (۲)

یوں تو نجمہ ایک ایسی سفرنامہ نگار ہیں جو نہ صرف مصروف شہروں کی تہذیبی و تاریخی اہمیت سے واقف ہیں بلکہ ان شہروں کا جو تاثر ایک سیاح پر پڑتا ہے وہ بھی بڑی خوبصورتی سے اس کے اثرات سمیت بیان کرتی ہیں۔ مثلاً تھائی سلک کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''تھائی سلک کو سلک کا یا ریشم کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔۔۔۔ آج کے دور میں زیور میں ہیرا اور کپڑے میں تھائی سلک پہننا امارت کا ثبوت بن گیا ہے۔ یہاں تھائی سلک کے بے تاج بادشاہ کو یاد نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ ایک یورپی باشندہ کہ نام جسکا جم تھامن تھا۔ پیشہ کے اعتبار سے فوجی اور رتبہ کے لحاظ سے جرنیل تھا۔ دوسری جنگ

۱۔ نجمہ افتخار راجہ بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۳

۲۔ ایضاً ص۔ ۶۵

عظیم کے بعد تھائی لینڈ کا ہی لیو کے رہ گیا۔ اسے یہ ملک ایسا بھایا کہ بیوی کا ساتھ چھوڑنا گوارا کرلیا۔ لیکن ملک نہ چھوڑا۔ لی نامی ایک تھائی باشندے کے ساتھ مل کر سلک کی فیکٹری لگائی گئی لیکن اللہ کی رضا سے بیوی کے بعد دوست سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ اور وہ ایسا ڈوبا کہ اسکی لاش بھی نہ پائی لیکن تھائی سلک کی پیداوا میں جم ٹھامن نے شہرت لافانی پائی''۔ (۱)

نجمہ افتخار جاپان کا عجائب گھر ہو یا وی نوسٹیشن کی بلٹ ٹرین Bullet Train ہو وہ یہاں کے جاپانی فلیٹ کو دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہیں۔ اس کا ذکر ہو یا جاپان میں لباس کا جواب آہستہ آہستہ مغربی طرف کے رنگ میں ڈھل رہا ہے۔ بعض خاص جاپانی لباس یا جاپانی طرز کا خاص لباس کمون جواب آہستہ آہستہ مغربی طرز کے رنگ میں ڈھل رہا ہے اور روائتی جاپانی کھانوں کے ساتھ انگریزی کھانوں کا رواج بھی ہو رہا ہے۔

جاپان میں مختلف فنون کہ جن میں آرائش گل سے لیکر پتنگ بازی کے خاص فن کے بارے میں بڑتفصیل سے بیان کرتی ہیں۔

> '' جاپان میں پتنگ سازی ایک فن کی حیثیت اختیار کرگئی اور پتنگ بازی ایک رسم اور جشن کی بلکہ اس کا رشتہ مذہب کے ساتھ جوڑ کر پتنگ بازی کے اکثر تہواروں کا ایک اہم حصہ پتنگ بازی بھی ہے۔'' (۲)

پروفیسر حسن عابد زیدی نجمہ افتخار راجہ کی اس ذہنی صلاحیت اور تجربہ اور مشاہدہ کے بارے میں یوں لکھتی ہیں۔

> ''نجمہ افتخار ادبی افق پر بہت آہستگی سے آئی ہیں جو بات کرتی ہیں وہ ہوش مندی اور تفکری کی حامل ہوتی ہے زندگی کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ انہیں بخوبی ہے جس کا اظہار وہ اس طرح کرتی ہیں کہ قاری کو فلسفہ اور منطق کی اصطلاحوں سے بچائے جاتی ہیں واقعات کے بیان میں توازن وتناسب کو بڑی خوبی سے انہوں نے برقرار رکھا ہے ان میں استعارہ وتحسین تو فطری ہے لیکن وہ غیر منطقی فکر کو پسند نہیں کرتیں اس لیے وہ دوسری قوم کے لوگوں میں استعام وعیوب تلاش نہیں کرتیں۔'' (۳)

افتخار راجہ بنیادی طور پر یا فطری طور پر کچھ کنجوس ہیں کپڑوں پر خرچ کرتے ہوئے فالتو کھاتے پیتے

۱۔ نجمہ افتخار راجہ بحوالہ سابقہ ص۔ ۸۸

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۳۶

۳۔ پروفیسر حسن عابد زیدی فلیپ سایونارا

ہوئے اس کا دل گھبراتا ہے۔ متوسط طبقے کی عورت کا یہ المیہ بھی مرد کا ہی عطا کردہ ہے کہ وہ ہر جگہ اس کو سلیقہ اور کفایت شعاری کی مار دے کر اس کی جائز خواہشات کا بھی گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اور عورت بے چاری دو لفظوں کی تعریف و توصیف کی خاطر اکثر جگہ بہت پسند آنے کے باوجود خریدنے کی جرأت نہیں کر پاتی۔

اس سفرنامے میں اگرچہ وفا کی دیوی کی طرح جگہ جگہ ڈاکٹر صاحب کو cover کرنے کی کوشش کی ہے کہ کہیں وہ تھائی سلک کی ساڑھی یا سوٹ خریدتے ہیں اور کہیں مشروبات دیتے ہیں۔

نجمہ افتخار کا اسلوب منفرد اچھوتا اور دلکش ہے۔ محمد علی صدیقی ان کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''انہوں نے وہی کچھ لکھا جو دیکھا اور محسوس کیا علم و عرفان کی بے جا نمائش نہیں کی بلکہ سادگی کو اختیار کیا اور اپنے اسلوب کو تازگی و توانائی سے کام کر کر ایسا سفرنامہ لکھا جو قاری کے علم میں توسیع اور اضافہ کا باعث ہوگا'' (۱)

نجمہ افتخار صاحبہ کا اسلوب نئی آواز اور نئے لب و لہجے کا پتہ دیتا ہے اس کا رنگ کچھ یوں نظر آتا ہے۔

''پیار کی فضاء بھی خوب ہوتی ہے جانی پہچانی خوش آمدید کہنے والی گھل مل جانے والی دوستی کے راستے بڑے آسان ہوتے ہیں یہاں جھوٹ اور بناوٹ نہیں ہوتی یہ راستے فراخ اور کشادہ ہوتے ہیں۔'' (۲)

انسان تو ہر جگہ ایک سا ہوتا ہے وہ خاک و خطا کا پتلا ہے اچھائی بھی کرتا ہے اور برائی بھی اچھے کام کر کے خوش ہوتا ہے تو برے کام پر نادم اپنے خاکستر میں کیسے کیسے ارمان چھائے کرتا ہے اسلوب کسی بھی ادیب کا وہ عکس ہوتا ہے کہ وہ جس میں خود منعکس ہو کر سامنے آتے ہیں۔

نجمہ کا کمال یہ ہے کہ ان کا فن ان کے اسلوب کے سانچے میں ڈھل کر اور خاص طور پر سفرنامے کے بیانیہ انداز میں ڈھل کر زیادہ نکھر کر اور خوبصورت انداز میں سامنے آیا ہے۔ اور نسائی رنگ نے اس حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ کہ ان کی نظروں نے وہاں جا کر ان اشیائے مظاہر کا بھی مشاہدہ کیا ہے جو کسی مرد کے بس کی بات نہیں ہے۔

۱۔ محمد علی صدیقی فلیپ سایونارا

۲۔ نجمہ افتخار راجہ بحوالہ سابقہ ص۔

بشری رحمن (ٹک ٹک دیدم ٹوکیو)

بشری کا یہ سفر نامہ مشرق بعید اور مشرق وسطی کے ممالک کی روداد ہے اس میں سات ملکوں جاپان چین انڈونیشیا ملائشیا انڈیا ایران اور سعودی عرب کی سیاحت کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔
سات ممالک اور ہر ملک دوسرے ملک سے فرق تہذیب ثقافت کلچر زبان رہائش ۔لحاظ سے فرق اتنے ملکوں کا ایک ہی سفر نامے میں معلومات کا بیان کرنا اور غیر ضروری ثقیل تفاصیلات سے بچ کر نکلنا ایک مشکل فن ہے لیکن بشری نے کمال ہنرمندی سے ان تمام پہلوؤں پر نہ صرف مکمل معلومات فراہم کی ہیں بلکہ اہم مقامات کی تاریخ کو قاری کی دل چسپی کے لیے بیان کیا ہے۔اور اس سفر نامہ کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے۔
اس سفر نامے کا پہلا باب جاپان کے سفر نامے کے حالات پر مشتمل ہے جاپان جو آج اپنی صنعتی ترقی کی وجہ سے دنیا کی چند سپر طاقتوں کے مدمقابل کھڑا ہے اگر چہ جنگ عظیم میں اس کے مشہور شہر ناگاساکی ہیروشیما کی تباہی نے اس کو ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے لا کھڑا کیا لیکن زندہ قومیں لہو گرم رکھنے اور اپنے آپ کو ترقی یافتہ اقوام میں شامل کرنے کے لیے صبح وشام کی تفریق ختم کر دیتی ہیں سخت محنت اور جدوجہد میں ان کا شمار ہوتا ہے۔کام کام اور صرف کام ان کا مقصد اولین بن چکا ہے۔بشری صاحبہ کو اس باب میں جاپانی قوم کی تہذیب وثقافت ماحول سڑکیں پھول اور ترقی کی رفتار میں جاذب نظر لگتے ہیں۔اس سفر نامے میں تنقید کی بجائے مدح سرائی کی زیادہ ہے۔

> ''جاپانی ایک قدیم ترین اور حلیم ترین قوم ہے اپنی ذات میں مگن رہتے ہیں مگر اپنی ذات کو ساری دنیا پر محیط دیکھنا چاہتے ہیں جس طرح ان کے نقوش وقد وقامت کو نہیں بدلا جا سکتا اس طرح ان کے بود و باش اور عادات واطوار کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔''(۱)

اس کے علاوہ وہ حسن معاشرت اور بیرونی عوامل کے اثرات نہ قبول کرنے کی عادت سے لے کر جاپانیوں کی قدامت پرستی اور ماضی پرستی کا بھی بیان کرتی ہیں پھول یہاں محبت و پیار کی علامت کے علاوہ ایک فن کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں اس فن کا نام آلتور رکھ لیا ہے۔یہاں کے مشہور ومعروف تاریخی عمارات کے

۱۔ بشری رحمن ٹک ٹک دیدم ٹوکیو ادارہ وطن دوست لاہور جون 1989 ص ۱۸

بارے میں مکمل معلومات فراہم کرتی ہیں۔ٹوکیوٹاور ہو یا سریلا محل ان کا معلوماتی انداز بیانیہ ہے لیکن اس بیانیہ انداز میں کہیں کہیں جاپانیوں کی ترقی دیکھ کر احساس کمتری جاگ اٹھتا ہے یہ ایک فطری امر ہے لیکن بشری کچھ زیادہ مایوس ہیں۔

''ساری ترقی یافتہ اقوام نے ترقی اور آسائش کی یہ ریلے ریس بہت عرصہ پہلے شروع کردی تھی کچھ منزل پر پہنچ گئے اور کچھ منزل کے قریب میں ہم نے کیا بھاگنا ہے ہم سے تو ابھی تک وہ جھنڈا ہی تیار نہیں ہوا جسے پکڑ کر مناسب لوگ ٹریک میں آجائیں۔''(۱)

دوسرا باب چین اور اس کی معاشرت پر روشنی ڈالتا ہے یہ بشری کا سرکاری دورہ ہے۔لیکن سرکاری پابندی اور ضابطوں کے باوجود وہ ذہن کے پٹ وا رکھتی ہیں۔ بشری کے علاوہ اس وفد میں پانچ خواتین اور شامل تھیں جو قومی اسمبلی سے تعلق رکھتی تھیں بشری پنجاب کی نمائندگی کر رہی تھیں۔

چین کے اس باب میں بشری چین کی قدیم تاریخ بودوباش معاشرت کو نئے انداز میں بیان کرتی ہیں۔مثلاً یہاں کی ٹھنڈی چائے کے بارے میں ان کی معلومات دلچسپ ہیں۔چین کی دیوار چین کو اپنے خوبصورت انداز میں یوں بیان کرتی ہیں۔

''اگر کوئی چین جائے اور دیوار چین کو دیکھے بغیر آجائے تو مانو اس نے۔۔۔۔اس لیے نہیں کہ دیوار چین چین کے اپنے خالص قدیم ترین فن تعمیر کا نادر نمونہ ہے نہ اس لیے کہ یہ دنیا کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ ہے صرف اس لیے کہ یہ دیوار اس کے پیچ وخم اس کی مضبوطی اس کی راہ داریاں اس کی طوالت چینی قوم کے تحت مزاج انتھک کوشش اور قومیت کے تحفظ کا ایک منہ بولتا شکار ہے۔''(۲)

اگلے دو باب انڈونیشی بیبیاں اور ملائم ملائم ملائشیا کے نام سے منسوب ہیں ان مقامات کی سیر وتفریح بھی سرکاری پروگرام کا حصہ ہے لیکن بشری صاحبہ کے ذوق نظر اور حسن بیان نے اس میں خوبصورتی پیدا کردی ہے۔اور انہوں نے ہر زاویے سے انڈونیشیا اور ملائشیا کا تعارف کروایا ہے۔وہ چونکہ ایشیا فاؤنڈیشن کی دعوت پر ان ممالک میں گئی ہیں۔لیکن یہاں کے سماجی سیاسی نظام کے علاوہ اس سرزمین میں بسنے والوں کے رہن سہن اور جذبات واحساسات کو بھی بیان کیا ہے۔انڈونیشیاء میں محرم کے مہینے کا احترام اور اہمیت اس طرح بتاتی ہیں

۱۔ بشری رحمن بحوالہ سابقہ ص ۹۰

۲۔ ایضاً ص ۱۱۵

''انڈونیشیا میں محرم کی پہلی تاریخ کو سرکاری طور پر سارے ادارے کالج وسکول یونیورسٹیاں بند ہو جاتی ہیں یکم محرم کو اسلامی سال کے پہلے دن کی طور پر مناتے ہیں بازاروں میں چراغاں کیا جاتا ہے سب لوگ پکنک سپاٹ یا تفریحی مقامات پر چلے جاتے ہیں۔'' (۱)

اس طرح سے جب وہ انڈیا میں جاتی ہیں تو وہاں کی تہذیب و معاشرت کا موازنہ اپنی تہذیب سے اس لیے بھی کرتی ہیں۔ کہ وہ ہمارا ہمسایہ ملک ہے۔ مثلاً تاج محل کیوں رویا؟ آگرہ میں موجود فصل عمارات اسلامی تاریخ کا ایک اہم باب ہے لیکن وہ تاریخ کو ادھورا چھوڑ دیتی ہیں۔ اور پورے پس منظر کے مطابق بیان نہیں کرتیں یہی وجہ ہے کہ ان کی معلومات میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں اس لیے ان کا اسلوب بیانیہ ہے۔ اور اپنے اندر جاذبیت رکھتا ہے۔ تاج محل ایک محبت کی یادگار ہے یہ ایسی چیز ہے ایسا لافانی شاہکار ہے کہ جس کے حسن کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دل کی گہرائیوں سے اور حسن تو ویسے بھی محسوس کرنے والے دل اور دیکھنے والی آنکھ میں ہوتا ہے۔

''اچانک دو آنکھوں نے جھانکا سفید کشادہ ۔۔۔۔۔ کھلی کھلی۔۔۔۔ روشن ۔۔۔۔ دس آنکھیں زندگی میں پہلی بار ایک ایسی عمارت دیکھی جو آنکھوں کی طرح دیکھتی تھی جو بصارت سے مالا مال تھی یوں جیسے کسی نے سفید براق طشت میں دو آنکھیں رکھ کر آپ کی طرف بڑھائی ہوں۔'' (۲)

محبت کی یادگار کو دیکھتے ہوئے ان احساسات ومحسوسات کا اظہار صرف محبت کرنے والا دل ہی جانتا ہے۔

اس طرح سے امید اور ایمان ۔۔۔۔ ایران! کے عنوان سے خاتم کردہ باب ایران میں ہونے والے انقلاب اور مسلمانوں کی جدوجہد کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ خاص طور پر حضرت امام خمینی اور خواتین کی انقلاب میں شمولیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

''جو تبدیلی ایران میں آئی ہے اس میں خواتین کا حصہ مردوں سے بڑھ کر ہے مرد ابھی تک جہاد کر رہے ہیں مگر ان کے پیچھے خواتین کندھے سے کندھا ملائے ہر میدان میں جہاد کر رہی ہیں'' (۳)

بلکہ ایرانی خواتین پردے کے باوجود جہاد کرتیں ہیں اور نزاکت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ تہران کی موجودہ حالت کی عکاسی اس طرح کرتی ہیں۔

۱۔ بشریٰ رحمٰن بحوالہ سابقہ ص ۱۳۶
۲۔ ایضاً ص ۲۷۲
۳۔ ایضاً ص ۳۰۶

''اس وقت تہران کی حالت اس لاچار عورت کی سی ہے جس کا شوہر عرصے سے لاپتہ ہے۔عزیز و اقارب اسے بیوہ سمجھ کر اس کا سب کچھ چھیننے کے درپے ہوں مگر وہ ابھی تک اپنے آپ کو سہاگن کہنے پر بضد ہے''۔(۱)

تنہائی کا احساس بشریٰ کو اکثر جگہ ہوتا ہے۔ بشریٰ کے بیان میں نسائی رنگ غالب ہے۔لیکن وہ لفظی معنوی رعائیت سے واقف ہیں اس لیے ان کا بہتر استعمال جانتی ہیں۔ اس سفرنامے کا ہر منظر اور ہر واقع نسائی لطافت کا اظہار ہے۔

ایک خامی جوان کے سفرنامے براہ راست میں بھی نظر آئی کہ وہ جذبات کے بہاؤ میں بہہ کر عام طور پر خودستائی کا شکار ہو جاتی ہیں جو بعض اوقات مبالغہ آرائی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔وہ ہر محفل میں اور ہر جگہ اپنے آپ کو باقی خواتین سے نہ صرف زیادہ قابل سمجھتی ہیں۔

بلکہ منفرد ہونے کے شوق میں تنہائی کا بھی شکار ہو جاتی ہیں کیونکہ اکیلے بیٹھ کر یادوں کے منظر سے لطف اٹھانے کے زخم میں بعض اوقات لوگ تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔مثلاً منفرد بننے کے شوق میں وہ کہتی ہیں۔

''اس محفل میں جکارتا کی ایک ناول نگار خاتون ٹی ٹیک Titik بھی تھیں اور وہ یہ سن کر آئی تھیں کہ پاکستان سے بھی وفد میں ایک ناول نگار خاتون آئی ہیں۔سوشل ورکر جھٹ بولی میں رائٹر بھی ہوں۔میں انگریزی کے پرچوں میں لکھتی ہوں۔کالم نگار بھی ہوں۔میں فیچر نگار بھی ہوں۔ میں اور مصنفہ جو غریب چپ چاپ ان کی گفتگو سن رہی تھی پتھرا سی گئی۔ بالآخر ٹی ٹیک نے مصنفہ کو ڈھونڈ نکالا تو آپس میں تبادلہ خیالات شروع ہوا''۔ (۲)

اس میں خودستائشی کی انتہا ہے کہ مصنفہ نے اپنے میں موجود سارے فن سوشل ورکر میں ڈال کر اپنی تمام خوبیوں کو گنوا دیا اور خود معصوم بن کر اپنی تعریف سنتی رہیں۔ اگر بشریٰ میں خامی ختم ہو جائے تو وہ ایک اعلیٰ پائے کی ادیب ہیں۔ ہیں تو وہ اب بھی لیکن بڑا وہی ہوتا ہے جسے دوسرے بڑا کہیں اور خوبصورت وہی ہوتا ہے جسے دوسرے خوبصورت مانیں ورنہ کہنے کو تو یہاں ہر شخص ہی اپنی تعریف و توصیف میں دوسروں سے کس حد تک آگے ہے۔ یہ بتانا ناممکن ہے۔

بشریٰ نے اس سفرنامے میں اپنی معلومات کو بھی دوسری خواتین کی معلومات سے برتر اور اعلیٰ جانا ہے۔ مثلاً عائلی قوانین، قانون شہادت اور فیملی پلاننگ کے بارے میں وہ سمجھتی ہیں کہ میری معلومات ان سے بہتر ہیں۔

لیکن مجموعی طور پر سفرنامہ اس خودستائی کے باوجود اسلوب اور بیان دونوں لحاظ سے ایک اچھا سفرنامہ ہے۔

سلمیٰ اعوان (یہ میرا بلتستان)

باہر کے موسموں کی طرح اندر کے موسم بھی بدلتے رہتے ہیں۔ان پر بھی بہار، خزاں اور صبح وشام کے اثرات پڑتے ہیں۔ جب انسان کی ذات پر کوئی کیفیت یا احساس طاری ہوتا ہے وہ مختلف انداز میں اسے بیان کرتا ہے۔یہی تنوع اسے باقی لوگوں سے منفرد کرتا ہے۔ انسانی فطرت میں جن چیزوں کی آرزو ہمیشہ کروٹیں لیتی ہے۔ان میں سے ایک ان دیکھے راستوں کا سفر ہے۔ کہ نئے انجانے دیس کی سیر، ان دیکھی راہیں، خوبصورت وادیاں، دلکش نظارے ہمیشہ کشش کا باعث رہے ہیں۔ اور یہ شاید زندگی کے تلخ حقائق سے راہ فرار بھی ہے۔ اس یکسانیت سے گھٹن کا سا احساس ہونے لگتا ہے یا کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ خوبصورت اور دل موہ لینے والے لوگ کہ جن کی وجہ سے وہاں (گھر) رہا جاتا ہے کہ جن کو زندگی سے بڑھ کر عزیز جانا جاتا ہے۔اچانک ہی انجان بن جاتے ہیں اور یہاں بیٹھنے میں زمانے درکار ہوتے ہیں وہاں سے نکل جانے کے لئے لمحے بھی بھاری ہو جاتے ہیں۔ ان اذیت ناک لمحوں کا کرب جب نوک قلم سے نکل کر صفحہ قرطاس پر بکھرتا ہے تو گاڑھے خون کی مانند ادب کی زمین کو زرخیز کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی پارہ صفتی اسے کبھی پناہ کی طرف اور کبھی فنا کی طرف گامزن کرتی ہے۔

سلمیٰ اعوان کا یہ سفر نامہ بلتستان کے تاریخی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔سلمیٰ اعوان لکھتی ہیں۔

''میری خواہش ہے کہ میں اس کے تاریخی پس منظر میں جھانکتے ہوئے اس کے مسائل،اس کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو اس انداز میں بیان کروں کہ قاری پڑھتا جائے اور جب وہ اسے پڑھ لے تو یہ جان لے کہ بلتستان کیا ہے''۔ (۱)

اس کا انتساب ان شہدا اور ان غازیوں کے نام ہے کہ جنہوں نے بلتستان کی جنگ آزادی میں حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے اور شہید ہوئے یا غازی بن کر لوٹے اور جن کے دل میں پاکستان کی محبت ایک محبّ وطن پاکستانی سے کسی طرح سے کم نہیں۔اس سفر نامے میں بلتستان کی تاریخ، معاشرت، سیاسی حالات، مذہب، مرکزی دینی ادارے، شادی اور پاکستان میں شامل ہونے کی جدوجہد کو اور خاص طور ان افراد کی محبت عقیدت شفقت کو اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ اس سفر نامے کا سادہ اور دلکش انداز قاری کے دل میں اترتا

۱۔ سلمیٰ اعوان یہ میرا بلتستان سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۸ ص ۸

چلا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کرداروں کی نفسیاتی کیفیات کو اور ان کی محبتوں کو دل میں محسوس کر کے بیان کیا ہے۔

سب سے پہلے وہ بلتستان کا تعارف کچھ اس انداز سے کراتی ہیں۔

''بلتستان کو چینی لوگ بلور، لداخی اسے بلتی بل یا سری بتان (خوبانیوں کی سرزمین) خلیجی ممالک نے اسے تبت خورد اور یہاں کے باشندوں کو تبتی کہا ہے۔ ایرانی مبلغین کی اس علاقہ میں آمد کے بعد اس کا نام بلتی زبان کے لفظ بلتی اور فارسی کے لفظ ستان سے بلتستان بنا اور یہی اس کا آج کا نام ہے''۔(۱)

یہ تعارف یوں محسوس ہوتا ہے کہ ادیبہ نے نہیں لکھا بلکہ تاریخ کی کسی پروفیسر نے کروایا ہے۔ کہ جو اس چیز کو سمجھتی ہوں کہ میرے قاری اس کے پس منظر کو نہیں جانتے ہوں گے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک محبّ وطن خاتون ہونے کا ثبوت دیتی ہیں کہ وہ سکردو کے ان غازیوں کو عقیدت و احترام کی نظر سے اور شہیدوں کو شجاعت و عظمت کا مینار جانتی ہیں ان کے لئے دعائے خیر کرتی ہیں۔

خاص طور پر سلمی اعوان نے کہف الوری کے ذریعے اپنی اس سائیکی کو بیان کیا ہے کہ عورت ہمیشہ ہمیشہ محبت کی تلاش کا سفر کرتی رہتی ہے کبھی ماں باپ میں، کبھی بہن بھائیوں میں، کبھی شوہر کی خدمت گار لونڈی بن کر اس کے دو پیار بھرے بولوں کی تلاش میں کبھی اولاد میں لیکن عورت کا مقدر ہے کہ وہ محبت کی اس پر خار وادی میں چلتی چلتی اپنے دل کو فگار کر لیتی ہے لیکن پیار اسے میسر نہیں آتا۔ یہی حال کیف الوری جو کہ اس سفرنامے کا اہم نسوانی کردار ہے اور اسے بلتستان کا سفر جبراً کرنا پڑا کہ جب شوہر کی وفات کے بعد اسے بانجھ عورت کا طعنہ دیکر اس کو گھر سے نکال دیا کہ یہاں اسنے شوہر کی خوشنودی کی خاطر نوکری کو خیرآباد کہہ دیا تھا اور اس کے گھر کے چپے چپے کو اپنی محبت اور جوانی کا خون دیکر سجایا اور سنوارا تھا کہ عورت تیرا مقدر ہی یہی ہے کہ تیرا کوئی گھر نہیں ہے۔ نہ ماں باپ کا گھر اور نہ شوہر کا گھر۔ تیرا گھر کہ جب شادی ہوتی ہے تو ماں باپ کا گھر بھی پرایا گھر ہو جاتا ہے کہ جہاں بھائی بیویوں کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں۔ یہی مسئلہ کیف الوری کو درپیش تھا۔ اسی وجہ سے وہ بھائی کے گھر جانے کی بجائے سکردو کا ٹکٹ کٹا کر بھائی کے دوست کے گھر چلی گئی اور پھر سارے علاقوں میں پھرتی پھرتی اپنا وجود اور دوسروں کی محبتیں تلاش کرتی رہی۔ اس دوران پورے علاقے کے تاریخی حقائق و

۱۔ سلمی اعوان بحوالہ سابقہ ص ۲۶

واقعات بھی بڑی خوبصورتی سے تحقیقی نقطہ نظر سے بیان کرتی ہیں۔ مثلاً سکردو کے پہلے مسلمان کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ''رگیالموشکری'' بلتی بل کی شہزادی تھی۔ ابراہیم درحقیقت پہلا مسلمان تھا جو اسی علاقے میں پہنچا اور مرتے دم تک مسلمان رہا۔

''مستند تاریخی روایات کے مطابق یہ نوجوان رعنا مصر کے شاہی خاندان کا مغرور شہزادہ تھا جو پہلے کشمیر آیا تھا وہاں کی خانہ جنگی سے اس نے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن مقامی لوگوں نے بغاوت کردی اور اس کی جان کے درپے ہو گئے۔ وہ کشمیر سے بھاگتا ہوا براستہ دیوسائی سکردو پہنچا اور شہزادی سے شادی کی۔۔۔۔۔ اور یوں اس خاندان کی ابتدا ہوئی جس نے بائیس پشتوں تک نہایت کروفر سے حکومت کی۔ اس خاندان کے بادشاہ پونجا نے موجودہ سکردو شہر بسایا''۔ (۱)

مسلمانوں کے ساتھ خاص عقیدت ومحبت کی وجہ سے ہی انہوں نے اتنی تحقیق کی کہ پہلے مسلمان تک کے نام کو دریافت کیا۔ اس کے علاوہ یہاں کے فلک بوس پہاڑوں کے درمیان کھدوائی ہوئی۔ نیز جو ''رگیانمو'' کی وجہ سے بنوائی گئی اس کی بڑی خوبصورت تفصیل بیان کرتی ہیں۔ لیکن اس شہزادی کی محبت کا انجام جو اپنے پتی کی بانہوں میں سونا چاہتی تھی لیکن وہ موت کی بانہوں میں ہمیشہ کے لئے سوگئی۔ ان کیفیات کو صرف ایک عورت ہی محسوس کرسکتی ہے کہ مرد تو ٹھہرا ہمیشہ کا سنگدل، بے وفا اور شکی مزاج ''رگیالمو'' ملکہ کی محبت ومحنت کا جواب یوں دیتا ہے۔

''گنگوپی نہر بتانے پر تم انعام کی مستحق ہو۔ میں انعام نہیں دوں گا۔ کھرپوچو قلعے کے لئے جو راستہ بنایا ہے اس کے لئے تم سزا کی حقدار ہوئیں۔ سزا نہیں دونگا، جیسے فضاؤں میں قلانچیں بھری لقی کبوتری کے دل پر کسی شکاری کا تیر لگ جائے اور پل جھپکنے میں وہ پھڑ پھڑا کر زمین پر گر جائے۔ بس تو ایسا ہی ہوا۔ اور اس نے ان فولادی بانہوں میں بس صرف ایک بار آنکھیں کھولیں اور ہمیشہ کے لئے موندلیں''۔ (۲)

عورت صرف سراپا نازک نہیں وہ سراپا احساس بھی ہے اور اس کے دل نازک پر جب چوٹ پڑتی ہے

۱۔ سلمیٰ اعوان بحوالہ سابقہ ص ۶۱

۲۔ ایضاً ص ۲۱۹

تو بڑی گہری اور اندر تک محسوس ہوتی ہے۔

"سلمی اعوان نے بلتستان کے مذہب اور قومی تہواروں کا مشاہدہ بھی بڑی عمیق اور گہری نظر سے کیا ہے۔ "بلتستان کا یہ سب سے بڑا دینی ادارہ غواری میں سڑک کے کنارے پر واقع ہے وہ جب ہاں پہنچا۔ ادارے کے سرپرست شیخ عبدالرشید تعمیر کا کام کروا رہے تھے۔ دومنزلہ عمارت میں کوئی تین سو کے قریب بچے زیر تعلیم تھے۔ حدیث، فقہ، فلسفہ اور تصوف پر تحقیقی کام ہوتا ہے۔ طلبہ فارغ التحصیل ہوکر جب نکلتے ہیں تو ان کی تعلیمی استعداد ایم۔اے کے برابر ہوتی ہے۔ غوازی خپکو کی آخری وادی ہے"۔ (۱)

تجرباتی عمل سفرنامے کو بامعنی بنا دیتا ہے اور جب انداز بیان بھی بھرپور نسائیت کا حامل ہو تو پھر یہ کاٹ دودھاری تلوار کا کام دیتی ہے۔ سلمی نے بلتستان کی تہذیبی، معاشی اور تعلیمی روایات کے لئے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ وہاں کے حالات و واقعات پر روشنی ڈالتا ہے بلکہ محسوس کرنے اور کروانے کی آخری حدوں تک جاتا ہے۔ خاص طور پر جس کرب کی کیفیت میں کیف الواری گھر سے نکلتی ہے وہ جہاں بھی خوشحالی خاندان کو دیکھتی ہیں۔ عورت کی ازلی وابدی خواہش کہ اس کا اپنا گھر ہو "سائے کی طرح" اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے مثلاً سردیوں کے موسم کی تیاری بلتستان میں ہمارے پنجاب سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ وہاں تمام سبزیاں اور پھل سکھا لیئے جاتے ہیں تاکہ برف باری کے دنوں میں کام آسکیں۔ ایک دن یہی کام کرتے ہوئے اس کا دل جذبات سے بھر گیا۔

"ساگ اور پالک سوکھ گئی تھیں اور انہیں پولیتھن کے لفافوں میں پیک کر لیا تھا۔ سوکھے ٹماٹروں کو بھی ایک دن دونوں نے مل کر پیس لیا۔ یہ سب کام کرتے ہوئے کبھی کبھی اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اسُے اپنا گھر یاد آتا۔ اپنا کچن جس کے لئے وہ مہینے کی اولین تاریخوں میں ایسے ہی چیزوں کو سلیقے میں پوری گرہستین بنی ہوئی دل سے ایک ہوک سی اٹھتی۔ اپنے گھر کی آرزو تڑپانے لگتی۔ پھر یکدم وہ اس آرزو کے گلے میں پھندا ڈال کر اس کا گلا گھونٹ دیتی ہے"۔ (۲)

سلمی نے معاشرے کا مطالعہ بے حد قریب سے کیا ہے یہی وجہ ہے کہ معاشرے کی خوبصورتی اور اس کے متعلق مسائل و معاملات کو بڑی شرح وتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ انجانے لوگوں میں جذباتی مانوسیت پاتی ہیں۔ وہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں اور نامساعد حالات سے لڑنے کی صلاحیت رکھتی ہیں لیکن انسان کہیں نہ

۱۔ سلمی اعوان بحوالہ سابقہ ص ۲۴۰

۲۔ ایضاً ص ۱۲۷

کہیں محبت کی گرم آنچ سے پگھلتا ضرور ہے۔ جسطرح ڈاکٹر ابراہیم کی محبت اسی میں ترنگ بھر دیتی ہے۔

''اس نے دل کے دروازوں کو دھکے لگا لگا کر کنڈیاں چڑھانے اور انہیں مکمل بند کرنے کی امکانی کوششیں کیں لیکن باہر خلوص محبت کی جو آندھیاں ڈاکٹر ابراہیم کے وجود کے ساتھ چل رہی تھیں وہ اس کی سب کاوشوں کو ناکام بنائے جاتی تھیں''۔ (۱)

سلمیٰ اعوان کا اسلوب بعض جگہ نسائیت کا بھرپور رنگ لیے ہوئے ہوتا ہے اور یہ صرف اس لیے وہ محسوس کرنے والا دل اور جذبوں کی گہرائی تک جانا جانتی ہیں۔

وہ عورت کے اس کرب کو محسوس کرسکتی ہیں جو مرد زندگی کی کسی Stage پر بھی محسوس نہیں کرسکتا کہ یہ معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے اور اس کی مرضی ومنشا کا معاشرہ ہے۔ سلمیٰ لکھتی ہیں۔

''قبر میں سوئی ماں یہ نہیں جانتی کہ بیٹی جلے نصیبوں والی نکلی۔ (۲)

یا

پاؤں سے ننگی بوسیدہ اور خستہ کپڑوں میں لپٹی وہ نوخیز لڑکی جو ہنستی تھی تو یوں محسوس ہوتا جیسے صبحدم گلاب کا نوشگفتہ پھول اپنے دامن پر شبنم کے موتیوں کے ساتھ مسکرا رہا ہو۔ (۳)

یہ عورت کا شباب تین بچے جننے تک ہوتا ہے۔
خوبصورت پھول بھی تین صبح تک کھلے رہتے ہیں۔
طاقتور گھوڑے بھی پولو کے تین گیم کھیل سکتے ہیں۔
گھر بار نہ ہونے کا احساس شام کو ہوتا ہے۔ (۴)

''اپنی بے مائیگی کا احساس سانپ کے زہر کی طرح رگ و پے اترنے لگتا ہے۔
نس نس جلنے لگتی ہے اور روح تڑپتے تڑپتے نڈھال ہوجاتی ہے''۔ (۵)

ان تمام اقتسابات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جسطرح سلمیٰ اعوان نے بلتستان کا حال لکھا ہے وہ شاید آدمی کے مشاہدے سے کمتر ہو لیکن محسوسات کو جو زبان سلمیٰ نے دی ہے وہ کسی بڑے ادیب مرد سے اعلیٰ وارفع ہے کہ دکھ کی وہ لہر جو عورت کے اندر تیر کی طرح چبھتی ہے مرد کے آر پار تو ہوسکتی ہے محسوس نہیں کی جاسکتی۔

۱۔ سلمیٰ اعوان بحوالہ سابقہ ص ۱۷۴
۲۔ ایضاً " ص ۱۹۷
۳۔ ایضاً " ص ۲۲۶
۴۔ ایضاً " ص ۲۵۷
۵۔ ایضاً " ص ۲۵۹

سائرہ ہاشمی (کمیرج اور کمپرج)

زندگی کی رنگارنگی کی طرح ہر سفر نامہ نگار کے مخصوص رجحانات اور منفرد نقطہ نظر ہوتا ہے۔ معاشرے میں اپنے آپ کو منوانے کے لئے اپنا تشخص کرانے کے لئے مختلف النوع کی پابندیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ معاشرہ ہمارا ہو یا مغربی ممالک کا مرد کا معاشرہ ہے۔ ایسے میں تخلیق کار عورت کے لئے اپنے لیے الگ راہ نکالنا اور اپنی ذات کی انفرادیت کے ساتھ اپنا مقام بنانا بے حد مشکل ہے۔

درد، کرب، انتشار اور تنہائی ہمیشہ سے انسان کا مقدر رہی ہے۔ سب نے اس سے نجات کی راہ تلاش کی ہے۔ ادیب کا کام درد کو گہری معنویت عطا کرنا ہے۔ اس کے فن بڑائی اور گہرائی اسی میں ہے کہ وہ زندگی کو عظمت بخشے اور دکھ کی نفی کرے۔ اس کے لیے وسیع مشاہدہ اور تجربہ ضروری ہے تاکہ قاری کو اعصابی تناؤ سے باہر نکالا جا سکے۔ زندگی میں کبھی کبھی ادیب اپنی ہی ذات کے اندر داخلی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کشمکش میں کبھی کبھی داخلی حیثیت، خارجی حیثیت پر حاوی ہو جاتی ہے اور کبھی خارجی حیثیت داخلی پر ان دونوں صورتوں میں اعصابی تناؤ جنم لیتا ہے۔ اس سے رہائی کا واحد ذریعہ دنیا کی رنگارنگی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

سائرہ ہاشمی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں ان کے افسانوں میں جذباتیت ہے اور یہی چیز ان کے سفر نامے میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ خود ساری دنیا کو ایک وسیع کائنات یا کینوس گردانتی ہیں۔ جس سے احساسات، مشاہدے میں گہرائی اور خلوص ان کی تحریر میں پیدا ہو جاتا ہے۔ انہوں نے متحرک واقعات زندگی کو سفر نامے کے ایوان میں یوں سجایا ہے کہ لندن جیتا جاگتا ہمارے سامنے موجود ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

> ''تاریخ اور جغرافیہ کا بیان میرا مقصد نہیں اور سفر نامے کے لیے میں ان علوم کو ضروری نہیں سمجھتی۔ میرا سفر نامہ تو صرف میرے احساست کو منعکس کرتا ہے۔ ایک سیاح کے ذاتی احساسات، قاری کا ان کے ساتھ متفق ہونا ضروری نہیں''۔ (۱)

عورت کی نظر گہری ہوتی ہے۔ وہ فطری طور پر جذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ حساس بھی ہے۔ اس کی یہی جبلت اس کو ذات کی ترجیع سے نکالتی ہے۔ اور اس کو کائنات کے مشاہدے پر اکساتی ہے۔

۱۔ سائرہ ہاشمی ، کیمرج اور کیمرج مکتبہ آرٹ ۱۹۸۹ ص ۵۶

سائرہ ہاشمی نے اپنے احساسات کو بڑی خوبصورتی سے سفرنامے کا حصہ بنایا ہے۔ خوبصورت مناظر واقعات پاکستانیوں کے مسائل پرنظر ڈالنے کے ساتھ ساتھ مغربی معاشرے کی خامیوں پرنظر ڈالتی ہیں۔انہوں نے لندن کو غیر دنیا دار کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ ان کا بیان تصنع اور بناوٹ کا عنصر نہیں رکھتا۔وہ لندن کی آزادی اوراس کی آزاد فضا سے بہت مسحور ہوئی ہیں۔ یہاں انسان ہو یا جانور یا پرندے وہ سب آزاد ہیں۔ لیکن اس بیان میں بھی شائستگی اور وقار کو برقرار رکھتا ہے۔مادی ترقی اوراس کے اثرات کو پوری طرح عیاں کیا ہے کہ کسطرح نئی تہذیب میں چلنے والے افراد اپنی اس بے جا آزادی سے روایات سے لٹ کر بے چین و بے قرار ہوگئے ہیں۔ وہ دوبارہ مرکز کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں۔ اخلاق کی حفاظت چاہتے ہیں۔غیر ضروری اشیاء سے گریز کرتے ہیں کہ ان کے اندر کی بے چینی اور ظاہری انتشار دونوں انہیں ایک مرکز پر لانے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔

گزشتہ دھائی میں تاریخی معلومات سفرناموں کا رجحان بھی سامنے آیا ہے۔ ہمارے قدیم سفرنامے بھی مختلف ممالک کی تاریخ، سیاست، معاشرے اور ثقافت کو جگہ دیتے ہیں۔ اب سفرنامے معلومات بھی ہوگئے ہیں لیکن اب معلومات ایسے پیش کرتا ہے کہ حقیقت و تخیل کا حسین امتزاج سامنے آتا ہے۔ وطن سے دور رہنے والے وطن میں کمائی بھیج دیتے ہیں لیکن وہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں کیونکہ بیرون ممالک میں اپنی شناخت پیدا کرنا اپنا تشخص برقرار رکھنا ایک اہم مسئلہ ہے اوراس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جو وطن سے دور ہے۔

سائرہ ہاشمی جو کچھ دیکھتی ہیں وہ بیان کر دیتی ہیں۔لیکن افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے واقعات میں ربط قائم ضرور رکھتی ہیں۔ آج کے سیاح کے اندر مشاہدات سفر کے ساتھ علمی و ادبی مباحث بھی جگہ پاتے ہیں اور فکری عنصر کے باعث بھی یہ سفرنامہ کامیاب ہے۔

لندن کی سیاحت کے دوران سائرہ ہاشمی نے اپنی فکر کو آزاد کر دیا ہے اور نظاروں سے لطف اندوز ہوئیں۔ زندگی کے خوبصورت رنگوں کی عکاسی کچھ یوں کرتی ہیں۔

> ”جھیل کا پانی سروں سے جھول رہا ہے۔ اس کے اوپر سیاہ سلیٹ کے پہاڑ ہیں اور پہاڑوں کے اوپر تنا آسمان، سورج، سارے دن کے بعد پہاڑوں کے پیچھے ہلکی شفق کو بکھرا رہا ہے۔ ہلکے گلابی گوٹ والے سفید بادل نیلے آسمان کے پس منظر میں دلکش لگ رہے ہیں“۔(۱)

۱۔ سائرہ ہاشمی بحوالہ سابقہ ص ۷۱

مغرب کی تہذیبی بے راہ روی پر ان کا ردعمل خاصہ طنزیہ ہے لیکن انہوں نے صراحت پیدا نہیں کی اور چھوٹے چھوٹے جملوں سے تاثر کو دوچند کر دیا ہے اور تجزیاتی عمل سے بامعنی بھی بنا دیا ہے۔ اس سفرنامے کی خوبی یہ ہے کہ سفرنامہ حقیقی ہے اور تاثر بھی قاری پر انتہائی گہرا ہے۔ سائرہ ہاشمی انوکھی سیاح ہیں کہ ان کی سیاحت میں آنکھوں کے ساتھ دل بھی مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ مناظر کو بے اعتنائی سے یا دھند کی دبیز تہہ تلے نہیں دیکھتی بلکہ وہ بڑی اپنائیت اور ہمدردی سے اس کی نقاب کشائی کرتی ہیں کہ زندگی باوجود پھیلاؤ کے ان کے قلم میں سمٹ جاتی ہے اور ہم ان کی نظر سے نظارہ دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور ایک ادیب کی پہچان بھی یہی ہے کہ وہ قاری کے ذہن پر اسطرح اثر انداز ہو کہ وہ اس کے ساتھ چلنے کا خواہش مند نظر آئے۔ سائرہ ہاشمی لکھتی ہیں معاشرے کی اخلاقی قیود کمتر ہیں۔ مادی ترقی اور پونڈ جمع کرنے کی تگ و دو نے زندگی سے حقیقی مسرت اور خوشی کا احساس ختم کر دیا ہے۔ احساسات ان کے اندر سے بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ وہ بے حس زندگی گزار رہے ہیں۔ جہاں پھول، رنگ، روشنی حسن ان کے لیئے بے معنی ہے۔ بلکہ وقت کا ضیاع ہے۔ اور وقت ضائع کرنے کے لیئے نہیں بلکہ عمل کے لیے ہے۔ ظاہری جنگ اور بے معنی نے ان کو ہر چیز سے بے نیاز کر دیا ہے۔ خوبصورتی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ بدصورتی انہیں گراں نہیں گزرتی۔ انتہائی نظم وضبط کے ساتھ صبح و شام کی قید سے بے نیاز زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن یہ دنیا خوفناک انجام کی طرف گامزن ہے۔

> "گھر قطار در قطار چھوٹے چھوٹے کچن، گارڈن، خودرو جڑی بوٹیاں، گھر کے مالکوں کو فرصت نہیں کہ ان کو اکھاڑ پھینکیں۔ کوڑے کے لفافوں کے ڈھیر لگ گئے ہیں۔ (۱)

سائرہ ہاشمی کے لئے یہ تکلیف دہ ہے کہ انسان حسیات سے عاری ہو جائے۔ وہ جمادات، نباتات میں سے انسان کو الگ تصور کرتی ہیں۔ وہ اسے جال و جمال کا پیکر سمجھتی ہیں۔ دکھ سکھ کے موسموں کو اپنے اندر اتارنے والا، ہجر میں وصال کے مزے لوٹنے والا موسموں کے مطابق اپنے اندر تغیر وتبدل پیدا کرنے والا، لیکن لندن میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں کا انسان صرف مشین ہے، وہ سانس بھی اتنے ہی لیتا ہے جتنے اسے زندہ رہنے کے لئے درکار ہوں۔ سائرہ ہاشمی کے سفرنامے میں بھی افسانوں کی سی جذباتیت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سفرنامے میں زندگی سے لطف اندوز ہونے والے کردار کم ہیں۔ اکتائے ہوئے

۱۔ سائرہ ہاشمی بحوالہ سابقہ ص ۱۴۲

بے زار خود غرض، جنس پرست، خوف زدہ پریشان، بے چین لوگ زیادہ ہیں۔ یا وہ لندن کی ظاہری چمک دمک کی بجائے وہاں کے گھٹن زدہ اور تاریک پہلوؤں کا ذکر بھی کرتی ہیں۔ اس لیے لندن ایک جگمگا تا ہوں شہر نظر نہیں آتا بلکہ یہاں پر ہمہ قسم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ زندگی سے پیار کرنے والے بھی اور زندگی سے بیزار بھی اور یہی متنوع رنگ ان کے سفرنامے میں تنوع پیا کر دیتے ہیں۔ کیونکہ سائرہ ہاشمی نے تہذیبی تصادات کو ابھارا ہے۔ انہوں نے غیر جذباتی اسلوب کے باوجود زندگی کے تاثر کو گہرے طریقے سے ابھارا ہے۔ سائرہ ہاشمی لکھتی ہیں۔

> ''ہم جنسی کے کلب، سیاہ دھواں، تاریک روشنیاں، پھٹے کپڑے، عریاں جسم، اور یہ رہی ہم جنس پرستوں کی یاد جھاگ اڑائی بیئر، تھوک اڑاتے ہونٹ، ترقی یافتہ انسانی ذہن کا بیک یارڈ تاریک اور کوڑا کرکٹ سے بھرا ہوا۔'' (۱)

لندن جو خوبصورت شہر تھا۔ روشنیوں کا شہر تھا۔ اب تباہیوں اور بربادیوں کے دھانے پر کھڑا ہے۔ یہاں پر اب انسان کی بھی قدر نہیں ہے۔ اور نہ ہی عزت نفس برقرار ہے۔ انسانی جسم نے جنس پرستی کی وجہ سے ذلت کی انتہا دیکھ لی ہے۔ نوجوان نسل نشے کی وجہ سے ہوش وخرد سے بیاگانہ ہے۔ مستقبل تاریک ہے۔ ماضی کا علم نہیں اور آج کی خبر نہیں۔ سائرہ ہاشمی لکھتی ہیں۔

> ''کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ اپنے من میں مگن ویران چہروں پر خون کی گردش رکی ہوئی ہے۔ خوابوں کے تاریک جزیروں میں انسان بھٹک رہے ہیں بظاہر خوشیوں میں لپٹے ہوئے تھکن زدہ لوگ'' (۲)

خوشی وہ ہوتی ہے جو اندر سے پھوٹے اور دل تک جائے لیکن یہاں کوئی آثار ایسے نہیں ہیں۔ سائرہ ہاشمی کے اسلوب میں فکر کی گہرائی اور پختگی ہے۔ ان کے ہاں جملوں کی آمد اور بے ساختگی ہر سطح پر نظر آتی ہے۔ ان کا انداز بیان رواں اور بے تکلف ہے بلکہ ان کے اسلوب میں رنگوں کی دھنک اور زندگی کی حرارت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے خوبصورت جملوں کی مدد سے منظر میں رنگ بھر دیا ہے۔

وہ حسن سے متاثر بھی ہوئی ہیں اور متاثر ہونے کی توجیح بھی تلاش کرتی ہیں لیکن غیر ضروری تفصیل سے گریز بھی کرتی ہیں کیونکہ زندگی اور کائنات کے وسیع کینوس پر گہرے رنگ اگر فطری معلوم نہ ہوں تو دلکشی سے خالی ہو جاتے ہیں۔

ان کا سفرنامہ خوبصورت نسائی رنگ کے ساتھ ساتھ افسانوی انداز کا منفرد سفرنامہ ہے کہ جس کو محسوس بھی کیا جاسکتا ہے اور معلومات بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اور روح کو معطر بھی کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ سائرہ ہاشمی بحوالہ سابقہ ص ۱۴۰

۲۔ ایضاً ص ۱۴۲

نوشابہ نرگس (سفر کہانی)

ادب کا لفظ بہت وسیع اور گہرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں مختلف اصناف ادب ہیں۔ مختلف لوگ تجربے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ادیب کی اپنی ایک انفرادیت اور پہچان ہوتی ہے۔ اور قاری ادیب کی تحریر سے جو تاثر قائم کرتا ہے۔ وہی اسے ادب میں منفرد مقام کا حامل ادیب بناتا ہے۔ اور اسی وجہ سے ادب میں تازگی برقرار رہتی ہے۔ ورنہ لفظ تو وہی ہیں۔ ان کا برقت اور برمحل استعمال ہی اسلوب کو دلکش اور زندہ تحریر بنانے میں مدد دیتا ہے۔

نوشابہ نرگس میرے ملتان کی ادیبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ رائے تاثراتی بھی ہے۔ لیکن نوشابہ واقعی بڑی دلکش شخصیت، دھیمے مزاج، خوش اخلاق اور خوش لباس خاتون ہیں۔

ادب کے میدان میں وہ نثر کے ذریعے شامل ہوئیں لیکن شاعری سے خاصا شغف ہے اور شاعری میں موضوعِ خواب ان کی شاعری پر غالب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی تعلق ہے اور روزنامہ امروز کی وجہ سے تقریباً ۳۱ سال سے خواتین کے صفحات باقاعدگی سے مرتب کر رہی ہیں۔ یوں نوشابہ ایک اچھی شاعرہ، منفرد افسانہ نگار، اعلیٰ صحافی اور اچھے ذوق نظر کی مالک ادیب ہیں اور اب انہوں نے ایک سفرنامہ ''سفر کہانی لکھ کر اپنے آپ کو منفرد سفرنامہ نگاروں کی صف میں شامل لا کھڑا کیا ہے۔

''سفر کہانی'' انہوں نے مسعود اشعر کے پرزور اصرار پر ۱۹۹۰ء میں شائع کروائی۔ اس میں انہوں نے ۳۲ عنوانات کے تحت خبریں اور واقعتاً کی گلرنگ داستان سنائی ہے''۔

نوشابہ نرگس نے اپنی انفرادیت، اپنے ذوق نظر اور ذوق بیان میں بھی برقرار رکھی ہے۔ عام سفرنامہ نگاروں کی طرح رودادِ سفر وہیں سے شروع نہیں کر دی کہ جہاں پروگرام طے پایا اور گھر سے پہلا قدم نکالنے کی تیاری سے شروع کرو اور واپسی پر وطن عزیز پر پہلا قدم رکھنے کے بعد ہی ختم کرو۔

لیکن نوشابہ نے جہاں سفر ختم ہوتا ہے۔ خوشی اور غمی کے ملے جلے لیکن لطیف سے احساسات پیدا ہوتے ہیں کہ یہاں اپنوں سے ملنے کی خوشی لیے وہاں ان مقامات اور لوگوں سے بچھڑنے کا غم بھی ہوتا ہے کہ جہاں پر

۱۔ نوشابہ نرگس سفر کہانی بیکن بکس ملتان ۱۹۹۰ ص ۳۴

واقعہ انوکھا اور ہر چہرہ نیا معلوم ہوتا ہے۔

نوشابہ نے اختتامی نقطے سے فلیش بیک کے ذریعے پورے سفر کی روداد بیان کی ہے۔ جدہ ٹاور سے پہلا باب شروع ہوتا ہے۔ مختلف جگہوں کو دیکھنے کا طریقہ اور سلیقہ ہر شخص کا انفرادیت کا رنگ لیے ہوئے ہوتا ہے۔ جدہ ائیر پورٹ، سعودی عرب کی ترقی کا منہ بولتا ثبوت ہے اور مغربی ترقی کے مقابل ایک ترقی یافتہ ائیر پورٹ نظر آتا ہے اور پھر عرب قوم خوشحال، متمول قوم ہے۔ تیل کی فروانی نے انہیں دنیاوی تفکرات سے آزاد کر دیا ہے۔ امریکہ جیسے دولت مند بھی ان کو بلیک میل نہیں کرتے۔ پاکستان کی طرح جدہ ایک ماڈرن شہر ہے۔ اس کے بارے میں نوشابہ لکھتی ہیں۔

> ''جدہ اس قدر خوبصورت، ماڈرن اور روشن شہر ہے کہ مغربی دنیا کے کسی بھی بڑے شہر کے مقابلے پر پرکھا جا سکتا ہے۔ اتنے بڑے بڑے شاپنگ سنٹر اور دنیا کا بہترین سامان دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ جدہ کا ایک پرانا بازار ''بلد'' ہے۔ یہ پورا کورڈ ہے۔ یہاں کی بڑی بڑی دکانوں پر دنیا کا بہترین کپڑا اور زیورات ملتے ہیں''۔ (۱)

پھر وہ عرب لوگوں کی خوشحالی، بے فکری، شاہانہ مزاج، وسیع وعریض دسترخوان، انواع واقسام کی ڈشیں اور قہوہ تک کا ذکر یوں کرتی ہیں کہ یہ سب چیزیں پوری جزئیات سمیت اور مکمل تدبیر کے ساتھ ہمارے سامنے یوں آنکھوں کے سامنے لہرا جاتی ہیں کہ ہم خود ان کا مطالعہ ومشاہدہ کر رہے ہوں۔

لیکن ایک چیز جو اس سفرنامے میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ارکان اسلام میں ہر صاحب مال پر حج فرض ہے تو ہر صاحب استطاعت پر عمرہ شوق کی طرح غالب ہے۔ اور جو مسلمان مرد وزن عمرہ یا حج کے لئے گھر سے نکلتے ہیں۔ ان کے دلوں کی دھڑکن ان کی آنکھوں کا شوق ان کی سفر کی وارفتگی ان کی بے چینی، بے قراری قابل دید ہوتی ہے کہ یہ وہ مقام ہوتا ہے کہ جہاں قلب ونظر کو سکون ملتا ہے۔ جہاں پر دکھ کا مداوا ہے۔ جہاں پر بیماری کا تریاق ہے۔ جہاں پر سفر اختتام پذیر ہے۔ جہاں شوق ومحبت وہ اسرار کھولتا ہے کہ ان اسرار ورموز کو سمجھنا کشف وکرامات ہی کے ذمرے میں شمار ہوتی ہیں۔ کہ جہاں سر کو قدم بنا کر چلنے کی روایات اور جہاں آنسوؤں سے وضو کرنے کا طریقہ انوکھا ہے۔ جہاق قلبی واردات کو لفظوں کو سانچے میں ڈھالنا اس لیے بھی مشکل ہوتا ہے کہ آنکھوں کو دیدار سے فرصت اور پیشانی کو سجدے سے فرصت کہاں۔ یہی تو وہ مقام ہے کہ

ا۔ نوشابہ نرگس بیکن بکس ملتان ۱۹۹۰ ص ۳۴

جہاں ایک آس، امید، خواہش اور تمنا جنم لیتی ہے کہ وہ یہاں ہے کہ جس سے محبت اپنی اولاد، ماں باپ اور دنیا میں سب سے زیادہ ہے یہ دل ونگاہ کا مرکز ومحور ہے۔

لیکن نوشابہ کا سفر اس ذوق وشوق اور وارفتگی کی کمی لیے ہوئے ہے کہ جو ایک عمرہ کرنے والے کے دل میں ہوتی ہے۔ کیونکہ گھر سے جس ذوق وشوق سے وہ نکلتی ہیں یا عام زندگی میں جسطرح وہ نماز، روزہ کی بہت پابند ہیں۔ وہی لگن یا رقت انگیز لمحات کا ذکر جو ایک راہ نورد کو پیش آتے ہیں۔ محبت کی وہ منزلیں جو ایک مسلمان کی اللہ کے محبوب کے ہاں جا کر ہوتی ہیں۔ وہ نظر نہیں آتیں۔ وہ صرف چند جملوں میں عمرہ کا حال بیان کر دیتی ہیں۔

> ''ہمارے میزبانوں نے عمرہ کا آغاز کیا۔ کچھ ان کی رہنمائی اور کچھ کتاب کی مدد سے ہم نے کعبۃ اللہ کا طواف شروع کیا۔ سنگ اسود کو چوما اور بار بار چوما۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ قیامت کے دن حجر اسود اپنے چومنے والوں کو پہچانے گا اور ان کے حق میں گواہی دے گا۔ سعی کرنے کے بعد مقام ابراہیم پر دو نفل ادا کیئے۔ عمرہ مکمل ہو گیا''۔ (۱)

نوشابہ کے اس بیان میں تڑپ، لگن، محبت، بے چینی نظر نہیں آتی یا وہ سکون قلب یا اطمینان جو ایک مسلمان کا شیوہ ہونی چاہیے وہ نہیں ہے۔

اگر چہ ان کے سفرنامے میں تخلیقی عنصر کی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تاریخی مشاہدہ بھی سطحی ہے۔ اس کے بعد مصر، جرمنی اور فرانس کے بارے میں لکھتی ہیں کہ اس میں بھی ان احساسات کا بیان نہیں کرتیں جو تاریخ کا بیان ہونے چاہیں لیکن یہ تاریخ، ذاتی مشاہدے یا حافظے پر مشتمل نہیں بلکہ دوسرے محققین کی کتابوں سے حاصل کیا مواد ہے۔ جس میں اپنی ذات کو شامل کر کے وہاں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ مثلاً قاہرہ، ائرپورٹ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

> ''قاہرہ صرف ایک نام نہیں رہا۔ ایک دروازہ بن گیا جو قدیم تہذیبوں، مقدس ہستیوں، نبیوں، پیغمبروں اور عظیم فراعنہ کی دنیا کی طرف لے جاتا ہے''۔ (۲)

مصر کی عظیم تہذیب کے بارے میں عبرت کا درس دیتی ہیں۔ فرعون کا تذکرہ مصر کی تہذیب معاشرت

۱۔ نوشابہ نرگس بحوالہ سابقہ ص ۵۱

۲۔ ایضاً ص ۹۹

میں می سازی کا ذکر بڑے خوبصورت اور تاریخی حقائق کو ملا کر کرتی ہیں۔ مصر کی قلوپطرہ کا ذکر نسوانی اور افسانوی رنگ میں کرتی ہیں۔

سب سے دلچسپ اور معلومات انگیز بلکہ فکر انگیز حصہ امریکہ کے بارے میں ہے۔ جہاں وہ امریکہ کو کھلی آنکھوں سے دیکھتی ہیں اور امریکی معاشرے کے معاشرتی، سیاسی وسماجی خدوخال کو تنقیدی نظر سے دیکھتی ہیں۔ وہ امریکہ جو سپر پاور ہے اور اپنی حکمت عملیوں کے ذریعے اندرونی و بیرونی مداخلت کرتا ہے۔ مشینی دور میں بھی یہ لوگ خوشیاں کیسے بانٹ دیتے ہیں۔ صحافی ہونے کے ناطے وہ ایک اخباری رپورٹر کی طرح اردگرد سے بے خبر نہیں۔ وہ ہر چیز کا بیان اس کے پس منظر اور پیش منظر کو سامنے رکھتے ہوئے کرتی ہیں۔

دراصل نوشابہ نے امریکہ کو جیسے دیکھا ویسے ہی بیان کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی دسترس میں یا اس کی رسائی محض ایسے حقائق و واقعات تک جاتی ہے۔ جہاں عام سفرنامہ نگار پہنچ ہی نہیں سکتا۔ لیکن نوشابہ کا انداز وضاحتی ہے۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ وہ قاری تک تمام معلومات گہرائی تک لے جا کر پہنچانا چاہتی ہیں۔ اور دوسرا صحافتی انداز بھی ان کے آڑے آجاتا ہے۔

نوشابہ امریکی سسٹم اور خاص طور پر امریکی کلچر کی تقسیم صحیح طور پر کرتی ہیں اور امریکی کی ایک ذہنی بیماری، فرسٹریشن یا ڈپریشن کے جس کا نئی نسل شکار نظر آتی ہے۔ اس کے اسباب کا ذکر تنقیدی نقطہ نظر سے اور گہرے شعور سے کرتی ہیں۔ ان کے مشاہدے میں گہرائی اور بیان میں طنز ہے۔

> ''امریکی معاشرے میں فرسٹریشن کا ایک بڑا سبب مشینوں کا انسانی جذبوں پر تسلط ہے۔ اتنا شور، اتنی تیز رفتاری۔ اسی لیے تو ہے کہ غیر شعوری طور پر انسان ان مشینوں سے آگے نکل جانا چاہتا ہے''۔(۱)

اس کے ساتھ امریکی معاشرے کی بے راہ روی، بے چینی، پرائی اقدار کی کمی، محبت، عزت واحترام کہ جس کے نہ ہونے نے وہاں کے بوڑھوں کو ''Old Houses'' کی نذر کر دیا ہے کہ جہاں جنم دینے والی ماں اور پالنے والا باپ دونوں کرب میں مبتلا ہیں کہ وہ صرف کرسمس ڈے کا انتظار کریں کہ جب بچے ان کے لیے چند گھڑیوں کے لیے تحفے لے کر حاضر ہوں اور سارا سال اسی کرب میں گذر جائے کہ کب انتظار کے دیپ جلیں گے اور کب آنکھوں کی لو ٹھنڈک محسوس کرے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ انتظار کا کرب جھیلتے جھیلتے وہ

۱۔ نوشابہ نرگس بحوالہ سابقہ ص ۲۱۵

آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی ہیں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ وہاں بچے ذرا بڑے ہو جائیں تو انہیں اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے۔ زندگی کے میدان کے سرد وگرم کا مقابلہ ان ناتواں کندھوں اور ناسمجھ ذہن سے خود کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل اخلاقی لحاظ سے اور مذہبی نقطہ نظر سے لا پرواہ ہوتی جارہی ہے۔

اسی لاپرواہی نے اس نسل کو Violance کا شکار کر دیا ہے۔ اپنے اندر بڑھتی ہوئی گھٹن کی وجہ سے وہ اونچا میوزک اور بے ہنگم حرکات کو ہی زندگی تصور کرتے ہیں۔

لیکن نوشابہ نے یہاں کی معاشرت، مذہب، ثقافت، تدریس پر بڑے مدلّل انداز میں بحث کی ہے۔ کہ یہاں کچھ مسلمان گھرانے تو مذہب سے بالکل بیگانہ ہیں لیکن کچھ گھرانے اپنے بچوں کو باقاعدہ اسلامک سنٹر اور مساجد میں لے جا کر اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرتے ہیں۔ بلکہ کچھ خواتین باقاعدہ پردہ بھی کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ یہاں کے باشندوں کے عقیدؤں کے بارے میں حیرت کے ساتھ ساتھ دلچسپی کا عنصر شامل کر کے انہوں نے قاری کو بھی اس میں شریک سفر بنا لیا ہے کیونکہ اقوام تو ہمارے ملک میں بھی کافی ہیں لیکن امریکی قوم ترقی یافتہ ہونے کے باوجود اور سپر پاور قرار دینے کے باوجود انہی چیزوں کا شکار نظر آتی ہے۔ پت جھڑ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

> ”ہیلووین کی رات کو طرح طرح کی شکلیں پمکینز کو اندر سے خالی کر کے خوبصورت قندیل کی شکل میں موم بتی جلا کر باہر رکھ دیتے ہیں“۔ (۱)

اسطرح امریکی باشندوں کی نفسیات، سماجی مسائل اور معاشرتی تفادات کو بڑی ذہانت سے بیان کرتی ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ رواں اور سلیس ہے۔ لیکن اس میں ہلکے پھلکے طنز ومزاح کی آمیزش نے اسے دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے وضاحتی انداز کے باوجود ”سفر کہانی“ پڑھنے کے قابل ہے۔ ورنہ تو شاید یہ تاریخ کی خشک کتاب ثابت ہوتا۔

۱۔ نوشابہ نرگس، بحوالہ سابقہ، ص ۲۲۹۔

کوکب خواجہ (نی ہائو)

کوکب خواجہ کا سفرنامہ ''نی ہاؤ'' میرے سامنے ہے اور میں سوچ رہی ہوں کہ خوبصورت کچن میں سوہنی صورت، دلکش ہاتھوں اور جاذب نظر اشاروں سے ایک ہی چیز کو مختلف طریقوں سے پکاتے پکاتے کوکب خواجہ ادب کے میدان بطور سیاح کیسے اتری کہ ہم تو عادی ہیں کہ آج وہ کونسی نئی ترکیب بتائیں گی۔ لیکن کمال ہے کہ وہ ادب کے میدان میں بھی کامیابی سے سارے فاصلے ایک ہی جست میں طے کر کے ادیبہ بن گئیں۔ اور اس انداز سے اپنی ناؤ پار لگائی ہے کہ پاکستان کے بڑے بڑے ادیب وسفیر ہی کیا، چینی لوگ بھی ان کے فن کے گرویدہ نظر آتے ہیں اور کمال فن تو یہی ہے کہ آپ قلم کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں اترتے چلے جائیں۔

کوکب خواجہ کا سفرنامہ ''نی ہاؤ'' چین کی سرزمین کے بارے میں ہے۔ چین کا طلسم اور ذکر ہماری احادیث اور داستانی ادب میں زمانہ قدیم سے ہی چلا آرہا ہے۔ پھر انشاء جیسے معروف اور اعلیٰ پائے کے ادیب نے ''چلتے ہو تو چین کو چلیئے'' جیسا بہترین سفرنامہ لکھ کر اور کچھ یہاں کی محنتی قوم اور شاہراہ ریشم نے پاکستانی قوم کو اس طرح متاثر کیا کہ یہ شخص چین کا سیاح بننے کی امنگ اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہے۔

''نی ہاؤ'' کا لفظی مطلب ہے کہ آپ کیسے ہیں یا کیا حال ہے۔ یہ لفظ ایک رابطہ ہے۔ چینی قوم اور پاکستانی قوم کے درمیان۔ کوکب خواجہ کا نام (قیام) دراصل عام سیاح کی نسبت بہت طویل تھا۔ اس طوالت کی وجہ سے انہوں نے یہاں کے رسم ورواج، تہذیب معاشرت، سیاست اور قومی تہواروں کا بڑی گہری نظر سے مشاہدہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سفرنامہ چین کی مکمل بھرپور اور مربوط تصویر پیش کرتا ہے۔

ممتاز مفتی نے لکھا ہے۔

> ''کوکب نے چین کے لوگوں کی زندگی کے ہر پہلو سے دیکھا، اپنائیت اور محبت سے دیکھا اور صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ بیت کر دیکھا ہے۔ جانا ہے۔ چونکہ انہیں چین میں تین سال رہنے کا موقع ملا۔ چین اور پاکستان ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں ۔ دونوں میں اتنی اپنائیت ہے جسے دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ محبت کے راستوں میں

نظریاتی اختلافات حائل نہیں ہو سکتے''۔ (۱)

چین ایک ایسا ملک ہے کہ جس نے ہمیشہ پاکستان کا ہر مشکل وقت میں ساتھ دیا ہے اور ان دوممالک کی دوستی کو مخالف قوتوں کے لئے ایک ایسا ہتھیار ہے کہ اس کو مجبور کرنا ناممکن ہے۔ کوکب کا مشاہدہ اور مطالعہ کا اندازہ بہت عمدہ ہے۔ وہ چینی قوم کے تمام رجحانات وعقائد کا بغور مشاہدہ کرتی ہیں۔ کوکب نے چین کو خوابوں کی سرزمین کا نام دیا ہے۔ ملک چین کا تعارف وہ کچھ یوں کرواتی ہیں۔

''چین دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا گھر ہے۔ اس کے پاس اپنی چار ہزار سالہ تحریری ہسٹری موجود ہے۔ آثار قدیمہ کے محققین کے مطابق دنیا کے قدیم ترین انسان کا وجود بھی چین ہی میں ملتا ہے۔ یہ وہ انسان ہے جس نے پیروں پر چلنا سیکھ لیا تھا اور اپنی ضرورت کے مطابق چھوٹے چھوٹے ہتھیار بھی بنانے لگا اور آگ روشن کرنے کا راز بھی دریافت کر چکا تھا۔ اس انسان کی دریافت کا زمانہ تقریباً ۵۰۰۷۰۰۰ سال قبل کا بتایا جاتا ہے''۔(۲)

کوکب نے یہاں کی مشہور پوسلین ریشم، کاغذ، بانس، قدرتی وسائل کوئلہ پانڈا کا بھی زکر کیا ہے۔

''چینی زبان میں پانڈا کو ڈیکیسونگ ماؤ کیا جاتا ہے جس کے معنی برار یچھ ''بلا'' پانڈا چین کی پہچان ہے۔ اس کی صورت ایسی بھولی بھالی اور پیار ہوتی ہے کہ بچے تو بچے بڑے بھی اسے شوق سے دیکھتے ہیں۔ معصوم سی صورت والا بھالو نام یہ جانور آپ کو چین کے چڑیا گھر میں اگر زندہ دکھائی دیتا ہے تو اسکی پینٹنگز مجسمے ہر جگہ نظر آتے ہیں''۔ (۳)

کوکب خواجہ یوں نگری نگری چین کی گھومی ہیں کہ جیسے لاہور کا میلہ چراغاں ہو اور اس میں گاؤں کے لوگ ہر سال پر جانا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔ کوکب نے یہاں کی بادشاہت، ثقافت رنگ نسل، جسم خدوخال رہن سہن، کھیتی باڑی، لباس، میک اپ، عورت کی نسوانیت اور بچہ جو قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کے بارے میں بڑا عمیق مشاہدہ کیا ہے۔ چینی فنون لطفیہ بھی ان کی نظروں سے بچ نہ سکے اور وہ ان کے آرٹ کے نمونے دیکھ کر دن رہ جاتی ہیں بلکہ اخروٹ اور چاول کے دانے پر کنندہ عبارت تو انہیں عمارتی حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ

۱۔ ممتاز مفتی فلیپ نی ہاؤ از کوکب خواجہ فیروز سنز لاہور ص۔ ۱۹۹۰

۲۔ کوکب خواجہ نی ہاؤ ص۔ ۳۱

۳۔ ایضاً ص۔ ۳۴

اس شہر کو عجوبہ قرار دیتی ہیں کہ قدم قدم پر انہی حیرتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔

یہاں کے ادب کے بارے میں ان کے تاثرات کچھ اس قسم کے ہیں۔

''چن بادشاہت ۲۰۷۔۲۲۱ قبل مسیح سے جنگ افیون تک جو لٹریچر ہے۔ وہ کلاسیکی ادب کہلاتا ہے۔ اس زمانے میں بڑے بڑے نامور ادیب اور شاعر پیدا ہوئے۔ ہان، زبان دراصل چینی زبان ہے جو تصویری رسم الخط میں تشکیل پائی۔ ہزاروں سال قبل چین نے بڑی تعداد میں خطاط پیدا کئے۔ انہوں نے خطاطی کے شاندار فن پارے چھوڑے ہیں۔ جو آج کے چین کا قیمتی سرمایہ ہیں''۔ (۱)

کوکب کا سفر نامہ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک تو یہ نسوانی ہاتھوں کی تخلیق ہے۔ دوسرا ان سے ٹی وی میں نت نئی تراکیب سن کر ہم بہت زیادہ گرویدہ تھے۔ اب راز کھلا ہے کہ آخر کوکب چینی ڈشز کیوں اتنی زیادہ تیار کرتی ہیں۔ وہ عورت ہونے کے ناطے یہ بھی جانتی ہیں کہ عورت کسی مقام اور کسی عہدے پر بھی فائز ہو۔ گھر والوں کو تسخیر کرنے کے لئے کے ٹو کی چوٹی سر کرنے سے زیادہ مشکل ہے اُن کے معدے کے راستے دل کو سر کرنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوکب اس فن میں مکمل مہارت اور عبور رکھتی ہیں۔ چینی لوگوں کی خوراک سادہ ہے لیکن وہ نیم پختہ، سبزیاں سوپ یا بھاپ میں پکے کھانے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ چاول، آٹا، پھل سبزیاں وہاں پاکستان کی طرح عام ملتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کیڑے مکوڑے اور مختلف قسم کے گھاس بھی کھانے میں پسند کرتے ہیں۔ مثلاً

''چین کے مختلف علاقوں کی مخصوص اور معروف ڈشز بھی ہوتی ہیں۔ چین کے دارالحکومت بیجنگ کی خاص ڈش کا نام پیکنگ (بیجنگ) ڈک ہے۔۔۔۔۔۔ ایک ہوٹل بھی اسی نام سے منسوب ہے اور لوگ یہاں کی خاص ڈش بھی روسٹ کی ہوئی بطخ کھانے کے لیے خاص طور پر جاتے ہیں۔۔۔۔ چینی لوگ خاص موقعوں اور تہواروں پر اسے ضرور پیش کرتے ہیں۔۔۔۔ اسطرح سو سالہ پرانے انڈے بھی چینیوں کی مرغوب خوراک ہیں''۔ (۲)

کسی تہذیب و تمدن کو دیکھنے کا ہر ادیب کا نقطہ نظر الگ الگ ہوتا ہے۔ کیونکہ سفر نامے کا فن بھی

۱۔ کوکب خواجہ بحوالہ سابقہ ص ۴۲

۲۔ ایضاً ص ۵۵

شخصیت، ماحول اور حقائق و واقعات کو جذب کرنے سے بنتا ہے اور سفر ہے ہی ان دیکھے راستوں اور انجانی منزلوں کی طرف، کوکب نے اس طلسمی ماحول کا مشاہدہ صاف ذہن اور کھلی آنکھ سے کیا ہے۔ وہ یہاں کے قومی تہواروں اور پاکستان کے قومی دنوں کا ذکر بڑے لگاؤ سے کرتی ہیں۔ لکھتی ہیں۔

''سفیر صاحب نے پرچم کشائی کی رسم ادا کی اور سب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ملک سے باہر اس قسم کی تقریب میں شرکت کا پہلا موقعہ تھا۔ پرچم ہوا میں لہرا رہا تھا اور میری آنکھیں آنسوؤں سے جھلملا رہی تھیں''۔(۱)

ادیب شعوری طور پر سفرنامے کی افادیت کا قائل ہوتا ہے۔ دلچسپی اور شگفتگی بھی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ کوکب کو اس سفرنامے میں بہت سے ایسے مواقع ملے کہ وہ یہاں کے باشندوں میں گھل مل گئیں۔ خاص طور تہواروں کے موقع پر کہ ایک اکتوبر کا جشن جو ۱۹۸۴ میں انہوں نے دیکھا۔ جشن بہار ہو یا یوم مئی کا دن یا چین میں بسنت کا موقع وہ ہر تقریب کا حصہ رہیں ہیں۔ اور ان عقائد و نظریات کا خلاصہ لکھنا بھی نہیں بھولتیں جو ان کے تہواروں کا حصہ ہیں لکھتی ہیں۔

''چین کے شہر تھین جن کی ''ہزار پا'' کی شکل کی پتنگ کو نہ صرف چین بلکہ بہت سے دوسرے ممالک میں بھی شہرت حاصل ہے۔ یوں تو ہر شہر میں پتنگ سازی ہوتی ہے مگر دارالحکومت بیجنگ کی پتنگیں اپنے منفرد اور کلاسیک ڈیزائنوں کی وجہ سے خاص شہرت کی حامل ہیں''۔(۲)

کوکب خواجہ تصویروں کے عکس کو اس طرح منعکس کرتی ہیں کہ آنکھوں میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ سفرنامے میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ متحرک تصویریں کوکب کے سامنے رواں ہیں او وہ ان میں پسند کی تصویروں کو لفظوں کا روپ دے کر خاص سانچے میں ڈھالتی چلی گئی ہیں۔ ان کا اسلوب سحر انگیز اور زبان جمالیاتی رنگ لیے ہوئے ہے۔ کہیں بھی زبان و بیان میں تصنع و بناوٹ کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ برقی رو کی طرح ایک جمالیاتی رنگ کی لہر ان کے اسلوب کا خاصا رہی ہے۔ فتح محمد ملک لکھتے ہیں۔

''کوکب خواجہ سے پہلے کے سفرنامہ نگاروں کو چین میں صرف چند دن یا چند ہفتے رہنے کا موقع ملا تھا اور وہ صرف سرسری نظر سے ہی سرزمین چین کو یہاں وہاں سے دیکھ پائے تھے۔ اس کے برعکس کوکب خواجہ نے تین سال قیام کیا ہے اور اس قیام کے دوران نئے چین کی زندگی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کو بہت قریب سے دیکھا۔ اس لیے ان کے سفرنامے کا رنگ و روپ جداگانہ ہے''۔(۳)

۱۔ کوکب خواجہ بحوالہ سابقہ ص ۵۷

۲۔ ایضاً ص ۷۶

۳۔ فتح محمد ملک فلیپ نی ہاؤ

بسنت کا میلہ ہو یا مذہبی آزادی کا تذکرہ۔ چینی ہیر رانجھا ہو یا لالین کا میلہ۔ کوکب خواجہ پاکستانی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو چینی زندگی کے مشاہدات و تجربات کے ساتھ شیر و شکر کرتی چلی جاتی ہیں۔ اس سے بیانیہ کی دلچسپی دو چند ہوگئی ہے۔ انہوں نے زندگی کو ایک سیاح کے انداز میں نہیں نہیں دیکھا بلکہ ایک محقق کے تجسس کے ساتھ بھی پرکھا ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ وہ یہاں کے پہاڑوں، دریاؤں، وادیوں کے ساتھ ساتھ مارکیٹوں، شاپنگ ہوٹل، پلازا، سفارت خانے غرض کہ ذرے ذرے کے بارے میں یوں لکھتی اور دیکھتی ہیں کہ شاید زندگی میں دوبارہ مواقع نہ ملے اور یہ بھی اس وجہ ہے کہ عورت ہونے کے ناطے وہ نسائی رنگوں میں یوں جذب ہوگئیں کہ ہر چیز کو آنکھوں کے راستے من میں سمولیا۔

مجموعی طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ مشاہدہ و مطالعے کے ساتھ اس میں اسلوب کے دلکش نمونے ملتے ہیں۔ مرد سفرنامہ نگار اپنی محبتوں اور فتح مندیوں کا ذکر سے سفرنامے کو لمبا کر دیتے ہیں لیکن کوکب کے ہاں خوبصورت اور دلکش عورت ہونے کے باوجود خود ستائشی کا رنگ کہیں نظر نہیں آتا۔ انہوں نے زندگی کے رنگوں کو نسائی آنکھ اور مردانہ وار مقابلہ کر کے جانچا، پرکھا اور پرتا ہے۔ ان کے الفاظ نسوانی رنگ کی بجائے ادبی مزاج کی عکاسی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فرخندہ جالی (گرین کارڈ)

سفرنامہ زندگی کا ایک خوشگوار عنصر ہے۔ زمانہ قدیم سے لیکر آج تک سفرنامے مختلف ممالک کی تہذیب و تمدن، مذہب، ثقافت، تاریخ اور معاشرت کو بیان کرتے رہے لیکن گزشتہ دہائی میں معلوماتی سفرناموں کے ساتھ سیاسی اور روحانی مسائل پر مشتمل سفرنامے لکھنے کا رواج ہوا۔

فرخندہ جالی کا سفرنامہ ناول اور افسانے کی طرز کا سفرنامہ ہے۔ جس میں کردار اور واقعات کے ذریعے سفر کا احوال بتایا گیا ہے۔ کرداروں کے ذریعے معاشرتی رویوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ مرزا ادیب لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر فرخندہ جالی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے گرین کارڈ کے حصول کی خاطر آغاز یا انجام جو مسلسل جدوجہد کی جاتی ہے۔ اس کی ساری روداد حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کردی ہے۔ پڑھنے والے کی نظروں سے اس جدوجہد کا کوئی گوشہ، کوئی جہت اور کوئی صورت بھی پوشیدہ نہیں رہتی۔ یہ روداد جہاں بہت دلچسپ ہے وہاں عبرت ناک بھی ہے''۔ (۱)

فرخندہ جالی کے اس سفرنامے کے بارے اہم بات یہ ہے کہ اس ناول نما سفرنامے کے بارے میں اختلاف رائے موجود رہی ہے۔ کسی نے اس کو ناول قرار دیا اور کسی نے اسے سفرنامہ بلکہ اس کا ٹائٹل ''گرین کارڈ'' اور نیچے ناول بھی لکھا ہوا ہے۔ لیکن مرزا ادیب جیسے اعلی اور کہنہ مشق ادیب نے بڑی خوبصورتی اور مئوثر انداز میں اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں۔

'' یہ ایک مشاہداتی سفرنامہ ہے مگر یہ ایک باطنی سفرنامہ بھی ہے۔ مصنفہ نے صرف وہی کچھ نہیں دکھایا ہے جو اس نے اپنی چشم بینا سے دیکھا ہے۔ بلکہ ان وادیوں کی بھی سیر کرائی ہے۔ جو اس کے کرداروں کے دلوں کی گہرائیوں میں آباد ہیں''۔ (۲)

یوں تو اس ناول اور سفرنامے کے حدود ایک دوسرے سے ملا دیئے ہیں لیکن یہاں اسی حقیقت سے

۱۔ مرزا ادیب فلیپ، گرین کارڈ از فرخندہ جالی س۔ن

۲۔ ایضاً

صرف نظر نہیں کرنا چاہیے کہ اس نے یہ کام فن کارانہ طریقے سے کیا ہے۔ نہ تو ناول کی اساسی خصوصیات مجروح کی ہیں اور نہ سفرنامے کے اجزائے ترکیبی کو فراموش کیا ہے۔ گرین کارڈ جہاں بہت دلچسپ ناول ہے وہاں بڑا دلآویز سفرنامہ بھی ہے۔

مرزا ادیب کے بیان سے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ ناول نما خودنوشت سرگزشت پر مشتمل خوبصورت سفرنامہ ہے۔ جو اپنے اندر بہت سی خصوصیات لیئے ہوئے ہے۔ جسکا غالب حصہ دیارِ غیر کے مشاہدات، تجربات اور واقعات پر مشتمل ہے۔ اس میں فرخندہ نے حیات کے بہت سنجیدہ، چٹکیے اور پہلو دار لمحوں کو بھی بڑی خوبصورتی سے احاطہ کیا ہے۔ اس کا ٹائٹل پورٹریٹ تاریخی حوالوں اور مختلف جگہوں کے مناظر کے ساتھ بڑی دلکش اور جاذبیت سمیٹے ہوئے ہے۔ جو شاید ان کے مجازی خدا ''جالی'' کی تخلیق ہو۔

یہ صرف ایک سفر کی داستان نہیں۔ محبت کی انمٹ لمحات کی تلاش میں خود سراب ہو جانے والوں کی داستان بھی ہے۔ یہ صرف زمین، پانی اور ہوا کا سفر نہیں۔ یہ زندگی کا سفر ہے۔ کڑوا، کسیلا، سفر۔ فرنگی تہذیب میں خود فرنگیوں کے درمیان رہ کر بیتے لمحات کو اپنی تہذیب کے ساتھ Relate کرنے کا سفر اور اس میں مردوں کے کھوٹ کا اور جھوٹ بول کر جنسی عیاشی کے لیے عورت کو استعمال کر کے پھینک دینے کا مشرق کا سچ ''گرین کارڈ'' ہے۔ ڈاکٹر فرخندہ حالی نے نعمان کے کردار کے ذریعے پاکستان کے ان لڑکوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو گرین کارڈ حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کے قانونی و غیر قانونی حربے استعمال کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ پاکستانی ماں باپ ہیں جو امریکہ یں تلاش و معاش کے سلسلے میں چلے تو جاتے ہیں لیکن پھر بیٹیوں کے رشتوں کی وجہ سے مجبور ہو کر پاکستان لوٹے ہیں اور ان پڑھ، بے روزگار اور خوبصورت شریف لڑکوں کی تلاش میں ذات پات کو ختم کر کے صرف لڑکا تلاش کرتے ہیں۔

بہر حال اس کے علاوہ انہوں نے نیویارک کا مشاہدہ ادیب کی مخصوص، جذباتی، ذہنی کیفیت سے کیا ہے۔ وہ زندگی کے خارجی پہلوؤں کا مشاہدہ اسطرح سے کرتی ہیں کہ جذبات و احساسات میں نہ صرف ہلکی سی ارتعاش پیدا ہوتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو ہلچل بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا معلوماتی انداز بھی تاریخ کی کتابوں سے اخذ شدہ نہیں ہوتے بلکہ ان کے مطالعے اور دلچسپی کی گواہی سمیت بھرپور انداز میں سامنے آتے ہیں۔ مثلاً

''۱۹۱۴ء میں ہنری بیکن کی نگرانی میں ڈینیئل چسٹر وغ کا تراشیدہ سنگ مرمر کا عظیم

الشان ابراہیم لنکن کا مجسمہ گویا امریکا کی خود اعتمادی اور دوسری اقوام پر دوستانہ فوقیت ، تدبر کامرانی و اقبال کا سمبل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ مجسمہ آئی ایم داموناک کی منہ بولتی تشبیہ ہے'' (۱)

اس میں بڑی خوبصورت صورت حال اس وقت پیش آئی ہے۔ جب اس میں امریکن نژاد ''سحر'' نعمان سے منگنی کا اعلان کرتی ہے اور بے بس ماں باپ کچھ بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن اس میں نعمان کے حوالے سے تقسیم ہند کے قبل کے مہاراجوں کی اتنی تفصیل یوں محسوس ہوتی ہے جیسے ابن الوقت۔ ''ابن الوقت'' میں نوبل کی دعوت پر کی تھی۔ یہ سب نہ بھی ہوتا تو سفر نامہ دلچسپی سے آگے بڑھ سکتا تھا۔ اسطرح سے انہوں نے ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ اور اس کے اردگرد کی خوبصورت عمارتوں کے بارے میں بڑی وسیع اور تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔ مثلاً

'' راکفیلر سنٹر کے برابر سینٹ پیٹرکس کھیتڈرل ہے دونوں کے جنوباً نیویارک پبلک لائبریری ہے۔ پھر شمالاً سنٹرل پارک، اس کے آگے میٹروپولیٹن میوزیم آف آرٹ۔ اسے سے ملحقہ سنٹرل پارک کے مغربی جانب نیویارک مکوز اور لنکن سنٹر ہیں۔ یہ دونوں عمارات ستاون سٹریٹ سے بہترویں سٹریٹ پر واقع ہیں''۔ (۲)

اس طرح سال کے تمام مہینوں اور ان کے ساتھ اہم واقعات کی تفصیل بھی بڑی دلچسپ ہے۔ اس کے علاوہ پکاسو کے فن پاروں کا ذکر ہو یا ڈائریکٹر ایلفرڈ ہچ کی پینٹنگز کا ذکر۔ انہوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ان معلومات کو قاری تک پہنچایا ہے لیکن وہ معاشرتی رسمیں بھی اگنور نہیں کرتیں۔ مثلاً نعمان کی شادی کی تفصیلات کو بڑے دلچسپ انداز میں اور خاص طور پر شیری کی سہیلیوں کی روداد اور شادی کی ہنگامہ خیزیاں ان کی نظروں سے چھپی نہیں۔

فرخندہ نے خارجی فطرت کے حسن اور توازن کو بھی منعکس کیا ہے۔ مثلاً وہ خوبصورت چیزوں کا یوں بیان کرتی ہیں۔ ''گریٹ فائر پارک'' میری لینڈ واشنگٹن ، ڈی۔سی۔ سے چوبیس کلومیٹر کے فاصلے پر میکارتھر یلے وارڈ کے آخری سرے پر واقع ہے۔ اس کے سرسراتے ، طرف آمیز آبشاروں کے لیے پانی حسین دریا کے پوٹو مال سے آتا ہے۔ لکڑی سے بنائی گئی خوبصورت روشیں اور جا بجا لکڑی کے سحرزدہ پل کا کمال

۱۔ فرخندہ جالی بحوالہ سابقہ ص ۷۹

۲۔ ایضاً ص ۱۴۴

فسوں کاری سے دائیں بائیں نازک اندام بیلوں اور سنبل ونسترن لالہ وسمران اور سوسن سے ڈھکے ہوئے ہیں۔
ایک اور جگہ حسن کو نوک قلم سے یوں مقید کرتی ہیں:

''گلستانوں پر لیلائے شام گیسو بکھرائے خراماں خراماں آگے بڑھنے لگی۔ آسمانوں پر شفقی ارغوانی کانسی، اودی قرمزی اور تاریخی رنگوں میں پھوٹ پڑی اور آبشاروں سے چھینٹے اڑاتے قطروں میں یہ خوب صورت رنگ گھل گھل گئے تو فضا میں رنگ برنگی موتیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی''۔ (۱)

ان کے اس انداز بیان مثنوی سحر البیان اور گلزار نسیم والا اسلوب جھلکتا ہے یوں لگتا ہے۔ جیسے لکھنو کے کوچہ وبازا میں مثنوی پڑھنے کا سماں باندھ دیا گیا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس تعفن زدہ معاشرے پر نشتر زنی بھی کرتی ہیں کہ جہاں بغیر تحقیق کے شادیاں رچا دی جاتی ہیں اور پھر بڑے دکھ اور کرب کے حالات سے گذرنا پڑتا ہے۔ مثلاً جب سحر نعمان سے شادی کر کے باوجود اس کے نعمان اسے منع کرتا ہے پاکستان نہ جائے کہ وہاں کے ماحول میں Set ہونا اس کے لئے مشکل ہوگا لیکن وہ بات نہیں مانتی تو ایک نیا موڑ سامنے آتا ہے۔

''اس سر بے استقلال و بے ثبات کو میری اب ٹھوکر، نعمان اچانک مجھ پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی۔ ہائے میرے ساتھ محض امریکن گرین کارڈ کی خاطر شادی کی تھی۔ You are as fragile as Dust شکر ہے خداوند عدل کا کہ میری کوکھ میں تمہارا کوئی نومزادہ پرورش نہیں پاسکا جو بعد میں کسی نوخیز خادمہ کو خونی چٹان پھلانگنے پر مجبور کرتا۔ یا وہ بے بال و پر چڑیا جنم نہ لے پائی جو زندگی کی تمام مجبوریوں اور زیادتیوں کے چرکوں کے ساتھ عمر بھر اس کے اندر تہہ نشین ہو جاتی۔ نعمان تمہارا میرا حساب خدائے حسیب نے برابر کر دیا۔ مظلوم خود ہی اس کا انتقام لینے کو آگے بڑھتی ہے''۔ (۲)

سحر نے جس انداز سے نعمان پر طنز کیا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ سب سے انتقام لے رہی ہو۔ اپنے آپ سے بھی اس سنجوگ سے بھی جو ایک حزنیے پر ختم ہوا۔ اور وہ پاکستان میں قید عورت جو صرف نام کی

۱۔ فرخندہ جالی بحوالہ سابقہ ص ۱۲۱
۲۔ ایضاً ص ۲۴۲

منکوحہ تھی اس سے آزاد ہوئی۔ اس کی زندگی کے دو قیمتی سال ضائع ہو چکے تھے۔ کم مائیگی، لاچارگی، بے بسی، کوفت، بے اطمینانی، اذیت اور تنہائی ان سب نے مل کر اس کے اندر ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور وہ خدائے بصیر سے دعا گو تھی کہ وہ ان خود غرض رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑے معاشرے سے نکل سکے۔ وہ خدا سے دعا گو بھی ہے۔

> '' یا خدائے مہربان، تیری عطا کی ہوئی زندگی کس قدر دلفریب ہے۔ اگر یہ دوسروں کی خود غرضیوں کی بھینٹ چڑھ کر خاک میں نہ مل جائے۔ تھینکس سیون! میں نے اب اپنے وجود سے تمام حزن و ملال اور وحشت بھرے دھندلے خاکے نوچ کر باہر پھینک رہی ہوں''۔(۱)

اس سے اس کرب کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ عورت ان دکھوں اور اذیتوں کو بھی برداشت کرتی ہے کہ جس میں اس کا قصور نہیں ہوتا۔ لیکن جذبے اگر بیدار ہوں اور ان میں تھرل ہو جو ایسی تھرل کے لمحات ہی انسان کو مسرت و خطرے سے نوازے ہیں۔ تھرل کی قیمت دنیا کا کوئی سکہ ادا نہیں کر سکتا۔ یہ خزانہ اگر حال میں منعکس ہو جائے تو بربادی کے ساتھ سنسنی اور شگفتگی عود کر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سحر شیری سے زندگی کا فلسفہ یوں بیان کرتی ہیں۔

> '' شیری زندگی کی ٹھاٹھیں مارتی مسرتیں ان گنت ہیں۔ بے پناہ ہیں اور ہمارا دامن ننھا سا ہے۔ اس کے اندر ہم کتنی اقدار سمیٹ پائیں گے؟ دنیا کی حدود غیر محدود ہیں۔ اس وسعت میں ہمیں نوازی گئی چند گھڑیاں اپنے دائیں بائیں اردگرد چند ہی قدم دیکھ پانے کے لیے ناکافی ہیں۔ شیری فرش تا عرش وسیع و عریض کائنات ہے اور ہماری زندگی ایک ذرا سی آب جو''۔ (۲)

اس سفرنامے کی ایک اور خوبی اس کا اسلوب بیان ہے۔ فرخندہ جالی اگرچہ ڈاکٹر ہیں لیکن ادب پر ان کی دسترس بڑی مضبوط ہے۔ اور وہ منظر، ماحول اشخاص، اور موقع کے مطابق الفاظ کا استعمال کرتی ہیں۔ لیکن خوبصورت اشعار نے ان کی نثر کو صوتی اثرات سے بھی مزین کیا ہے لکھتی ہیں۔

۱۔ فرخندہ جالی بحوالہ سابقہ ص ۲۵۱

۲۔ ایضاً ص ۳۶۰

''قسم ہے خدائے رافع کی! جس نے عظیم آسمانوں کو بے ستون تان رکھا ہے۔
قسم ہے خدائے متکبر کی! قسم ہے انسان کی عظمت کی!

آفرینش سے آج تلک ہر وہ انسان جو اپنی عزت و حرمت کے لیے برسرِ پیکار رہا ہے۔ وہ انسان کہلانے کے قابل ہے۔ ایسا نہیں ہوتا تو انسانیت کے ارفع ترین اصول کب کے نیست و نابود ہو چکے ہوتے۔ لہذا

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟

(۱)

فرخندہ کا یہ سفرنامہ عمومی لحاظ سے مشرق کی محرومیوں اور امریکی چمک دمک جو کہ مصنوعی ہے اس کی مکمل عکاسی ہے۔

۱۔ فرخندہ جالی بحوالہ سابقہ ص ۲۴۷

ڈاکٹر فرخندہ جالی (کریڈٹ کارڈ)

کریڈٹ کارڈ فرخندہ جالی کا دوسرا عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے ڈاکٹری کے پیشے سے منسلک ہونے کے باوجود ادب میں اپنی تحریر کے ذریعے ایک خوشگوار اور نرم رو پھوار کا اضافہ کیا۔ ان کے اندر جہاں ادب کی شناسائی اور گہرائی ہے بوہاں ایک موئثر ادیبانہ صلاحیت بھی ہے کہ انہوں نے اپنے مصروف پیشے کے باوجود گرین کارڈ اور پھر کریڈٹ کارڈ جیسی خوبصورت کتابیں ادب پڑھنے والوں کے لیے تحریر کیں۔ اور ان کے اندر وہی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک اعلی درجے کے ادیب محقق اور شاعر میں پائی جاتی ہیں۔ اپنی تحریر کے بارے میں وہ لکھتی ہیں۔

"کسی نے مجھ سے کہا تم ڈاکٹر ہو فقط سائنسی مکالمے لکھا کرو، میں نے جواب دیا میں ادیبہ پہلے تھی ڈاکٹر بعد میں بنی ہوں اور پھر ادب کسی کی میراث نہیں۔ میں نے محسوس کیا ادب کو میری اسطرح ضرورت ہے جیسے میرے مریضوں کو۔ کیونکہ اس آف بیٹ جیٹ ایج میں ادب کو سیچنے کے لیے نیا شعور نئی راہیں اور ارتقائی سوچ چاہیے۔ اب وہی ادب پھلے پھولے گا جو کسی ٹکے بندھے فارموں سے عمل یں نہ لایا گیا ہو"۔ (۱)

جو ادیب اپنے اندر ان صلاحیتوں کو پہچان لے کہ جس کے لئے قدرت نے اسے تخلیق کیا ہے۔ تو دنیاوی رکاوٹیں اس کے راستے میں حائل نہیں ہوتی ہیں۔ فرخندہ جالی نے بھی اپنے ذہن کے چشموں کو خشک کرنے کی بجائے اپنے قلم کی سیاہی سے انہیں تروتازگی بخشی ہے اور قدرتی چشمے کی بجائے اپنے قلم کی سیاہی استعمال کی ہے۔ اور قدرتی چشمے کبھی خشک نہیں ہوتے۔ فرخندہ کا فن بھی لازوال فن ہے کہ جس میں زمانہ اور وقت حائل نہیں ہوسکتے۔ ہمارے ہاں عام روایت ہے کہ امریکہ جا کر ہم احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور وہاں کی ترقی دیکھ کر اور اپنی پستی کا سوچ کر ہمارا رویہ عموماً معذرت خواہانہ ہو جاتا ہے کہ امریکہ واقعی سپر طاقت ہے۔ باقی سب ہیچ ہے۔

۔دوسرا رویہ ہے کہ امریکہ جا کر کہ ہم سفر نامہ ٹائپ کی چیز لکھتے ہوئے مشرق سے اپنی والہانہ محبت کا بار بار

۱۔ فرخندہ جالی کریڈٹ کارڈ فیروزسنز ۱۹۹۲ دیباچہ ص۔ ۴ ۔ ۳

۲۔ ایضاً ص ۱۴۴

اظہار کرتے ہیں اور اسی کاوش میں مغرب کی اچھی اور مثبت قدروں تک کو پس منظر میں چھوڑ دیتے ہیں۔ یا برملا ان سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ مغرب کی مادی اور سائنسی ترقی کو یقیناً پسندیدگی کی نظر سے دیکھنا چاہیے اور مبہوت ہونے کی بجائے خود کاوش کرنی چاہیے۔

فرخندہ کا گرین کارڈ اور پھر کریڈٹ کارڈ دونوں اس بات میں توازن کی اعلیٰ مثال ہیں۔ انہوں نے صرف مشرق کی محبت میں کہیں مغرب کو برا نہیں کہا نہ احساس کمتری کا شکار ہو کر اس میں نقص نکالنے کی کوشش کی ہے۔

امریکہ جہاں راتیں جاگتیں ہیں۔ جہاں دن دگنی رات چگنی ترقی ہے۔ جہاں زندگی رات دن رقص کناں ہے۔ دنیا کے امیر ترین اور دولت مند جہاں پناہ لیتے ہیں۔ جس کی آسائشیں اپنی مثال آپ ہیں۔ جہاں کی سہولتیں بے نظیر ہیں۔ جہاں جا کر چکا چوند روشنیاں دل و دماغ سے اپنوں کی یاد آنکھوں سے، حیا دل سے وفا اور ضمیر کی خلش کو کھو دیتا ہے۔ جہاں پر شب شب برات اور ہر روز روز عید ہے کہ ہر طرف خوبصورت مہ لقا کبوتریاں۔ شراب کباب، جنس غرض کسی چیز پر بھی پابندی نہ ہو۔ ہر چیز آپ کی دسترس میں ہو۔ وہاں غم کیسا لیکن فرخندہ کی دوررس اور حقیقت شناس آنکھوں نے ان چکا چوند روشنیوں میں دلوں کے ان اندھیروں کو تلاش کر لیا کہ جہاں جسم تھرکتے ہیں اور آنکھوں سے ساون بھادوں برستا ہے۔ جسم کسی کی بانہوں میں ہے اور دماغ ہولناک سوچوں کا محور۔ مرزا ادیب اس بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''فرخندہ جالی کی حقیقت شناس نگاہیں ان گھمبیر اور تلخ حقیقتوں تک پہنچ جاتی ہیں جو عام نظروں سے چھپی رہتی ہیں کیونکہ ہر دیکھنے والے کی آنکھیں خوش نما پردوں کے پیچھے پوشیدہ بدنمائی دیکھنے کے قابل نہیں ہوتیں۔ فرخندہ جالی کی نظریں تیز ہیں۔ اس قدر تیز کہ وہ رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ ان میں سے گزر جاتی ہیں اور فرخندہ جالی میں یہ جرئات بھی ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتی ہیں جو کچھ محسوس کرتی ہیں۔ اسے سامنے لے آتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ادب کے ان تقاضوں اور فنی نزاکتوں کو نظر انداز نہیں کرتیں۔ جرات مندی، گہرا مشاہدہ، کردار نگاری میں صداقت کی تلاش اور خوبصورت انداز بیان فرخندہ جالی کی امتیازی خوبیاں ہیں''۔ (۱)

۱۔ مرزا ادیب فلیپ کریڈٹ کارڈ

فرخندہ جالی نے اس خوبصورت ناولٹ نما سفرنامے کی مدد سے امریکہ کی بڑی رنگین تصویر کشی کے ساتھ ساتھ معاشرتی اشعاروں اور معاشی حالت پہ بھی سیر حاصل سفر نے بہم پہنچاتے ہیں۔

''ایجوکیشن من موجی امریکی نسل کے مابین اس کا رجحان سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔انجینئرنگ کے بعد میڈیکل اور میڈیکل کے بعد وکالت مشکل تر زندگی ناگفتہ بہ حالات اکثر والدین کی بے نیازی کے باوجود طالب علموں کے حصول علم کی پیاس نہیں بجھتی۔ اس لیے کہ ان کو کوئی بڑا اسیانا فیڈ نہیں کرتا۔ انہیں خود اپنے پیروں پر مکمل بھروسہ ہوتا ہے۔ کتاب اور ذہن کے مابین کو وہاں کے طالب علم نے ایمانداری کے ساتھ فوقیت دے رکھی ہے تا حال ادھر کتاب کو کلاشنکوف کی نوک پر ٹانگنے کے سسٹم نے جنم نہیں لیا'' (۱)

کس خوبصورتی سے اور بغیر کسی تعجب کے تبصرہ ہے۔ یہی چیز فرخندہ کو عام سفرنامہ نگاروں سے منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

اس طرح فیلی جو اس کی دوست ہے۔ اس کے ذریعے امریکی تہذیب، امریکی سیاحت کے متعلق اپنے آپ کو مورتی کے نام سے شامل کر کے زندہ و جاوید تصویر کشی کی ہے کہ خوبصورت اور بیانیہ مناظر آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ فیل (رافیل) کے جذبات کو اس نے بڑے دلکش انداز میں اسلوب کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ فیل کے شادی کے نقطہ نظر کو یوں بیان کیا ہے۔

''میرے کلاس فیلو ــــــ؟ ان میں سے کسی کے ساتھ شادی کا تصور ہی میرے نزدیک انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ وہ سارے تو آٹھ دس برس مجھ سے بھی چھوٹے ہیں۔ پھر یہاں پر مقیم میرے ہم وطن یہ تھوڑدلے منافق جھوٹے لوگ ــــــ ان کی تقدیر میں اب تا زیست اپنی اپنی ذات کے خول کے اندر گھٹے رہنا لکھ دیا گیا ہے۔اری ان کا تو ذکر خیر ہی کیا قعر مذلت میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرکھپ جائیں گے مگر میرے جیسی اور ایجوکیٹیڈ لونڈیا کے لیے پروپوزل بھجوانے انہیں سو سو لاج نہ آئے گی۔یہ بوگس ریا کار ملمع ساز ــــ'' (۲)

اسطرح سے ورجینیا کے غاروں کی تفصیل اس کی سجاوٹ اس کی تاریخ، بلندی، راستے ہوٹل گاؤں، خاص طور پر ایش ولیج وہاں کے سامان تاریخی پنسلوینیا فارم میوزیم غرض ہر چیز کی تفصیل یوں بیان کی ہے کہ منظر

۱۔ فرخندہ جالی کریڈٹ کارڈ ص ۱۱

۲۔ ایضاً ص ۱۹

زندہ ہو جاتا ہے۔

وہاں بلکہ اب تو یہاں بھی خاص بیماری کہ جس کی وجہ سے رافیل اپنے شوہر کو جھوٹا، کمینہ، دغا باز، گھٹیا، بے حیا، اٹھائی گیر، لوفر۔ لفنگا تک کہہ اٹھتی ہے۔ اس جذباتی کیفیت کا احساس عورت ہونے کے ناطے اور رافیل کی بے بسی کو جسطرح فرخندہ نے محسوس کیا ہے۔ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس طرح سے بڑا آدمی میں عورت کے جن جذبات و احساسات کی عکاسی کی گئی ہے وہ نسائیت ہی کا کام ہے۔ کیونکہ مرد چاہے جتنا بھی مطالعہ اور مشاہدہ کر کے عورت کے نزدیک آ جائے وہ کرچی کرچی ہوتی ہوئی اس سوچ کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا کہ جہاں عورت روز مرتی ہے اور جیتی ہے۔ ''الینا'' جو اس افسانے کی ہیروئن ہے وہ ایک بڑے آدمی سے صرف اس لیے شادی نہیں کرتی وہ اپنے ارد گرد جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو اکھٹا کئے رکھتا ہے لیکن پھر یہی مولوی سمیع اللہ کے بیٹے رفیع اللہ کو اپنا جیون ساتھی بنا لیتی ہے جس کا موٹا بھدا ڈس فگر بے ڈھنگی توند ہے۔ وہ اپنی قصیدہ خوانی یوں کرتے ہیں۔

> ''بس جی خداوند کریم کی برکت ہے۔ کچھ اپنے خزانہ میں سے ہمیں بھی نواز دیا ہے۔۔۔۔۔تو میں انہوں نے جاری رکھا بس کچھ نہ پوچھیئے فیکٹری میں۔۔۔۔۔۔ آفس میں۔۔۔۔۔۔کلب میں یارٹیوں میں کسطرح حسین لڑکیاں پروانوں کی طرح منڈلاتی ہیں ۔ مابدولت جس عقل کو رونق بخشیں راجہ اندر کا اکھاڑہ بن جاتا ہے۔''(۱)

یہ کردار بھی صفراز کے کردار کا عکس ہے۔ ان کا مشہور و معروف افسانہ جو انہوں نے سلطان باہو کے نصف مصرعے دل دریا سمندروں ڈونگے کے پس منظر میں تحریر کیا ہے۔ ممانی کے کردار کے ذریعے تمام عورتوں کی بے بسی صبر و تحمل کہ جو اپنے ظالم شوہر کی خدمت اپنا فرض سمجھ کر کرتی ہیں۔ بچوں کی پرورش اور آنگن میں کھلے پھولوں کی پرورش وہ ایک ہی جذبے سے کرتی ہیں لیکن بے حیلہ و بے مراد کہ سرہانے کے سانپ کی طرح خاوند بھی جب چاہے اسے ڈس لیتا ہے اور اولاد بھی جوان ہو کر آنکھیں دکھاتی ہے اور عورت کی زندگی دو سسکیوں کے درمیان گزر جاتی ہے کہ عموماً عورت کا بڑھاپا اس کا طبعی عمر کا نہیں ہوتا۔ بلکہ دن رات کی کھٹن مشقت ماحول کی ناانصافیوں، زندگی کی بے کیفی اور قدرت کی ستم ظریفی سب نظر آتی ہے۔

۱۔ فرخندہ جالی ص ۶۵

فرخندہ

اسلوب کے لحاظ سے فرخندہ جالی کا اسلوب بڑا کامیاب، مؤثر اور معاشرے کی حقیقتوں کو اپنی گرفت میں لینے والا ہے۔ خوبصورت اور دلکش چھوٹے چھوٹے فقروں میں بے پناہ گہرائی پائی جاتی ہے اور بعض جملوں سے بھرپور نسوانیت جھلکتی ہے۔ مثلاً

''ادھر وقت بے حد و حساب ظالم ۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔ برسہا برس کی برسائیں تنہا ہی بیت چکی ۔ مون سون میرے شہر کے اوپر سے نہیں گذرا۔ کرنیں بن بادل برسات ہوا کرتی ہے۔ یا پھر ڈاکٹری کی جھلک نظر آئی ہے۔ اس لیے تو ہر کھال کے اندر دھوکے کو اپنی قوت تخیلہ کے زور پر ایکسرے کر ڈالتی ہوں۔ لہذا ابلا تاخیر جھوٹے کو جھوٹے کے گھر تک پہنچا آئی''۔ (۱)

فرخندہ نے عورت کے کرب کے اظہار کے لیے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ کسی مرد کے بس کی بات نہیں۔ مثلاً

''یہ ہاتھ اس گھر کے اندر پہلے روز ہی ننگے کر دیئے گئے تھے جبکہ ان کے سارے گہنے نوچ لیے گئے تھے اور آج بھی یہ خالی ہیں۔ ان ہاتھوں نے تم سے کچھ نہیں مانگا تھا اور تم نے انہیں کچھ نہیں دیا۔۔۔!!!۔ میں نے اپنا فرض سمجھ کر اپنی زندگی کا ہر لمحہ تمہاری اور تمہارے باپ کی خدمت کی اس نے بدلہ میں میرے ساتھ ایک زرخرید لونڈی سے بھی کم تر سلوک روا رکھا مگر تم میری اولاد میری عمر بھر کی تگ و دو کے بدلے محض مجھے میرا مقام بھی نہ دے سکے۔'' (۲)

ایسا خوبصورت، احساسات کا تجزیہ مرد تو مرد شاید عام عورت کے بس کی بھی بات نہیں۔ اس لیے ان کا اسلوب اپنے اندر دردمندی اور نسائی دکھوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

کہ دکھ شاید عورت کی وہ ردا ہے جو اسے اوڑھنی ہی پڑتی ہے کہ عورت ترا نام ہی دکھ، کرب، اذیت کا ہے۔ اور کبھی اگر کسی اونچے سنگھاسن پر بیٹھی عورت مسکراتی ہوئی بھی نظر آئی تو شاید اس کی آنکھیں اس کا ساتھ نہیں دیتی کہ آنکھیں وہ دروازہ ہیں کہ نیم وا ہو تب بھی اندر کی ساری کیفیت اس کے چلمنوں کی پھڑپھڑاہٹ سے بھی ہو جاتا ہے۔

۱۔ فرخندہ جالی — بحوالہ سابقہ — ص ۱۷

۲۔ ایضاً — ص ۲۰

ڈاکٹر فرخندہ جالی (پرایا سفر)

ڈاکٹر فرخندہ جالی ''پرایا سفر'' سے پہلے ''گرین کارڈ'' اور ''کریڈٹ کارڈ'' لکھ چکی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ محبوب کے گھر کی طرح وہ بار بار امریکہ جا کر اسے نت نئے زاویوں سے دیکھنے اور اس کی چکا چوند سے متاثر ہونے کی بجائے اور وہاں کی رنگینیوں میں گم ہونے سے زیادہ وہاں کے زخموں پر ڈاکٹری نقطہ نظر سے مرہم رکھنا چاہتی ہیں۔ وہ امریکہ کے باسیوں اور گرین کارڈ حاصل کرنے کی جستجو میں اپنی برسوں کی کمائی اور شہرت کو داؤ پر لگانے والے معصوم لوگوں سے ہمدردی رکھتی ہیں۔ ان کی آنکھیں جلوہ دانش فرنگ سے خیرہ نہیں ہوتیں۔ وہ وہاں بھی انسان دوستی اور اخلاق کے اعلی معیار کی متلاشی ہیں۔ اسی تلاش وجستجو میں وہ ایک محقق کی طرح صرف زخموں کو کرید کر نہیں چھوڑتیں بلکہ ان گہری روٹس کو بھی ختم کرنے کی خواہاں ہیں جو یہاں کے معاشرے کو دلدل کی طرح اپنے گھن چکر میں لپیٹ لیتی ہیں۔ وہ ظلم کی جگہ محبت اور حیوانیت کی جگہ انسانیت کی حمایت کرتی ہیں۔ ان کا یہ سفرنامہ پانچ مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ لیکن ان عنوانات کا موضوع ایک ہی ہے۔ امریکہ کی سماجی زندگی اور ان کے اثرات۔ ڈاکٹر اے آر خالد صاحب لکھتے ہیں۔

> ''ڈاکٹر فرخندہ جالی نے جس طرح امریکہ کے سماجی ڈھانچے کے روگ پڑھے ہیں۔ ان کی معاشرتی بیماریوں کو دیکھا ہے۔ اس پر گمان گذرتا ہے کہ انہیں افراد کے ساتھ معاشرے کی بیماریوں کا بھی پورا ادراک ہے۔ ان بیماریوں کی تشخیص کرنا جانتی ہیں اور اگر کوئی روبہ صحت ہونے کا خواہاں ہو تو ڈاکٹر صاحبہ شفایابی کا نسخہ بھی تحریر کرسکتی ہیں۔'' (۱)

ہمارے مشرق میں اور خاص طور پر پاکستانی ''گرین کارڈ'' اور امریکہ جانے کا اتنا خواہش مند ہے کہ خواہ اس کے لئے اس کو اپنی عزت و ناموس بھی داؤ پر لگانی پڑے اور وہاں جا کر گوروں کے باتھ روم ہی کیوں نہ صاف کرنے پڑیں۔

''پرایا سفر'' کی ابتداء میں فرخندہ جالی نے بڑی خوبصورتی سے پروین شاکر کے ایک ہی شعر میں اس

۱۔ ڈاکٹر اے۔ آر۔ خالد دیباچہ پرایا سفر از فرخندہ جالی فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ ۱۹۹۷ .. ص۔ ۸

کی بھر پور عکاسی کر دی ہے کہ ظلم سہنا بھی ظالم کی پشت پناہی اور حمایت کے مترادف ہے اور اس کا احساس مختلف مواقع پر مختلف ہوتا ہے کہ جو نا قابل فہم اور نا قابل بیان ہے۔

''زرین بہن کا والہانہ استقبال دیکھ کر اور اتنا پر جوش اور گرم خوش آمدید دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھی کہ شاید صدیوں سے اس کی بہن اس کے لئے ترس رہی تھی لیکن جلد ہی اسے احساس ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے لئے نہیں بلکہ اپنے گھر اور بچوں کی وجہ سے اسے سپانسر شپ کا دھوکہ دے کر اسے گھریلو ملازمہ تصور کرتی ہے اور کیسے کڑوی گولی، الفاظ کے میٹھے بولوں میں لپٹ کر ماری جاتی ہے کہ جسے نگلنا اور اگلنا دونوں مشکل'' باجی آپ لوگ تھوڑا تعاون کریں تو کون سی قیامت آ جائے گی۔ باجی پلیز ذرا ذوق شوق کے ساتھ امریکی ڈنر تیار کر دیا کریں ۔۔۔۔ یہاں کے مصروف شوہروں کے لیے ڈنر کا طعام کرنا ایک طرح کا خوش آئندہ ترین روز مرہ کا معمول ہے۔۔۔۔ اگر میز پر اس کی مرضی کے مطابق گرما گرم پکوان نہ ملے تو مرد تندخوئی کا اظہار تو کرے گا اور تم سے دیڑھ درجن فراکوں پر ڈھنگ سے استری پھیری نہیں جاتی۔۔۔۔۔۔۔ وہ تینوں اس کے منہ سے گرتے زہریلے الفاظ کو بے دلی کے ساتھ پکڑنے کی سعی میں گم سم سے بیٹھے رہے۔ اس حقیقت کا ان کو زندگی میں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ادھر امریکہ میں اپنے سگوں پیاروں کے گھر بطور مہمان ٹھہرنا کس قدر مقام عزت ہے۔''(۱)

اگلا عنوان خدائی خدمت گار ہے جو امریکی معاشرے پر ایسا زہرناک طنز ہے کہ اگر کوئی ذی شعور شخص کھلی آنکھ اور گہری نظر سے اسے پڑھ لے تو شاید کبھی امریکہ جانے کا نام نہ لے۔ امریکہ یہاں کالے، گوروں، مہاجرین اور ماں بچوں سب کے حقوق کا انسانی پرچار کیا جاتا ہے۔ دراصل ہر قسم کے حقوق سے غافل ہے۔ وہاں ماں کو بچے کی بڑوں کو چھوٹوں کی، رشتہ دار کو اپنوں کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ ہر طرف بے مروتی اور سیکس ہے کہ جس کی وجہ سے نئی نسل ''گے'' بن رہی ہے اور پرانی نسل اس وقت کو رو رہی ہے جب آزادی کے چکر میں اس نے رشتوں کے تقدس ختم کیا اور آج بچے سے لیکر بوڑھے تک لا پرواہی، بے نیازی، سرد مہری کی وجہ بیمار اور بے کس ہیں کہ جن کی اولاد مشینی انداز میں صرف مدرز ڈے پر چند لمحے نکال کر پھولوں کے

۱۔ فرخندہ جالی پرایا سفر ص ۴۸

گلدستے اور تحفے تحائف دے کر صدیوں کی ممتا کی پیاس کو لمحوں میں بجھانا چاہتے ہیں اور جوان سائنس کی ترقی سے نالاں ہیں کہ جہاں نسائی اوسط عمر میں اضافہ کیوں ہوا۔ لاوارث بوڑھی ماؤں کے گھر بدبودار ہیں لیکن یہ سب کیوں ہے۔ اس لیے ۔

''امریکی زندگی کے گنجلک بڑے طویل ہیں۔ مارٹ گیج، کریڈٹ کارڈ اور گاڑی کی اقساط کی ادائیگیاں، ناشتہ میں جے ٹوسٹ، ڈیلینگ سالہا سال میں ایک آدھ بچے کی پیدائش اور پھر نگہداشت کے اٹھارہ سالہ کھٹن ترین مراحل، سویرے سویرے بیوی سے لڑائی اور گاڑی کے انجن کے ساتھ ہاتھا پائی پارک وے کی جام ٹریفک، جاب پر تاخیر، باس کے بگڑے تیور،'' (۱)

یہ سب انسانوں کو ایک متوازن انسان کے روپ میں پیش نہیں کرتا۔ لیکن ان کے درمیان والنٹیئر اور رفاعی ادارے بہت خدمت کر رہے ہیں۔ جو مختلف آرگنائزیشنوں اور پبلک فنڈ از کی بدولت نہ صرف کہ عام انسانی زندگی میں مسکراہٹیں بکھیرتے ہیں بلکہ ان کے لیے صحت وصفائی کے ساتھ گھروں کی تعمیر کا بھی کام کرتے ہیں۔

تیسرا عنوان ہے چوہترویں (۷۴) گلی جیکسن ہائیس جو کہ پاکستانیوں میں اپنے کلچر اور ہم وطنوں کی وجہ سے مقبول ہے۔ یہاں پر آفتاب اور قدیر بٹ جیسے لوگ نیویارک سٹیٹ، اٹارنی سرٹیفکیٹ حاصل کر کے اپنے ہم وطن بھائیوں کی مہنگے داموں خدمت کرتے ہیں۔ لیکن شوخی تقدیر کی ایک بم دھماکے کی وجہ سے دونوں کو سزا ہوئی۔ اور لائسنس الگ ضبط کر لئے گئے۔ کیونکہ تقدیر کے فیصلے چالاکیوں سے نہیں ہوتے کہ تقدیر کی ڈور کسی جیکسن ہائیس کی عمارت سے اونچی بہت اونچی جگہ پر مقیم اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اس سفرنامے کا سب سے زیادہ دل ہلا دینے والا حصہ ''ایک بنگلہ بنے نیارا'' ہے۔ کہ جس میں چوہدری فیض جیسے بھولے بھالے آدمی پاکستان میں صدیوں سے ہی ساکھ کو امریکہ کی چکا چوند میں بمعہ اپنے تیرہ عدد خاندانی ممبرز کے ساتھ فلشنگ میں کرایہ کے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ اور یہاں چوہدری فیض علی کی جدی جائیداد اور کثیر سرمائے سے دو سٹور خرید کئے گئے لیکن جو تباہی ان کے خاندان نے یہاں آ کر بغیر سوچے سمجھے خریداری پر کی۔ اس کی وجہ سے جلد ہی انہیں واپس لوٹنا پڑتا ہے کیونکہ امریکی نسل پاکستانیوں سے بہر طور زیادہ شاطر اور چالاک ہے۔ فرخندہ جالی زندگی کے مخصوص خارجی پہلوؤں کا مشاہدہ اس انداز سے کرتی ہیں کہ ان کی ذہنی کیفیات مواد کے ساتھ یوں مدغم ہو جاتی ہیں کہ جیسے سب ان پر گزر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چوہدری فیض علی کی فیملی کا برا حال دیکھ کر بہت پشیمان ہوتی ہیں اور جب پاکستان کے امیر خاندان وہاں سب کچھ لٹا کر

۱۔ فرخندہ جالی پرایا سفر ص ۱۳۱

پاکستان آنا چاہتے ہیں۔ تو ان کے پاس چند ہزار ڈالر بھی نہیں ہوتے کہ واپس کے ٹکٹ ہی لے لیں تو فرخندہ ان کی پشیمانی اور خفت کا حال کچھ یوں لکھتی ہیں۔

''اف وہ گھڑی جب وہ گھڑیاں بھرپور روپیہ پیسہ امریکہ لاتے تھے۔ کس قدر طمطراق کے ساتھ اور اب وہ بالکل خالی ہاتھ اس سرزمین کو چھوڑ رہے ہیں۔ امریکی بینک کارڈوں اور سٹوروں کے ڈالر کے قرضہ کے جوانبار ان کے سر اجب الادا ہیں۔ ایک سینٹ ادا کیئے بنا یہ لٹے پٹے بھولے پردیسی الٹا چوروں کی مانند اس چکا چوند دھرتی سے کھسک رہے ہیں۔ یہاں جہاں ان کی آخری پونجی تک شعوری یا لاشعوری طور پر انہوں نے از خود دوسروں کی نوچھا کھسوٹی کے حوالے کر دی ہے۔ جس کشش سراب نے ان کو شاہ سے گدا کر کے چھوڑا۔ آج وہ اسی کے مجرم تھے۔'' (۱)

اور آخری عنوان رولر کوسٹر ہے۔ یہ رولر کوسٹر وہ گھن چکر ہے کہ جس کے اندر جا کر بچارا پاکستانی اس یں سے نہ نکل سکتا ہے اور نہ اسے چھوڑ سکتا ہے۔ یہی حال راجہ .... کا ہوا کہ جو انتہائی ذہن اور کاروباری سمجھ بوجھ کا مالک تھا لیکن وہاں جا کر اپنے ماما اور ایک انگریز لڑکی ٹارا کی بدولت اپنی ساری دولت کھو دیتا ہے۔

اس سفرنامے کی خاص خوبی فرخندہ جالی کا اسلوب ہے۔ کیونکہ ادیب کے مخصوص خیالات، احساسات ہی سفرنامے کو رنگینی وتنوع بخشتے ہیں۔ ورنہ امریکہ جانے والا ہر شخص امریکہ کے بارے میں اپنی معلومات بہم پہنچانا اپنی پہلی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ لیکن فرخندہ کا انداز انوکھا، نرالا اور دل تک اتر جانے والا ہے۔ ڈاکٹر خالد صاحب لکھتے ہیں۔

''مصنفہ کے اظہار کا قوی طاقتور اور سچا انداز اس مسئلے کی سنگینی اور مغرب کے آج کے امام امریکہ کے دوغلے پن کو جسطرح عیاں کرتا ہے۔ اس پر پرایا سفر کے قارئین ایک ہی مرکز پر کھڑے نظر آئیں گے۔ ڈاکٹر فرخندہ جالی کا انداز اپنا ہے۔ جو دوسروں کے لئے دل پذیر ہے وہ لفظوں کی جادوگری کو بھی اپنے سر چڑھ کر بولنے کی جسارت نہیں کرنے دیتیں۔۔۔۔۔۔ بے تکلفانہ انداز اور بے ساختہ پن مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے اور یہ دونوں رویے اس سفرنامے میں موجود ہیں۔'' (۲)

۱۔ فرخندہ جالی بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۵۳
۲۔ ڈاکٹر اے۔ آر۔ خالد، دیباچہ پرایا سفر ص۔ ۹

اسلوب ہمیشہ موضوع اور مواد کے تابع ہوتا ہے۔فرخندہ کا اسلوب تکرار کا رنگ نہیں رکھتا بلکہ مقام اور جگہ کی یکسانیت کے باوجود ان کے اسلوب میں اچھوتا پن نظر آتا ہے۔مثلاً

''کرسمس نے نیویارک کے بند بند کو جکڑ رکھا تھا۔ زمین وزمان فرش تا عرش جب کرسمس کے چیختے چلاتے رنگوں اور برقی وتجلی کی سنوارا اپنے عروج بھی تھی کرسمس پر شام چھانے لگی۔کرسمس کی آخری کلبلاہٹ رات بھر جاری رہنے کے بعد اگلی صبح دم توڑ گئی۔اچانک سب چوپٹ'' (۱)

یا پھر امریکہ کے ان خاص جنون کا ذکر کرتے ہوئے کہ جہاں وہ دن رات محنت کر کے روپیہ کماتے ہیں لیکن ویک اینڈ پر یا اپنی کسی خواہش پر یوں لٹا دیتے ہیں کہ جیسے یہ ان کی کمائی نہ ہو بلکہ کسی سے چھینی ہوئی ہو۔ فرخندہ لکھتی ہیں۔

''موسم گرما کے شرع ہوتے ہی فرد واحد کو اس بات کا غم کھانے لگتا ہے کہ وہ دوسری کی نسبت زیادہ گورا کیوں ہے ہے تا عجیب! کالے امریکیوں کے ساتھ صدیوں کا تعجب اور منافر محض ان چمڑی کی رنگ کی بنا پر ہے تاہم گورے اپنے گورے پن سے نجات پانے کی خاطر سالانہ ۴۴۵۰۰ ملین ڈالر ٹیننگ لوشن وغیرہ پر خرچ کر ڈالتے ہیں۔ (۲)

''عطاالحق قاسمی لکھتے ہیں''فرخندہ کے ہاں وہ روحانیت اور لفظوں کا سستا پن بھی نظر نہیں آیا۔جس کے نتیجے میں ادب میں خواتین ادیبوں کے برتن الگ کر دیئے گئے ہیں''۔ (۳)

ادب اور ادیب ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن سفر اور قاری کے ساتھ ساتھ سیاح کا ہم خیال ہونا بھی بہت ضروری ہے ہم فرخندہ جالی کی اس تصویر سے جو انہوں نے امریکی معاشرے کی بتائی ہے۔متفق ہیں یہی وجہ ہے کہ فرخندہ کا اسلوب زندہ اسلوب ہے اور ان کی نثر کی روانی آزاد کی طرح شعری روانی ہے کہ جس میں ایک بات کو سو طرح بیان کرنے کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

۱۔ فرخندہ جالی بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۰۸

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۵۲

۳۔ عطاالحق قاسمی فلیپ پرایا سفر

بلقیس ریاض (بحر ظلمات سے آگے)

''بحر ظلمات سے آگے'' بلقیس ریاض کا سفر نامہ ہے کہ جن کا نام پڑھتے ہی یہ خیال آتا ہے کہ آخر اس بڑے سمندر کی تاریکیوں اور اندھیروں کے آگے کیا ہے۔ یہی چیز دیکھنے کی خواہش ہمیں یہ سفر نامہ پڑھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ انہوں نے یہ سفر نامہ بالکل اس انداز میں لکھا ہے کہ جسطرح ماں بچوں کو چھوڑ کر کہیں سفر کرتی ہے تو واپسی پر بچے جہاں اداس آنکھوں میں انتظار کی شمع جلائے ماں کے پیار کے منتظر ہوتے ہیں۔ وہاں وہ اس چیز کے بھی خواہش مند ہوتے ہیں کہ ماں نے سفر کیسے کیا اور راستے میں کن مناظر اور کن لوگوں سے واسطہ پڑا۔ واقعات کو چسکے لے لے کر اور کھانا پکانے کی ترکیب کی طرح کہ اگر اس میں کسی چیز کی کمی رہ گئی تو گھر والے مزے کے کھانا نہیں کھا سکیں گے۔ اسطرح سے انہوں نے سفر نامے میں مکمل جزئیات بالکل سادہ تاثرات کے ساتھ یہ سفر نامہ تحریر کیا ہے۔ اس کی سادگی اور دلکش انداز بیان نے ان لوگوں کے لیے دلچسپی پیدا کر دی ہے جو خود دوسرے ملکوں اور ان ملکوں کے لوگوں سے مل نہیں سکتے اور گھر بیٹھے بٹھائے ان جگہوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں کیونکہ عموماً سفر نامے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سفر نامہ وہ ہے کہ جس کے پڑھنے سے فی الوقع کسی سفر کا تصور ذہن میں ابھرے اور اس میں فن حصہ اور تاریخ ساتھ ساتھ چلیں۔ اس سفر نامہ کا آغاز بڑے ڈرامائی انداز میں ہوا۔

> ''ہم باہر جا رہے ہیں ''کب'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد انہوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا باہر جانا ہے تو مجھے اب بتا رہے ہیں۔ اتنی جلدی میں کیسے تیار ہو سکتی ہوں۔ تم ہو سکتی ہو تو میں نے پروگرام بنایا ہے۔ اتنی جلدی تیار ہونا ناممکن ہے۔ ٹکٹ بک ہو چکے ہیں۔ وقت ضائع نہ کرو۔ شاباش تیاری پکڑو''۔ (۱)

بلقیس ریاض بڑی زندہ دل اور حساس طبعیت کی مالک خاتون ہیں۔ راستے میں ہر عورت کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ کر اسے تسلی دینا پاکستانی عورت کی فطرت کی عکاسی کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ

۱۔ بلقیس ریاض بحر ظلمات سے آگے مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۹۳ ص۔ ۷

ساتھ وہ اردگرد کے مناظر اور خاص طور پر چائے پر بہت توجہ دیتی ہے۔ سارے سفرنامے میں انہیں کہیں بھی چائے کا لطف نہیں آیا۔شاید وہ چائے ڈھ چاہ کے ساتھ پینے کی عادی ہیں۔ اس لئے بار بار پاکستان میں بنے والی چائے اور خاص طور پر ڈرائیور ہوٹل میں بننے والی کڑک چائے تو انہیں بہت یاد آتی ہے اور کبھی کبھی وہ میزبان کے سامنے اس کا اظہار بھی کر دیتی ہیں''۔

''چائے پیوگی؟ نیکی اور پوچھ پوچھ۔

میری اس بات سے اس نے کیتلی میں پانی بھرااور اس کا سوئچ آن کر دیا۔تھوڑے ہی منٹ میں پانی ابلنے لگا۔۔۔۔۔اس نے مگ میں ٹی بیگ ڈالا اور کھولتا ہوا پانی گلے میں ڈال دیا۔۔۔اور بوتل سے ٹھنڈا دودھ ڈالنے ہی والی تھی کہ میں نے کہا پلیز اس کو گرم کرلو اوہ۔۔۔۔۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔۔۔۔کہ تم کھولتی ہوئی چائے پیتی ہو۔ (۱)

عورتوں کی کچھ مختلف قسم کی نفسیات اور دکھ انہیں ایک دوسرے کے قریب کر دینے کا باعث بنتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ رشتوں کی بات کہیں ہو رہی ہو وہ وہاں ضرور حصہ لیں گی اور اپنے اپنے تاثرات بیان کریں گی کہ اللہ توبہ۔ یہاں بھی باجی منیرہ کی پریشانی کا حال کچھ یوں لکھتی ہیں۔

'' میں چاہتی ہوں کہ کوئی فیملی اچھی سی مل جائے تو رشتہ طے کر دو۔ مگر لوگوں کی باتوں سے ڈر لگتا ہے۔سنا ہے کہ پاکستان کے لوگ نہایت ہی کنجوس ہیں۔ میری بٹی کو بہت عمدہ قسم کے بسکٹ کھانے کی عادت۔۔۔۔ وہاں پر کوئی مہمان آئے تو بسکٹ منگواتے ہیں۔۔۔ یہاں پر ان کو ہر اچھی چیز دستیاب ہے''۔(۲)

یہاں دو چیزیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ پاکستان کا تصور سوائے غربت کے وہاں کچھ نہیں ہے۔دوسرا یہ کہ ماں دنیا کے کسی بھی خطے میں ہو بیٹی کی ماں ہو تو اس کی پریشانی اسے ضرور لاحق رہتی ہے۔

بلقیس ریاض کا مشاہدہ بالکل ایسے ہے جیسے عام گھریلو سی خواتین جو کہ بازار جائیں تو دس گرما گرم خبریں اپنے مشاہدے اور کچھ تجربے کی رو سے بیان کریں گی اور کچھ زیب داستان کے لیے بڑھا چڑھا کرتا

۱۔ بلقیس ریاض بحوالہ سابقہ ص۔ ۴۶

۲۔ ایضاً ص۔ ۵۱

کہ ان کی علمیت کا رعب پڑ سکے۔ یہی حال بلقیس ریاض صاحبہ کا ہے۔ جب وہ لندن سے پیرس جاتی ہیں تو وہاں اپنی دوست یاسمین سے پوچھتی ہیں کہ یہاں پاکستانی کیوں کم ہیں تو لسانی مسئلے پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ تو انہیں بہت افسوس ہوتا ہے۔ اس طرح سے یہاں کے ''شاپنگ سنٹر'' بس سٹاپ، سمارٹ عورتیں بکنی پہنے ہوئے مرد وعورت اور بچوں کی آزادی، سب کو وہ کھلی آنکھ سے دیکھتی ہیں اور بیان کرتی ہیں۔

پیرس سے ورسائیسلز جاتے ہوئے اس کا فاصلہ تک بھی بیان کرتی ہیں۔ فن اور تاریخ دونوں کو مدنظر رکھتی ہیں اور بڑی خوبصورتی سے تبصرہ کرتی ہیں مثلاً

> '' اس جگہ کی اہمیت صرف آرٹ اور جمالیات کے حوالے سے ہی نہیں تھی بلکہ اس کی وقعت تو انقلاب فرانس ہے۔ جس کی بدولت دنیا میں آمریت کے خلاف جدوجہد کا سنگ میل رکھا گیا۔ ان محلوں میں لوئیس ۱۴۔ اور ان کے خاندان والوں کا عبرت ناک انجام اور غرور وتکبر کا خاک میں مل جانا، آنکھوں کے آگے گھوم جاتا ہے ۔۔۔۔۔ یہ وہی محل تھا جہاں اکتوبر ۱۹۸۹ کو عورتیں پیرس سے پیدل مارچ کرتی ہوئیں اپنے مطالبات اور مہنگائی کے خلاف گھروں سے باہر نکل آئی تھیں۔ جنہوں نے بادشاہ اور ملکہ کو پیرس پہنچا دیا۔ اور پیرس پہنچنا ہی ان کے عبرت ناک انجام کی ابتدا تھی۔ یہ فرانس تھا ورسائیلز تھا جہاں سے انقلاب فرانس کے لیئے بہت حیثیت رکھنے والے نعرے نکلے جو دنیا کے ہر انقلاب کے باعث بنے آزادی مساوات اور بھائی چارے یعنی ایکویٹی اور فریڈم جیسے عظیم نعرے نکلے۔''(۱)

اس سفرنامے کو اگر منظر نگاری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو متحرک منظر نگاری سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ واقعاتی انداز میں سادہ سی معلومات کہ جن کے ذریعے قاری ان مقامات کی معلومات حاصل کر کے اپنے علم مسلم میں اضافہ کر سکتا ہے۔ اس کو بلقیس ریاض نے اپنے سفرنامہ میں بیان کر دیا ہے۔

جن چیزوں نے، لوگوں نے، اصولوں نے، تعلیم نے، شائستگی نے اور ڈسپلن نے انہیں متاثر کیا۔ انہوں نے دلکش پیرائے میں اسے بیان کر دیا ہے اور جو باتیں جو مناظر ان کے دل میں اترے کوشش کی کہ ان کو بہتر یہ اسلوب میں ڈھال کر پیش کیا جائے۔ بلکہ جو چیز ناپسند ہے اس کی ناپسندیدگی کی وجوہات بھی بیان کر دی ہیں۔

۱۔ بلقیس ریاض بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۸

ہمارے زیادہ تر سفرنامہ نگار اپنی ذات کو پس منظر میں رکھ کر اردگرد کی چیزوں پر زور دیتے ہیں۔ بلقیس ریاض نے اس میں اپنی ذات کو فراموش نہیں کیا بلکہ ان حالات و واقعات کے ساتھ اپنی ذات کو یوں مدغم کیا ہے کہ ذاتی حسیات ہی کی وجہ سے یہ سفرنامہ زندگی سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً اس میں کبھی بیٹے کی محبت کا مرکز ومحور اور کبھی نجی زندگی میں میاں کے ہلکی پھلکی لڑائی میں میاں کو گرویدہ واسیر کرنا اور اپنی ذات کو کسی بھی لمحے فراموش نہ کر کے ہر ایک منظر کا حصہ سمجھنا بلقیس ریاض ہی کا کام ہے۔

نسائی رنگ ان کے اسلوب میں ہی نہیں بلکہ جہاں جہاں وہ گئی ہیں وہاں کی منظر نگاری کے پس منظر میں ان کا خاص اسلوب جھلکتا ہے۔ وہ جہاں کہیں کسی سہیلی کے گھر میں گئی ہیں وہاں کے آرائشی سامان کے ساتھ ساتھ اس کی سلیقہ مندی بھی ضرور بیان کرتی ہیں۔

عموماً مرد حضرات بہتر طور پر رنگوں کے امتزاج سجاوٹ کی چیزوں اور مکین کی نفاست سے غافل ہوتے ہیں لیکن بلقیس ریاض اس کو اہمیت دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ جگہ جگہ وطن کی محبت کا بھی ذکر کرتی ہیں اور ماؤں کا رنگ بھی نظر آتا ہے کہ جنہیں ہر حال میں اپنی ہی اولاد خوبصورت و حسین نظر آتی ہے۔ وطن کی محبت کا ذکر یوں کرتی ہیں۔

''پیرس کو جنت سے تشبیہ دی جاتی ہے۔۔۔۔۔مگر ہماری جنت تو پاکستان ہے۔
یاسمین کی باتوں سے میرے دل میں خیال آرہا تھا۔ اپنا ملک ہی جنت ہے تھوڑی دیر
پہلے۔۔۔۔۔خیال دل میں جو آرہے تھے تمام گلے شکوے جاتے رہے''۔ (۱)

بلقیس ریاض کا سفرنامہ خوبصورت اور دلکش اسلوب کا حامل ہے۔ اور منظر نگاری میں بھی بہت کامیاب ہے۔ مثلاً

''پارک کی کیاریوں میں رنگ برنگے پھول مسکرا رہے تھے۔۔۔۔
شبنم کے قطرے سچے موتیوں کی طرح ابھی تک چمک رہے تھے۔۔۔
ان موتیوں کو چوم لینے کو جی چاہ رہا تھا۔۔۔۔۔۔زمین
کے اندر پاؤں دھنستے چلے جارہے تھے۔۔۔۔۔اتنا عمدہ گھاس کہ
لگتا تھا ویلوٹ کا فرش بچھا ہے۔'' (۲)

دراصل سیاح کی آنکھ صرف باہر کا نظارہ کرتی بلکہ نظارے کو جذب کرنے کی کوشش کرتی ہے اور زندگی

۱۔ فرخندہ جالی بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۰
۲۔ ایضاً ص۔ ۹۲

کے تجربات سے لوگوں کو روشناس کروانا ہی دراصل اصل کام ہے۔

''نئی دنیا۔۔۔۔۔اور نئے لوگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ زندگی کے تجربات ہی تو ہیں زندگی کا سفر جب تک جاری ہے انسان نئے نئے تجربات سے روشناس ہوتا ہے''۔ (۱)

اور آخر میں

''جہاز کی پرواز کے ساتھ ساتھ میرا ذہن بھی پرواز کر رہا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے دنیا کی جنت سے نکل کر اصل جنت میں جا رہے ہوں۔۔۔وہاں ملک اپنا۔۔۔۔۔لوگ اپنے۔۔۔۔۔۔اور وطن کی سوندھی سوندھی مٹی اپنی۔۔۔۔۔۔۔''(۲)

سادہ سلیس اور رواں انداز میں لکھا ہوا یہ معلوماتی سفرنامہ ہے۔ لیکن اس سفرنامے میں جذبہ حب الوطنی بہت ہے اور قدم قدم پر اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً

''جو بھی پاکستانی دوسرے ملک میں سیٹل ہوتا ہے۔ وہ اسی ملک کی تہذیب اپنا لیتا ہے۔ لیکن ہم نے یہ کیا ہے کہ بجائے ان کی تہذیب اپنانے کے ان کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہے۔ ہر وہ قدم اٹھایا جس سے ہمارے ملک کا نام روشن ہو۔ میرے میاں کی فوٹوگرافی کی بزنس ہے۔ ہم نے سارا اسٹاف پاکستانی رکھا ہوا ہے۔ ہمارے آنے سے پہلے جتنے عربی تھے انہوں نے پاکستانیوں کی نسبت ہندوؤں کو نوکریاں دی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں نے عربیوں کو ذہن نشین (برین واش) کروایا اور کہا کہ آپ مسلمان ہیں اور مسلمان بھائیوں کو ملازم رکھیں۔۔۔۔۔ اس کو میں پاکستان کا پرچار کہتی ہوں۔ ہم نے وہاں ایک خاص پاکستانی ماحول بنایا ہوا ہے'' (۳)

اس سے وطن کی محبت اسلام سے عقیدت اور لوگوں کا احترام جھلکتا ہے۔

۱۔ بلقیس ریاض بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۴۷

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۳۲

۳۔ ایضاً ص۔ ۲۲۷

پروین عاطف (ٹپرواسنی)

پروین عاطف ایک زبردست سوشلٹ اور ماڈرن نقطہ نظر کی حامل ایک بے باک خاتون ہیں۔ ان کے انداز میں بڑی تازگی ہے اور وہ خواتین کی آزادی کی شدت سے قائل ہیں۔ وہ سفرنامے میں جو کچھ لکھتی ہیں اپنے مشاہدے کی بناء پر لکھتی ہیں۔ سفر کے دوران انہیں کائنات کے ہر گوشے کے لوگ ان کے مشیران کی تہذیبیں ماضی حال سبھی کچھ اپنی طرف مائل کرتا ہے۔

اپنے جذبات کو اچھی طرح سے پیش کرنے کے فن سے آشنا ہیں۔ نئے انداز، نئی سوچ کی حامل یہ خاتون نہ صرف انوکھے واقعات کو نئے احساسات سے بیان کرتی ہیں بلکہ خوبصورت ساعتوں اور نئے لوگوں کے لمس کو بھی محسوس کرتی ہیں اور ان کے اندر لکھنے کی خداداد صلاحیت ان کو گرفت میں لینے کی مکمل دسترس بھی رکھتی ہیں۔ پروین عاطف کے اس سفرنامے کا نام بھی چونکا دینے والا ہے اور انداز اس سے بھی منفرد ہے۔ اپنے سفرنامے کے بارے میں لکھتی ہیں۔

> ''اپنی طرح اپنی تحریر کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتی یہ چند تجربات ہیں۔ مسافری کے۔ جی چاہا آپ کے ساتھ شیئر (Share) کروں۔ آگے آپکی صوابدید پر اور ایسا تو کبھی ممکن ہی نہیں کہ کوئی مسافر سفر پہ نکلے تو صرف باہر کا سفر کرے اور اپنے اندر کی دنیا کہیں اور چھوڑ جائے۔ اس دنیا کے رنگ و بو کا تماشہ میں نے بھی جب بھی کیا اپنے دونوں جہان ساتھ لے کر کیا۔ دسیوں جہتیں چاک و چوبند رہیں۔۔۔ رنگوں، خوشبوؤں میں ڈوب ڈوب گئی۔ معذرت کے ساتھ پڑواسنی اس لئے کہ میں سمجھتی ہوں۔ عورت جنم سے مرن تک خانہ بدوش ہے۔(۱)

تعارف میں ممتاز مفتی لکھتے ہیں۔

> '' شخصیت کے لحاظ سے پروین عاطف اوکھی نہیں'' اولڑی ہے۔ اولڑے کو انگریزی میں Non Confirmist کہہ سکتے ہیں''۔(۲)

۱۔ پروین عاطف ٹپرواسنی سنگ میل ۱۹۹۵ ص۔ ۱

۲۔ ممتاز مفتی بحوالہ پروین عاطف دیباچہ

خود پروین عاطف نے اور پھر ممتاز مفتی نے بڑی خوبصورتی سے اور کتنے کم الفاظ میں لیکن دلکش انداز سے عورت اور اس کی شخصیت کی تشریح کر دی۔

پروین عاطف کا خیال ہے کہ مرد نے ہمیشہ عورت کو ہر مقام پر استعمال کیا۔ اسے سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ ہر لمحہ اسے اونچے سنگھاسن پر بٹھایا۔ پوجا کی لیکن مطلب کی خاطر حسن کی تعریف وتوصیف کی۔ محفل کی رونق بنایا۔ دیوی اور داسی کا مقام بھی دیا تو اپنی برتری کو فراموش نہ کیا۔ جہاں اس کے حسن و دلکشی ڈھل گئی وہی عورت دل سے نکل گئی۔ پابندی اس کا مقدر، ستم اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ، ظلم سہنا اس کے لیے لازم و ملزوم ہے جو تا زندگی ختم نہیں ہوتا۔ وہ چاہے ماں، بہن، بیوی، بیٹی کے روپ میں ہو۔ مرد حاکم و برتر بن کر اس کے سر پر منڈلاتا رہے گا۔

اور عورت بھی کمال کی بات ہے کہ اسی میں خوش ہے کہ محبت و پیار نہ سہی راگ ہی سہی۔ نظروں کا مرکز تو ہے لیکن اس کے لئے اس نے اپنی انا کی قربانی دی۔ زندگی کو جبر مسلسل کی طرح کاٹا۔ جیتے جی سولی پر لٹک گئی۔ ہر روز ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھتی ہے کہ آج وہ ہر ظلم کے خلاف صدا بلند کر دے گی لیکن صرف سوچنے کی حد تک۔ ماں باپ کے گھر میں پڑ واسنی رہی کہ ابتدا ہی سے ایک آواز ہتھوڑے کی ضرب مسلسل کی طرح اس پر اثر انداز ہوتی رہی کہ پرائے گھر جانا ہے۔ سسرال آئی تو ساس نے سلیقے طریقے کے طعنے دیئے۔ ذرا ہوش آیا تو اولاد جوان ہو چکی تھی۔ اب اپنی نسبت اس کی خوشیاں عزیز تھیں۔ بہو گھر لائی تو پھر ایک کو نہ اس کا مقدر بن گیا۔ اس بچاری کو کہیں بھی گھر نصیب نہ ہوا۔ نہ ماں باپ کے گھر میں، نہ خاوند کے گھر میں، نہ اولاد کے گھر میں۔ وہ بڑے خلوص سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کرتی رہی۔ اس کی حیثیت بدلتی رہی لیکن مقام نہ بدلا۔ مرتبہ نہ ملا۔ اور یوں وہ صدا کی پڑ واسنی ٹھہری کہ جب کوئی مقام مقام آخری نہیں تو پھر تلاش و جستجو کیسی لیکن خلوص اتنا محبت ایسی وفا ایسی کہ ہر راہ میں اپنے آنکھوں کے دیئے لہو سے روشن کر کے تن من کو قربان کر کے راستوں پر گامزن ہے لیکن صلہ کیا ملا کم فہم، کم عقل، بے شعور، گنوار۔

ممتاز مفتی لکھتے ہیں۔

''پروین عاطف کے ہاں بھی دوسرے روشن خیال مصنفین کی طرح عورت کے دکھ

درد کا شدید احساس موجود ہے بلکہ ذاتی زندگی کے تلخ تجربات کی بنا پر اس کا تذکرہ
اس کی تحریروں میں ایک نمایاں عنصر کے طور پر بار بار ہوتا ہے۔ اس نے عورت کے
مصائب ہر جگہ خون کے آنسو روئے ہیں''۔ (۱)

ممتاز مفتی صاحب کی بات درست ہے کبھی کبھی شخصیت میں خوبصورت سرخ گلاب اگتے ہیں کہ چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھر جاتے ہیں اور کبھی کبھی شخصیت میں ایسے آلاؤ ابلتا ہے کہ آتشیں مادہ روکے نہیں رکتا۔ پروین کی شخصیت بھی ایسے ہی رنگوں کا حسین امتزاج ہے۔

ٹپر واسنی کے آغاز ہی میں لکھتی ہیں۔

''یہ فہم کے چھل بل بھی عجیب ہیں۔
شاید آپ کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہو۔ کبھی کبھی تنہائی کا آتشین سحر، موسم خزاں میں بیراگ کے جوگیا زرد رنگ اور ہفت آسمانوں کی بھید بھری چپ، اچانک میرے کچیلے کرودھ بھرے دل پر ہمہ اوست کی دستک دینے لگتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ذلتوں، رسوائیاں، بربادیوں کی عمیق اندھیری سرنگ میں اچانک کوئی البسر انارنجی، گلابی روشنیاں پھیلاتی آدھمکے''۔ (۲)

پروین عاطف بہت ذہین اور زمانہ شناس عورت ہیں۔ وہ حیرتوں کے سمندر میں گم ہونے کی بجائے حیرتوں میں مبتلا کرنے کے فن سے آشنا ہیں۔ وہ احساس کمتری کا شکار عورت نہیں۔ وہ دنیا کو تسخیر کرنے کے نقطہ نظر اور زمانے کو ٹھوکر لگا کر آگے گزرنے کا راستہ تلاش کر لیتی ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا ہے۔ وہ دنیا کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ سرسری نگاہ سے اندر تک جھانکنے کی کوشش میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ کیونکہ زندگی نے انہیں اتنے روپ دکھائے ہیں کہ ہر ہر انداز انوکھا، نرالا اور تکلیف دہ ہونے کے باوجود پروین کی زندگی کی نئی جہت سے آشنا کرواتا چلا گیا اور یہ آشنائی خود آشنائی سے نکل کر جگ آشنائی بن گئی اور کسی بھی سفر نامہ نگار کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے سفر کے دوران دل کی آنکھ سے مشاہدہ کرے اور بقول پروین عاطف۔

''لاگ لپیٹ سے دور اپنے وجود کی فومنڈ چاٹی کو بلو بلو کر تلچھٹ سے معنی نکالنے کی جدوجہد اس سے بہتر کہیں اور نہیں ہوسکتی اور اس لئے کئی برسوں سے مجھے تن تنہا سفر بڑا آسودہ لگتا ہے۔ (۳)

۱۔ ممتاز مفتی ٹپر واسنی تعارف ص۔ ۹
۲۔ پروین عاطف بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۰
۳۔ ایضاً ص۔ ۸۶

پروین عاطف کا کمالِ فن ہے کہ وہ دکھ اور کرب کو محسوس کرتی ہیں تو ان کے بیان سے اس کا اظہار اتنا بھرپور ہوتا ہے کہ وہ غمِ دوراں کی بجائے غمِ جاناں محسوس ہوتا ہے۔ ان کا خوبصورت اسلوب۔

''انسانی جسم بھی لوئر مڈل کلاس پاکستانی لڑکی کی طرح ہر موسم، ہر رت کی درشتی کو اپنے آپ میں جذب کر لینے کی عجیب قوت رکھتا ہے۔ انگریزوں کا جمِ غفیر موسم کی تندی سے بے نیاز آکسفورڈ سٹریٹ، شاپنگ وغیرہ میں اسطرح مشغول تھا جیسے میلے پر آیا ہوا اور میں اس ایک ہی رنگ اور ایک ہی نسل کے کثیر انبوہ میں افلاس ایشیا کا ایک بے مایہ درہ کیا بیوٹی کلینک کی گوریاں میری گردش زمانہ سے روندی ہوئی صورت میں اپنے جیسا اعتماد بھر دیں گی۔ یا تقسیم ہند سے پہلے کے اپنے گورے دادا پردادا کے بچوں کی بروان آیا سمجھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیں گی؟؟ میں وسوسوں میں گھرتی چلی جا رہی تھی۔ ہونہہ! میں کوئی بھارت کی محکوم مسلمان ہوں!! خوفزدہ۔۔۔ احساس کمتری سے لبریز! مجھے مارا ہے تو کم از کم اپنوں ہی نے مارا ہے نا؟ (۱)

کیسا خوبصورت اور بھرپور انداز ہے کہ لمحوں میں دل کی کسک کو چٹیوں میں اڑایا اور تتلی کی طرح یہ جا وہ جا کہ اصل بات تو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے محسوس کر کے منظر کو بیان کرنے کی تھی اور طنز کے نشتر کی لیکن انداز ایسا ہلکا کہ احساس بھی ہو اور پشیمانی بھی ہو۔

Love and Sex یہ وہ دو جذبے ہیں کہ جب تک دنیا ہے۔ ان جذبوں سے دنیا انکار نہیں کر سکتی۔ دراصل بدن اور روح کا رشتہ ہر مسلمان جانتا بھی اور یقین رکھتا ہے لیکن محبت اور جنس کا گورکھ دھندا عجیب ہے کہ جس کو جانتا ہر کوئی ہے لیکن مانتا کوئی نہیں ہے اور جس کو حل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ عورت نے جس کو مرد کی محبت قرار دیا اور اس کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کوچہ و بازار میں آ کر سج گئی۔ اپنے خواب اتنے ارزاں کر دیئے کہ ہر اشتہار اور ہر مکان پر یوں چھابڑی لگا بیٹھی کہ فٹ پاتھوں سے لیکر خواب گاہوں تک یہ کھیل رچایا لیکن اس کے مقام کو نہیں مانا گیا بلکہ بیوقوف سمجھ کر ذرا اس کے حسن کی تعریف کی وہ اپنے آپ کو شہزادی ڈیانا سمجھ بیٹھی۔ حالانکہ اگر وہ دیکھے تو یہ سب وقتی تعریف تھی۔ باقی سب جھوٹ ہی جھوٹ تھا کیونکہ اگر محبت ہوتی تو اس میں اتنی آفاقیت رکھتی ہے۔ لمحوں کو ہی نہیں صدیوں کو مقید کر لیتی ہے اور لطافت اتنی بڑے بڑے شاہ محبت کے در پر سجدہ ریز ہوتے نظر آتے ہیں۔ پروین لکھتی ہیں۔

۱۔ پروین عاطف بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۴

''میرا مشاہدہ بھی ہے اور تجربہ بھی اظہار کے لمحوں میں پہاڑوں کو سرکر دینے اور دریاؤں کے رخ موڑ دینے کی قوت ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔انسان پر ازل اور ابد کے بھید پورے کے پورے کھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر ایسے عظیم ایسے پر اسیر سحر انگیز جذبے کا کوئی سلیقہ کوئی وقار تو ہونا ہی ہوگا۔۔۔یورپ والوں نے اُس کے دام پتا نہیں اتنے کیوں گرا دیئے تھے؟؟؟ (۱)

اس بیان سے یوں اندازہ ہوتا ہے کہ خواب تو انگلستانی قوم دیکھتی ہی نہیں۔جذبے اب محبتوں کے امین ہی نہیں۔ زندگی کا محور اور مرکز اب صرف بدن ہے اور بدن ہی ازل ہے اور بدن ہی ابد ہے۔نیم عریاں بدن کو تھالی میں سجا کر پیش کرنا ان کے لیے کسی قسم کی توہین نہیں ہے۔یہی وجہ ہے اب مرد کو عورت کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جب جنس اسقدر اور ارزاں ہو تو اس میں کشش ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کی تلاش و جستجو بھی ختم ہو جاتی ہے اور مرد کو اب یہاں خوبصورت ترین عورت کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں رہی۔

پروین عاطف کے ہاں جذبات و احساسات کو بے ساختہ پن اور جزئیات سمیت بیان کرنے کا بڑا منفرد انداز پایا جاتا ہے۔ وہ خوبصورت الفاظ میں اپنے نازک لیکن دل سے دل اُتارنے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔حسن سے متاثر ہونا عورت کی فطرت میں شامل ہے لیکن دوسری عورت کے حسن سے متاثر ہونا عورت کی سرشت میں شامل نہیں ہے۔دوسری عورت سے متاثر ہونا خواہ پروین عاطف ہو یا عام عورت ہو بہت مشکل۔ پروین بھی Mèditr Anian خوبصورت عورتوں کو دیکھتی ہیں تو جلاپے کی عجیب لو ان کے اندر جاگ اُٹھتی ہے لکھتی ہیں۔

''ہاں Meditranian کی ہوائیں واقعی حسن میں گندھی تھیں۔میں نے اپنے اخروٹ کے پرانے چھلکے ایسے رنگ کے ہاتھوں کو دیکھا لگتا تھا۔مجھے گھڑتے وقت صرف دیسی کھاد استعمال ہوئی تھی وہاں اٹلی میں ساری گجی سلک۔۔۔۔۔۔شاید یہی وجہ ہے۔وہ جانتی ہیں اپنی گجی سلک جلدوں کا بھاؤ کیسے ڈلوانا ہے۔ جینے کا حق کیسے مانگتا ہے کہ نازنخرے کیسے اٹھوانے ہیں''۔ (۲)

یہاں اگرچہ احساس کمتری نہیں لیکن پھر بھی عورت کا دوسری عورت خواہ وہ کسی خطے کی ہو برداشت نہ

۱۔ پروین عاطف بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۵

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۱۴

کرنے والی ضد موجود ہے۔ لیکن پروین عاطف کا تجزیہ مشرق و مغرب کی عورت کا اتنا سچا اور کھرا ہے اور یہ پروین کا الفاظ وتراکیب میں معانی وروح کا تجزیہ ہے کہ وہ لفظ کو مناسب موقع پر مناسب اصطلاح کے ساتھ ذہنی کیفیت کو بیان کر کے تاثر اور معنی کو پر کیف ہی نہیں بتاتی بلکہ خیال اور الفاظ کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ کیونکہ وہ جدت اور ندرت کے فن سے آشنا ہیں اور عورت ہونے کے ناطے وہ عورت کے کرب کو محسوس ہی نہیں کرتی بلکہ اس میں گزر کر دیکھتی ہے۔ مشرق و مغرب کی عورت کا تجزیہ کتنے بھرپور اور دکھ بھرے انداز میں کیا ہے لکھتی ہیں۔

> ''جہلم یا شیخوپورہ کے کسی میلے سے چوبارے میں صبح اٹھتے ہی لو کے تھپیڑے کھاتی خاندان بھر کی روٹیاں پکاتی ہے۔ ساس کے کپڑے دھوتی ہے۔ فرشوں پہ پچارے پھیرتی ہے۔ گھر بھر کی گھرکیاں کھا کر رات ہوتے ہی نیلے آسمان تلے کھری چارپائی پر منگو پیر کے بدلے کی طرح یوں بے جان گر جاتی ہے جیسے اس کے مقدر میں کوئی چمکیلی خوش آئند صبح ہی نہ ہو۔۔۔۔ آزمائش بھی شاید راسخ عقیدے والوں کے نام لکھی جاتی ہیں۔ سارے بھاگ مغرب والیوں کو لگے ہیں۔ روپ کے بھی اور ذات کے بھی۔ پتا نہیں کہاں جا رہی تھی؟ پینڈا کھوٹا ہو رہا تھا۔ ذات کے ذکر سے میرا پینڈا سدا ہی کھوٹا ہو جاتا ہے''۔ (۱)

راشد الخیری سے لیکر پروین شاکر تک اور پھر پروین عاطف تک سبھی کی سوچ کی یہی ہے اور حقیقت بھی کہ ہمارے ہاں زرینہ ہو یا زینب بھاگ ناموں سے نہیں مقدر سے ملتے ہیں اور پاکستان عورت تو اگر نام کی بھاگ بھری بھی ہو تو قسمت بان کی چارپائی کی طرح کھردری اور کھوٹی بلکہ پھانس کی طرح گلے میں اٹکنے والی۔

سفرنامے میں ایک جذبہ جو کارفرما ہوتا ہے وہ ہے سیاحت اور دوسرا شوق مجبوری کے سفر اور سفر برائے سیاحت کے سفر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ خالص ذوق سیاحت سفرنامے کے لیے اکسیر کا کام دیتا ہے اور یہی جذبہ اندرونی بے چینی کے لئے ضمیر کا کام کرتی ہے اور یہ وہ جذبہ تھا کہ جس نے پروین عاطف سے خوبصورت سفرنامے لکھوائے۔ کیونکہ تخلیقی آنچ اگر زندہ ہو تو حسی تجربہ صحت وصداقت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس سفرنامہ کو ہم تجرباتی نوعیت کا بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ تاریخ کی غلام گردشوں میں گھومتی پروین عاطف نے ٹر واسنی میں تاریخ اور سفرنامے کو یوں یکجا کیا ہے کہ حسین مرقع بن کر ہمارے سامنے آیا ہے لیکن تاریخ اور

۱۔ پروین عاطف بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۱۴

جغرافیہ کی معونیت تبدیل نہیں کی لکھتی ہیں۔

''ہم اپنے باپ داداؤں پر حکومت کرنے والے لارڈز اور سر Sir سے ملے تھے تو سہمے سہمے سے تھے۔ انگریز کے چلے جانے کے بعد اگر مکمل آزاد ہو جانے کا امرت رس پی لیتے تو شاید ہمارے اعتماد کی حالت کچھ اور ہوتی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا رنگ بدل جانے سے غلاموں کی سائیکی کیسے بدل سکتی ہے۔ ہمیں تو House of Commons میں ہر اکڑی ہوئی گردن اور درشت آنکھوں والا انگریز لارڈ کلائیو اور لارڈ ونرے ہی نظر آ رہا تھا''۔ (۱)

اردو ادب پروین عاطف اپنا ایک الگ منفرد اچھوتا/سادہ اور رنگین باتوں کے جال میں الجھانے اور منظر نگاری میں جان ڈال دینے بلکہ اسے متحرک کرنا بھی جانتی ہیں اور چشم تماشا حیرت نظارہ سے کیفیت کو دو چند کر دیتی ہیں۔

''خود رو پھولوں کی جنگلی مہک، روح کی کثافتیں دھونے والی تھی۔۔۔۔۔۔ پستہ قد تاریخی پہاڑیوں کی دوسری طرف دفن گندھارا کی کہنہ سال ثقافت اور ہمارے خون کی سرخ بوتلوں سے سینچے ہوئے پاکستانی بیوروکریسی کے رنگا رنگ بنگلے، ٹیکسلا کے ہزاروں سال پرانے شہر کی طرح جیومیٹری کی لائنوں میں ایستادہ اس شہر پہ حکومت کی مہربانیوں کا پتہ دے رہے تھے۔ وفاقی زندہ و پائندہ بیوروکریسی کا معیار زندگی دلربا تھا۔ ڈیم کے شفاف نیلے پانی۔۔۔۔۔۔''(۲)

منظر نگاری میں پروین عاطف خوبصورت تشبیہات چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایسا نادر رنگ بھرتی ہیں کہ ان کی وسعت مطالعہ اور مشاہدہ کائنات کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ ادب ہو یا تاریخ ان دونوں پر انہیں مکمل دسترس ہے۔

پروین عاطف نے اس سفرنامے میں ممتا اور نسوانیت کا بھی بھرپور اظہار کیا ہے۔ کیونکہ عورت زندگی کے کسی بھی Stage پر فائز ہو۔ اپنے اندر سے ان جذبات کو نہیں نکال سکتی اور اسی سے کائنات رقص کناں ہے اور مال اور اولاد کی آزمائش کا ذکر تو خود خدا نے بھی کیا ہے تو پھر عورت کیسے ان سے بچ سکتی ہے۔

۱۔ پروین عاطف بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۳۴

۲۔ ایضاً ص۔ ۷۰

پروین عاطف بڑے خوبصورت انداز میں بیان کرتی ہیں۔

''ڈپارچر لاؤنج میں بچوں نے جب اپنی معصوم محبتوں کی جے مالا گلے میں پہنا کر کہا ۔آپ وہاں مزے سے رہیں۔امی ہم بالکل نہیں گھبرائیں گے تو مجھے لگا میرے وجود کو کسی نے آرے سے چیر دیا ہے۔لیکن ارجنٹینا سفر کی لکیر میرے ہاتھ میں ماہی بے آب کی طرح کلبلا رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔اور کچھ نادر تجربات میرے نام اوپر والے نے جانے کب سے لکھ رکھے تھے''۔(۱)

مجموعی طور پر پروین عاطف کا یہ سفرنامہ ان کے گہرے شعور کی عکاسی کرتا ہے اور نسائی رنگ غالب ہے لیکن اس رنگ میں تخلیقی صلاحیت نے اسے چار چاند لگا دیئے ہیں۔اور نام کی نسبت سے یہ خاصا جاندار سفرنامہ ہے اور مکمل عکاسی کرتا ہے۔

۱۔ پروین عاطف بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۸

سلمی اعوان (میراگلگت وھنزہ)

سلمی اعوان کا نام اردو سفر نامے میں نیا نہیں ہے۔انہوں نے اس سے پہلے بھی ایک سفر نامہ یہ میر بلتستان کے عنوان سے لکھا ہے اس میں بھی وہ ان شہدا اور غازیوں کے کارنامے بیان کرتی ہیں جہنوں نے مال و دولت سے نہیں بلکہ جذبہ ایمانی کے تزہت جنگ جیتی اور آج بھی وہ اس جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں۔

اس سفر نامے میں بھی وہ مستنصر حسین تارڑ کی طرح شمالی علاقہ جات کی طرف خاص کشش محسوس کرتی ہیں وہاں کے معصوم لوگ حسن و دلکشی اور خوبصورت فضا ان کے قلم میں روانی پیدا کر دیتا ہے اور وہ ان کے جذبات واحساسات دکھ وکرب اور قرب کو بڑی خوبصورتی سے بیانکرتی ہیں۔

ان کے سفر نامہ میں قدم قدم پر اپنائیت ومحبت کا اظہار ہوتا ہے۔ایک ایک لفظ سے محبت کی سرشاری جھلکتی ہے جس نے اس سفر نامے کو ادب کی دنیا میں ادب پارہ بنا دیا ہے یہ ادب پارہ اردو کی سفر نامہ نگاری کی تاریخ میں روشنی کا مینار ہے۔ جو ان علاقوں کی تاریخ اور داستان دونوں کو بیان کرتا ہے اس پر سلمی اعوان کا نسائی رنگ خوبصورتی میں اضافہ کر دیتا ہے۔

وہ ان علاقوں کی تاریخ پہاڑی سلسلے‘قدیم باشندے ان کے رسم ورواج گزرنے والے دنوں میں ان کا اثر آنے والی نسلوں پر ان کا انداز سب پر بہت دسترس رکھتی ہیں۔

زبان وبیان پر انہیں پورا عبور حاصل ہے وہ ان علاقوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں مثلاً سنسکرت زبان تک میں ان کی تاریخ بیان کرتی ہیں۔جس سے اندازہ ہوتا ہے۔کہ وہ صرف ان علاقوں کا سرسری جائزہ نہیں لیتی بلکہ اس کی روح تک میں اتر کر محسوس کرنے کا فن جانتی ہیں۔وہ قدیم زمانے کے لوگوں کی جنگیں اور انکے ہتھیاروں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتی ہیں جن سے ان کا سفر نامہ معلوماتی بھی ہو گیا ہے اور تفریحی بھی۔

شاہراہ ریشم کے بارے میں سلمی اعوان لکھتی ہیں۔

> ’’شاہراہ ریشم کا وہ قصبہ جوشیام سے سازین تک کا ہے بے حد خوبصورت ہے سکندر اعظم نے جب ٹیکسلا فتح کیا تو یہ ٹیکسلا کا حصہ تھا تیمور نے اسے ترکوں کے حوالے کیا اسکے بعد دو مارنی آئے پھر سکھ آئے آزادی پاکستان کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۷۶ کو اسے ضلع کا درجہ دیا اور یہ پاکستان میں شامل ہے۔‘‘(۱)

۱۔ سلمی اعوان میراگلگت وھنزہ مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۹۵ء ص۔ ۳۹

یہاں کے لوگوں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ یہ لوگ بہادر رسم ورواج کے پابند ہیں لیکن انکی آپس کی بولیاں مختلف ہیں۔ وہ راستے میں آنے والے ہر مقام کے بارے میں بڑی خوبصورت معلومات فراہم کرتی ہیں اور تاریخ کے اوراق بھی پلٹتی ہیں وہ ادب کو تاریخ کیساتھ یوں ملا کر دیتی ہیں کہ ہم بیان کے حسن میں کھو کر ساری معلومات جذب کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ گلگت بلتستان کے علاقوں کیساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں چلاسیوں اور استوریوں کی عادات واطوار جنگوں کے احوال کے بارے میں یوں روشنی ڈالتی ہیں کہ جیسے صدیوں سے ان کے ساتھ مقیم ہوں۔ اور راستوں پر توان کی بڑی گہری نظر ہے وہ جس سواری کو بھی استعمال کرتی ہیں اسکی تفصیل بھی لکھ دیتی ہیں مثلاً

''تھوڑی سی چڑھائی کے بعد میرے سامنے ایک پختہ سڑک تھی جس کے دونوں جانب بڑے بڑے دروازوں والی پختہ دوکانیں تھیں۔ گاہکوں اور دوکانداروں کی اکثریت باریش تھی دلوں کے حال خدا جانتا ہے کہ یہ سنت نبویؐ سے وابستگی کی بنا پر ہے یا اس میں خط بنوانے کی کاہلی کا بھی عمل دخل ہے چلاس کی اٹھانوے فیصد آبادی سنی مسلک سے تعلق رکھتی ہے۔''(۱)

سلمی واقعی ماضی کے دریاؤں میں غوطہ خوری کرتے کرتے یوں سطح آب پر ابھرتی ہیں کہ پورا منظر مکمل پیش منظر سمیت ان پر عیاں ہو جاتا ہے۔ مثلاً گلگت کی شہزادی جو جلاوطنی کی زندگی گذارتے تنگ آ گئی ہے۔ وہ جس عاجزی وانکساری سے اللہ سے دعا کرتی ہیں اور وزیر رشو اس کی دعا کے ساتھ ہی بہت سے تحفے تحائف کے ساتھ پہنچ جاتا ہے۔ اس بیان کو جس طرح سلمی اعوان نے بیان کیا ہے یہ ان کی فنی بصیرت کا کمال ہے کہ وہ احساس غریب الوطنی کو اس حد تک محسوس کرتی ہیں کہ اس کو خوبصورت الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔ ہوائیں پچھمی ہوں تو بے چینی اور بے قراری دلوں تک جاتی ہیں لیکن کبھی کبھی زخمی نگاہوں سے اور مضطرب دل سے جب انسان اللہ کو پکارتا ہے تو وہ سن لیتا ہے۔ لکھتی ہیں۔

''کہتے ہیں کبھی کبھی تو اپنی آسمانی دنیا سے اتر کر نیچے بہت ہی نیچے کسی کے دل میں آ جاتا ہے اور وہ سب کچھ جان لیتا ہے اور سن لیتا ہے جو وہ جانے کب سے تجھے سناتا چلا آتا ہے اور جیسے تیرے کانوں کے بند دروازے ذرا سی درز کھول کر اندر نہیں جانے دیتے۔ کچھ ہرج ہے اگر آج چند لمحوں کے لیے تو میرے پاس آ جائے اور یہ جان لے کہ میں اپنے وطن گلگت جانے کی آرزومند ہوں۔''(۲)

۱۔ سلمی اعوان بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۹

۲۔ سلمی اعوان بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۰۰

اور وہ واقعی گلگت کے خالی تاج وتخت کی مالکہ بن گئی۔اور دیتور کے قریب شہزادی کا استقبال گلگت کے باسیوں نے دوتو (شاہی خاندان) شین (درباری امراء ووزراء) نے اور شکن (عوام) نے کیا۔اور قلعہ فردوسیہ کے شاہی محلات میں داخل ہوئی۔اور سجدہ شکر ادا کیا۔

سلمی اعوان عورت ہونے کے ناطے انکی تمام تکالیف دکھ وکرب کو محسوس کر سکتی جو مرد کا قلم اور مرد کا دل کبھی محسوس ہی نہیں کر سکتا ہے۔وہ چونکہ ایک نسائی انداز اور ہمدرد دل رکھتی ہیں اس لیے ایسا ہوا ہے۔

''مرد کے لیے آنسو بہانا اپنے آنسوؤں کی توہین ہے۔وہ کبھی عورت کے ایثار اور قربانیوں کی قدر نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنی ماں یاد آتی تھی چنبیلی کے پھولوں جیسی رنگ والی تیکھے نقش ونگار والی جسے میرے باپ سے پیار ہی نہیں عشق تھا غصیلا اور اکھڑ مزاج کا مالک میرا باپ جو ذرا سی بات پر چیل کی جلتی لکڑی کی طرح بھڑک اٹھتا۔ ہنڈیا اٹھا کر زمین پر مارتا پیالے گلاس کنالی جو ہاتھ میں آتا توڑ دیتا اور وہ ان ٹوٹے برتنوں کی کرچیاں سمیٹے اس گھر کو بناتی اور سنوارتی رہی۔اپنی عمر کے درمیانی حصے میں وہ فالج اور دل کا مریض بن کر بستر پر پڑ گیا صاف ستھرے بستر پر چمکتے دمکتے واکنگ سٹک بجاتے نوٹوں سے ہردم بھری جیب پر ہاتھ رکھتے اور اس کے وزن سے اپنے ڈوبتے دل کو تقویت دیتے اس نے چھ سال گزارے کمال صبر اور محبت سے اسکی تیمارداری کا بار اٹھاتے اس کا چنبیلی جیسا رنگ سرسوں کے پھولوں جیسا ہو گیا اور پھر ایک دن اچانک ہی وہ برین ہیمرج کا شکار ہو کر چل بسی اس کے مرنے کے چند دن بعد ہی ابا نے اپنے بینک بیلنس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

> ''آدمی کے پاس پیسہ ہونا چاہیے بیویاں بہتیری وقت کا وہ لمحہ بڑا ظالم تھا جب میں نے اس کی یہ بات سنی تھی۔ مانتی ہوں میں نے اس کی کمزور کلائی کو اپنی گرفت میں تھام لیا آپ کو وہ سارے دکھ اور مشقتیں تڑپاتی ہیں جو اس گھر کو بنانے کے لیے کی گئیں بس ایسا ہی ہوتا ہے عورت کا دوسرا نام ہی قربانی ہے۔''(۱)

یہ وہ احساسات ہیں جو مرد بزعم خود پرستی جان ہی نہیں سکتا اور عورت غیر عورت کے احساسات کو بھی سمجھ سکتی ہیں یہی حال سلمی اعوان کا ہے۔

آگے وہ ھنزہ کی تاریخ کو پورے پس منظر کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔
کہ اسکی کتنی تحصیلیں ہیں اور ھنزہ ضلع گلگت کی سب ڈویژن ہے اور اسکی سرحدیں چین اور افغانستان سے ملتی

۱۔ سلمی اعوان بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۴۱

ہیں اور سب سے بڑھ کر پاکستان کی عظیم تاریخی شاہراہ قراقرم درہ خنجراب سے ہوتے ہوئے چین کے صوبے سنکیانگ سے ملتی ہے۔ ہنزہ کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتی ہیں۔

'' ہنزہ جغرافیائی اور لسانی لحاظ سے تین بڑے حصوں میں منقسم ہے مرکزی ہنزہ یہ مرتضیٰ آباد سے لے کر احمد آباد تک کا علاقہ ہے یہ گنجان آباد جگہ ہے تقریباً تیس ہزار نفوس پر مشتمل لوگ بروشسکی بولتے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہنزہ بالا اسے گوجال کہتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ہنزہ پائیں یہ مظفر آباد سے ہندی تک کا علاقہ ہے اکثریت شین اور زبان شنا ہندی بہت قدیم گاؤں ہے پرانی تہذیب وتمدن کے اثرات ابھی تک موجود ہیں۔'' (۱)

سلمیٰ عوان بیدار ذہن اور کھلی آنکھ سے مشاہدہ کرتی ہیں وہ معاشرتی اونچ نیچ پابندیوں اور تضادات کا ایک احساس ذہن محسوس کرتی ہیں۔ اس سفر نامے میں تاریخ بھی اور تاریخی پس منظر بھی وہ زندگی ماحول اور سماج کو بہترین طریقے سے منعکس کرتی ہیں۔ وہ روشن پہلو پر تو نظر ڈالتی ہی ہیں لیکن تاریک پہلو بھی ان کی نظر سے نہیں بچ سکے۔ ہنزہ وادی میں مذہب کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''ہنزہ وادی تقریباً پینتالیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے نناوے فی صد اسماعیلی ایک فی صد شیعہ اور چند گھرانے سنی لوگ ہیں معاشی لحاظ سے یہ وادی خاصی عروج پر ہے آغا خان کے بہت سے ترقیاتی منصوبے یہاں زیر تکمیل ہیں۔ آغا خان دیہی ترقیاتی پروگرام کے تحت بہت کام ہو رہا ہے۔ ریاست کا نظم ونسق چلانے کے لیے مختلف سطحوں پر کونسلیں قائم ہیں یہ کونسلیں ایسے افراد پر مشتمل ہیں جو معاشی اور مذہبی دونوں طرح مضبوط ہیں ان کونسلوں کے سربراہوں کے احکامات مذہبی سپرٹ سے تسلیم کئے جاتے ہیں۔'' (۲)

یعنی سلمیٰ اعوان دنیا کی وسعتوں اور زندگی کی رنگارنگی کو اپنے مخصوص انداز میں دیکھنے اور پھر بیان کرنے کے فن سے آشنا ہیں۔

نسائیت کے لطیف رنگوں اور عورت کے باریک بین ہونے نے سفر نامے کے فن کو زندگی کے ایک دلکش اور نئے رنگ میں دیکھنے کا عادی بنایا ہے۔ جو عام طور پر مرد سفر نامہ نگاروں سے اوجھل تھا۔

''گھر کے دروازے پر رسیوں میں پروئی پالک دھوپ میں خشک ہو رہی تھی۔ زمین پر ٹماٹر سوکھتے تھے اور درمیانی عمر کا ایک مرد نیم پختہ بالکونی میں بیٹھا جھیل کے پانیوں کو دیکھتا تھا یا گانا سننے میں ڈوبا ہوا تھا۔'' (۳)

عموماً سفر نامہ نگار گھر اور گھر کی مصروفیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن خواتین کی سرشت میں شامل ہوتا ہے کہ وہ

۱۔ سلمیٰ اعوان بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۵۵

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۷۲

۳۔ ایضاً ص۔ ۱۹۰

گھر کی ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھتی ہیں۔ یہی انداز سلمی اعوان میں بھی نظر آ تا ہے۔ راکاپوشی کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''جانے کتنے انقلاب اس راکاپوشی نے دیکھے ہونگے۔ عروج وزوال کی کتنی داستانیں اس کے دامنوں میں محفوظ ہونگی۔ یہ کب سے یونہی کھڑی دنیا کو اپنے پیچھے پاگل کئے ہوئے ہے اور خود اس کا اپنا وجود بدلتے وقت کے ساتھ کتنا بدلا ہوگا''۔(۱)

ہنزہ کی وادی میں ''بڈہ لس'' کے بارے میں جو داستان انگریز کی سنتی ہیں کہ جو یہاں آ کر بیمار ہو گیا اور شادی کے ابتدائی دنوں نئی نویلی دلہن کے ساتھ ارمانوں کے دن گزارنے کی بجائے اس کی جنت جہنم میں بدل گئی اور دلہن چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ بعد میں اس نے گجرات کاٹھیاوار کی لڑکی سے شادی کی اور صحت یاب ہونے کے بعد ''بڈہ میں'' ایک ریسٹ ہاؤس بنایا۔ لکھتی ہیں۔

''وادی بڈہ لس'' میں اکبر ہمیں اس گرم چشمے پر لے گیا۔ جس کی شہرت اندرون ملک کم اور بیرون ملک زیادہ ہے۔ جلدی بیماریوں اور جوڑوں کے درد کے لئے یہ پانی اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ قدرت نے جانے کون سی معدنیات کا اس میں رچاؤ کر دیا ہے کہ زندگی سے مایوس لوگ یہاں آتے ہیں اور شفایاب ہوکر جاتے ہیں''۔(۲)

کہیں کہیں وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو طنز ومزاح کے انداز میں بیان کرتی ہیں کہ اسطرح زندگی تلخ ہونے کے باوجود قابل برداشت ہوجاتی ہے۔ شمالی علاقہ جات کے نیچے کی دنیا کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''اندرونی وادیوں میں اگر آپ جائیں تو بڑے بڑے نالوں پر آج بھی قدیم طرز کے پل موجود ہیں۔ جالو (Skinfaft) اور ایک رسی پر مشتمل پل جسے شنا زبان میں ووٹ کہتے ہیں۔ ہمارے لوگوں کو مرنے کے بعد پل صراط سے گزرنا پڑے گا۔ تو وہ بغیر کسی دشواری کے یہ مرحلہ طے لیں۔ بلکہ اس دوڑ میں اول انعام حاصل کریں گے۔ کیونکہ یہ ذرائع انہیں زندگی میں ہی اس کی تربیت دے رہے ہیں''۔ (۳)

گلگت کی جغرافیائی صورت حال اس کی تحصیلیں اردگرد کے علاقے اس کی فصلیں فروٹ اور موسم سب کا تفصیلی ذکر کرتی ہیں۔

''گلگت کی جغرافیائی کیفیت سے ظاہر ہے کہ یہ تنہائی اور علیحدگی کا علاقہ ہے۔ شاہراہ ریشم کی تعمیر نے اس کی معاشی اور معاشرتی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مگر باقی حصے ابھی تک مشکل اور دشوار گزار راستوں کی زد میں ہیں۔ یہاں بہت سی قومیں آئیں۔ کشمیر سے کشمیر بلتستان سے بلتی شمال کی طرف سے منگول، چینی اور ترکمان مغرب سے چترال۔ ان سب کا امتزاج یہاں موجود ہے۔ باشندوں میں سب سے زیادہ تعداد نسلی طور پر نورانی لوگوں کی ہے جو دو ہزار قبل مسیح کے قریب اس خطے میں داخل ہوئے''۔(۴)

۱۔ سلمی اعوان بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۶۰

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۶۱

۳۔ ایضاً ص۔ ۲۱۶

۴۔ ایضاً ص۔ ۱۹۰

شاہراہ قراقرم نے زندگی کی سہولیات میں اضافہ کر دیا ہے لیکن آنکھوں میں نمی بھی بھر دی ہے کہ جب نوجوانوں کی بند صندوقوں میں لاشیں شہیدوں کے روپ میں گھر میں پہنچتی ہیں تو نہ جانے کیسے کیسے ارمان کچلے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں خواہش بولنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ بھری جوانی میں مانگ اجڑ جائے تو یہ کرب انتہائی تکلیف دہ ہے اور پھر اسے برداشت کرنا اس سے بھی زیادہ اذیت ناک کہ زندگی گزارنا اور زندگی میں سے گزرنا دو مختلف حقیقتیں ہیں۔ بالکل اس طرح سے کہ جسطرح بعض لفظوں کا مطلب اپنے زخموں سے سمجھ آتا ہے۔ اس طرح سے بعض دکھوں کا مفہوم اپنے دکھ سے واضح ہوتا ہے۔

''قوموں کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ایسا کرنا اور سونا ناگزیر ہے۔ خون بہائے بغیر گلستان کے چہرے کو نکھار نہیں ملتا، دکھ اور یاس کے ہزاروں رنگ میری آنکھوں میں گھل گئے۔ اس لمحے میری حالت اس غبارے جیسی تھی جو حسرتوں کی ہوا سے لبالب بھر فضاؤں میں اڑتا پھرتا ہو۔ پر آناً فاناً ہوا کا زبردست تھپیڑا جس کا پٹاخہ بجا دے''۔ (۱)

سلمیٰ اعوان صاحبہ یہاں مذہب، تاریخ اور ثقافت کے ساتھ ساتھ یہاں پر شادی بیاہ کے رسموں کا بھی ذکر کرتی ہیں کہ کس طرح یہاں کے لوگ رشتہ داروں کو سدا بھیجتے ہیں۔ پھوپھی، خالہ، چچا، ماموں ہر طرح کی مدد کرتے ہیں اور لڑکی کا دل آنے والے حسین تصورات کی وجہ سے دھنک رنگوں سے سجا دیا جاتا ہے اور پھر بارات کا جو کھانا دیا جاتا ہے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

''رات کا کھانا خمیری روٹی اور گوشت کے شوربے پر مشتمل تھا۔ کھانے کی سینیاں ابھی اٹھائی بھی نہ گئی تھیں کہ باہر (ڈوم ناچنے بجانے والے) لوگوں نے ڈھول کھڑکانے اور سرنئی بجانی شروع کر دی تھی۔ اس آواز نے گویا کھلبلی مچا دی۔ رسم تاؤ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ آنگن کے ایک کونے پر تل کی لکڑیاں جلا دی گئیں۔ بھڑکتے شعلوں کی روشنی میں رقص و موسیقی کا کھیل شروع ہو گیا۔''(۲)

بعض جگہ سلمیٰ اعوان نے اپنی ذات کو طنز کا نشانہ بنایا ہے لیکن انداز انتہائی خوبصورت ہے کہ بالکل خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً جب وہ رات دیر گئے آتی ہیں تو چھوٹی خالہ انہیں بتاتی ہیں۔

''تمہارے خصم کو پتہ چل گیا ہے اور وہ رات کی فلائٹ سے بچوں کو لینے

۱۔ سلمیٰ اعوان بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۱۷

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۳۳

آ رہا ہے۔ کہتا تھا جہنم میں جائے ایسی بے لگام بیوی''۔ آئینہ دیکھے بغیر بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا ہے اور میری آنکھوں کے ڈھیلے کسی ذبح کیئے ہوئے بکرے کی مانند پتھرا رہے ہیں''۔(۱)

یہ وہ عورت ہے جو ازل سے ابد تک عورت کے سر پر سوار رہتا ہے۔ وہ خاوند کی تابع دار رہتی ہے لیکن اس کے باوجود ڈرتی رہتی ہے۔ سلمیٰ کی خالہ اسے کہتی ہے۔

''کمبخت تو نے جو اتنے پر اگے ڈالنے تھے۔ تو بیاہ کاہے کو کیا تھا۔ بچے کیوں پیدا کئے۔

............ارے واہ کمال کی باتیں کرتی ہیں۔ آپ بھی۔

''بھلا بیاہ کیوں نہ کرتی۔ بیاہ کا اپنا حسن ہے اور بچے کیوں نہ پیدا کرتی۔ بچوں کے بغیر عورت کس کام کی۔ واہ چھوٹی خالہ واہ زندگی کے ان پہلوؤں کی مسرت سے آشنا ہوئے بغیر ہی قبر میں اتر جاتی۔'' (۲)

سلمیٰ کا اسلوب رواں پر کشش شگفتگی لئے ہوئے ہے اور اخلاص سے پر ہے۔ ان کے سفرنامے ان کی دلآویز شخصیت کا عکس ہیں۔ وہ ہنزہ گلگت میں قدم قدم پر اپنا ہیت و محبت کا جو اظہار کرتی ہیں اور جو انہیں اپنا ہیت و محبت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی تحریر کے ایک ایک لفظ سے چھلکا پڑتا ہے۔

ان کے اسلوب بیان کے مختلف نمونے پیش خدمت ہیں۔ جن میں گہرائی بھی اور وسعت نظر بھی وسیع مطالعہ کے غماز بھی ہیں اور ان کی بے تکلفی کے عکاس بھی۔

''آنے والے دنوں کے حسین تصورات نے میرے وجود کو دھنک رنگوں سے سجا دیا تھا۔ میں یوں چمکتی تھی جس طرح مرغ زریں کے جسم پر حسین رنگی کلغی لشکارے مارتی ہے''۔

وہ مسلسل تین دن رضائی میں لپٹا سرشاری کی پھوار میں بھیگتا رہا۔

'' رات اتنی تاریک اور ستارے اتنے روشن تھے کہ دو متضاد کیفیات کا احساس ہوتا تھا۔'' (۳)

گلگت کا چہرہ جس قدر خوبصورت معصوم اور صبیح ہے۔ اس کے خدوخال اسی قدر تیکھے ہیں۔ اندر کئی خانوں میں بٹا ہوا مرکٹا بھٹا ہے۔ ان کا اسلوب ان کی شخصیت کے دھنک رنگوں اور فطری انداز کی عکاسی کرتا۔ مثلاً

''ایک ہوٹل جس پر کشکاری ہوٹل لکھا ہوا تھا۔ چار پائیوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ گرم گرم روٹیاں میرا جی چاہا میں کھڑکی سے چھلانگ مار کر اس چار پائی پر جا بیٹھوں۔ جس کے سامنے دھری میز پر سفید چینی کی رکابی میں سالن اور چنگیر میں روٹی دھری تھی۔ مجھے بھوک کا شدت سے احساس ہوا تھا۔'' (۴)

۱۔ سلمیٰ اعوان بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۸۰

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۸۱

۳۔ ایضاً ص۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵

۴۔ ایضاً ص۔ ۱۰۶

سلمیٰ انسانی نفسیات و کیفیات کو بھی خوبصورت انداز میں پیش کرتی ہیں۔

'' وہ شیرازی کی سحر زدہ شخصیت سے متاثر ہوا تھا لیکن اس کی سبز آنکھوں میں جھلکتے جاہ و جلال کے رنگوں سے اتنا ضرور سمجھا تھا کہ وہ اسے کٹھ پتلی نہیں بنا سکے گا۔ وہ نبض شناس تھی اور نظر شناس بھی۔ پر تھوڑا سا دھوکا کھا گئی۔ تاج پوشی کی رسم دو دن بعد تزک و احتشام سے منائی گئی۔ اس وقت جب دربار لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور درباری لوگوں کے چہرے وفور مسرت سے گلنار تھے۔'' (۱)

مجموعی طور اس سفرنامے کو ہم مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں کی طرح انتہائی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ کیونکہ شمالی علاقہ جات کے بارے جتنا خوبصورت تارڑ نے لکھا ہے۔ نسائی انداز میں سلمیٰ اعوان نے خوبصورت لکھا ہے اور جاندار بھی۔ کیونکہ مرد اگر لکھتا ہے تو اپنے آپ کو ہیرو بنا کر پیش کرتا ہے۔ یہاں ہر علاقے میں ایک لڑکی دیدہ و دل فرش راہ کیئے ہوئے اس پر صدقے وار ہونے کو تیار ہوتی ہے۔ خواہ سیاح کسی بھی عمر کا ہو لیکن سلمیٰ اعوان نے ذات کے حصار سے نکل کر اردگرد بھرپور نظر ڈالی ہے۔ جس میں جذبہ بھی، گہرائی بھی اور تنوع بھی۔

یہی وجہ ہے کہ نسائی رنگ نے بھی اردو ادب کے سفرناموں میں زندگی کے ہزار رنگوں کی دھنک سجا دی ہے۔ جہاں ہر رنگ انوکھا نرالا اور خوبصورت ہے۔

۱۔ سلمیٰ اعوان بحوالہ سابقہ ص۔ ۷۶

نیلم احمد بشیر (نیلا ان نیپال)

زندگی لحہ لحہ بدلتی ہوئی دھندلائی ہوئی بصارت کے دکھ سے گھائل ہے۔مگر رسائی کے درمیان نارسائی کی آہٹ بڑی ہی مدہم ہے۔خواہش جنم لیتی ہے۔تو زندگی میں امنگ پیدا ہوتی ہے۔جذبے مرجائیں تو موت کے مواقع پیدا ہو جاتے ہیں۔گھاؤ گہرا ہوتو ذات کی توسیع کا وسیلہ بن جاتا ہے۔مرشد کامل ہو تو راستہ آسانی سے کٹ جاتا ہے۔رہبر رہنما ہوتو منزل مل جاتی ہے۔

نیلما بشیر کا نہ صرف مرشد کامل تھا بلکہ رہبر نے یسی رہبری کی کہ انگلی پکڑ کا راستہ دکھایا۔ جب ایسے سچے مہربان خوبصورت سچے اور کھرے لوگ ساتھ ہوں تو کڑی دھوپ کا سفر آسان ہو جاتا ہے۔راستے کی تمازت تنگ نہیں کرتی۔ بلکہ لذت بخشتی ہے۔ ہر ادیب اپنے ساتھ ایک کتھا رکھتا ہے۔جس کو وہ دلآویز انداز میں بیان کرتا ہے۔ ہمیشہ ماضی نئی دنیا سے ہم آہنگ ہو کر نئے عصری تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

نیلم احمد بشیر کا سفرنامہ ''نیلا ان نیپال'' عہد حاضر کا ایک خوبصورت سفرنامہ ہے۔ اس سفرنامے میں نیلما احمد نیپال میں ایک کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے پاکستان کی طرف سے جاتی ہیں۔

نیلم احمد بشیر کا سفرنامہ انور عنایت اللہ اور ممتاز مفتی کے نام ہے۔نیلم احمد بشیر کا یہ سفر Acfod آرگنائزیشن کی طرف سے کیا۔جس کا مفہوم یہ ہے۔

''Asian Cultural Forum on Development

نیلم کے اندر نسوانی حسیات کے ساتھ ساتھ ایک اور حس جو اسے کرب سے گزارتی ہے وہ ہے دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں جا کر اسے محسوس کرنا اور پھر کوشش کرنا کہ اس سے نجات بھی دلوائی جائے۔ کیونکہ اچھا ادب مشاہدے کے ساتھ ساتھ جذبات واحساسات سے ہم آہنگ ہو کر نئی صورتیں اختیار کرتا ہے اور یوں زندگی کے نشیب وفراز سے قافلہ زندگی رواں دواں رہتا ہے۔

زندگی ان گنت روپ لیئے ہوئے ہے۔ ادیب ان رنگوں کو تلاش کر کے جذب ومعنی کی دنیا سے آشنا کرتا ہے۔ نیلم احمد بشیر ابتداء ہی میں ایسا کربناک واقعہ سناتی ہیں کہ ہم امارات میں کام کرنے والا ایک شخص وہاں کے حالات یا جسمانی تھکاوٹ کی وجہ سے جس اذیت سے گذرا۔ اس کی وجہ سے وہ دماغی توازن کھو بیٹھا اور اس کے ساتھ اس کو نشے کا

ٹیکہ لگا کر جہاز میں بیٹھا گئے۔ نشہ ختم ہونے کے بعد جب اس نے جہاز کے ماحول کو خراب کیا۔ اپنے شور شرابے سے تو وہ اس جیسے انسانوں نے ہی اسے ایک گھڑی سمجھ کر اتنا مارا کہ وہ بنگلہ دیشی نیم جان ہو گیا۔ یہ خوفناک منظر دیکھ کر نیلما لکھتی ہیں۔

''کاش ہماری تیسری دنیا کے ممالک اتنے پسماندہ، اتنے غریب، اتنے محتاج نہ ہوتے کہ ہمارے لوگوں کو اپنے اپنے گھر اپنے ملک تہذیبیں، اپنے لوگ چھوڑ کر پردیس میں روٹی کمانے کے لئے مجبوراً جانا پڑتا''۔(۱)

نیلم احمد کا بیان چاکلیٹ (چاکولیٹ) کی طرح لذیذ ہے لیکن تاثر بہت گہرا، دوررس اور کڑوا ہے۔ کیونکہ ان کی نسائی لطافت بے حد ترش ردعمل کی غماز ہے۔ ان کا مشاہدہ بے حد تیز اور اعلیٰ پائے کا ہے لیکن اس میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ مثلاً جب وہ آڑ چڈ ہوٹل کی روداد لکھتی ہیں تو کہتی ہیں کہ

''آدھ چھٹانک دہی، آدھ چھٹانک بمعہ دو منی منی کلچہ سائز روٹیوں کے ہمارے سامنے چن دی گئی اور چار عدد ویٹر ہمارے اردگرد کھڑے ہو کر ہمارے اس ماحضر کو تناول کرنے کے منظر کی دید کو کھڑے ہو گئے''۔ (۲)

اور سب سے پرلطف یہ ہے کہ مزید کھانا کھانے اور مانگنے کے باوجود ان حضرات کی بھوک کم نہ ہوئی بلکہ مزید کی خواہش ہوئی۔

زندگی میں کبھی کبھی انسان جو کچھ چاہتا ہے وہ باوجود کوشش کے حاصل نہیں کر پاتا اور لاحاصل کا دکھ اسے زندگی کے اسرار و رموز سے آشنا کرتا ہے۔ جب خواب وخیال حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آتے ہیں تو جنہیں ہم بھولنا چاہتے ہیں۔ وہ پوری شدتوں سمیت ہمیں یاد آتے ہیں۔ اور یوں ہجر وفراق، تنہائی کی وصال گلے ملتے ہیں کہ جیسے کبھی بچھڑے ہی نہ تھے۔ اور کبھی کبھی تو انجانے لوگ یوں اپنے بن جاتے ہیں کہ صدیوں کا فاصلہ پل میں طے ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ یہ شناسائی اب کے جنم کی نہیں ہے بلکہ یہ روحوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے جو اب ظاہر ہوا ہے۔ نیلما احمد بشیر لکھتی ہیں۔

''کبھی عادات کے نہ ملنے کے باوجود دل مل جاتے ہیں اور عجیب دیپک راگ جلتا ہے۔ دنیا میں لوگوں کا ایک دوسرے سے مل جانا ہی میرے نزدیک اس کائنات کے چلتے رہنے کا باعث ہے اور کتنا پیارا باعث ہے یہ۔ (۳)

نیلما بشیر کے اندر جو تحقیقی جوہر ہے وہ انہیں تاریخ کے اوراق یوں پلٹنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ادب کے سربستہ راز تو

۱۔ نیلما بشیر نیلاان نیپال سنگ میل پبلیکیشنز ۱۹۹۶ ص۔ ۱۷

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۹

۳۔ ایضاً ص۔ ۱۴

کھلتے ہی ہیں۔ تاریخ کے اوراق بھی پلٹنے پڑتے ہیں۔ کھٹمنڈوں میں جاتی ہیں تو ایک اچھے سیاح کی طرح نہ صرف وہاں کی عمارات وتہذیب ومعاشرت کا جائزہ لیتی ہیں بلکہ اس بات کی بھی کوشش کرتی ہیں کہ تاریخی عمارات اور ان کے پس منظر کو بھی دیکھا جائے۔ پہلے یہاں کی عمارات کا حال سنیئے۔

''مجھے کھٹمنڈو کی عمارات دیکھ کر خاصی مایوسی ہوئی کیونکہ ان میں کوئی خاص قابل ذکر نہیں تھی۔ انتہائی عامیانہ سی بلڈنگیں تھیں جسے انہیں صرف ضرورت کے تحت ہی بنایا گیا ہو اور استعمال کیا گیا ہو''۔ (۱)

حضرت محل جو کہ واجد علی شاہ والی لکھنو کی بیگم تھی ان کا مقبرہ کھٹمنڈو میں ہے جو کہ بہت بہادر عورت تھیں لیکن واجد علی شاہ بہت ہی رنگین مزاج اور شوقین بادشاہ تھا۔ جس نے راگ راگنی کے انتہائی خوبصورت بہر خود مرتب کیئے تھے۔ ان کی بیگم کے بارے میں کہتے ہیں کہ جب لکھنو میں انگریزوں نے حملہ کیا تو بڑے بڑے لوگ ان کا سامنا نہ کر سکے لیکن حضرت محل بیگم نے انگریزوں کے خلاف مورچے سنبھال لئے اور آخری وقت تک مقابلہ کیا۔ حتی کہ وہ نیپال کے جنگلوں میں اتر گئیں لیکن بہادری سے مقابلہ کیا اور ہتھیار نہ ڈالے۔ نیلما اس خاتون حضرت بیر محل کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''خدا جانے واجد علی شاہ کو اپنی بیگم کی شخصیت کے ان شاندار پہلوؤں کی خبر بھی ہوسکی تھی یا نہیں۔ وہ فنکار طبع بادشاہ تھا۔ حاکم کم اور تخلیق کار شوقین مزاج زیادہ تھا''۔ (۲)

نیلما بشیر احمد کا بے ساختہ اسلوب اور دلچسپ معلومات کی بنا پر یہ سفرنامہ منفرد ہے۔ لیکن وہ اپنے مافی الضمیر کو سادگی سے بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب وقائع نگاری کا انداز رکھتا ہے۔ وہ معاشرتی زندگی کی عکاسی بے حد خوبصورت انداز میں کرتی ہیں لیکن اس میں حزن زیادہ ہے۔

''سڑک پر چلتی نیپالی عورتیں دیکھ کر میرا دل دکھ سے کٹ کر رہ گیا۔ غربت حرماں تھیں اور زندگی کی سختیاں ان کے چہروں، ان کی آنکھوں اور ان کے انداز سے ظاہر تھیں۔ دبلی پتلی عورتیں، ننگے پاؤں معمولی کپڑوں میں ملبوس مجھے اچھے کپڑوں، جوتی میں دیکھتیں تو پل بھر کو ٹھٹکتیں اور پھر آگے کو چل دیتیں۔ ان کی کمروں پر لدی لمبوتری ٹوکریاں، اینٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ کچھ آگے کو جھک کر چلنے پر مجبور تھیں۔ دنیا کی ہر عورت کی طرح یہ عورتیں بھی اپنی اپنی کمروں پر بوجھ لادے ہوئے تھیں۔ بوجھ ہی ہر عورت کا مقدر اور نصیب ہے۔ صرف اس بوجھ کی شکلیں اور صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ جب وہ من کے اندر ہوتا ہے تو تخلیق کہلاتا ہے اور من کے باہر ہوتا ہے تو روح کا زخم بن جاتا ہے۔ (۳)

۱۔ نیلما بشیر بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۴

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۲

۳۔ ایضاً ص۔ ۵۵

نیلم احمد بشیر معاشرتی برائیوں کا جائزہ بڑے تلخ انداز میں لیتی ہیں۔ عام زندگی میں انسان جب تلخ ہوتا ہے تو اس کی وجہ غم کا حد سے گزر جانا ہے۔ یہاں بھی کرب جب جیسا دل کے نہاں خانوں سے نکل کر آنکھوں سے چھلک پڑتا ہے تو دکھ اور اذیت نا قابل برداشت ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کے نسوانی لہجے میں اپنا ہیت محبت اور دوستی کا انداز ہے کہ جس کی وجہ سے دکھ کی تہ تک جانے کی کوشش کرتی ہیں اور دکھی دل خود ہی مائل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے دکھوں کو نیلم صاحبہ کے سامنے بیان کر کے خود ہلکا پھلکا ہو جائے لیکن نیلم کا مشاہدہ بہت گہرا اور باریک بین ہے۔ وہ دنیا سے سرسری نہیں گذرتی وہ ہر جگہ کا مطالعہ جہان دیگر سمجھ کر کرتی ہیں اور موازنہ تو اتنی خوبصورتی سے کرتی ہیں کہ ان کی حقیقت نگری (نگاری) کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

> ’’ہم برصغیر کے لوگوں کی سُستیاں بھی ایک جیسی ہیں۔ انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش ایک ہی عادات، مزاج، رویے رکھنے والی قومیں ہیں۔ اسی لیے ان کے نصیب بھی کم وبیش ایک سے ہی ہیں۔ باوجود بسیار ٹریننگ کے بھی وقت کی قدر و قیمت کرنے کا رواج اور شعور ہم میں پیدا نہ ہو سکا اور ہم تھرڈ ورلڈ لیئے پسماندہ کے پسماندہ رہے اور ست الوجود کہلائے۔‘‘ (۱)

کتنے خوبصورت انداز میں برصغیر میں بسنے والی تینوں قوموں کا تجزیہ کر دیا۔ وہ معاشرتی اقدار کا جائزہ بھی اسی انداز میں لیتی ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ عورتوں کا احترام اور ان کی عزت وتوقیر ہم پر واجب ہے لیکن ہمارے ہاں ایسا نہیں ہے۔ نیپالی غیر مسلم ہیں لیکن وہاں نہ عورت عدالتی نظام میں موردالزام ٹھہرائی ہے نہ فیوڈل لارڈ اسے مال مفت سمجھ کر اٹھالے جاتا ہے کیونکہ ہماری ترجیحات ہمارا زاویہ نظر انسانیت کی بجائے Rituals کو زیادہ اہم گردانتے ہیں۔ وہ عورت کو عزت وتکریم نہیں ہے بلکہ محض استعمال کی چیز سمجھتے ہیں۔

اور وہ عزت جو کہ رسول پاکؐ نے ماں بہن، بیویوں اور بیٹی کے روپ میں دی عورت کا حق دیا اس کو ہم نے فراموش کر دیا لیکن یہ غیر مسلم لوگ کہ جہاں غربت کی وجہ سے ایک نیپال اپنی چولی اتار کر پتھر کی اوٹ میں کھڑی اپنے کپڑے دھو رہی ہے تو کوئی مرد اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا لیکن پاکستان میں اور کچھ ہو نہ ہو عورت پر حدود آرڈیننس کا دعوی ضرور عائد کر دیا جائے گا کہ ہمارا مرد اس کے سوا دے بھی کیا سکتا ہے کہ جب چاہا اس سے کھیل لیا اور جب چاہا اس کو توڑ کر پھینک دیا۔

> ’’افسوس ہمارا معاشرہ عورت کی ظاہری صورت ’’سر پر دوپٹہ ہونے نہ ہونے اور اسی قسم کی غیر ضروری باتوں پر اتنا فوکس کرتا ہے کہ اس کی جگہ اسے روح کا ننگا پن اصولوں کا قتل،

۱۔ نیلما بشیر بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۷

اخلاقایات کا زوال، قطعی طور پر نظر نہیں آتا۔ عورت کے سر پر سے دوپٹہ اتر جائے تو ہم اسے فحاشی گردانتے ہیں اور گینگ ریپ کی خبریں پڑھتے ہیں تو اسے روزہ مرہ کی بات سن کر کوئی اہمیت نہیں دیتے مکمل طور پر نظرانداز کر دیتے ہیں۔'' (۱)

ان کا سفرنامہ ماضی کا حال لکھتے ہوتے موئے حال کا حصہ بن جاتا ہے اور وہ ماضی کے کھنڈرات سے حقیقی زندگی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں سیاح اور ادیب دونوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ مشاہدے اور تخیل کی رنگ آمیزی سے عجیب امتزاج پیدا کرتی ہیں اور ان کی فطری تندی اور بعض اصناف نرم خول کا وہ لبادہ اوڑھ لیتی ہے کہ وہ خوبصورت اور خوش مقال نظر آتی ہیں اور اپنی یادوں کے ذریعے اپنی ذات کا سفر طے کرتی ہیں کہ اپنی شخصیت کے انوکھے رنگوں کو منکشف کر دیتی ہیں۔ حسن خوبصورتی اور رعنائی پیدا ہو جاتی ہے۔ لکھتی ہیں۔

'' بھگتا پور کے مندر میں جب گئی تو عجیب کیفیت پیدا ہو گئی۔ بھگتا پور میں بہت کچھ تھا اور بہت من موہنا تھا۔ وہ سب کچھ مندروں، مجسموں، دیویوں اور دیوتاؤں کے روشن کیے تو یوں لگا جیسے میں اپنی دنیا میں نہیں کسی اور دنیا میں Transeend کر گئی۔ میرے دل کے اندر آباد شہر جیسا، اس کی گلیاں بھی تو اتنی ہی پر پیچ اس کے بام و در بھی اتنے ہی پرانے اس میں بسنے والی آرزوئیں اور حسرتیں بھی اتنی ہی رومانوی، انوکھی، درد میں بسی ہوئی اور پر اسرار ہیں۔ اس لحاظ سے بھگتا پور مجھے کوئی خوابوں میں بسا شہر لگ رہا تھا۔ جہاں حقیقت کی دنیا سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔'' (۲)

برصغیر کی تاریخ میں بہت سے اولیائے اللہ کا ذکر ملتا ہے۔ ہر کوئی اپنے رنگ میں یکتا اپنی ذات میں انوکھا اور One of Kind ہی تھا۔ صرف نماز، روزے سے کوئی جنت میں نہیں جاتا۔ اپنے ذہن کو کعبہ اور اپنا جسم اپنے گھیرے میں لینے والی مسجد ہوتی ہے کہ جس میں ذات گم رہے اور گم کس میں اللہ ہو کے ورد میں۔ صبر کو پنج وقتہ نماز کا جزو اور خوف خدا لازمی ہو۔ مذہبوں کی تفریق اور تذلیل سے خدا نہیں ملتا۔ من کو میل سے صاف کرنے سے خدا ملتا ہے۔ من میں کھوٹ ہو تو خدا تک رسائی ناممکن ہے۔ کیونکہ خدا تو سچا اور کھرا ہے۔ اس لیے اس کی ذات اور تلاش کا سفر بھی ان مادی کثافتوں سے مبرا ہونا چاہیے تاکہ راستے کی دھول من کے پانی سے دھل جائے اور تن اگر اجلا نہ بھی ہو تو من کی روشنی نوید صبح کا پیغام ضرور دیتی ہے۔ ان بزرگوں میں خواجہ بختیار کاکی، امیر خسرو، مولانا رومی، مادھول حسین کا ذکر کرتی ہیں لکھتی ہیں۔

'' مادھولال نامی ایک ہندو لڑکا تھا مگر یہ تفریق شاہ حسین کے راستے میں کبھی حائل نہ ہو سکی۔

۱۔ نیلما بشیر بحوالہ سابقہ ص۔ ۵۷

۲۔ ایضاً ص۔ ۶۷۔ ۶۸

مادھولال سے انہیں تعلق خاطر تھا۔ اور دونوں ہر پل اکھٹے رہا کرتے تھے۔ وہ دونوں اتنے قریب تھے کہ ایک اکائی بن چکے تھے۔ عشق چاہے حقیقی ہو یا مجازی۔ محبوب کے ساتھ مل جانا ایک ہو جانا۔ رانجھا رانجھا کر کے آپے رانجھا ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔ شاہ حسین نہ صرف مادھولال کو اپنے نام نسبت سے مادھولال حسین بنایا بلکہ اپنی وفات کے بعد اپنی ہی قبر میں سلا لیا۔ یہ بھی محبت کا ایک الگ رنگ ایک ڈھنگ ہے۔"(۱)

نیلم احمد بشیر برصغیر کی فرقہ واریت کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے نیپال جاتی ہیں۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی تقسیم ہو یا تقسیم ہند۔ ہر طرف خون کا بازار سرگرم ہو گا۔ ہندو مسلم ہر ظلم ڈھاتے ہیں لیکن مسلمان چونکہ اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں اس لیے مسلمان ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ کیونکہ ایسے وقت میں عقل و خرد کا ناطہ ٹوٹ جاتا ہے اور انسان صرف وحشی رہ جاتا ہے۔ کانفرنس کے شرکاء اس بات پر اتفاق کرتے ہیں۔

"برصغیر پاک و ہند میں موجود ٹینشن فرقہ واریت Communical Violance کی وجوہات زیادہ تر سیاسی ہیں۔ دونوں ممالک کی Ruling Class اپنے ذاتی اور مخصوص مفادات کی خاطر اپنی عوام کے بیچ اس زہریلے تعصب کی فضا کو پروموٹ کرتی ہیں تاکہ لوگ آپس میں یہی کرتے رہیں۔ نفرت کرتے رہیں۔ اور ان کو اس بدامنی کی فضا کو کیش کرنے کا موقعہ ملتا رہے۔"(۲)

ماں کے جذبات وہ ہیں کہ جس کو لفظوں کے سانچے میں ڈھالنا بہت مشکل ہے۔ اگر خود ماں بھی اپنی محبت کو پابند لفظ کرنا چاہے تو ایسا ممکن نہیں کیونکہ یہاں محبت کا وہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے کہ جس کی طغیانی کو لفظوں میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دل سے روح تک کے سفر کو طے کر کے کہ اس میں وہ گہرائی ہے کہ جس کو ماپنا ناممکن ہے۔ اسی لئے نیلم احمد بشیر بھی اس قسم کی جذباتی کیفیت سے گذری ہیں کہ انہیں اسے بیان کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ لکھتی ہیں۔

"کسی کی یاد اتنی ظالم بھی ہو سکتی ہے کہ یکلخت کسی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ میرا بچہ کاشی کہاں چلا گیا تھا۔ کتنے نازوں سے پالا تھا۔ اسے میں نے گھر آتا تو گھستے ہی سب سے پہلے آواز دیا کرتا تھا۔ ام۔ میرے دل پر آرے چلنے لگے۔ خون کے فوارے ابل پڑے۔ میرے عنبری میری سیمی"۔ (۳)

مجموعی طور پر گہرے احساسات اور کھلی آنکھ سے مشاہدے کا حاصل سفر نامہ ہے۔

۱۔ نیلما بشیر بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۱
۲۔ ایضاً ص۔ ۱۰۸
۳۔ ایضاً ص۔ ۱۴۳

رضیہ فصیح احمد (دو تھے مسافر)

سفر زندگی کی ان گنت راستوں میں سے ایک راستہ ہے۔ جہاں سیاح بیدار آنکھ سے معاشرے کے خدوخال کو جزئیات کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ سیاح کا کام ہے کہ وہ ہر واقعے کا مشاہدہ فہم وفراست سے کرے اور اس کا بیان پورے بیک گراؤنڈ کے ساتھ کرے تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

کوئی سفرنامہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک اس میں تہذیب، معاشرت، تاریخ، مذہب اور زندہ کرداروں کے عادات ومسائل کا دخل نہ ہو۔ معاشرت کی دخل اندازی ہی سفرنامے کو رنگ آمیزی بخشتی ہے۔

رضیہ کا سفرنامہ ''دو تھے مسافر'' ایک دلچسپ روداد ہے ویزہ حاصل کرنے سے لیکر آخر سعودی عرب تک کہ جہاں ہم قدم بہ قدم اس کے ساتھ چلتے ہیں اور کبھی حیرت سے دوچار ہوتے ہیں کبھی دکھ سے اور کبھی نئے نئے لوگوں سے آشنا کہیں حسین مناظر سے اور کہیں تہذیب وتمدن سے۔

سفرنامہ دراصل ایک ایسی داستان ہے جو دل پر پہلے رقم ہوتی ہے اور کتابی شکل بعد میں اختیار کرتی ہے۔ رضیہ فصیح احمد صاحب نے جو سفرنامے تحریر کیئے ہیں ان میں خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ بیان میں سادگی ہو اور تحریر میں گہرائی ہو۔ تاکہ بہتر طور پر سیاحتی رنگ سامنے آئے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ رضیہ صاحبہ جہاں جہاں سے گذرتی ہیں۔ دوبئی ہو یا ابوظہبی وہ بڑے خوبصورت انداز میں ان کی تاریخ اور موجودہ صورت حال کی منظر نگاری کرتی ہیں کہ لفظوں کے ساتھ ساتھ منظر متحرک ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ آئرلینڈ، بیلجیئم، ہالینڈ وہ سب جگہوں کے مشہور مقامات کا ذکر آنکھوں سے دل میں اتارتی ہیں اور تب رقم کرتی ہیں جب انہیں پوری طرح معلومات فراہم ہوجاتی ہیں۔

فرانس کے ساتھ وہ سوئٹزرلینڈ کی خوبصورتی کی اتنی تعریف کرتی ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ ابھی وہاں کی راہ لو۔ ہالینڈ کا ویزا لینے جاتی ہیں تو وہ بھی انکار کردیتے ہیں۔ پھر انہیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بیلجیئم کونسلیٹ چلی جائیں تاکہ وہاں سے ہالینڈ کا ویزا مل جائے گا۔

رضیہ صاحبہ کو جب کافی تگ ودو کے بعد مختلف ممالک کے ویزے نہیں ملتے تو وہ خاصی مایوس ہوتی ہے لیکن اس مایوسی میں وہ طنز سے کام لیتی ہیں اور لکھتی ہیں۔

'' ویزا کیا ہوگیا عذاب جان ہوگیا۔ غضب خدا کا انکا ملک دیکھنے جاتے ہیں کہ وہاں کے

.........کی بہار، پون چکیاں اور پینٹنگز کب سے دامن دل کھینچ رہی ہیں مگر ان کو دیکھو کہ اس طرح ہم سے دامن بچا رہے ہیں جیسے کوئی عفت ماب بی بی کسی غنڈے بدمعاش سے یا کھاتے پیتے لوگ کسی فقیر سے کہ جاؤ بابا اگلا گھر دیکھو۔ شاباش ہے تم کو تمہارے ہاں مہمان نوازی اور اخلاق اسی کو کہتے ہیں۔ جی میں آئی کہ ایک دم ہی پھنکار کر کہوں رکھو اپنا ملک اپنے پاس، نہیں دیکھتے ہم آخر وہ ہمارے بزرگ ہی تھی جو درکعبہ وا نہ ہونے پر واپس چلے آئے تھے''۔ (۱)

خاصا خوبصورت اور زندگی سے بھرپور انداز بیان ہے لیکن نسائی رنگ کی جھلک بھی دکھاتا ہے کہ عورتیں خاص طور پر جب کوئی کام نہ ہو سکے تو دوسرے کو طعنوں دیکر مارتی ہیں اور جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی ہیں۔ یہی صورت حال رضیہ صاحبہ کی ہے کہ ویزا نہ ملنے کی وجہ سے بہت گلے شکوے کر رہی ہیں اور غالب کو بھی یاد کرتی ہیں جو الٹے پھر آ گئے تھے درکعبہ وا نہ ہونے پر لیکن رضیہ صاحبہ دل میں دنیا کی سیر کا ایسا جنون سمایا ہوا ہے کہ وہ باوجود اس کے کوشش جاری رکھتی ہیں۔

''میرا ایمان ہے کہ جو چیزیں ہم نے نہیں دیکھیں اور جو کیفیات ہم پر نہیں گزریں۔ ان سے متعلق الفاظ کے معنی ہم جانتے تو ہیں مگر سمجھتے نہیں ہیں اور جب کبھی ان کے معنی اچانک ابہام کی طرح نازل ہوتے ہیں۔ جو جی کو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ درختوں کے سائیں سائیں کرنے کا مطلب سردیوں کی راتوں میں مری میں سمجھ آیا۔ جبکہ چیڑ کے درختوں کو میں نے واقعی سائیس سائیں کرتے نہیں کہتے سنا۔ اسی طرح لق ودق صحرا، آدم نہ آدم زاد پرندہ پر نہیں مارتا، پانی کا نام ونشان نہیں ہم سنتے آئے اور حسب توفیق سمجھنے کا دعوی بھی کرتے رہے مگر اب پتہ چلا کہ دراصل ان الفاظ کے مطلب سے ہمیں آگاہی نہیں تھی''۔ (۲)

دراصل الفاظ کے مطالب ہونا یا ان کا استعمال موقع کے مطابق یہ سب تخلیق حسن کا نام ہے۔ ادب میں الفاظ کے استعمال کو فن کا درجہ حاصل ہے۔ عام سے الفاظ کو جب غزل کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو ایک نئی دنیا اور نئی جہتوں سے آشنا کرواتے ہیں۔ ادب داخلی وخارجی دونوں سطحوں پر کیفیات کے اظہار کا نام ہے۔ جسطرح سے رضیہ فصیح احمد نے یہاں خوبصورت انداز میں ایک نئے آہنگ کے ساتھ لفظوں کے مطالب کو واقعے کے ساتھ منسوب کر کے نئی حقیقت سے روشناس کرایا ہے۔ مثلاً

۱۔ رضیہ فصیح احمد دو تھے مسافر مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۹۶ ص۔ ۲۱

۲۔ ایضاً ص۔ ۳۹

''ابوظہبی کے نزدیک عجیب منظر ہے۔ بالکل انگوری رنگ کا پانی اور سیاہ کنارے سیاہ سڑکوں کے ربن پھر انگوری پانی میں گہرے فیروزی پانی کی ایسی خوبصورت ملاوٹ جیسے الگ لگ تالاب اور نہریں بنا کر ان میں جدا جدا رنگ کا پانی بھر دیا گیا ہو۔ پانی اتنا ساکن نظر آ رہا ہے جیسے پینٹ کر کے چھوڑ دیا گیا ہو۔ اب دور سے ابوظہبی نظر آ رہا ہے۔ دوبئی کی طرح یہ ابھی بن رہا ہے۔ دور سے بنتے ہوئے مکان یوں معلوم ہو رہے ہیں جیسے آثار قدیمہ ابو ظہبی دوبئی سے بڑا، عمارتیں بھی نسبتاً زیادہ اور بڑی ہے۔'' (۱)

رضیہ فصیح احمد نے منظر کی جمالیات اور اس کا حسن آنکھوں کے راستے جذب کیا اور پھر قلم کے ذریعے ہمیں یوں محسوس کروایا کہ مشاہدات کی نوعیت تخلیقی سفر نامہ نگاروں کے ضمن میں شمار ہونے لگی۔ ان کا مشاہدہ قوی اور بیان دلچسپ ہے۔ لیکن وہ تاریخ اور جغرافیے کو اس کے پورے پس منظری میں بیان کرتی ہیں۔ ان کا رویہ عام رویے سے مختلف ہے وہ واقعے کو حسی تجزیہ بناتے اور اسے صحت وصداقت کے ساتھ پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں مثلاً

'' فورٹ ولیم کے نام سے ہمارے ذہن میں کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج ابھرا۔ جہاں کے منشیوں نے فارسی اور عربی کی کتابوں کے آسان اردو میں تراجم کئے۔ فورٹ ولیم چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہ ولیم سوم کے نام پر ہے اور بن نیوس Ben Nevis کے سائے میں واقع ہے۔ یہاں ریلوے لاس بھی ہے۔ یا

''اوڈنبرا کا قلعہ جو ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ بے حد مشہور ہے۔ اس نے سارے اوڈبرا کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ پرانا شہر صرف اس پہاڑی تک محدود تھا۔ نیا شہر چرجین طرز کا ۱۹۷۶ء میں بنایا گیا۔ اس وقت سے اب تک اس کا شمار دنیا کے خوبصورت ترین شہر میں ہوتا ہے۔'' (۲)

تاریخ کو یوں بیان کرنا کہ اس میں تاریخی حقائق بھی صحیح نہ ہوں بہت بڑا فن ہے۔ اور اسی کے واقعاتی دلچسپی بھی برقرار رکھنا یہ اچھے ادیب کا کام ہے۔ عام ادیب اپنے سفرنامے میں اور تاریخ کے فرق کو روا نہیں رکھ سکتا لیکن رضیہ کا کمال ہے کہ انہوں ان دونوں کو ساتھ ساتھ نبھایا۔

اور ان کے اس بیان میں فکر ونظر کی بلندی اور گہرائی بھی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے اسلوب میں حسن آفرینی بھی نظر آتی ہے اور جاذبیت بھی۔ اس سفرنامے میں ابتدائی ویزا حاصل کرنے کی مشکلات تک ہمیں رضیہ فصیح احمد کی شخصیت نظر آتی ہے ورنہ انہوں نے اپنی ذات کو کم ہی ترجیح دی ہے۔

۱۔ رضیہ فصیح احمد بحوالہ سابقہ ص۔ ۴۰

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۱۷

سفرنامے میں مقام حسن کو بہت توجہ دیتے ہیں اور اغراض و مقاصد کے بغیر بے ساختگی اور تخلیقی حسن پر توجہ دیتے ہیں۔ ان کا انداز بیاں ڈرائنگ میں بیٹھ کر ہر سفرنامہ نگاروں جیسا نہیں ہے بلکہ وہ منظر اور پس منظر دونوں کا احاطہ کر کے قاری کو وہاں جانے پر اکساتا نظر آتا ہے۔ اور یہی چیزیں صرف اصل مناظر سے روشناس کرواتی ہے بلکہ ثبوت سفر بھی دیتی ہے کہ سیاح نے واقعی ہی ان مقامات کو مشاہدے اور مطالعے کی نظر سے دیکھا ہے۔

''بیلجیم کے دیہی کھیت پنجاب کی طرح ہیں۔ میلوں میل ہموار زمین پر کھیت ہی کھیت کہیں گیہوں سنہری ہو گیا کہیں مکئی لہلہا رہی ہے۔ کہیں گوبھی کے کھیت ہیں اور کہیں گائیں چر رہی ہیں۔ یہاں کی گائیں چتکبری ہوتی ہیں۔ سب کی سب کالا اور سفید افق پر اور کہیں کہیں کھیتوں کے درمیان درختوں کی قطاریں ہیں۔ اگر سرخ ٹائلوں کی ڈھلوان چھتوں والے گھر بھید نہ کھولیں تو آدمی یہی سمجھ لے کہ وہ پنجاب کے دیہات میں سفر کر رہا ہے۔ بیلجیم سے بلا روک ٹوک ہالینڈ میں داخل ہو گئے۔ ہالینڈ کو یورپ کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ اس کے مشرق میں مغربی جرمنی اور جنوب میں بیلجیم ہے۔''(۱)

رضیہ کے ہاں اظہار کا دھیما پن تو ہے لیکن اس کی وجہ سے منظر دھند میں غائب نہیں ہوتا۔ بلکہ منظر پوری طرح منکشف ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ خوبصورت جھیلوں اور دریاؤں کے بیان سے قاری کو سحر میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ مثلاً

''آئرلینڈ کی سرحد دیکھنے کا شوق نہ تھا۔ جھیلیں ساری ہی خوبصورت تھیں۔ لاک فن، لاک لانڈ، لاک نیں ہالا کا ہنس پر یاد آیا کہ اس میں ایک عفریت ہے بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے اس جھیل میں کہیں کہیں بے پایاں گہرائیاں ہیں جب اس کی تلاش میں نکلتا ہے تو وہاں جا کر غائب ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بے حد قدیم آبی جانور ہیں جسکی نسل اب ختم ہو چکی ہے۔''(۲)

خاتون ہونے کے ناطے وہ لباس کے رنگوں اور تراش خراش کو بھی فراموش نہیں کرتیں۔ بلکہ اس فیشن کے ساتھ یوں بیان کرتی ہیں کہ عورتیں اور پس منظر متحرک ہو کر سامنے ہو جاتا ہے کہ خود بخود بیزاری ٹپکنے لگتی ہے۔ مثلاً

''پاکستانی خواتین عجیب عجیب طرح کے کپڑوں میں ملبوس ہیں۔ ایک صاحبہ تیز نارنجی رنگ کی میکسی پہنے ہوئے ہیں۔ جس پر سرتا پیر سنہری کام کیا ہوا ہے۔ ایسا لباس عرب میں شاہد جشن تاجپوشی کے موقع پر پہنے جاتے ہوں۔ سفر میں کاہے کو کسی نے دیکھے ہوں گے۔ ایک صاحبہ شنیل کے سوٹ میں ہیں۔ اس پر بھی خوب کام کیا ہے۔ دمشق میں جسطرح یہ گرمی سے ہانپ رہی تھیں دیکھا نہ جاتا تھا۔ ایک صاحبہ تین عدد منی بچیوں کو لے جا رہی ہیں۔ خود تو خیر شلوار قمیص میں ہیں مگر بچیوں کو زندگی میں پہلی مرتبہ غالباً ریشمی میکسیاں پہنا دی ہیں۔ انہیں کا جگرا ہے کہ ان گھیر دار میکسیوں کو جھیل رہی ہیں۔''(۳)

۱۔ رضیہ فصیح احمد — بحوالہ سابقہ — ص۔ ۱۲۴

۲۔ ایضاً — ص۔ ۱۱۰

۳۔ ایضاً — ص۔ ۱۴۵

زندگی کے قدیم وجدید رنگ بھی دیکھتی ہیں۔ اوران پر تبصرہ بھی کرتی ہیں۔ مثلاً پون چکیوں کے بارے میں لکھتی ہیں'' یادش بخیر۔ اپنی پون چکیاں ان پون چکیوں کو دیکھنے کا کتنا ارمان تھا۔ پورے ہالینڈ میں اب بھی ۹۵۰ پون چکیاں ہیں۔ اب ان کا شمار آثار قدیمہ میں سہی مگر ان کے بغیر ہالینڈ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سبز میدانوں میں اپنے کالے پنکھ پھیلائے کھڑی بڑی خوبصورت لگتی ہیں جیسے بڑی بڑی تتلیاں یہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ہیں۔ ان سے ہالینڈ کی سمندر سے حاصل کردہ زمین سکھانے کا کام بھی لیا گیا ہے۔'' (۱)

رضیہ فصیح احمد اردگرد کے مناظر سے بے خبر نہیں ہیں۔ وہ سفر کرتے ہوئے اپنے ہمسفر مسافروں کے تاثرات لباس ریستوران دکانیں اور اوقات کار چوراہوں میں کھلے پھول مکانات ان کی طرز تعمیر رنگ، شکل، تاریخی مقامات غرض ہر چیز کا بیان ایک فلم کی طرح کرتی چلی جاتی ہیں اور یہ فراموش نہیں کرتی کہ میں معلومات کسی تاریخی معلوماتی کتاب کی طرح نہیں دے رہی بلکہ ادب کی چاشنی کے ساتھ ساتھ قاری کو اکتاہٹ کا احساس دلائے بغیر اس کے دل میں منظر اتارتا ہے کہ وہ اس میں دلچسپی لے۔ وہ مختلف شہروں کی آبادی، رقبہ، قدامت، مشہور عمارات سب کا ذکر بڑی خوبی سے کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ ہالینڈ کے پہاڑوں کی کمی کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ وان گاف میوزیم کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''وان گاف میوزیم بھی نزدیک ہی ہے۔ یہ جدید وضع کی عمارت ہے۔ جس میں دل کھول کر شیشہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے عالمگیریوں سے کہیں زیادہ روشن ہے۔ یہ میوزیم اس عظیم پینٹر کی شایان شان ضرور ہے مگر اسے دیکھ کر یہ خیال ضرور آتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے دن کس عسرت، بدحالی اور پریشانی میں کاٹے۔ یہاں تک کہ اس کا دماغی توازن بھی جاتا رہا۔ وان گاف کی زیادہ تر پینٹنگز اتنی جاندار اور زندہ ہیں کہ بیان سے باہر۔ اس کی زندگی اور فن کی ساری دیوانی قوت ان میں موجود ہے۔'' (۲)

رضیہ فصیح احمد انسانوں کے جذبات، احساسات، ثقافت و معاشرت تک رسائی کھلے بازوؤں سے کرتی ہیں لیکن بھرپور تجسس جب طمانیت میں بدل جاتا ہے تو وہ قاری کو بھی اس میں شریک کر لیتی ہیں۔ وہ راستے میں ہائیڈل برگ اور میونخ کے بارے میں بھی معلومات دیتی ہیں۔ اور فلورینس کے قومی عجائب گھر کے بارے میں بھی بتاتی ہیں اور سانتا کرچ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''Pan Theon of Italian Geniues'' جس کا ترجمہ میں نے اطالوی نابغوں کا خیالی قبرستان کیا سب سے پہلے تو یہی دنیا کا مشہور ترین مجسمہ ساز مائیکل اینجلو دفن ہے۔ فلورنس اس کا پسندیدہ شہر تھا۔ مائیکل اینجلو کا مجسمہ دیوار پر خاص بلندی پر نصب ہے۔ جس کی ناک ٹوٹی ہوئی ہے۔ نیچے تین عورتوں کے سمبل ہیں۔ یہ اس کی مشہور شاگردو

۱۔ رضیہ فصیح احمد بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۴۵

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۵۲

ساری کے بنائے ہوئے ہیں۔ درمیان میں مائیکل اینجلو کے پسندیدہ موضوع کی پینٹنگ ہے۔ یہ موضوع کرائسٹ کا صلیب پر سے اتارا جاتا ہے۔"(۱)

روم کے بارے میں زبردست تاریخی معلومات فراہم کرتی ہیں۔

"۲۷۔م۔ق۔ میں آگسٹس سیزر شہنشاہ بنا اور اس نے روم میں سب سے زیادہ عمارتیں بنوائیں۔ اس کا دعوی تھا کہ میں نے انکوا ینٹوں کا پایا۔ اور سنگ مرمر کا چھوڑا۔ اس زمانے میں سلطنت اپنے عروج کو پہنچی۔ ~~اسی زمانے سلطنت اپنے عروج کو پہنچی~~ اس زمانے میں خسرو اور ورجل اور ہوریس گزرے ہیں۔ اس کے بعد شہنشاہ آئے۔ ہنرو کا عہد ۵۴ سے ۶۴ عیسوی تک ہے۔ اس کے زمانے میں روم زبردست آتشزدگی کا شکار ہوا اور عیسائیوں کو اسکا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اس آتشزدگی کے بعد بھی روم ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا عہد وسطی کے روم کی ترقی کا سہرا عیسائیت کے سر بندھتا ہے۔"(۲)

آگے دیکھیں کیا منظر نگاری کمال ہے اور پورے جزئیات سمیت اسے بیان کیا گیا ہے کہ تشنگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

"اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ آسمان گہرا نیلا تھا۔ گھومتی ہوئی سڑک پر چڑھ کر ہم ایک بلند پہاڑی پر آئے۔ جہاں سے روم پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے لئے ہمیں اتارا گیا۔ ہم روم کو دیکھنے منڈیر پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دو لانبے سیاہ سائپرس کے بیچوں بیچ پورا چاند چمک رہا ہے۔ بالکل سرخ رنگ کا۔ اپنے ملک کے چاند کو ہم زیادہ سے زیادہ نارنجی کہہ سکتے ہیں۔ مگر روم کا چاند گہرا آتشی تھا۔ جسے سرخ کہہ لینے میں کوئی حرج نہیں اور اس کے پیچھے آسمان مارے نیلاہٹ کے سیاہ پڑا ہوا تھا۔ آپ مانیئے نہ مانیئے روم میں سارے رنگ ہمارے ہاں کے رنگوں سے گہرے ہیں۔ سڑکیں زیادہ کالی ہیں۔ کائی زیادہ سبزی مائل ہے۔ پتے زیادہ گہرے سبز ہیں۔ اگر زردی مائل ہیں تو وہ زردی بھی گہری ہے۔ پھول زیادہ گلابی یا زیادہ اودے ہیں۔ اس چاندنی رات میں روم کا منظر اس قدر دلنواز تھا کہ منڈیر سے ہٹنے کو دل نہ چاہتا تھا۔"(۳)

"ڈینیس (Deans Yard) میں کئی عمارتیں ہیں۔ سامنے ویسٹ منسٹر اسکول کی عمارتیں اور پیچھے ویسٹ منسٹر اپی (Abbey West Minster) یہاں زندہ شاہوں کو تاج پہنائے جاتے تھے اور مرجانے پر یہیں دفن کیئے جاتے تھے۔ سرشاہی شخصیات کے ساتھ وزرائے اعظم اور فیلڈ مارشل حضرات ہیں۔ گوشہ سخن وراں میں تھیکرے، ہینڈل، رکسن، گولڈ اسمتھ، پرنس، ورڈزورتھ، ٹینی سن، ملٹن اور چاسر وغیرہ دفن ہیں۔ بے چارے بائرن کو یہاں جگہ نہیں ملی تھی۔ ہمارے ساتھ ایک سیاح خاتون نے دیواروں اور زمین میں دفن ان گنجہائے گرانمایہ کے بارے میں کہا buriecrery) یہ تو ہر جگہ دفن ہیں۔"(۴)

۱۔ رضیہ فصیح احمد — بحوالہ سابقہ — ص۔ ۱۸۱

۲۔ ایضاً — ص۔ ۲۲۱

۳۔ ایضاً — ص۔ ۴۲۲

۴۔ ایضاً — ص۔ ۲۹۴

پاکستانی سیاح خواہ عورت ہو یا مرد۔ ایک تو اپنی غربت سے نہیں نکلتا۔ دوسرا ہمیشہ اسے یہ احساس کمتری کا رہا ہے کہ وہ دوسرے ممالک کی نسبت غیر ترقی یافتہ اور غیر تہذیب یافتہ ہے۔ یہی چیز رضیہ فصیح صاحبہ محسوس کرتی ہیں لکھتی ہیں۔

''صبح ہوئی تو دیکھا ماشا اللہ ہر طرف ہم وطنوں کی ریل پیل تھی۔ سامنے میز پر شلوار اودی قمیص اور گلابی چھاپے کے دوپٹے میں پی آئی اے کی پریاں بیٹھی تھیں۔ بہت سے ہم وطن ٹیڑھے بانکے صوفوں پر پڑے سو رہے تھے۔ ہم ننگے دونوں اور ننگے مجسموں کو دیکھ کر آ رہے تھے۔ اس لیے نگاہوں کو طہارت کی ضرورت تھی۔ ہم اپنے وطنوں کے پیر مٹی سے چیکٹ داڑھیاں بڑھی ہوئی۔ آنکھوں میں میل اور کپڑوں سے بدبو اٹھتی ہوئی شاید سارا معاملہ پیسے ہی کا ہے۔ یہاں کی ائیر لائن پیسے کم لیتی ہے مگر خوار خوب کرتی ہے۔''(۱)

اچھے بیان میں صرف تشبیہات و استعارات صوتی آہنگ، ترنم لہجہ یا منتخب الفاظ ہی کافی نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ بیان کو قابل تاثیر بناتے ہیں بلکہ اس کے لئے دلوں میں اثر کرنے کا سامان اور منظر کو بیان کرنے کی خوبی بھی ہونی چاہیے۔ جو ذوق حسن کو اجاگر کرے اور تخیل کی تشفی کرے۔ رضیہ فصیح احمد اس میں کامیاب ہیں۔ مثلاً

''سوئٹزر لینڈ دنیا کا خوبصورت ترین ملک ہے۔ بعض لوگ اس کو صحیح نہیں مانتے مگر ہم نے جتنے ملک دیکھے اس میں سوئٹزر لینڈ واقعی سب سے خوبصورت ترین ہے۔ اٹلی میں انسانی صفت گری کی بہتات تھی اور سوئزر لینڈ میں قدرت کی صناعی کہ سوئٹزر لینڈ میں زیادہ تر تصویروں میں برف پر زور ہوتا ہے۔ مگر گرمیوں میں سرسبز درختوں کے ڈھکی چوٹیاں، وادیاں گہری کھائیاں، اونچے سیدھے دھاگوں کی طرح گرتے آبشار اور جھیلیں کم دلکش مناظر نہیں ہیں۔ اتنی بلندی پر ایسے خوبصورت مناظر عجیب طرح دل کو گدگداتے ہیں۔ شاید پہاڑوں کی ہوا میں پائی جانے والی۔۔۔۔ کا یہی اثر ہوتا ہے۔ ہوا میں شراب کی تاثیر یہ شاعرانہ اصطلاح ہے یا اس میں کچھ سچائی بھی ہے۔ یہ تو اہل دل جانیں مگر اپنا تجزیہ یہ ہے کہ ایسی جگہ خواہ مخواہ ہنسنے اور مسکرانے کو جی چاہتا ہے اور فکر و پریشانی کا احساس زائل ہو جاتا ہے۔''(۲)

۱۔ رضیہ فصیح احمد بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۱۲

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۵۰

کوئی بھی زندہ قوم اپنے تاریخی ورثہ کی حفاظت کرنا نہیں بھولتی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے تاریخی ہیروز کو بھی ہمیشہ یاد رکھتی ہے۔ وہ زندگی کے کسی بھی میدان سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ چیز فرانس میں ہے اور یہی چیز پیرس میں نظر آتی ہے۔

> ''پیرس میں فرانس کی تمام مشہور شخصیتوں کے نام کی سڑکیں، گلیاں اور گودیاں ہیں۔ ویکارت، اناطول، فرانس، ایملی زولا۔ پراؤٹ وکٹریو۔ والٹیز ہانراک۔ میڈم کیوری اور گیری بالڈی وغیرہ۔'' (۱)

مجموعی طور پر سفرنامے میں نازک احساسات کے بیان کے ساتھ ساتھ زندگی کے تلخ حقائق، قوموں کا وجود و عروج وزوال اور انسانوں کے رویوں کے ساتھ ساتھ تاریخ وثقافت کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۔ رضیہ فصیح احمد بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۹۳

ذکیہ ارشد (سورج کے ساتھ ساتھ)

سفر نامہ نگار قدیم زمانے کو آنکھوں کے سامنے عیاں کرنے کے ساتھ ساتھ زمانہ حال پر بھی نظر ڈالتا ہے۔ موجود اور غیر موجود کا پورا ادراک رواں عصریت کے ساتھ آگے اور آگے قدم بڑھانا ہی علامت ہے زندگی کی۔ کچھ فراموش کیے ہوئے دکھ یا لوگ جب اذہان میں زندہ ہونے کے لیے زندگی میں تلاطم برپا کر دیں تو ہم اس کائنات کو ایک اور ہی طرح سے ایک اور ہی انداز سے ایک اور ہی جذبے سے دیکھتے ہیں۔ پھر ان میں کچھ مناظر زندگی کی تمام تر سچائیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت لیے ہوئے ہیں۔ اور پھر یہی دکھ فراق کرب اور اذیت تخلیق کا متحرک اور نارسائی کے دکھ کو لذت سے بھر دیتے ہیں۔

سورج کے ساتھ ساتھ ذکیہ ارشد کا مختلف نوع کا سفر نامہ ہے یہ بیشتر سفر ناموں کی طرح نہ تو افسانوی انداز لیے ہوئے ہے اور نہ ہی انسائیکلو پیڈیائی داد و دھش سے مبرا ہے۔ ذکیہ صاحبہ نے جو کچھ دیکھا اسے کھلے ذہن اور دل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اس میں فرانس اسپین مصر سعودی عرب اور جاپان کا سفر نامہ بیان کیا گیا ہے اور اس میں خاص طور پر اس عمل کو جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ آخر ان ممالک میں تبدیلی کا عمل کس طور ہو رہا ہے اور اپنے اندر بھی ملکی سطح پر کوئی صفاتی پہلوؤں کی کمی ہے کہ پاکستان ابھی تک ترقی پذیر ملک کی صف میں شامل ہے۔ ذکیہ ارشد خود لکھتی ہیں۔

''مجھے امید ہے کہ یہ سفر نامہ اپنی بے ساختگی اور بے ریائی کی بنیاد پر پسند کیا جائیگا۔'' (۱)

سب سے پہلے وہ فرانس کی طرف رواں دواں ہیں فرانس کو وہ تاریخی تنقیدی اور جمالیائی نقطہ نظر سے دیکھتی ہیں اور تجزیہ کرتی ہیں۔

> ''یہ ملک بھی عجیب ہے اس کے عوام عجیب تر یہاں کبھی گال آئے کبھی روسی۔ بڑے بڑے انقلاب آئے جنگیں ہوئیں اور اس صدی میں دو لڑائیاں ہوئیں لیکن اس سب کے باوجود ترقی کرتا رہا پہلے سے زیادہ بڑا صنعتی مرکز بن کر ابھرا سورج کے بلند ہوتے ہوئے شہر کی رونقیں بڑھ گئیں۔ چھٹی کی وجہ سے دکانیں تو بند ہیں لیکن تفریح گاہوں میں میلے کا سماں بندھ گیا ہے زیر زمین ریلوے سٹیشنوں پر اوپر کی دنیا سے بے نیاز ریلیں آ جا رہی ہیں دودھیا چمکتی روشنیوں میں ہر شے چمک رہی ہے۔'' (۲)

فرانس کے اس تاریخی تعارف کے بعد وہ فرانس کے یوم آزادی کا ذکر کرتی ہیں کہ لوگوں میں انقلاب کے بعد

۱۔ ذکیہ ارشد   سورج کے ساتھ ساتھ   مکتبہ دانیال لاہور ۱۹۹۴   ص۔ ۱۱

۲۔ ایضاً   ص۔ ۱۷۔ ۱۸

ایک نئی روح اور ایک نیا ولولہ پھونکا کہ فرانس کی حکومت مصر تک پھیل گئی لوگ اس آزادی والے دن موسموں کی سختی کی پرواہ کیے بغیر بارش سے بھیگتے ہوئے آتشبازی دیکھنے گھروں سے جوق در جوق نکل رہے ہیں اور اسکی وجہ سے لوگوں کے چہرے بھی گلنار ہو گئے ہیں ہر طرف رنگ برنگی روشنیوں کے دائرے پھیلے ہوئے ہیں لوگ خوشی میں رقص کر رہے ہیں اور جھومتے ہیں شہر میں میلے کا سماں ہے۔ ذکیہ ارشد لکھتی ہیں۔

''آج چودہ جولائی ہے اور فرانس کا یوم آزادی جسے یہ باسل ڈے Bastilday کہتے ہیں چودہ جولائی ۱۹۷۹ کو پیرس کے لوگوں نے انقلاب برپا کر دیا اور پھر یہ تحریک تمام ملک میں پھیل گئی اور اس کے نتیجے میں بادشاہت ختم ہوئی۔ جمہوریت کی بنیادیں پڑیں لیکن ان بنیادوں میں ان گنت لوگوں کا خون شامل ہے۔ اب یہ دن تہواروں سے بھی زیادہ جوش وخروش اور خوشی سے منایا جاتا ہے اس دن عام چھٹی ہوتی ہے ہم بھی صبح ہی صبح شانزے لیزے پر پریڈ دیکھنے پہنچ گئے۔''(۱)

پنولین کو فرانس میں خاصی اہمیت حاصل ہے کہ اس نے فرانس کی پیشانی پر فتح کا جھومر سجایا اور اپنی ذہانت ومحنت کی بدولت نہ صرف دس سال تک یورپ پر قبضہ جمائے رکھا بلکہ لوگوں کے اندر بھی ایک نئی روح اور ولولہ پھونکا۔
ذکیہ ارشد نے زندگی کے پہلوؤں کو تہذیب ومعاشرت اور تمدن کی بنیادوں پر پرکھا ہے۔ لکھتی ہیں سپین کو دیکھ کر احساس ہوا۔

''یہ اس قوم کی تاریخ کا باب ہے جس کی عظمتوں کی داستانوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ یہ وہ سرزمین ہے جس کے ہر ذرے پر ہمارے بزرگوں کی عظمت کی داستانیں نقش ہیں۔''(۲)

ذکیہ ارشد نے ان تاریخی مقامات کو زندگی سے ملا کر کچھ یوں دیکھا کہ زندگی کے شوخ رنگ اپنی تمامتر حشر سامانیوں کے ساتھ ان کے سفرنامے میں جلوہ فگن ہیں۔ وہ زندگی کے رنگوں کو اپنی سوچ اور اپنے فکر کے آئینے میں منعکس کرتی ہیں۔ ایک عورت ہونے کے ناطے وہ ہمیشہ یہ دیکھتی ہیں کہ ملک کی خوشحالی یا بدحالی کے اسباب کیا ہیں۔ اور اس کے اثرات عمومی زندگی پر کس طرح مرتب ہوتے ہیں۔

''اسپین کی سول وار نے ملک میں غربت وافلاس پھیلا دیا تھا ہنرمند لوگ ملک چھوڑ کر باہر چلے گئے تھے اب ان کی دولت آنے سے حالات بدل رہے ہیں۔ فرانس کی سی خوشحالی یہاں ناپید ہے لوگوں کا لباس گھر دکانیں چال ڈھال بتا رہی ہے کہ ان کی زندگی

۱۔ ذکیہ ارشد بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۲

۲۔ ایضاً ص۔ ٦٨

آسان نہیں ہے فرانس کی فی سکرٹ یہاں آتے آتے گھٹنوں سے نیچے لٹک گئی ہے خوبصورت سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والی لڑکیاں سیاحوں کو اپنی اپنی دکانوں کی طرف بلا رہی ہیں یہاں اسپین کی گڑیاں چھوٹی بڑی گٹار دف ڈھولک سیپ اور موتیوں سے بنی چیزیں بک رہی ہیں۔'' (۱)

ذکیہ ارشد کا مشاہدہ گہرا اور عمیق ہیں کہ وہ نہ صرف سیاح کی نظر سے دیکھتی ہیں بلکہ پرکھتی بھی ہیں کہ زندگی کے نشیب وفراز سے درد کی لذت کیسے پیدا ہوتی ہے وہ اصل حقیقت کو بیان کرنے کے لیے تصنع کی بجائے خلوص اور صداقت سے کام لیتی ہیں۔ کہ نظر کی تہہ تک وہ منظر کشید ہو جاتا ہے۔

''چوراہوں پر سڑکوں کی نکروں پر یا بڑی بڑی دکانوں کے باہر کچھ عمر رسیدہ آدمی گٹار بجاتے نظر آئیں تو سمجھ لیجیے کہ وہ شوقیہ نہیں بجا رہے بلکہ اس کے عوض چند سکے چاہیں تو وہ بظاہر سوٹ بوٹ پہن لیتے ہوں گے لیکن کوٹ کے کالر کی میل اور پتلون کے پیوند انکی مالی حالت ظاہر کر دیتے ہیں۔'' (۲)

زندگی کی عظمت کو سمجھنا اور پھر صبر و رضا کے ساتھ گذارنا بہت مشکل امر ہے لیکن اس میں مایوسی راستے میں حائل نہیں ہوتی بلکہ صبر و رضا کا درس دیتی ہے۔ ذکیہ ارشد کے سفرنامے میں نہ صرف حالات و واقعات سے خود متاثر ہونے کی صلاحیت ہے بلکہ وہ دوسروں کو بھی متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مصر ایک قدیم ملک ہے وہاں کی تاریخ حضرت عمر فاروق کے دور سے بیان کرتی ہیں اور حضرت عمر فاروق نے ایک خط جو دریائے نیل میں ڈالا تھا کہ لوگوں کے بقول چونکہ قربانی ممنوع قرار دیدی ہے اس لیے پانی میں روانی نہیں آتی اس کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ کے اوراق کچھ یوں پلٹتی ہیں۔

''اللہ کے بندے عمر (امیر المومنین) کی جانب سے مصر کے دریائے نیل کے نام''

''اے نیل اگر تو پہلے رواں تھا اور اب رواں نہیں ہے اور اگر واحد القہار تجھے رواں کرتا ہے تو ہم اس معبود سے یہ التجا کرتے ہیں کہ وہ تجھے جاری کر دے حضرت عمر کا رقعہ دریائے نیل میں ڈالا گیا تو دوسری صبح دریا کا پانی اپنی گہرائی سے سولہ گز اوپر چڑھ آیا اور پھر مصر میں اس خشک حالی کی نوبت آج تک نہیں آئی۔'' (۳)

۱۔ ذکیہ ارشد بحوالہ سابقہ ص۔ ۶۹
۲۔ ایضاً ص۔ ۶۸
۳۔ ایضاً ص۔ ۸۴

اگرچہ اس واقعے کو شامل نہ بھی کیا جاتا تو ہر مسلمان جانتا ہے لیکن انہوں نے اپنے تاریخی معلومات کے بارے میں بھی مستند بیان کو لکھنا پسند کیا۔ اس طرح فرعون کے بارے میں لکھتی ہیں کہ یہ فرعون اعظم خونو کا مقبرہ ہے جسے سقارا کا نام دیا گیا ہے۔

''فرعون کے معنی ہیں سورج دیوتا کی اولاد قدیم اہل مصر سورج کو جوان کا میا دیو یا رب اعلی تھا ـــ کہتے تھے اور فرعون اسی کی طرف منسوب تھا۔ اہل مصر کے اعتقاد کی رو سے کسی فرماں روا کی حاکمیت کے لیے اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ رع کا جسمانی مظہر اور اس کا ارضی نمائندہ ہو اس لیے ہر شاہی خاندان جو مصر میں برسر اقتدار آتا تھا اپنے آپ کو سورج و ینسی بنا کر پیش کرتا اور ہر بادشاہ جو تخت نشین ہوتا فرعون کا لقب اختیار کر کے لوگوں کو یقین دلاتا کہ تمہارا رب اعلی میں ہوں۔'' (۱)

اس سفرنامے میں چونکہ پانچ ملکوں کی روداد شامل ہے اور ذکیہ نے خاص کوشش کی ہے کہ تخیل کی بجائے حقیقت پر زور دیا جائے اور اپنے تاثرات کو سادہ اور رواں زباں میں قاری کے سامنے پیش کیا جائے اور قاری پڑھتے ہوئے متحرک مناظر کو محسوس کرے یہی وجہ ہے۔ کہ ان کی حقیقت پسندانہ سچائی نے اس سفرنامے کے حسن میں اضافہ کیا ہے اور ان کا سفرنامہ شخصی اور غیر رسمی ہے۔ ان کے ہاں بے ساختگی اور برجستگی دونوں خصوصیات نظر آتی ہیں فطرت نگاری یوں کرتی ہیں۔

''گاڑی سمندر کے ساتھ ساتھ چلتی رہی اونچی نیچی ڈھلوانوں پر سبزے سے ڈھکے گھر دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں اس علاقے کو اللہ نے سبز مخملیں لباس نسب فیاضی سے عطا کیا ہے۔ ریڑھیوں پر جگہ جگہ انجیر زیتون اور انگور پک رہے ہیں لیکن سارڈین مچھلی تب تھی کچی پکی بھنی تلی ہوئی ہر قسم کی مل جاتی ہے دوپہر کھانے کے وقت ہر چیز بہ آسانی دستیاب ہے۔'' (۲)

اس بیان سے نہ صرف ذکیہ ارشد کے ذوق پھل کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کھانے کی رغبت اور انداز کا بھی پتا چلتا ہے۔

''وہ مرقع نگاری کے فن سے بھی آشنا ہیں۔ کیونکہ سچا فن کار زندگی سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا آج سب مرد عورتیں بچے رنگ برنگے کپڑے پہنے سروں پر ٹوپیاں لیے یا سکارف

۱۔ ذکیہ ارشد بحوالہ سابقہ ص۔ ۸۵

۲۔ ایضاً ص۔ ۶۹

باندھے لوگ ہاتھوں میں ہاتھ تھامے رقص کی صورت میں گرجا کی طرف جارہے ہیں۔ میلے کا سماں ہے اور یہ رونق دس بجے تک ختم ہوئی آج زیادہ تر دکانیں بند ہیں لیکن فٹ پاتھوں پر تحفے بیچنے والے اپنی دکانوں کی رونق بڑھا رہے ہیں اپنے اپنے مال کی نمائش دیدہ زیب طریقوں سے کر رہے ہیں۔''(۱)

اب ذکیہ ارشد ایک ایسے سفر کی طرف گامزن ہیں۔ کہ جہاں جانا مسلمان کی ازلی وابدی خواہش ہے۔ جو کبھی قلق بن جاتی ہے اور کبھی کرب کا روپ دھارتی ہے لیکن مرکز ایک ہی رہتا ہے۔ دل ونگاہ کے لیے سکون بس وہی ہے سفر بھی وہی ہے اور معراج سفر بھی وہی نشان بھی وہی ہے اور نشان منزل بھی حاصل زندگی بھی یہاں ہے اور متاع درود وسوز وآرزومندی بھی ذکیہ ارشد بھی یہاں پہنچ کر روحانی تجربے سے دوچار ہوتی ہیں اور سکون کی ایک نئی منزل سے آشنا ہوتی ہیں ایسا سکون کہ جس کی تلاش میں صدیوں کی بے قراری کاٹی اور اب ایک پل میں نصیب ہوا تو اپنی کم مائیگی کا احساس انسان کے پور پور میں سما جاتا ہے۔

''تقدس بھری خاموشی درود وسلام کی ہر طرف سے گنگناہٹ ایک مسحور کن خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی یہ وہ مقام ہے جہاں بندے کا تعلق دنیا سے ٹوٹ کر رشتہ صرف اللہ اور رسول سے رہ جاتا ہے ابلیس کے پر یہاں آنے سے پہلے جل جاتے ہیں وہ باہر بازار میں منتظر بیٹھا ہے کہ کمزور دل کے لوگ آئیں اور وہ انہیں دبوچ لے۔''(۲)

ہر حاجی کی طرح وہ بھی یہاں کی تاریخ توسیع مسجد اس کی لمبائی چوڑائی اور کس کس خلیفہ کے دور میں توسیع کے بعد امہات المومنین کے گھر شامل کیے گئے سب کی تفصیل بتاتی ہیں حتیٰ کہ ستونوں کی تعداد رنگ لمبائی چوڑائی ستونوں کے گرد سبزی جالیاں محرابیں خوبصورت خطاطی سب کا ذکر بڑی عقیدت واحترام سے کرتی ہیں۔ ریاض الجنہ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''ریاض الجنہ اور روضہ پاک کے سامنے لوگ انکساری سے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں اپنے گناہوں سے توبہ آنسو ہی آنسو دل کی میل دھل دھل کر آنکھوں کے ذریعہ بہہ رہی ہے یہاں اندر کی میں اور انا دونوں سو گئی ہیں صرف پگھلا موم بچا ہے۔ کاش ہم ان آنسوؤں میں سے صرف ایک آنسو بچا کر اپنے ساتھ لے جائیں یہ ایک قطرہ دلوں کے میل دھونے کو بہت ہے۔''(۳)

آخر میں وہ کہتی ہیں کہ جاپان کا نام بچپن سے دادی اماں سے سنا تھا۔ ابھرتے سورج کی اس سرزمین کا ذکر وہ خاندانی حوالے سے شروع ہو کر یہاں کی ترقی تک لے آتی ہیں۔ وہ جاپان جس کے لوگ اپنے آپ کو سورج دیوتا کی اولاد سمجھتے ہیں انسان جوازل سے متحرک رہنے کا خواہش مند ہے اور اسی حرکت نے اب دنیا کو سمیٹ کر چھوٹا کر دیا ہے۔ یہ سب انسان کے اندر کی روح کرواتی ہے تو پھر جاپان کیونکر دسترس سے باہر ہوسکتا ہے وہ جاپان کو آتش

۱۔ ذکیہ ارشد بحوالہ سابقہ ص۔ ۷۲۔ ۷۳

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۱۴

۳۔ ایضاً ص۔ ۱۵۸

فشاں پہاڑوں کا ملک کہتے ہیں۔ وہ جاپان جس کے شہر ناگاساکی پر امریکہ نے ایٹم بم گرا دیا جو دوسری عالمی جنگ میں جرمنی اور اٹلی محوری طاقتوں میں شامل تھا جاپان کو ایشیا کا شہنشاہ بھی کہا جاتا ہے۔ مذہب کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''گوتم بدھ کے پیروکار ہمالیہ کی بلند و بالا چوٹیوں پر اپنے معبد بناتے ہیں چین کے میدانوں میں تبلیغ کرتے بحرالکاہل کے سمندروں میں تیرتے جاپان جا پہنچے اور اپنے اوتار گوتم بدھ کو شنتو کے مقابل کھڑا کر دیا اور جاپانی قوم نے گوتم بدھ کو بھی اپنے مندروں میں خوشی خوشی آباد کر لیا اب وہ دونوں کی پرستش کرنے لگے۔''(۱)

جاپان میں کھانے کے فن میں ایک خاص مہارت کی ضرورت ہے پھر ذکیہ ارشد خاتون ہونے کے ناطے خاص دلچسپی اور تفصیل سے یہاں کا حال لکھتی ہیں۔

''کمونو پہنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے تیز تیز چلتی یہ خادمائیں میز پر جلدی جلدی انگھیٹھیاں رکھ رہی تھیں۔ مہمانوں کے میز پر بیٹھتی ہی یہ چولہے جلا دیے گئے اور برتن میں پانی کھولنے لگا۔ اس میں گوشت کے باریک خوبصورتی سے کٹے ہوئے ٹکڑے تنکوں کی مدد سے ڈالے گئے ایک آدھا ابال آنے پر انہیں ہماری پلیٹوں میں رکھ دیا گیا اور اس ابلتے پانی میں کچھ سبزیاں وغیرہ ڈال دی گئیں اس ڈش کو شابو شابو کہتے ہیں اور یہ بہت خاص اور مہنگی ہے اس گوشت کی تعریف یہ ہے کہ جس بچھڑے کا یہ گوشت ہے اسے پانی کی بجائے شراب پلائی جاتی ہے اور اسے خاص اسی لیے پالا جاتا ہے۔''(۲)

جاپانیوں نے پھولوں پتیوں اور ٹہنیوں کی سجاوٹ کو فن لطیفہ بنا دیا ہے اس فن کو جاپانی زبان میں اکیبانا کہتے ہیں اور یہ فن پاکستان میں بہت مشہور ہو رہا ہے یہ فن جاپانی بدھ مت کے مخصوص فلسفیانہ تصورات کو علامتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ انہی میں سے ایک فن Rika کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''رکا کی آرائش کا آغاز اس تصور سے ہوا تھا کہ پھولوں کو ایسے طریقہ سے سجایا جائے کہ شوی سین یعنی بدھ مت کے ماننے والوں لے مقدس پہاڑ جو دنیا کی مانند ہے کی نمائندگی ہو سکے اس آرائش کو اکثر گھر میں ایک چھوٹے باغ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ قدرتی مناظر کی نمائندگی کے لیے درختوں کی مختلف چیزیں استعمال کی گئیں ہیں۔ چٹانوں اور پتھروں کی علامت ظاہر کرنے کے لیے صنوبر کی شاخیں دریاؤں اور چھوٹے چشموں کے پانی کے لیے گل داؤدی دھوپ و چھاؤں اور موسم کے مختلف رنگ بھی منتخب پودوں کو ان کی مناسب جگہوں پر ترتیب دے کر پیش کیے جاتے ہیں۔''(۳)

۱۔ ذکیہ ارشد بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۷۲

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۷۵

۳۔ ایضاً ص۔ ۱۹۲

جاپان کے ساتھ ساتھ وہ وہاں کے خاص خاص مقامات کے بارے میں اس طرح معلومات فراہم کرتی ہیں کہ سفرنامہ پڑھتے ہوئے کسی قسم کی الجھن کی بجائے جاپان کی تمام تاریخ کو ہمارے سامنے روشن کرتی چلی جاتی ہیں مثلاً جاپان کا مردہ آتش فشاں فیوجی کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ''یہ وہی فیوجی ہے کہ جس کا لاوا جب بہہ نکلا تو اس نے بہت تباہی و بربادی مچادی۔لیکن اس تباہی و بربادی کیساتھ ساتھ وہ وہاں کے دلنشیں نظاروں کو بھی فراموش نہیں کرتی بلکہ ان کا بھی تفصیلی حال بین کرتی ہیں۔

ہاکونے میں سب سے بڑی جھیل آنتی نوکو ہے یہ وادی کوہ فیوجی اور سطح مرتفع ازو ۱۱۲۴ کے درمیان سرسبز پہاڑوں سے گھری ہے اس وادی کی خوبصورتی پر نظمیں بے شمار لکھی گئی ہیں یہ گرم پانی کے چشموں کی وجہ سے بھی بہت مشہور ہے میتا توشیتا اپنے گرم پانی اور ذکیہ ارشد پوری سچائی کے ساتھ مسلمانوں کی قلبی وردات اور ذہنی روداد کا ذکر کرتی ہیں۔اور ایک اچھے ماہر امراض کی طرح اس کو بیان کردیتی ہیں۔لیکن انکے بیان میں کرب کی کیفیت نمایاں ہے کہ وہ ایسا دیکھنا نہیں چاہتی جیسا کہ ہورہا ہے۔

''لیکن حرم سے باہر آتے ہی ہم کیوں بدل جاتے ہیں وہ انکساری عاجزی دل کا درد سب اندر کی چوکھٹ پر چھوڑ آتے ہیں۔باہر آتے ہی حرص لالچ بدکلامی غصہ سب کہاں سے آجاتے ہیں۔یہ سب Tetage کی کرامات ہیں افراط زر کا کرشمہ ہے اب در حبیب پر اور اللہ کے گھر جانے کیلیے راہ کی دشواریاں اور صعوبتیں ختم ہوگئی ہیں۔پہلے ان مقامات پر صرف اور صرف وہی لوگ جاتے تھے جن کے دلوں میں حقیقی اللہ اور رسول ﷺ کی محبت ہوتی تھی وہ راستے کی مشکلات کو خاطر میں نہیں لاتے تھے بلکہ اپنے مولا کی خوشنودی حاصل کرنے کیلیے تن من دھن کی بازی لگاکر سر سے کفن باندھ کر اللہ کی راہ میں قربان ہونے کیلیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔پائی پائی رخت سفر کیلیے جمع کرتے تھے اب تو صرف لوگ سوچتے ہیں اور پہنچ جاتے ہیں۔''(۱)

ذکیہ ارشد کا یہ تجربہ کسی حد تک درست ہے کہ لوگ حرم سے نکل حسد کینہ بغض جیسی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں لیکن اب بھی وہ لوگ ہیں جو بنا کے سر کو قدم چلتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ یہ راستہ کوئی اور ہے۔اور وہاں کے ذرے ذرے میں سماکر اپنی دلی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔جواب بھی اسی ڈر سے کھلی آنکھ سے مکمل نظارہ نہیں کرتے کہ کہیں بے

۱۔ ذکیہ ارشد، حوالہ سابقہ، ص ۲۳-۲۴

ادبی نہ ہوجائے۔ جوآج بھی ان گلیوں میں قدموں کے نشان ڈھونڈتے ہیں کچھ آج بھی اس خوشبو کومحسوس کرتے ہیں اور کچھ آج بھی دیارنبی میں پاک ﷺ کو چلتا پھرتا محسوس کرتے ہیں آج بھی مسجد نبوی سے حضرت بلال کی اذان کے منتظر ہوتے ہیں آج بھی سبز گنبد انہیں صرف اور صرف رحمت نظر آتا ہے۔

ذکیہ ارشد نے اپنے سفرنامے میں اسلوب کے بہترین نمونے فراہم کیے ہیں یہ ان کا اردوادب سے لگاؤ اور ان کے مشاہدے کی دلیل ہے کہ وہ لفظوں کا استعمال موقع محل کے مطابق جانتی ہیں مثلاً انہوں نے اپنے سفرنامے میں اپنی بات سمجھانے کے لیے بعض جگہوں پر موقع محل کے مطابق محاورات کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا ہے مثلاً کیفے ہاؤس کے اندر لوگ گتھیاں سلجھائے ملیں گے۔

سیاح بھی اکا دکا ہی ہوں گے

اپنے اپنے مال کی نمائش دیدہ زیب طریقوں سے کررہے تھے

ان میں لفظوں کا استعمال اور پھر محاورے کے ساتھ نہ صرف بیان میں زور پیدا کررہا ہے۔

بلکہ اسلوب کا حسن نکھر کر سامنے آ گیا ہے۔

لفظوں کی تکرار سے ذکیہ ارشد نے اپنے فقروں میں موسیقیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً ''یہ اس سرزمین کی ہوائیں ہیں جن کی عظمت کی داستانیں یہاں کے ذرے ذرے پر لکھی ہیں۔

''یا لوگ جوق در جوق فوج میں بھرتی ہوکر اس کا ساتھ دیتے رہے چھوٹے چھوٹے چوکور پتھروں کی بنی سڑکیں یا ریڑھیوں پر جگہ جگہ انجیر زیتون اور انگور بک رہے تھے۔''(۱)

اس کے علاوہ بھی آتے آتے بڑی بڑی جلدی جلدی چلتے چلتے اپنی اپنی لہکتے لہکتے جیسے الفاظ بھی استعمال کیے مجموعی طور پر خوبصورت سفرنامہ ہے۔

۱۔ ذکیہ ارشد بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۳۔ ۲۷

ثریا حفیظ الرحمن (جس دیس میں گنگا بہتی ہے)۔

ثریا حفیظ الرحمٰن کا سفر نامہ ہندوستان کی جیتی جاگتی دنیا کا ایسا عکس ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ سفر نامہ نہیں بلکہ کوئی دستاویزی فلم ہے جو متحرک ٹی وی پر نظر آ رہی ہے اور ہم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک جاندار سفر نامہ ہے جو پڑھنے کے بعد دیر تک قلب ونظر پر نہ صرف اثر پذیر رہتا ہے بلکہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ہم اس خطہ ارضی کی قدر نہیں کرتے جہاں ہم باعزت زندگی گزار رہے ہیں یہ خداوند کریم کی خاص نظر عنایت ہے کہ ہمیں اس نعمت سے نوازا۔

ثریا حفیظ الرحمٰن کے خاوند کی ہندوستان میں بطور اے پی پی کے نمائندے کی حیثیت سے ۶۵ء کی جنگ کے بعد پہلی تعیناتی تھی اور وہاں جا کر انہیں جو تجربات ہوئے انہوں نے سفر نامے کی صورت میں پیش کر دیے وہ 1979 سے ۱۹۸۵ تک اپنے خاوند کے ساتھ تقریباً چھ سال تک مقیم رہیں اور ان کے رسم ورواج کا بغور مشاہدہ کیا اس مشاہدہ کا عکس اس سفر نامے میں نظر آتا ہے۔

پروفیسر پریشان خٹک صاحب لکھتے ہیں۔

> ''یہ سب کچھ من وعن اسی رنگ میں ریکارڈ کیا گیا ہے جو ان کے مشاہدے اور تجربے میں آیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کا مشاہدہ ایک عام آدمی سے کہیں زیادہ گہرا ہے اور ہر چیز کو دیکھنے میں انہوں نے انتہائی بصیرت کا ثبوت دیا ہے اور پوری غیر جانبداری سے نہایت ہی حسین انداز میں سب کچھ ریکارڈ کیا ہے اگر کسی کو شک ہے تو جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھے یا خدا کو حاضر وناظر جان کر کسی بھی مشاہدہ کی تردید کرے ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ پاکستان بننے سے اب تک جو کام کروڑوں پاکستانی نہ کر سکے وہ ایک خاتون نے کر دیا۔''(۱)

پریشان خٹک صاحب کی رائے حقیقت پر مبنی ہے کہ ثریا صاحبہ نے واقعی ہندوستان کے حالات کی صحیح تصویر کشی کی ہے۔

دہلی کے ساتھ ہماری ہی نہیں ہماری اردو ادب کی قدیم وابستگی ہے اور ہم اپنا ادبی آغاز وارتقاء یہیں سے تلاش کرتے ہیں۔ ثریا حفیظ دہلی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

۱۔ پروفیسر پریشان خٹک تبصرہ، جس دیس میں گنگا بہتی ہے بک ٹاؤن اسلام آباد 1995 ص۔ ۹

''شہر دہلی جس نے قرنوں میں کئی سلطنتیں اور کئی تہذیبیں ابھرتی مٹتی اور حصار و فصلیں بنتی ٹوٹتی دیکھیں اس کے کوچے اور بازار اس کے محلات و مینار اس کے قلعوں کے کھنڈرات مسجدوں اور مندروں کے در و دیوار اور ان کے شکستہ آثار شہر کے اندر اور باہر دور اور نزدیک قدیم زمانوں سے نمایاں ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس کے ساتھ اس شہر قدیم کا علاقہ نہ رہا ہو۔ ہندو ادوار میں اساطیری داستانوں کے مطابق کبھی سیتا پور کے نام سے مشہور ہوا۔ اندر پرستھ (اندر پریت یا اندر پت) کہلایا اس شہر کے گرد قدیم زمانوں کے کھنڈرات اور خرابے نظر آتے ہیں۔ جن پر کئی ادوار میں دہلی شہر بسا اور اجڑا انہی شہروں کی پرانی بنیادوں پر مسلم سلاطین نے کبھی کسری شہر کی بنیاد رکھی کبھی فیروز آباد کبھی دین پناہ کبھی تغلق آباد کبھی شاہجہاں آباد اور کبھی فیروز شاہ کوٹلہ اور پھر نئی دہلی کے شہر بسائے غرض یہ کہ دو ہر کہ آمد عمارت ت و ساخت''(۱)

صدیوں پر محیط داستان اور تاریخ کو یوں کوزے میں سمیٹ کر بنایا ہے کہ تمام تاریخ اور بادشاہان وقت سامنے گئے یہی نہیں وہ دہلی کے در و دیوار سے لیکر اس کے گلیوں کا بھی تجزیہ کرتی ہیں اونچی اونچی عمارات آرٹ گیلریاں لائبریریاں پارلیمنٹ ہاؤس ہوٹل بنک قبرستان اور سلطان التمش کے آب رسائی کے انتظام کا بھی ذکر ہے لیکن اہم چیز یہاں کے مکین ہیں وہ سیاہ و سفید دونوں روپ سامنے لائی ہیں

لیکن ایک بات پاکستانی سیاح امریکہ چلا جائے ہندوستان چلا جائے یا حتی کہ مکہ بھی چلا جائے تو وہ مقابلہ ہمیشہ اپنی سرزمین سے ہی کرے گا مکان سے لے کر مکین تک اور زندگی سے لے کر موت تک اس کے حدنظر ہمیشہ پاکستان اور پاکستانی رہے مثلاً ثریا حفیظ صاحبہ لکھتی ہیں۔

''دہلی میں جہاں ایک طرف خوابناک ٹھنڈے آنند بھون جیسے محلوں میں دھن و دولت میں کھیلنے والے براہمن اور ہندو سیٹھ جاہ و جلال سے رہتے ہیں وہیں بھوک و ننگ اور غربت کے مارے انسان اپنی زیست کی تگ و دود میں کیڑے مکوڑوں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک میں جو دنیا کی چوتھی بڑی طاقت بھی ہے یہ تضاد معاشرتی بے انصافیوں کی علامت ہے دہلی کا موسم اجلا سویرا چمکیلی دوپہریں اور دھندلی شامیں تقریباً لاہور شہر جیسی ہیں ان دونوں شہروں میں ایک مماثلت مغلیہ عمارت کی ہے۔''(۲)

سیاح دنیا کے کسی بھی حصے میں چلا جائے وہ ہمیشہ اپنے ملک کو یاد کرتے ہیں۔ کیونکہ اپنا ملک اس کے لوگ اس کی

۱۔ ثریا حفیظ الرحمٰن جس دیس میں گنگا بہتی ہے ص۔ ۴۷

۲۔ ایضاً ص۔ ۵۰

ہوائیں موسم خواہ سرد ہوں یا گرم دل و دماغ میں ایک تازگی اور رونق بخشتے ہیں۔

اس قلعے نے دور اقتدار سے ہی تغیر و انقلاب دیکھنے شروع کر دیے تھے اسی قلعہ نے شاہجہاں کا جلال و جمال اورنگزیب کا دبدبہ وطنطنہ دیکھا اسی قلعہ میں نادر شاہ درانی قہر خداوندی بن کر نازل ہوا۔ اسی قلعہ کے در و دیوار نے محمد شاہ رنگیلے کو ذلیل وخوار ہوتے دیکھا۔ یہیں غلام قادر روہیلہ نے اپنے بے بس آقا شاہ عالم کی آنکھیں نکالیں۔ اسی قلعہ کو مرہٹوں نے پامال کر کے سارے زر و جواہر لوٹ لیے اسی قلعہ کے مرمریں ایوانوں میں مغل شہزادوں کے کٹے ہوئے سر آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو پیش کیے گئے اور یہیں سے بہادر شاہ ظفر جلاوطن ہوئے۔

بیگم ثریا خاتون ہونے کے ناطے معاشرتی رسم و رواج پر بھی گہری نظر رکھتی ہیں بلکہ شادی بیاہ کی رسمیں تو عورت ہی احسن طریقے سے بیان کرتی ہے ثریا حفیظ صاحبہ یہاں منڈپ میں جاتی ہیں تو اس کا پورا حال بین کرتی ہیں لیکن افسوس ناک صورت حال اس وقت سامنے آتی ہے جب یہ راز کھلتا ہے۔ کہ ہندو قوم تو لیکھوں کی بھی بیوپاری ہے۔ دولہا کی باقاعدہ ایک قیمت ہوتی ہے اور اخبار میں دولہوں کی پوری لسٹ درج ہوتی ہے جس میں ڈاکٹر انجینئر فوجی افسر وکیل جج وغیرہ کی قیمت پانچ لاکھ اور ایک معمولی چپڑاسی کی قیمت پچیس ہزار تک لکھی تھی۔ اور جہیز کی لسٹ بھی عہدے کے مطابق دی جاتی ہے۔ مثلاً

> ''وہاں دولہوں کی بولی لگتی ہے چکاچوند کر دینے والی روشنیوں سے بیاہ منڈپ سجاتے ہیں اور پھر جہیز کی بیوی پری کومل دلہنیں جلا دی جاتی ہے۔ ہندو اپنی سیتا اور ساوتری کو بھی نہ چھوڑا۔۔۔۔ اپنی مہرانیوں اور دردپدی اور دمینتی کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا۔ ہندو استری اپنے جان و مال سمیت اپنے پتی اور اس کے پریوار (خاندان) کی داسی ہے وہ سپتری ہے تو روگ پتنی ہے سوگ اور ودھوا ہے تو جوگ۔۔۔۔ اس کا جیون ہی پتا پتی اور پتر کے گرد گھومتا ہے کڑھنا اور جلنا اسکے لیکھ ہیں دھرم کے انورسار سے اس کی اپنی اچھائی نہیں وہ کٹھ پتلی ڈوری ہے آنکھوں سے اندھی ہے کانوں سے بہری بس ایک ڈور سے بندھی جیسے چاہو نچالو۔''(۱)

ہندو مذہب ذات پات اور رسم و رواج کا ایک گورکھ دھندا ہے بچے کے پیدا ہوتے ہی رسم و رواج کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جنم نام کرن مونڈن رسم شادی بیاہ رسوم کریا کرم حتی کہ آواگون غرض اس قسم کے کے ہزاروں ہی رسومات ہیں جن میں سارا ہندوستان اس بری طرح جکڑا ہوا ہے کہ اس سے نکلنا بے حد مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔

''ہندوؤں کی دنیا بھی کبھی ہولیوں اور پرچھائیوں کی دنیا ہے دیومالائی دیویوں اور دیوتاؤں

۱۔ ثریا حفیظ الرحمن بحوالہ سابقہ ص۔ ۷۷

کی دنیا شرک اور کفر کی دنیا توہمات کی دنیا۔۔۔جنم جنم کے حلیوں بھوت پریتوں کی دنیا
!!!!اور جھانک کر دیکھو کفر کی دنیا۔'' (۱)

ثریا حفیظ الرحمٰن امرتسر کے بارے میں لکھتی ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے پاکستان سے بھارت اور بھارت سے پاکستان آنے والوں کو یہاں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ امرتسر کی تاریخ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''چار سو برس پہلے سکھوں کے چوتھے گورو رام داس نے امرتسر شہر کو امرتسر کا نام ملنے سے پہلے اسے گورو کا چک کہا جاتا تھا اسے رام داس پور بھی کہتے ہیں اس مقام کے قریب ایک چھوٹا سا جوہر تھا جس میں بابا گورونانک نے غسل کیا تھا۔'' (۲)

ثریا صاحبہ یہاں گولڈن ٹیمپل اور جلیانوالہ باغ کی بھی سیر کی۔ اسی دوران ایک حادثہ ہوا کہ اندرا گاندھی وفات پا گئے اور ہندوستان کے حالات بہت کشیدہ ہو گئے۔ اس سفرنامے میں ایک باب بعنوان چنڈال پوری ہے جس میں مسلمانوں کے حالات نہایت ہی کشیدہ دکھائے گئے ہیں۔

اس میں وہ پہلے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے دربار پر اکبر بادشاہ کی حاضری اور پھر راجہ بہاڑ امل کی بیٹی جو شہنشاہ اکبر کی رانی جودھا بائی کہلائی اور جن کے بطن سے شہزادہ سلیم (جہانگیر) پیدا ہوا اور پھر ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم و ستم کی داستان تفصیل سے بیان کرتی ہیں کہ ا (ترکمان گیٹ) ایک مسلمانوں کی بستی میں جب بلڈوزر پھرایا گیا تو کیا حالت ہوئی۔

''ترکمان گیٹ میں جب بلڈوزر پھرے تو یہ بیوی بچوں کو لے کر بمبئی سیر کرانے گیا ہوا تھا پیچھے اماں باوا ایک چھوٹا بھائی اور دو بہنیں گھر سے نہ نکلے۔ بلڈوزروں نے گھر کے ساتھ سب کو مٹی میں ملا دیا پیسہ زبوں حال گھر گرہستی سب مٹی کے برابر ہو گئے جب یہ واپس آیا تو صدمے سے بالکل پاگل ہو گیا۔ بچوں کو لے کر مکانوں کے تباہ شدہ ڈھیروں کے اوپر بیٹھا روتا چلاتا رہتا ایک دن۔۔۔ پولیس والے ٹرک میں ڈال کر یہاں چھوڑ گئے۔ باجی کیا کیا سنائیں کیسی کیسی قیامتیں ہم پر ٹوٹی ہیں۔ اب اس بیچارے کو ٹی بی ہو گئی ہے گھر میں کوئی اور کمانے والا بھی نہیں۔ بیوی نے اپنی سونے کی چوڑیاں اتار کر دیں اور ہم سب رشتے داروں نے پیسے ڈال کر اس کے گھر کے اوپر ایک بنوا کر کرائے پر اٹھوا دیا تا کہ بچوں کے لیے دال روٹی چلتی رہے۔ بیوی قسمت کی ماری خود محنت مزدوری کرتی ہے۔ بچے چھوٹے چھوٹے ہیں بیچاروں کا آگے پیچھے کوئی سگا سوتیلا بھائی بندہ بھی نہیں سرکار نے اس کا کمرہ بھی چھین کر کسی آدمی کو آلاٹ کر دیا ہے اوپر سے اس پر جائیداد ٹیکس بھی لگا دیا ہے کہ تمہارے پاس بہت پیسہ ہے جو گھر کے اوپر کمرہ بناتے ہو۔'' (۳)

۱۔ ثریا حفیظ الرحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۱۴
۲۔ ایضاً ص۔ ۱۱۸
۳۔ ایضاً ص۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷

آج کا دن دہلی ہی میں پورے ہندوستان میں منحوس دن تھا کہ اس دن اندرا گاندھی کے لاڈلے سپوت سنجے گاندھی طیارے کے حادثے میں جاں بحق ہوا۔تو گویا ہندوستان کا ان داتا مر گیا۔لیکن نچلے طبقے پر اس نے ذاتی طور پر اتنے ظلم وستم کیے تھے کہ وہ لوگ خوش تھے کہ اسے مہاراج سے بھگوان نے جان بچائی مسز حفیظ کے گھر ایک کام کرنیوالی آئی تو اس کے جزبات کی عکاسی یوں کرتی ہیں۔

''بدھائی ہو میم صاحب ! کاہے کی بدھائی میں نے حیرت سے پوچھا آپ کو پتہ نہیں چلا اندرا دیوی کے راکھش پتر کا دھانت (انتقال) ہوگیا ہے سنا ہے وائی جاج کے ایکسیڈینٹ میں مرا ہے (ہوائی جہاز کے ایکسیڈینٹ میں مرا ہے) پھتی پھتی ہوگیا ہے

> ''بری بات ہے کملیسو !مرنے والوں کو اس طرح نہیں کہتے ۔۔۔۔۔تم نہیں جانو میم صاحب !اس نے تو مسلمانوں کیساتھ مسایوں (عیسائیوں) اور ہریجنوں کی بھی نس بندی کروادی تھی۔''ہندوؤں کی دنیا بھی کیسی ہوسوں اور پرچھائیاں کی دنیا ہے دیومالائی دیویوں اور دیوتاؤں کی دنیا شرک اور کفر کی دنیا تو ہمات کی دنیا۔۔۔۔قسم قسم کے بھوت دیوتاؤں کی دنیا شرک اور کفر کی دنیا تو ہمات کی دنیا۔''(۱)

اس طرح سے ثریا حفیظ الرحمٰن جہاں ہندو معاشرے کی مذہبی رسومات اور انتم یاترا (موت کی رسمیں) کی دو تعریفیں کرتی ہیں وہی وہ اس بات کی بہت تعریف وتوصیف کرتی ہیں کہ ہندو معاشرے میں جبر اور انتظار پاکستانی قوم سے کہیں زیادہ ہے۔وہ دکھ تکلیف یا سکھ اور خوشی میں آپے سے باہر ہوکر نہ تو حکومت کو دوش دیتے ہیں نہ اپنے تیں برا بھلا کہتے ہیں بلکہ سب کچھ قسمت کا لکھا سوچ کر قبول کرتے ہیں۔اور معاشی طور پر یہ ان کے لیے سکون اور سکھ کا باعث ہوتا ہے۔وہ بھارت کے بارے میں رائے دیتی ہیں۔

> ''بھارت میں آبادی کا بے پناہ دباؤ ہے غربت اور بے چارگی کی انتہا ہے لیکن عام لوگ صابر وشاکر ہیں۔ان میں ادھیرج ہے ٹھہراؤ اور قناعت ہے کوئی بڑے سے بڑا آدمی ہو یا چھوٹے سے چھوٹا کسی بات پر برا یا بھلا نہیں کہتا۔اپنے کو کوسنے دیتا ہے نہ حکومت کو تنگ کرتا ہے یہ بات زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہے۔ہر ہندو نیا پن کی حد تک کفایت شعار ہے۔عام زندگی میں نمائش بہت کم ہے ہاتھ جوڑ کر مکینوں کی طرح کوئی سہولت ہے تو خوشی کا اظہار نہیں اور اگر تنگی تنزلی ہے تو کسی قسم کی شکایت حرف زبان پر نہیں'' (۲)

۱۔ ثریا حفیظ الرحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۲۵

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۰۲

یہی نہیں بلکہ وہ گھنٹوں کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرتے ہیں اور دھکم پیل نہیں ہے صبر ہے۔
سفرنامے میں ایک باب شاپنگ سیری کے نام سے ہے اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ پاکستانی قوم جب وہاں سے واپس آتی ہے تو کتنی بڑی بڑی رقوم کی شاپنگ کرتی ہے جو ہمارے لیے شرمندگی اور ندامت کا باعث ہے مثلاً باب کا آغاز یوں کرتی ہیں۔

''ابھی تو جیولری کی پے منٹ کرنی ہے دو لاکھ تو جوڑوں پر ہی صرف ہو گئے ہیں اب پاکستان سے مزید رقم کا انتظار کرنا پڑیگا اور کارڈوں کا کیا کیا کنور صاحب نے پوچھ لیا۔ وہ جی پرسوں تک مل جائیں گے آپ لوگوں کے لیے کارڈ میں یہیں دے جاؤں گی۔'' (۱)

ایک خاتون مسز ڈار ہندوستان میں مسز ثریا کی مہمان بنی ان کی کسی دوست نے ہندوستان سے خریداری کی تھی اور ایک شال فروخت کروانے کے لیے دوکان دار کو دے گئی تھی۔ جو کہ خردل باغ کی ایک مشہور دکان تھی وہاں جا کر انہیں وہ شال تو مل گئی لیکن ثریا صاحبہ کو خاصی شرمندگی ہوئی۔

''بہن جی کیا بتائیں معاف کیجیے گا دکان دار نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا آپ کے ہاں پاکستانی بیبیوں کی تو مت ہی ماری گئی ہے پیسہ تو ایسے پھینکتی ہیں جیسے کچرا ہو۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ ایک انٹیک (Antique) ہے ہم نے شال شوکیس میں شوپیس کے طور پر لگائی تھی۔ ایک پاکستانی سیٹھانی جی کو پسند آ گئی۔ لاکھ سمجھایا کہ خریدنے کے قابل نہیں نہایت قدیم شوپیس ہے۔ لیکن وہ کسی صورت نہ مانیں اور بیس ہزار روپے میں خرید کر لے گئیں۔ ہم اپنی دکانداری خراب نہیں کرنا چاہتے پرانی شال ہوٹل پہنچتے ہی مسک گئی الٹے پاؤں واپس آئیں کہ اب رفو کروادو۔ پورے تین ہزار روپے رفو پر لگے۔ ہماری تو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کا کیا کریں گی۔ پاگل پن کی انتہا ہے ویسے انہوں نے طوش اور پشمینے کی ڈیڑھ لاکھ کی شال خرید کی تھی۔'' (۲)

اس کے علاوہ پاکستانی خواتین لاکھوں روپے کی شاپنگ کرتی ہیں اور آخر میں ادھار مانگ کر انہیں غلط ایڈریس دے آتی ہیں اور ہر پاکستانی سے اسکا ذکر کرتے ہیں بلکہ سید جونیئر پی۔ آئی۔ اے میں دہلی ایئر پورٹ مینیجر تھے انہیں پاکستانی سفارت کاروں کے ادھار چکانا پڑا لیکن پٹھان بچے نے رقم دکاندار کے منہ پر ماری اور ایسی حرکتوں سے

۱۔ ثریا حفیظ الرحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۴۱
۲۔ ایضاً ص۔ ۱۸۲

پاکستانی پاک لوگوں کے نام وناموس کو دھبہ لگاتے ہیں۔ مثلاً ثریا حفیظ 'جھونگا' کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''ایک ہندو دکاندار نے سرگوشی کرتے ہوئے میرے میاں سے کہا تھا یہ پاکستانی مہلائیں ٹھیکروں کی طرح بے حساب روپیہ خرچ کرتی ہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بعد میں جھونگا کیوں مانگتی ہیں پھر اس نے دھرم کی قسم کھا کر بتایا آپ کے ہاں کی ایک بہت بڑی آرٹسٹ نے جو خود کروڑوں میں کھیلتی ہے یہاں دہلی اور بمبئی میں جی بھر کر لاکھوں کی شاپنگ کی اور بعد میں ہنستے ہوئے فرمایا کہ بھئی اب ہمیں جھونگا بھی دونا' صاحب ہمیں تو بڑی شرم آئی ہم نے کہا آپ ہماری بہن جی ہیں یہ ساری دکان آپ کی ہے ہمارے بھاگ جو آپ جیسی دھتوان ہمارے دورے پر آئی ہیں۔ آپ ہاتھ رکھیں کون سی ساڑھی چنی شال یا کوئی لہنگا چولی آپ کو پسند ہے وہ ہم آپ کو اپنے طرف سے دیں۔''(۱)

پاکستانی عوام ایک غیر ملک اور وہ بھی دشمن ملک جا کر اپنی اتنی بے عزتی کرواتے ہیں اور لوگ بھی وہ جو صرف کروڑوں کے مالک ہیں بلکہ دھن و دولت حسن کے ساتھ ساتھ پاکستان میں ایک مقام رکھتے ہیں۔

یہاں ہمیں ثریا کی اس بات پر متفق ہونا پڑے گا کہ انہوں نے دشمن ملک کی ذہنیت کا ہی جائزہ نہیں لیا بلکہ امیر لوگوں کی غریب ذہنیت جو کہ پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں ان کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے کہ وہ ذرا سے فائدے کے لیے ملک کی عزت اور ذاتی انا اور خودداری کو داؤ پر لگا دیتے ہیں صرف نفس کی تسکین کیلیے۔

ہندو قوم انتہا سے زیادہ توہم پرست ہے اس توہم پرستی کو سائنسدان حقیقت حال جاننے کے باوجود ختم نہ کر سکے اتنا علم بھی ان کو اوہام پرستی کی حدود سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکا حتی کہ نئی نسل بھی اس چکر سے آزاد نہیں ہے۔

''''ہندوؤں میں چاند گرہن اور سورج گرہن کی بڑی اہمیت ہے جب چاند یا سورج کو گرہن لگتا ہے ہندو دھرم کے مطابق چاند اور سورج نہایت کشٹ (مصیبت) میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کا اثر زمین پر رہنے والے لوگوں پر پڑتا ہے اور اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے ہندو جاتی طرح طرح کے توڑ کرتی ہے اس خاص وقت میں ہندو لوگ اوہام پرستی کی حدود کو بھی پھلانگ جاتے ہیں۔''(۲)

ہندوستان میں اب بدھ مت تو تقریباً ختم ہو چکا ہے اور ہندو جائتھ کے مطابق سورج گرہن ان کے کرم کانڈ ھا کے لیے ایک شبھ اوسر یعنی نیک ساعت ہے لیکن بدھ مت تقریباً ختم ہے۔ اب تو سارا چکر دھن دولت کا ہے اور بدھ یاتریوں کو نجات کی راہیں سمجھا جاتا ہے۔

''ہندوستان میں بدھ مت کو جب تک راجوں مہاراجوں کی سرپرستی حاصل رہی

۱۔ ثریا حفیظ الرحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۹۱

۲۔ ایضاً ص۔ ۳۳۵

وہ خوب پھلا پھولا ۔۔۔۔۔راجاؤں کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑی تو براہمن چڑھ دوڑا۔اسنے بدھ مت کو دوحصوں میں تقسیم کروایا ۔ہنایانہ (Hinayana) اور ماہیانہ (Mahayana) اول الذکر جو کہ بدھ کوایک ایفارمر سمجھتے تھے وہ صرف اس کی تعلیمات پر قائم رہے انہیں تو ہند کے برہمن نے اپنے ملک سے بالکل نابود کردیا آخر الذکر کواپنی سرپرستی میں لے کر مہاتما بدھ کو دیوتا بنا کر اسکی مورتی کی پوجا شروع کروادی اورآہستہ آہستہ بدھ کے ماننے والوں کو بت پرستی میں غرق کردیا ہے۔''(۱)

ڈلہوزی جو کہ ثریا حفیظ الرحمٰن کی جائے پیدائش ہے وہ وہاں پر اس ماحول پہاڑی فضا کو محسوس کرنے جاتی ہیں کہ جس میں انہوں نے اپنے والدین کے ساتھ اچھا وقت گزارا تھا اور جنم بھومی تو ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے اور ایک حساس ذہن رکھنے والی ادیبہ کو تو وہاں کے چپے چپے سے پیار تھا لیکن وہ اس فضاؤں ہواؤں ٹھنڈک بادلوں بارشوں کا ذکر اتنے خوبصورت پس منظر کے ساتھ کرتی ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم سیر کر رہے ہوں وہ ڈلہوزی کی تاریخ کو بھی فراموش نہیں کرتیں۔

''ڈلہوزی ۔۔۔۔لارڈ ڈلہوزی کا آباد کردہ شہر سطح سمندر سے۲۰۶ میٹر اونچائی پر ۔۔۔۔سلسہ کوہ دھولدار میں پانچ پہاڑیوں پر مشتمل ہے بیلوں ۔۔۔۔Balan کا ٹھکام یالکڑی منڈی Kathlog پترین Potreyn سہرا Tehral بکروٹہ Bakrota جن میں بے انتہا خوبصورت وادیاں گھنے جنگلات میں بل کھاتی پگڈنڈیاں ! ان وادیوں کے گہرے سرمئی شہابی پہاڑوں کے درمیان چناب بیاس اور راوی بہتے ہیں دریائے چناب کا پانی جتنا گدلا ہے دریائے راوی کا پانے اتنا ہی اجلا شفاف اور دودھیا ہے۔ چمکیلے سنہرے دنوں میں جب آسمان صاف ہوتا ہے تو ڈلہوزی کے سرمئی شہابی پہاڑوں کے دامن میں واقع وادیوں میں چناب راوی اور بیاس گزرتے ہوئے نہایت دلفریب نظارہ پیشکرتے ہیں۔''(۲)

اس سفرنامے میں تاریخ بھی ہے۔اور تہذیب بھی معاشرت بھی اور تمدن بھی مذہب بھی اور ثقافت بھی لیکن سب سے بڑھکر ممتا کے جذبات بھی کہ جو ہر چیز پر حاوی ہیں۔ماں ماں ہوتی ہے صدیوں پرانی بھی اور آج کی پڑھی لکھی بھی وہ ترقی کی کتنی منزلیں طے کرلیں۔قلم کے سہارے ساری دنیا کو اسیر وتسخیر کرے لیکن بچے اس کی ازلی وابدی مجبوری ہیں اور پیار کی چھایا بھی سہارا بھی اور مان بھی شان بھی عزت بھی اور سب سے بڑھکر جوانی کا غرور اور گھر کا تحفظ بھی مسز ثریا حفیظ کے بچے جب ڈلہوزی میں پہاڑ پر چڑھ جاتے ہیں تو وہ پریشان ہوجاتی ہیں۔اور یہ سب کچھ اس لیے کہ وہاں پر شیر چیتا اور بھالو ہوں گے اس راجیہ میں سیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ثریا صاحبہ لکھتی ہیں۔

۱۔ ثریا حفیظ الرحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۱۷

۲۔ ایضاً ص۔ ۳۴۹

''میرے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے میں بھاگ کر پتھروں کو پھلانگتی اوپر چڑھنے لگی حفیظ ایکدم اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے نیچے سے میرے دونوں پاؤں اپنے ہاتھوں میں سختی سے جکڑ لیے رک جائیں اوپر نہیں چڑھیں گر جائیں گی۔ پریشانی کی ایسی کیا بات ہے بچہ ہے۔ مارے تجسس کے اوپر چڑھ گیا ہے ابھی واپس آ جائے گا حفیظ نے مجھے سخت پریشان دیکھ کر دلاسا دیا۔نہیں۔۔۔۔نہیں حفیظ یہ سارا علاقہ تو جنگلی درندوں کا مسکن ہے اور یہ آبی گزرگاہ یہاں تو جانے کتنے کچھار درندوں سے بھرے پڑے ہوں گے کسی گھنے پیڑ سے کوئی چیتا جھپٹ پڑا تو۔۔۔۔میرا سارا جسم کپکپائے جا رہا تھا ایک منٹ۔۔۔۔دو منٹ دل اچھل اچھل کر منہ میں آنے لگا۔حفیظ میرا بیٹا۔۔۔۔؟ میرے ہاتھ پاؤں سن ہوئے جا رہے تھے اور مجھے یوں لگا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔''(۱)

یہی وہ جذبہ ہے کہ جس کی وجہ حضورﷺ نے تین مرتبہ فرمایا تیری ماں' تیری ماں' تیری ماں اور پھر تیرا باپ کہ پہاڑ لمحوں سے گزرتے ہوئے ماں کی ذات کلی کے دو پاٹوں میں سے گزر کر سرمہ ہو جاتی ہے اور باپ پہاڑ کی اس کھائی کی مانند کہ جس کے درمیان سے قافلے والے گزرتے ہوئے مر بھی جائیں تو وہ آسانی سے ہضم کر جاتا ہے۔لیکن قدرت بہتر جانتی ہے اس لیے اس نے مردوں کا حوصلہ پہاڑوں جیسا اور ماں کی ممتا کا جذبہ گھنیرے درختوں کی چھاؤں جیسا کہ جو ہر چیز کو سایہ بخشتی ہے اور آرام وسکھ دیتی ہے۔

آخر میں وہ چنبہ گئے اور اس وادی کا تعارف بڑی تفصیل سے کروایا وہاں کی مصنوعات لباس بازاروں میں بکنے والی ہینگ عورتوں کے زیورات مذہب رہائش جمعہ بازار اور اس میں سب سے حیرت انگیز چیز عورت کی نیلامی جو کہ ناقابل یقین ہے لیکن حقیقت سے نظریں چرانا مشکل ہے ثریا لکھتی ہیں۔

''ہمارے ہاں کے جمعہ بازاروں کی طرح چنبہ میں بھی ہر مہینے ایک بڑی منڈی لگتی ہے جس میں مقامی اور غیر مقامی مصنوعات کے بازار سجتے ہیں ہر قسم کی مصنوعات کے علاوہ بکنے والی قابل ذکر جنس 'عورت' ہے منڈی میں باقاعدہ ایک بازار عورتوں کی نیلامی کے لیے بھی لگتا ہے جسے مقامی زبان میں 'معاملہ' کہا جاتا ہے منڈی ماہوار بازار کے علاوہ بھی عورت کو عام دنوں میں بازار سے جا کر بیچا جا سکتا ہے بڑی بڑی بولیوں کے ساتھ بھی اور نہایت قلیل قیمت پر بھی عورت خریدی جا سکتی ہے حد یہ ہے عورت سوا روپے تک بک جاتی ہے۔''(۲)

اور یہ ہے کہ خریدار کی بھی کوئی تخصیص نہیں اس ارزاں جنس کو جانوروں کی طرح سے انگ انگ سے دیکھا اور پر

۱۔ ثریا حفیظ الرحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۶۱

۲۔ ایضاً ص۔ ۴۱۹

پر لکھا جاتا ہے ثریا صاحبہ یہاں کے میلوں اور تہواروں کے بارے میں بھی بڑے تفصیل سے لکھتی ہے۔حتی کہ جھیل کی خوبصورتی کہ جس کا نام منی مشش (Meani mashesh) مشہور ہے یہاں کے مشہور باغ پھل اور پنڈتوں کی عیاشیوں بھی ان کی نظر سے پنہاں نہیں ہیں۔لیکن وہ مقامی لوگوں کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔

''مقامی لوگ نہایت معصوم سیدھے سادھے فلاکت زدہ بالکل گمشدہ حیوانوں کے ریوڑوں کی طرح گلیوں اور بازاروں میں مارے مارے پھر رہے تھے دولت میں کھیلنے والے راجہ کا پریوار اور غیر مقامی سیٹھ لوگ اونچے پہاڑوں کی ڈھلانوں پر سفید براق اور سنہرے چمکیلے بھوں اور بنگلوں میں آ کاش پرتنی دھنک پر جھول رہے تھے وہ اوپر سے اتر کر سیدھے چوگان کے میدان کے ساتھ واقع عالیشان کمرشل سینٹر میں گھس جاتے ہیں یا دریا کے کنارے بنے پارکوں میں چہل کر کے کسی آ فاق مخلوق کی طرح اوپر اپنے محلوں میں روپوش ہو جاتے ہیں۔''(۱)

ثریا حفیظ الرحمٰن کا تجزیہ مشاہدہ اور تحقیق کی حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے وہ نسائی انداز رکھنے کے باوجود ہر چیز کے حسن سے ہی متاثر ہوتیں بلکہ حقیقت تک رسائی تاریخ اور ادب کے سنگ یوں ملا کر بیان کرتی ہیں کہ ہم ان کے اسلوب بیان کے ساتھ ساتھ ان کی وسعت نظر کے بھی قائل ہو جاتے ہیں مثلاً :-

''چنبہ دلکش مناظر طلسماتی حسن کا مرقع ہے جہاں جگہ جگہ گیروئے کپڑوں والے جوگی اپنی اپنی پٹاریاں کھولے بیٹھے ہیں۔چنبہ میں جوتشیوں اور لیکھ بیوپاریوں کا شہر ہے جس کے بازاروں میں کوڑیاں اور موتی ایک ساتھ بکتے ہیں حسن بکتا ہے۔۔۔۔لیکھ بکتے ہیں چنبہ مندروں اور شوالوں کا شہر ہے بتکدوں کے جھرمٹ میں شوا کے مندر۔۔۔۔۔وشنو کے مندر۔۔۔۔۔چنڈی کے ڈیرے اور جانے کون کونسے خداؤں کے معبد ہیں۔ماتھے پر قشقے کھینچے سرخ آنکھوں والے پنڈت اپنے اپنے بھگوان سے اپنے اپنے شوالوں میں بھگتوں کی پوجا کرواتے ہیں۔بوڑھے برگدوں کی چھایاں میں جٹادھاری سادھ یوگی دھوتیاں ۔۔۔۔۔آس لگائے ساکت وجامد بیٹھے رہتے ہیں بازاروں میں کھڑتالیں بجاتے سنکھ پھونکتے ننگے بدن بھبھوت ملے سادھو شور مچاتے گزر جاتے ہیں ودھیالوں میں پنڈت پرویت برہمچاری کا سیان کرتے ہیں۔

''چنبہ۔۔۔۔۔جوگیوں۔۔۔۔۔سادھو رشی منیوں پنڈتوں پروہتوں اور مندروں شوالوں کا سینٹر ہے۔چنبہ۔۔۔۔ہندو قوم ہندو کلچر۔۔۔۔ہندو معاشرت۔۔۔۔بالکل ہندو شہر ہے۔''(۲)

۱۔ ثریا حفیظ الرحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۴۲۲

۲۔ ایضاً ص۔ ۴۴۳

ثریا حفیظ الرحمٰن اس میں ہر وہ برائی بیان کر دی ہے جو کہ ہندو معاشرے میں پائی جاتی ہے لیکن اس انداز میں کہ گراں بھی نہ گزرے اور تمام حقائق بیان بھی کر دیے جائیں لیکن یہ سب عام سیاح کے بس کا روگ نہیں ہے اور نہ ہی یہ سرسری جائزے سے ممکن ہے یہ برسوں کا تجربہ اور عمیق مشاہدہ بول رہا ہے۔ اسلوب بیان کے لحاظ سے یہ سفرنامہ ایک ایسے اسلوب کا حامل ہے کہ جس کی وجہ سے صدیوں کی تاریخ و تہذیب یوں اجاگر ہوتی ہے کہ لفظ خود اپنے مقام کو پہنچاتے ہیں۔ لکھتی ہیں۔

> ''ہند کے گوشے گوشے میں جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنے عجائب خانے حیرت کدے تعمیر کئے صدیوں کی گرد اور موسموں کی عریاں کاری بھی ان آثار کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی ۔ مسلمانوں کی چکاچوند کر دینے والی تہذیب و ثقافت جو بھارت ورش کے ہر ذرے میں رقص کناں ہے وہ ایٹم کی طرح ہندو کا سینہ شق کر رہی ہے۔ چپے چپے پر مسلمانوں کے بنائے ہوئے شاہکار دیکھ کر ہندو تڑپ تڑپ جاتا ہے۔ وہ بھارت کے طول و عرض میں بکھرے مسلمانوں کے عجائبات کھونا بھی نہیں چاہتا اور رکھنا بھی نہیں چاہتا۔ شاہوں کے استخوانوں پر کھڑی پرشکوہ عمارات و مقابر انہیں زرمبادلہ کے ذخائر دلانے کے باوجود آسیب بن کر ان سے چمٹی ہوئی ہیں نادر و نایاب شاہکاروں سے مزین محلات اور قلعے ہندو کو سحر زدہ کیے ہوئے ہیں مسلمانوں کے یہ آثار سونے کی سنہری کلغی والے دولت کے شیش 'ناگ'' بن کر بنئے کے سینے پر لوٹتے ہیں اور وہ دھوتی پوش اپنے ملک میں اپنا کوئی نشان اپنی کوئی پہچان نہ دیکھ کر تلملاتا ہے۔''(۱)

ثریا صاحبہ کا کمال ہے کہ انہوں نے اتنے گہرے اور غم انگیز واقعات کو کتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ مجموعی طور پر سفرنامہ منفرد انداز نظر رکھنے والا اور خوبصورتی کے ساتھ نسائی انداز میں بیان کیا ہوا سفرنامہ ہے۔

۱۔ ثریا حفیظ الرحمٰن ، بحوالہ سابقہ ، ص ۔ ۲۲۵

رضیہ فصیح احمد (سیر کر دنیا کی)

زمانہ قدیم سے لے کر آج تک سفرنامے مختلف ممالک کی تہذیب وتمدن معاشرت تاریخ وثقافت کا حال بتاتے اور محفوظ کرتے ہیں۔اس میں تصویر کے دونوں رخ ہوتے ہیں۔اچھے بھی اور برے بھی۔وطن سے دوری ایک ایسا احساس ہے کہ اپنوں کی محبت اور وطن کی محبت بھرپور جذبے سے جاگ اٹھتی ہے اور سیاح بیرون ملک کی ہر چیز کا موازنہ ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے وطن کی ہر چیز کو مس بھی کرتا ہے اور ان کے مسائل کی نشاندہی بھی کرتا ہے جو اسے دیار غیر میں درپیش رہے۔

گذشتہ دھائی میں امریکہ کے سفرنامے بہت لکھے گئے اور ہر وہ شخص جس کو کسی بھی قسم کی دعوت ملی یا اپنی جیب میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ جمع ہوا تو جھٹ علاج کے بہانے میں امریکہ کو بھاگا۔

رضیہ فصیح احمد کا سفرنامہ سیر کر دنیا کی اگرچہ ان دیکھی سرزمینوں کے راز کھولتا ہے لیکن امریکہ کی تصویر جیسے فرخندہ جالی نے پیش کی ہے وہ اس طرح کامیاب نہیں ہوتیں۔اسکی وجہ یہ ہے کہ شاید وہ بنیادی طور پر ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ان کے سفرنامے میں بھی اس چیز کی کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ بیانیہ انداز کے باوجود سفرنامے میں جو بیانیہ انداز اور متحرک تصویر امریکہ کی سامنے آنی چاہیے تھی ویسے نہیں ہے۔

اگرچہ انہوں نے پورے سفرنامے کو مختلف جگہوں کے نام کے حوالے سے ترتیب دیا ہے مثلاً شکاگو ہو واشنگٹن نیو یارک سان فرانسکو شکاگو یا نیاگرا فال وہ ہر جگہ کا ذکر تفصیل سے بیان کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ احساس ہوتا ہے۔کہ کچھ کم ہے۔حالانکہ رضیہ نے شکاگو کے موسم سے لے کر وہاں کی عمارات میوزیم کاٹھ پتلیوں کا بیان شو کا اور ان کی سوغات کا ذکر بڑے سادہ اسلوب اور رواں انداز میں کیا ہے لیکن اس میں شعور کی کاوش زیادہ نظر آتی ہے اور اسلوب کا وہ بہاؤ یا خیالات کا وہ تنوع یا بیان کی وہ قوت جو سفرنامے کا خاصہ یا تقاضا ہے اس کی بجائے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناول کی ہیروئن سیر کر رہی ہیں اور وہ کیمرہ لے کر ان مناظر کو عکس بند کرتی چلی جا رہی ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں۔

> ''یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ادیب کے تخلیقی سفر کی پہلی منزل مشاہدہ ہے لیکن دوسری منزل اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر ہے اگر وہ اپنے آپ کو مشاہدے تک ہی محدود رکھے

تو تاثرات کے حدود سے باہر نہیں نکلتا لیکن ادبی تخلیق کا میدان محض تاثرات تک ہی محدود
نہیں ہے اس میں غور وفکر کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں غور وفکر کے بغیر وہ نتائج جو فن کار
مشاہدے کے بعد نکالتا ہے غلط اور بے بنیاد ہو سکتے ہیں اس لیے غور وفکر تخلیقی فن کار کے لیے
ضروری ہے اس غور وفکر سے اس کا نظریہ حیات بنتا ہے۔'' (۱)

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے اس بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مشاہدہ اور مطالعہ لازم وملزوم ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر بیان میں قوت پیدا نہیں ہوتی ایک اچھے ادیب اور خاص طور پر سفر نامہ نگار کے لیے کھلی آنکھ، روشن دماغ، اچھا حافظہ، گہری نظر، عمیق مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے کہ وقت اور منظر بدلتے دیر نہیں لگتی ' رضیہ فصیح احمد لکھتی ہیں۔

''اصل میں شہروں سے شناسائی بھی انسانوں کی طرح آہستہ آہستہ ہوتی ہے پہلے دن کوئی
بھی نیا شہر کسی اجنبی کی طرح لگتا ہے بہت خوبصورت، بہت بدصورت یا پر اسرار یا چرب
زبان۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے اسرار کھلتے ہیں خوبیاں اور فاصل آشکار ہوتی ہیں نیویارک
سے پہلی شناسائی کسی انسان سے نہیں دیو سے ملتی جلتی تھی جسکے اعضا بھی پوری طرح نظر نہ
آتے ہیں پہلی ملاقات میں ایسے دیو کا احاطہ کرنا آسان نہیں جس کا سر بادلوں میں چھپا
ہوا ہو سراپا مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا ہو جس کی ہیبت دل میں بیٹھی ہو۔'' (۲)

رضیہ نے بڑے خوبصورت انداز میں نئی جگہ نئے ماحول کا ذکر کیا ہے۔ اور خاص طور پر اس مرعوبیت کا جس کے تحت ہر پاکستانی امریکہ جا کر دماغ سے پہلے آنکھیں کھولے ورطہ حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔ دماغ تو تب کھلتا ہے کہ جب ان کی ترقی کو دیکھ کر ہم سوچتے ہیں کہ ہم کیوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا ہیں۔ ہم کیوں محنت نہیں کرتے کہ ہم اس کو سپر پاور تسلیم نہ کریں۔

رضیہ فصیح احمد نے امریکہ کے ہر منظر میں اتر کر دیکھا ہے وہ یہاں پر مجسمہء آزادی ہو یا وائٹ ہاؤس وہ سب کے بارے میں تاریخی پس منظر کو مدنظر رکھتی ہیں۔ وائٹ ہاؤس کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''وائٹ ہاؤس کیپٹل سے ایک میل مغرب میں ہے جارج واشنگٹن کے علاوہ جنہوں نے یہ
جگہ پسند کی تھی سارے صدر حضرات یہاں رہے ہیں یکم نومبر ۱۸۰۰ء کو صدر جان آڈر سے
پہلے یہاں رہنے کو آئے انہوں نے داخل ہونے کے بعد جو دعائیہ کلمہ ادا کیا وہ بعد ازیں
صدر روز ویلٹ نے کندہ کرا کے کھانے کے کمرے میں آویزاں کیا۔'' (۳)

رضیہ نے یہاں کے تاریخی مقامات کے ساتھ تہذیبی نقش اور معاشرتی رنگ کو بھی نظر انداز نہیں کیا وہ اس کا ذکر بھی یوں کرتی ہیں جیسے وہ سب ان کے سروے کا حصہ ہو مثلاً برف باری اور لوگوں کی حالت شاپنگ سنٹر اور نوادرات کا ذکر

۱۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ادب اور ادبی قدریں ادارہ ادب وتنقید لاہور ۱۹۸۳ ص۔ ۸۳
۲۔ رضیہ فصیح احمد سیر کر دنیا کی، مکتبہ دانیال عبداللہ ہارون روڈ جولائی ۱۹۹۸ ص۔ ۳۳
۳ ایضاً ص۔ ۹۸

یا سب سے بڑھ کر سڑک کا ذکر وہ کہیں بھی تبصرہ کرتے ہوئے جھجک محسوس نہیں کرتی خواہ یہ تبصرہ ضروری ہو یا غیر ضروری ۔لیکن کہیں کہیں ان کا تبصرہ محسوسات سے نکل کر کرب کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔مثلاً

''رولنگ ہلز کے سبزے میں لوٹتے مکانوں کو دیکھ کر ہماری نند نے کہا یہاں رہنے کا مزہ ہے یہی تو ہوتا ہے ان کے گھر کے آگے گزرتے ہوئے لوگ ان کے مکانوں کو دیکھ کر کہتے ہوں گے یہاں رہنے کا مزہ ہے اور رولنگ ہلز والے پام اسپرنگ کے مکانوں کو دیکھ کر کیا کہتے ہوں گے یہاں رہنے کا مزہ ہے پام اسپرنگ والے خدا جانے کسی چیز کو دیکھ کر کیا کہتے ہوں گے مگر یہ کم بخت یہاں رہتے ہی کہاں ہیں لمبے چوڑے مکان بنا کر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں دنیا بھی عجیب ہے جو کہیں نہیں رہتے ان کے چار چھ گھر ہوتے ہیں جو ایک چھت کو ترستے ہیں انہیں وہ بھی نہیں ملتی ۔سب وے یا ہوائی اڈے کی عمارتوں کی چھتوں کے نیچے گزر اوقات کرتے ہیں۔'' (۱)

ایک اور اہم مسئلہ جو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ابھی تک پاکستان میں نہیں ہے شاید اسلام کی وجہ سے یا خاندانی روایات کی وجہ سے ورنہ پاکستانی تو امریکی کو کھانستے بھی دیکھے تو دیسا کرنیکی کوشش کرتا ہے ۔اخلاقی اور اسلامی قوانین یا اقدار کی نسبت مادی ضروریات کو زیادہ مدنظر رکھا جاتا ہے۔لیکن اپنے بوڑھے ماں باپ کے سلسلے میں ان کی رگوں میں تازہ گرم خون محبت کی وجہ سے جوش مارتا ہے اور وہ ان سے محبت کرتے ہیں۔لیکن امریکہ میں پینسٹھ برس کی عمر سے پہلے ہی بوڑھ گھر یا اولڈ ہوم میں پہنچا دیتے ہیں ۔ یہاں اگر چہ صاف وستھرا ماحول تو ہے لیکن اپنوں کی محبت اور خون کی کشش باقی نہیں ہے۔

''بوڑھے گھروں کو دیکھ کر خواہ کتنے ہی خوبصورت اور صاف ستھرے کیوں نہ ہوں دل بیٹھتا ہے ۔لگتا ہے امریکہ میں بوڑھے بہت زیادہ ہو گئے ہیں حکومت ڈاکٹر اور دوسرے لوگ ملکر ان کی عمر بڑھائے دے رہے ہیں مگر ناک میں آکسیجن کی نلکی لگائے خود جینا چاہتے ہیں یا نہیں کون جانے'' (۲)

کیسا اذیت ناک منظر ہے جہاں اپنے اپنوں سے نزدیک رہتے ہوئے بھی صدیوں تک انتظار کے کرب میں مبتلا ہوتے ہیں۔

رضیہ فصیح احمد بعض اوقات ایسی خواہشات کا ذکر کرتی ہیں ۔ جو کہ ابھی تک ناممکن ہیں لیکن ان خواہشات کے اندر علمی وادبی سرمائے کیساتھ ساتھ تاریخ کو محفوظ کرنے کی خواہش انکی سوچ کو عظمت بخشتی ہیں مثلاً

''ذہن کے البم میں اتنی بہت سی تصویریں اور نئی لگتی ہیں جی نہیں چاہتا کہ یہ البم

۱۔ رضیہ فصیح احمد بحوالہ سابقہ ص۔ ۵۰

۲۔ ایضاً ص۔ ۹۸

ساتھ لے کر مروں کیا کوئی دن آئے گا جب کوئی سائنسدان ان ساری تصویروں کا پرنٹ نکال لے جو میں اپنی نئی نسل کی نذر کر سکوں گی۔ مگر نئی نسل کے لوگ ان تصویرون کا کیا کریں گے! انہیں ان سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی ان کے اپنے شوق اپنی سیریں اپنے ارمان اور اپنی تصویریں ہوں گی۔ ہر شخص اپنی جنت اپنی دوزخ اپنی باتیں اور اپنی یادیں'' (۱)

یہ ایک ایسی سوچ ہے جو ہر ذی شعور اپنی نئی نسل کے بارے میں رکھتا ہے لیکن نئی نسل اس سرمایے کی قدر نہیں جانتی۔

رضیہ کے سفرنامے میں تاریخی رنگ سفرنامے کے تقاضے کی طرح ساتھ ساتھ چلتا ہے کیونکہ قاری سفرنامے کو پڑھتے ہوئے سرسری منظر نگاری کو پسند نہیں کرتا بلکہ وہ ان مظاہر اور اشیاء کے بارے میں پوری تاریخ بھی جانتا ہے یہی وجہ ہے کہ سفرنامہ نگار نہ چاہتے ہوئے بھی پوری تاریخ بتانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جیسے رضیہ لکھتی ہیں۔

''جارجیا اسٹیٹ میں اسٹون ماؤنٹین پارک یعنی پتھر کے پہاڑ کا باغ دیکھنے سیاہ گرے نائٹ کا پہاڑ سا پتھر یا پتھر کا پہاڑ ۳۲۰۰' ایکڑ کے باغ میں درمیان میں یوں رکھا ہے جیسے کسی نے کہیں اور سے اٹھا کر یہاں لا کر رکھ دیا ہو آس پاس نہ کوئی پہاڑ پہاڑی سلسلے بھی پگھلتا لاوا تھا۔۔۔ اس پہاڑ کو بیالیس فٹ گہرا کھود کر تین گھوڑے اور تین جنرلوں کی یادگار بنائی گئی امریکہ میں دنیا کی سب سے بڑی بہت سی چیزیں ہیں چنانچہ یہ سنگی کھدائی کے آرٹ کا سب سے بڑا نمونہ ہے۔'' (۲)

اسلوب نگاری کے لحاظ سے رضیہ کا سفرنامہ نسائی رنگ کے ساتھ ساتھ اسلوب کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے بعض جگہ تو نثر میں اتنی روانی ہے کہ شعری نثر کا گمان ہوتا ہے اور پھر موقع کے مطابق اشعار کے استعمال نے اسے اور بھی خوبصورت بنا دیا ہے۔ مثلاً

''چلتے مسافر کے ساتھ چلتے موسموں کا ایک منظر''

''خبروں میں بتایا گیا۔ خزاں آگے بڑھ گئی ہے اس دفعہ زیادہ بارش ہونے کی وجہ سے بے چارے پتے الجھن میں پڑ گئے تھے کہ سرسبز رہیں یا زرد ہو جائیں۔ اکتوبر تک تو ہرے بھرے ہیں جبکہ بعض دفعہ ستمبر سے ہی زرد پڑنے شروع ہو جاتے ہیں گھاس بھی زرد

۱۔ رضیہ فصیح احمد   بحوالہ سابقہ   ص۔ ۱۲۹

۲۔ ایضاً   ص۔ ۱۶۸

ہوتے ہوتے پھر سے سبز ہوگئی ہے یا پھر سبزہ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا انگلستان میں پانی دے
دے کر اور کاٹ کر سات سو سال میں گف بنایا جاتا ہے یہاں شاید سات مہینوں میں تیار
ہو جاتا ہے امریکہ اتنا انتظار کہاں کر سکتا ہے۔ یہاں قطرے کے گہر بننے کا انتظار نہیں کیا
جاتا قطرے کو گہر بننے پر مجبور کیا جاتا ہے ہم نے دیکھا کہ اگی اگائی گھاس زمین سمیت گول
گول بنڈل کی طرح لپٹی رکھی ہے۔ جہاں لگانی ہو زمین کو انچ بھر کھودا اور گھاس کو قالین کی
طرح بچھا دیا جہاں ناپ سے بڑی سوئی قینچی لے کر کاٹتے چلے گئے پھر ذرا سا ٹھوکا ٹھا کا پانی
دیا اور لیجئے گھاس تیار ہے کئی دن تک متواتر پانی دینا پڑے گا اس کے بعد آپ کی گھاس کی
باہمی رضامندی۔''(۱)

عورت ہمیشہ سے دو اور دو چار کی بجائے دو اور دو چار میں سے دو بچانے کے چکر میں رہتی ہے۔ عام خواتین کی طرح رضیہ فصیح احمد بھی یہاں کے خوبصورت شاپنگ سنٹروں میں خریداری کی بجائے اپنے پیسے کے چکر میں رہی ہیں۔ مجموعی طور پر ایک اچھا سفرنامہ ہے جس میں رضیہ نے بھرپور کوشش کی ہے کہ وہ امریکہ کی مکمل تصویر پیش کر سکیں۔

۱۔ رضیہ فصیح احمد بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۷۵

خالدہ ادیب خانم (سفر نامہ ہند)

سفر کے راستے دورانیئے مقامات اور انسان ایک جیسے ہوتے ہیں۔لیکن سفر نامہ نگار اپنے زاویہ نگاہ اور اسلوب بیان سے ایک سفرنامے کو دوسرے سفرنامے سے منفرد اچھوتا، دلکش اور دیدہ ذیب بنا دیتا ہے۔

خالدہ ادیب خانم ترکی کی مشہور خاتون ہیں۔اپنے وطن کی انقلابی میٹنگ اور تحریک نسواں کی اہم رکن بھی رہیں ہیں۔جنوری ۱۹۳۵ میں ڈاکٹر انصاری صاحب نے انہیں ہندوستان مدعو کیا۔اور انصاری صاحب کے کہنے پر ہی انہوں نے یہ کتاب لکھی جو کہ (Inside India) کے نام سے مشہور ہوئی۔ جو ۱۹۳۸ میں شائع ہوئی۔

اس کتاب کا ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی نے کیا۔ جسے تخلیقات لاہور نے ۱۹۹۶ء میں شائع کیا۔

سید ہاشمی فرید آبادی پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

’’خالدہ خانم کی کتاب سفرنامے سے بھی بڑھ کر اہل ہند کے مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور معاشرتی حالات پر ایک جامع تبصرہ پیش کرتی ہے۔طرف تر یہ کہ مصنفہ نہ صرف خدوخال وخط بلکہ ہندوستان کے باطن سے بحث کرتی ہیں۔جس کے لئے سیاح کے مشاہدے سے زیادہ ماہر نفسیات کی بصیرت درکار ہے۔‘‘(۱)

اس سفرنامے کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

حصہ اول۔ ان کے قیام دہلی سے متعلق ہے۔وہاں انہوں نے ڈاکٹر انصاری کے گھر قیام کیا اور وہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئیں۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہندوستان کے مختلف کانگرسی لیڈروں سے ملاقاتیں بھی کیں جن میں ہندو مسلمان، خوانین اور قوم پرست لیڈروں کے علاوہ جامعہ علیہ اسلامیہ دہلی میں وہاں کے اساتذہ اور طریق تعلیم کا بھی مشاہدہ کیا۔

حصہ دوم۔ برصغیر پاک و ہند کے بڑے بڑے شہروں میں علی گڑھ، لاہور، پشاور، لکھنو، بنارس، کلکتہ، حیدرآباد اور بمبئی کی سیر وسیاحت کی اور وہاں کی تہذیب و معاشرت کا بغور مشاہدہ کیا۔

حصہ سوم میں خالدہ خانم ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، عبدالغفار خان، کانگرسی لیڈروں اور مسلم لیگ اور دوقومی نظریہ رکھنے والی قوم سے تفصیلاً گفتگو کرتی ہیں۔ اور آخری باب اور ’’انگریز‘‘ میں وہ اس چیز کی وضاحت کرتی ہیں کہ :۔

۱۔ سید ہاشمی فرید آبادی پیش لفظ سفرنامہ ہند تخلیقات لاہور ۱۹۹۶ ص۔ ۷

''ہندوستان کی کھد بداتی ہنڈیا میں تیسری چیز یعنی انگریز تعداد میں بہت ہی تھوڑے ہیں
لیکن ہندوستان کی قسمت کے معاملے میں ان کے قول پانی وہ عناصر ہے جن میں ہندوؤں
کی تعداد کثیر بھی شامل ہے۔ کہیں زیادہ وزن رکھتا ہے۔ ایک لاکھ انگریزوں کا ۳۵ کروڑ
ہندوستانیوں پر حکومت کرنا مغرب کی فتح کے مترادف ہے جو اسے اپنی کاریگری مادی تمدن
اور اخلاقی استقامت کی بدولت حاصل ہوئی۔''(۱)

سفرنامہ ہند سیاسی سفرنامہ ہے۔ جس میں ۱۹۳۵ء کے برصغیر پاک و ہند کی زندگی کا گہرا مطالعہ ہے۔ خاص طور پر کانگرس، کانگرسی لیڈر اور قوم پرست مسلمانوں کا جن میں عبدالغفار خان کا اور ان کے خاندانی پس منظر، مسلم لیگ اور کانگرسی لیڈروں میں اکثر کا ذکر ہے۔ سب سے زیادہ مدح سرائی گاندھی جی کی گئی ہے کہ وہ انہیں سیاست میں لینن سے بھی کچھ اونچے درجے کا رہنما قرار دیتی ہیں۔ اور ہندو جاتی کی اصلاح واستحکام کے لئے گاندھی کے اصول وقوانین پر اور علمی و عقلی دلیل کو نہ صرف سراہتی ہیں بلکہ قابل عمل اور قابل قبول سمجھتی ہیں۔

دراصل انیسویں صدی میں ہندوستان کے مسلمان جس آشوب قیامت سے دوچار تھے۔ ان کی سیاسی، معاشرتی تہذیبی اور جذباتی زندگی جس انتشار، بے چینی اور افراتفری کا شکار تھی۔ اس کی تفصیل سیاسی پس منظر میں بیان کی گئی ہے۔ خالدہ ادیب اس سلسلے میں لکھتی ہیں۔

''بیسویں صدی کے ہندوستان نے مجھے بھی اس قدر متاثر کیا جس قدر کہ البیرونی کو دسویں
صدیں کے ہندوستان نے کیا تھا اور میں نے چاہا کہ اپنے زمانے کے ہندوستان کا حال بھی
اس قدر سچائی اور بے تعلقی کے ساتھ لکھ جاؤں جیسا کہ البیرونی اپنے زمانے میں۔''(۲)

کردار نگاری خالدہ ادیب خانم کا سب سے بڑا ہنر ہے۔ عوام اور خواص دونوں کے سکیچ ہوں یا فل پورٹریٹ دونوں ہی مہارت اور عمیق نظری سے بنے ہیں۔ وہ شخصیات جن کی تاریخی اہمیت ایسی ہے کہ وقت کی رفتار اور گزرتی صدیاں بھی ان کو دھندلا نہیں سکتی۔ ان کا بیان بھی خالدہ نے یوں کیا ہے کہ وہ انسانی خاصیتوں اور عقائد نظریات توہمات، خیالات اور نظریات کے ساتھ ساتھ اپنی امتیازی خصوصیات سمیت ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس صورت حال نے ان کے سفرنامے کو بیانیہ انداز کی دلکشی اور سفرنامے کی رنگینی عطا کی ہے۔

عام لوگوں میں ہندو ہوں یا مسلمان ان کی تصویریں بھی سرمو فرق کے بغیر الگ الگ جانی پہچانی جاتی ہیں اور

۱۔ خالدہ ادیب خانم سفرنامہ ہند ص۔ ۳۳۶
۲۔ ایضاً ص۔ ۱۲

یہی خالدہ ادیب خانم کا ہنر ہے۔مثلاً
ڈاکٹر انصاری کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''ڈاکٹر انصاری ایسے خاندان کے اسلاف میں سے جس کے افراد شمالی ہندوستان میں انتظامی اور عدالتی حکام، سپاہی اور علماء کی حیثیت سے نام پا چکے ہیں۔ اگر اجداد کے اوصاف متوارث ہوتے ہوں تو ضرور ہے کہ ڈاکٹر انصاری گہرے روحانی میلان، تنظیمی قابلیت اور دلیری سے متصف ہوں۔ نیز قانونی طبعیت رکھتے ہوں۔ان سب باتوں کے ساتھ خود انہوں نے طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔'' (۱)

''بیگم جہاں آرا کے بارے میں لکھتی ہیں۔بیگم شاہنواز، بلند قامت، خوبصورت اور باتیں کرنے، سننے، دونوں میں اچھی انہیں دیکھ کر پہلا خیال ہی ہوتا ہے کہ وہ ان عورتوں کا نمونہ ہیں جو حقوق نسواں یا دوسرے مسائل کی بین الاقوامی مجالس میں حصہ لیتی ہیں۔واقعتاً لندن کی آخری گول میز کانفرنس میں وہ مسلمان مندوبہ تھیں۔''(۲)

مہاتما گاندھی کے بارے لکھتی ہیں

''یہ مثلثی سانولا حسین چہرہ اس قدر واضح اور ترشے ترشائے خدوخال رکھتا تھا کہ اس سے زیادہ قیاس میں نہیں آتا۔ دہانہ چوڑا اور سوائے سامنے کے ایک دانت کی بتیسی غائب تھی۔ ہونٹ ایک دوسرے سے خوب چسپید نہ ہو جاتے تھے لیکن انہیں دیکھ کر وحشت انگیز خشونت یا انتہائی بڑھاپے کا خیال پیدا نہ ہوتا تھا۔''(۳)

ان شخصیات کے خاکے پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خالدہ خانم کی قوت مشاہدہ تخلیقی بصیرت اور جزئیات سمیت پورے خدوخال کے ساتھ سامنے آتی ہیں اوران کی حیات انسانی سے فنکارانہ شعور کا پتہ چلتا ہے۔

فضا بندی اور ماحول کے سلسلے میں بھی ان کی قوت مشاہدہ واقعاتی پس منظر کو دل کش اور معنی خیز بنا دیتی ہے۔ ماحول کا نقشہ اتارنے میں انہوں نے لفظوں کا برمحل خوبصورت مکمل اور بھر پور استعمال کیا ہے۔مثلاً جب تاج محل کو دیکھنے جاتی ہیں تو وہاں کی دلکشی کو یوں بیان کرتی ہیں۔

''اس عجوبہ روزگار عمارت میں ایک عجیب دلنشینی یہ تھی کہ یہ تاریخ عالم میں مرد کی عورت سے شیفتگی کا نشان تھا۔اہل یورپ کے لئے کمال طعن آمیز حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمان تھا۔جس نے عورت کی یہ جاوداں یادگار تعمیر کی تھی لیکن مجھے اس طرف مطلق توجہ نہ تھی۔اس شے نے مجھے سکون وراحت عطا کی۔ میں ہر قسم کے محدود اثرات سے خواہ وہ نسل و مذہب کے ہوں یا طرز فن کے باہر نکل آئی تھی۔ اس منظر کا ذہنی تجزیہ ممکن نہ تھا اور وہ جذباتی کیفیات سے بھی

۱۔ خالدہ ادیب خانم بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۹
۲۔ ایضاً ص۔ ۴۴
۳۔ ایضاً ص۔ ۵۲

ماوراتھا۔ یہ بات کہ معمار ترک تھا یا فلورنس کا باشندہ یا یہ کہ جس بادشاہ نے اسے بنایا۔ اس کا
قدیم وطن کسی صحرائی اور زیادہ قوت آفریں علاقے میں تھا۔ کچھ اہمیت نہ رکھتی تھی۔''(۱)

بلا لحاظ اس کی وضع اور معماروں کے یہ عمارت ہندوستان کا شاہکار تھی۔ خالدہ خانم کے اس انداز بیان کے بارے میں ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں۔

''یہ نکتہ رسی، یہ آزادی بیان کی لطافت جو شائستگی جذبات و مشاہدات کی یہ شاعرانہ نقاشی، کم
ادبی کتابیں ہیں۔ جن میں بہ یک وقت اتنی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔''(۲)

اس سفرنامے کی سب سے دلچسپی اور خواتین خصوصیت یہ ہے کہ خالدہ کپڑوں کے سلسلے نہایت جزئیات پسندی سے کام لیتی ہیں اور شاید یہ ان کے مسز گاندھی کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''ان کی بے مثل نزاکت جاپان کی گلی مورتیوں کہی تشبیہ کھا سکتی ہے۔ وہ ہاتھ کی بنی ہوئی
سوتی ساڑھی پہنے تھیں جیسی غریب سے غریب عورتیں پہنتی ہیں اور پر بھی انہوں نے
ساڑھی کی تہوں کو ایک خاص نفاست بخش دی ہے۔''(۳)

اس طرح سے رقص و موسیقی کے بیان میں بھی وہ بڑی ہی دقیق قسم کی آرا سے لفظوں کو مزین کرتی ہیں۔ لیڈی ارون کالج کے بارے میں لکھتی ہیں۔

'' چائے کے بعد ہم پروگرام سے لطف اندوز ہوئے۔ مسلمان لڑکیوں نے شاعری پڑھی
اور ہندو لڑکیوں نے رقص کیا۔ شاندار تصوراتی رقص ایک دبلی پتلی ہندو دوشیزہ ایک ناگ
کی خوشنما صورتیں پیش کرتے ہوئے پچکتی گھومتی اور مڑتی تھی۔ اس کے پائلوں کے
گھنگروں کی چھن چھن سے اس کے بدن کے تال میل کے ساتھ ساتھ تھی۔''(۴)

خواتین کی تعلیم کے بارے میں بھی ان کا مشاہدہ بہت گہرا اور عمیق ہے۔ کیونکہ خواتین کسی ملک ہی کی کیوں نہ ہوں۔ بحیثیت مجموعی وہ ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہوتی ہیں۔ ان کے دکھ سکھ ساجھے ہوتے ہیں۔ جامعہ کے پرنسپل شیخ ڈاکٹر ذاکر حسین ہندوستانی عورت کی تعلیم کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''عورتوں کی آزادی پر گفتگو کرتے وقت وہ ہمیشہ کہتے۔ پہلی چیز تعلیم ہے۔
عورتوں کو اپنی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ جو چاہیں روش اختیار کریں۔ انہیں جدید زندگی
بسر کرنے پر مجبور ایسا ہی جابرانہ ہے۔ جیسا پردے میں رہنے پر مجبور کرنا۔ واقعی جبر جبر ہے۔
اس کا منشا کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔۔۔ جامعہ کے تمام اساتذہ کا رویہ اپنی بیویوں کے
ساتھ یہی تھا۔ جن میں سے بعض ایک وسطی حالت میں تھیں اور پردے میں رہتیں یا جزوی
طور پر آزاد تھیں اور محض پردہ ترک کر دیا تھا۔ یہ سب کی سب اپنے خیال کی پکی معلوم ہوتی
تھیں لیکن لڑکیوں کی تعلیم بہت اہتمام سے کی جاتی تھی۔''(۵)

۱۔ خالدہ ادیب خانم بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۷
۲۔ سید ہاشمی فرید آبادی بحوالہ سابقہ ص۔ ۹
۳۔ خالدہ ادیب خانم بحوالہ سابقہ ص۔ ۵۹
۴۔ ایضاً ص۔ ۴۹
۵۔ ایضاً ص۔ ۹۰

ان کا مشاہدہ ہندوستان کی گزرگاہوں کے متعلق بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ساتھ جہاں جہاں بھی گئی ہیں۔ وہاں کے نفوس کا مطالعہ بھی ان کی عادات وخصائل کے ساتھ کیا ہے۔
مثلاً شالامار باغ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''یہ وہ باغ ہے۔ جہاں مسلمان سلاطین عہد گزشتہ میں آرام وعیش کرنے آتے تھے۔ بیگم کا خاندان اس باغ اور اس کے قریبی دیہات کا امن رہا ہے۔ باغ میں سنگ مرمر کے حوض اور فوارے میں اور پانی کے عجیب عجیب انتظامات کئے ہیں۔ خوبصورت پھولوں کی وہ افراط کی جیتا جاگتا مشرقی قالین نظر آتا ہے۔ پرشکوہ درفت غلام گردشیں اور ذکور واناث دونوں کے لئے شاہانہ عمارات'' (۱)

ہندوستان کے دیہات کے بارے میں لکھتی ہیں۔

'' اگرچہ تمام ہندوستان میں انتظام اراضی مختلف ہے۔ لیکن دو بڑی طریقے زمیندرای اور رعیت واڑی رائج ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جن دیہات کو میں نے دیکھا وہ زمینداری طریقے کے مطابق ہیں۔ ان میں کاشتکار پٹے دار ہوتے۔ جو لگان ادا کرتا ہے اور سرکار کو مالیہ ادا کرتا ہے۔ یہ طریقہ قریب قریب وہی ہے۔ جیسا اصلاحات سے قبل روس میں رائج تھا۔'' (۲)

مذہبی طور پر بھی ان کی نگاہ دور رس واقعات وحقائق کا جائزہ لیتی ہیں۔ مثلاً

''بنارس کا سب سے بڑا مشہور یہ وشنو کا مندر ہے۔ اندر سے پیچ در پیچ سنگ مرمر کی چوکیاں اور ملمع کئے ہوے پیل پایوں پر ستونوں کثرت نے عجیب حصص کاٹ دیے ہیں اور چھتیں بھی انوکھی وضع کی ہیں۔ دیوتا کے سامنے ایک ملمع کی ہوئی جالی ہے۔ اور دیوی دیوتاؤں کی صورتیں مورتیں ہر جگہ پھولوں کے انبار میں ڈھکی ہوئی ہیں۔'' (۳)

ان بیانات نے سفرنامہ ہند کو ایک جیتا جاگتا محرک ہندوستان کے طور پر متعارف کروایا ہے۔
شخصیات کی عکاسی یا روایات کا بیان خالدہ نے ہر چیز کا مشاہدہ ایک اعلیٰ پائے کے محقق کی طرح کیا ہے اور زیادہ تر ثانوی مآخذ کی بجائے بنیادی مآخذ کو مدنظر رکھا ہے۔ اسلوب کے لحاظ سے بھی ان کا یہ سفرنامہ منفرد مقام رکھتا ہے اور بعض مقامات پر تو یوں احساس ہوتا ہے کہ عورت کا کرب واضح ہے۔

''دوسرے گوشے میں ایک اور چٹائی پڑی تھی۔ جس پر عورتیں گھٹی بیٹھی تھیں۔ ان گوشوں کی جذباتی کیفیت میں اتنا ہی فرق تھا جتنا فرق خط استوا اور قطبین میں یعنی وہاں کے جذبات سے ہوا تک مرتعش تھی۔ حتیٰ کہ بعض عورتوں کے چہروں کی حالت ایسی تھی جیسے درد شکم کے وقت کسی کی ہو جاتی ہے۔'' (۴)

۱۔ خالدہ ادیب خانم بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۲۱
۲۔ ایضاً ص۔ ۱۵۴
۳۔ ایضاً ص۔ ۱۶۶
۴۔ ایضاً ص۔ ۵۲

ایک اور جگہ لکھتی ہیں۔

''ہندوستان کی عورتوں کا مجھے انتہا درجے خیال اور میرے دل میں کام قدر و منزلت ہے۔ یہ قدر و منزلت ان کی بے پایا مہر کمال، دلیری اور حال و مستقبل کو بہتر بنانے کا شوق دیکھ کر ہوئی ہے۔ آج دنیا میں ہر طرف عورتیں بیدار ہو رہی ہیں کہ اپنی ذمہ داری اور آئندہ نسلوں کو ڈھالنے میں اپنے خاص حصے کا کام سر انجام دیں۔ ہندوستان کی عورتوں نے وفاداری، خدمت گزاری اور دلنوازی کی اعلیٰ صفات ورثے میں پائی ہیں۔ اور وہ بہت کچھ سکھا سکتی ہے۔ لہٰذا نوع انسان کی خدمت میں انہیں پیش پیش ہونا چاہیے۔''(۱)

اس سفر نامے میں جہاں بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں وہاں خالدہ ادیب خانم کی یہ بات کھٹکتی ہے کہ مہاتما گاندھی اور غفار خان کی طرف ان رویہ خاص ہمدردانہ ہے اور وہ ان کے نقطہ نظر سے متاثر نظر آتی ہیں۔ مسلمان عورتوں کی روشن نظری اور مسلمان تہذیب کی خوبیوں کی طرف ان کی نظر گئی ضرور ہے مگر انہوں نے دوسری طرف اپنی نظر عنایت زیادہ رکھی ہے اور ہندوؤں اور سکھوں کو زیادہ اہم مقام دیا ہے۔

کتاب کے آخر میں ایک ہندوستانی قومیں کے عنوان کے تحت کچھ تذکرہ تحریک پاکستان کا بھی آ گیا ہے جسکو مصنفہ نے چوہدری رحمت علی کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ جن سے ان کی ملاقات لندن اور پیرس میں ہوئی تھی۔ جس سیاست اور سیاسی کشمکش کے تذکرے سے یہ سفر نامہ شروع ہوا تھا۔ وہ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنے انجام کو پہنچا تھا۔

مجموعی طور پر سفر نامہ ہند ایک با مقصد اور اچھا ترجمہ ہے۔ اور مترجم نے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ یہ کتاب ترجمہ شدہ ہے۔ ان کی زبان بھی سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ یہ سفر نامہ ہندوستان کے گہرے، سیاسی، سماجی اور معاشی مشاہدے پر مبنی ہے۔

۱۔ خالدہ ادیب خانم بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۰۱

کشور ناهید (آ جائو افریقہ)

کشور ناہید کا نام بلاشبہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔اردو ادب میں ان کا مقام منفرد بھی ہے اور ایک اعلیٰ مقام کا حامل بھی ہے۔کشور ناہید نے عورتوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اور وہ عورتوں کو ایک خاص مقام بھی دلانا چاہتی ہیں۔ آ جاؤ افریقہ'' کشور ناہید کا ایک ایسا سفر نامہ ہے جس میں وہ ادھوری تحریر کا پورا ابتدائیہ کے عنوان سے لکھتی ہیں۔

'' افریقہ کے قیام کے سولہ دنوں میں صبح سے رات تک مختلف ملکوں کی ہر طبقے کی خواتین سے ملنے اور بات کرنے کا موقع تلاش کیا۔حالانکہ وہاں بے شمار لیڈر خواتین دوسرے ملکوں کی لیڈر خواتین سے مل کر پتے لے کر صرف اپنے دوسرے ممالک کے دوروں کا پروگراموں کا ابتدائی نقشہ تیار کرتی رہیں اور باقی بازار میں گھوم کر افریقی نوادرات اکٹھی کرتی رہیں۔مگر بہت سی مجھ جیسی تھیں ادھوری بیوی،ادھوری ماں،ادھوری ملازمت پیشہ، ادھوری مصنفہ اور ادھوری عورتوں اور انسانوں کے حقوق لئے لڑنے والی۔اسی ادھوری کو پورا کرنے کی کوشش اگلے صفحوں میں درج ہے''۔(1)

کشور ناہید وہ باغی عورت ہے جو عورت کی مظلومیت پر لڑتی کڑھتی اور لکھتی ہے۔وہ صرف پاکستانی عورت پر ظلم ہونے برداشت نہیں کرتی بلکہ عورت خواہ کسی خطے،علاقے یا مذہب کی ہو اس کے لئے صرف عورت ہے اور وہ اس کو اس ظلم سے نجات دلانے کی خواہش مند ہے۔ لیکن ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ "Male Dominating Society " ہے جہاں مرد حاکم ہے اور عورت محکوم۔مرد خدمت کروانے کے لئے اور عورت خدمت گار ہے۔ عورت حکم ماننے کے لئے اور مرد حکم منوانے کے لئے ہے۔یہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔مرد کو ہر جگہ آسانیاں میسر ہیں۔عورت کو ہر جگہ رکاوٹیں درپیش ہیں وہ خواہ گھر میں ہو یا باہر۔نوکری کرے ہر جگہ طرح طرح کی روکاوٹیں اس کے سامنے اس کا راستہ روکنے کے لئے تیار ہیں۔اسی لئے کشور ناہید لکھتی ہیں۔

''مرد کے لئے ساری کائنات اور عورت کے لئے صرف گھر (بلکہ وہ بھی نہیں) مرد اپنے شوق سے کسی بھی وقت کسی خوف سے بے نیاز ہو کر سفر کر سکتا ہے۔ اور آسانی سے ایک کامیاب و کامران سیاح بن سکتا ہے۔ عورت ضرورت کے تحت ''محرم'' کے ساتھ سفر پر

۱۔ کشور ناہید آ جاؤ افریقہ سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۵ ص۔ ۳

روانہ ہوتی ہے اور اگر کوئی لڑکی اپنے شوق جہاں گردی سے مجبور ہو کر اکیلی رخت سفر باندھ لے تو اس کے سامنے کامیاب سیاح بننے کے امکانات کم اور کچھ اور بننے کے خطرات زیادہ ہوتے ہیں''۔ (۱)

اس میں کشور ناہید افریقہ میں منعقد ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے جاتی ہیں اور وہاں پر ان کی ملاقات بہت سے ممالک کی خواتین سے ہوتی ہے جو قلم کار بھی ہیں۔ کام بھی کرتی ہیں۔ اشاعتی ادارے بھی چلاتی ہیں۔ پڑھتی بھی ہیں پڑھاتی بھی ہیں لیکن ظلم کی چکی میں پستی بھی ہیں۔ ایسی خواتین کے بارے میں کشور ناہید لکھتی ہیں کہ اس کانفرس میں عورت کا کردار اگھر میں نسلی امتیاز خاص طور پر امریکہ میں ''نکاراگوا'' کا مسئلہ فلسطینی ریاست اور لبنان پر بمباری کا مسئہ سامراجی رویوں کے خلاف متحدہ احتجاج کہ ان مسائل کی وجہ سے ایران عراق کی خواتین کی آپس میں لڑائی بھی ہوئی لیکن اس کو احسن طریقے سے سلجھایا گیا۔ کیونکہ ان خواتین کے درمیان ''انجیلا ڈیوس'' اور ''بیٹی فریدن'' جیسی اہم شخصیات تھیں۔ بیٹی فریدن نے تو اپنی کتاب "Hostile" میں خواتین کے تمام امور کو تفصیل سے لکھا ہے لیکن وہ کسی پینل پر نہیں بولیں صرف ہر معاملے کو غور سے لیتیں اور کہتی میری کتاب پڑھ لو۔

اس کانفرنس میں خواتین پبلشرز کی کافی زیادہ تعداد تھی۔ قابل ذکر خواتین میں فرانس، چلی، ہندوستان، زمبیا، ناروے، اٹلی اور جاپان اور پاکستان کی عورتیں تھیں۔ پاکستان میں ''سیمرج'' کے نام سے اشاعت کا ایک وسیع ادارہ کام کر رہا ہے اور اس بین الاقوامی طور پر جانا بھی جاتا ہے۔ کشور ناہید لکھتی ہیں۔

> ''عورتوں کے یہ اشاعتی ادارے صرف اس لیے عورتوں کے نہیں کہلاتے کہ یہاں عورتوں کی چیزیں چھپتی ہیں یا عورتوں کے زیر انتظام چلتے ہیں بلکہ اس لیے یہ عورتوں کے پبلشنگ ہاوسز کہلاتے ہیں کہ ان اداروں میں خواتین سے متعلق وہ سنجیدہ و تحقیقی اور تخلیقی مواد شائع ہوتا ہے جس کو چھاپنے کے لئے مردوں کے اشاعتی ادارے بہت کم تیار ہوتے ہیں''۔ (۲)

اس کانفرنس کا نعرہ Strategies for Development in the year 2000 تھا لیکن یہاں پر ہر ملک کی خواتین ان تعصّبات اور حدود کو بھی پار نہیں کر سکتی تھی جوان پر بچپن میں یا خاندانی روایات یا غیر شعوری طور پر لگ گئیں تھیں۔ مثلاً

۱۔ کشور ناہید بحوالہ سابقہ ص۔ ۷

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۱

''ہندوستان کی کچھ عورتیں صرف سبزی اور روٹی مانگتی تھیں۔ وہ انڈے، گوشت، مچھلی کو ہاتھ لگانے کو تیار نہ تھیں۔ کچھ نہ ملتا تو وہ پراٹھا، دودھ یا دہی کے ساتھ کھا لیتیں مگر جھینگے سے لے کر مرغ تک کسی چیز کو ہاتھ لگانے کو تیار نہ تھیں''۔ (۱)

عورت خواہ کسی ملک کی ہو۔ اس پر ظلم اور زیادتی تقریباً ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود تہذیب و تمدن اور معاشرتی اصول وقوانین کے مطابق کچھ مظالم اپنی زبان الگ رکھتے ہیں۔ مثلاً

''............ کھجور تلے بیٹھ جاتی اور تمام ملکوں کی عورتیں اپنے اپنے مسائل آ کر بیان کرتیں۔ عرب ممالک کی عورتیں شادیوں کے نام پر ہونے والی زیادتیوں کا ذکر کرتیں۔ مذہب کے نام پر غلامانہ ذہنیت کا رونا روتیں اور مردوں کی بے حسی پر یہ واویلا کرتیں۔ افریقی عورتیں زندگی کی بنیادی سہولتوں کے فقدان عورت پہ ہر طرح کے جبر اور معاشرے کی بے حسی کے قصے سناتیں۔ لاطینی امریکہ کی عورت، مذہب کے نام پر عورت پہ شادی کے جبر کا قصہ سناتیں اور امریکی عورتیں مردوں کے مارنے، تنخواہوں میں تفاوت اور معاشرے میں ترقی کی راستے عورتوں کے لئے محدود ہونے کی باتیں کرتی جاتیں۔ ہئی اپنے انداز میں نوٹ کرتی جاتیں جواب دیتیں اور بحث میں حصہ لیتیں۔ (۲)

آگے جا کر وہ کانفرنس کی میزبان خاتون نیتا برو کا تعارف کرواتی ہیں۔ جو تیرہ ہزار خواتین کی میزبان ہیں۔ ان کی مختلف حیثیت کے کاموں سے متعارف کرواتی ہیں۔

'' نیتا برو جو بنیادی طور پر ایک نرس کی حیثیت سے گزشتہ ۴۰ برس سے کام کرنے کے علاوہ کیئر چیٹین جزیروں میں عام لوگوں کی تعلیم کی ذمہ داری اپنے سر لیے ہوئے ہے۔ نیتا بیرو غیر سرکاری فورم کی پلاننگ کمیٹی کی چیئر پرسن تھیں۔ انہوں نے کیئر بلیٹن جزیروں کی خدمت سے نکل کر عالمی ادارہ صحت ورلڈ کونسل آف چرچز اور انٹرنیشنل کونسل برائے تعلیم بالغان کی پریذیڈنٹ کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے۔ (۳)

نیتا بیرو کے ساتھ ساتھ ایک اور خاتون انجلا ڈیوس تھی جس کے بارے میں کشور ناہید لکھتی ہیں۔

'' ۴۱ سالہ انجلا ڈیوس نے فلاسفی میں ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ لوگوں کو سب سے پہلے انجلا کی شعلہ بیانی اور انقلابی سرگرمیوں کا علم ۱۹۷۰ء میں ہوا۔ جب کہ اس نے امریکہ میں سول رائٹس مومنٹ میں بھرپور حصہ لے کر کیلی فورنیا کے اس وقت کے گورنر رولا ڈریگن کے خلاف مزاحمتی تحریک چلائی تھی۔ انجلا نے کانفرنس میں شرکت کو ایک بھرپور تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ مجھے افریقہ میں بسنے والی اپنی

۱۔ کشور ناہید بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۲

۲۔ ایضاً ص۔ ۴۶

۳۔ ایضاً ص۔ ۵۴۔ ۵۵

بہنوں سے ملنے اوران کے تجربات سننے کا بے پناہ اشتیاق تھا۔ اس کانفرنس کے تمام سیاہ فام لوگوں کے اتحاد اور مسائل کو جسطرح واضح کیا ہے وہ کسی اور طرح ممکن ہی نہیں تھا اور اب ہماری طرح استحصالی نظام میں گرفتاری آپ جیسی تیسری دنیا کی عورتوں سے مل کر خواتین کی مظلومیت اور استحصال کا احساس اور شدید ہورہا ہے''۔ (۱)

انجلا بہت معروف عورت ہیں۔ وہ دنیا بھر میں تمام عورتوں کے مسائل کو ختم کرنے کی کاوش میں مصروف ہیں۔ وہ افریقہ کے دیہاتوں میں جا جا کر وہاں کی عورت کو حقوق دلانے کی خواہش مند ہیں۔ وہ مردوں کے برابر مزدوری دلانے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔

انجلا افریقی عورتوں کی مشترکہ کمیشن کے نمائندہ کی حیثیت سے مورین ریگن (امریکی صدر کی بیٹی اور کانفرنس میں امریکی وفد کی لیڈر) کے سامنے پٹیشن پیش کرتی ہے اور بار بار حکومتوں کی توجہ عورتوں کے مسائل کی طرف دلاتی ہے۔

عام زندگی ہو یا ادب کی عورت کو ایک جامعہ روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس روپ میں عورت کو اپنی ذات کے شعور حاصل کرنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ عورت کی جسمانی ساخت کے حوالے سے یہ طے شدہ بات ہے کہ اس کی زندگی کا تمام محور بیوی اور ماں بننے پر ہے۔ اس کے باقی تمام جذبے یا احساسات ان دونوں افعال کے تابع ہیں۔ عورت کی صحت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ عورت جسمانی طاقت میں مرد کے مقابلے میں کم ہے۔ اس لئے وہ بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہے اور اس میں موت کا شکار ہوتا یا اس عمل میں مرجانا اسے عورت کی تقدیر قرار دیا گیا۔ عورت کی صحت کے بارے میں جدید طبی علوم ہیں جو رویئے عام میں ان میں سے کئی رویے غلط تصورات پر بھی مبنی ہیں۔ جیسا کہ مشرقی وسطی کے بعض مما لک میں عورتوں کے Circumcision کئے جاتے ہیں۔ اس قبیح رسم کی وہ صورت حال زیادہ خطرناک ہے جب Circumcision کا یہی عمل جدید علوم کے نام پر دہرایا جاتا ہے۔ مثلاً عمل جراحی کے Clitoris کا انقطاع یعنی نسوانی Circumcision اور بیضہ دانی (بچہ دانی) کو نکالنے کے عمل کو عورتوں کو بیماریوں سے نجات دلانے کا عمل قرار دیا جاتا ہے۔ مغربی نائیجیریا میں یہ عمل شادی سے پہلے کیا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ تر مما لک میں یہ عمل سات سال کی عمر میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً کشور ناہید لکھتی ہیں کہ

> ''زیادہ مما لک میں یہ عمل سات سال کی عمر میں ہی کیا جاتا ہے۔ تین خواتین متعلقہ لڑکی کو سٹول پر بٹھا کر اس کے ہاتھ پیچھے کس کر پکڑ لیتی ہیں۔ ایک عورت اس کی گردن میں ہاتھ

۱۔ کشور ناہید بحوالہ سابقہ ص۔ ۶۰

ڈال لیتی ہے۔ سامنے کلمہ پڑھتے ہوئے پیشہ ور دائی نائن رسم سرانجام دیتی ہے۔ اس رسم کے بعد دیہاتوں میں خیرات کے طور مکئی دی جاتی ہے اور شہروں میں ـــــ یہ عمل پندرہ بیس منٹ جاری رہتا ہے۔ پھر لڑکی چیخ چیخ کر ادھ موئی ہو جاتی ہے اور یوں بستر پر لٹا دی جاتی ہے۔ اگر دائی بہت بوڑھی ہو یا پھر لڑکی تکلیف میں ہلے جلے تو زخم اور بھی گہرا اور دوسری جگہوں پر بھی خطرناک زخم لگ سکتا ہے''۔ (۱)

اس رسم کے کتنے نقصانات ہیں۔ اس پر کبھی کسی نے غور نہیں کیا۔ کیونکہ زیادہ تر مائیں اپنی ذمہ داری اور نگہداشت کی صعوبت سے بچنے کے لئے ایسا کرتی ہیں۔ لیکن اس سے نہ صرف زہریلا مادہ پھیل جاتا ہے بلکہ جنسی تحرک کے غدود بھی متاثر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کانفرنس کے دوران ۴۱ ڈاکٹروں اور نرسوں نے ایک پمفلٹ تقسیم کیا۔ جس میں اس بات کی نشان دہی کی گئی کہ عورت کے Circumcision ہر حال میں عورت کے جسم اور صحت کو متاثر کرتے ہیں۔ لیکن عالمی ادارہ صحت بھی اس کے بارے میں دخل اندازی کا مجاز نہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ رواج مقامی رسوم سے متعلق ہے۔ اس لیے عالمی ادارہ مقامی رسوم میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ لیکن کچھ لوگوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اس رسم کے خاتمے کے لئے کاوش کی ہے۔ مثلاً کشور ناہید لکھتی ہیں۔

'' فی الوقت سوڈان میں اس سلسلے میں بہت پیش رفت ہوی ہے۔ سوڈان کے نرسنگ کالجوں میں باقاعدہ کورسز شروع کیئے گئے ہیں اور عربی میں چھوٹے چھوٹے پمفلٹ اس روایت کو ختم کرنے کی ترغیب کے لئے جاری کیئے گئے ہیں۔ یہ کورس کینیا میں بھی شروع کیئے گئے ہیں۔ مگر بہت محدود اور وہ شہروں تک صومالیہ میں ۹۰ فیصد عورتوں کو صوتی اور بصری آلات کے ذریعے اس روایت کو ختم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس میں چینی عورتوں کے پیر باندھنے کی روایت اور پھر اس کو ختم کرنے کی تحریک کو مثال کے طور پر جگہ جگہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح ہندوؤں میں عورت کے ستی ہونے کی روایت کو ختم کرنے کے لئے جسطرح جدوجہد کی گئی۔ اس کو بھی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بزرگ عورتوں کا تعاون حاصل کر کے ان کے تلخ تجربات کو نونوان نسل کے لئے سبق آموز بنا کر پیش کرنے کا تجربہ بھی کافی زوداثر ثابت ہوا''۔ (۲)

۱۔ کشور ناہید بحوالہ سابقہ ص۔ ۷۶

۲۔ ایضاً ص۔ ۷۷ ۔ ۷۸

اقوام متحدہ کے مطالعتی ادارے Organization for Economic Co-operation and Development نے ۱۴ ممبر ملکوں کی خواتین کی معاشرتی ترقی کی رپورٹ کی اور بتایا۔ اب بھی بنگلہ دیش میں خواتین کی صرف ایک فیصد آبادی ملازمت کرتی ہے اور باقی ممالک میں بھی ترقی کے باوجود خواتین کی شرح کم ہے بلکہ فنی شعبوں میں عورتوں کی شرح انتہائی کم ہے بلکہ بعض اوقات ترقی تنزلی کا عث بنتی ہے۔ مثلاً جانوروں کی دیکھ بھال، جانوروں کو چرائی کے لئے لے کر جانا، دودھ پینا، ان کو نہلانا، چارہ ڈالنا یا کھیتوں تک لے جانا عورت کا کام سمجھا جاتا ہے مگر جب ہل کی جگہ ٹریکٹر نے لے لی تو پھر اس کام کے لئے نکما سے نکما مرد بھی اس کا اہل سمجھا جاتا ہے۔ عورت نہیں مثال کے طور پر ''جاوا'' میں چاول سٹور کرنے کا کام روائتی طریقے سے عورت کا کام سمجھا جاتا ہے۔ جیسے ہی چاولوں کی ملیں بنیں۔ یہ کام مردوں کا ہو گیا اور عورت باہر کر دی گئی ۔ لائبریا میں چاول کی پنیری لگانے کا کام عورتوں کے ذمے تھا مگر جب تشہیر کا وقت آیا تو مردوں نے چاول کی پنیری لگانے کا کام کر کے دکھایا''۔ (۱)

افریقہ میں ایک قبیلہ ہے مسائی جن کی زندگی اور آمدنی کا تمام تر انحصار مویشیوں پر ہوتا ہے۔ یہ لوگ اس کے علاوہ کوئی کام کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ لیکن یہ نیم وحشی اور نیم خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے ہیں۔ گھر سر کنڈے، پتلی لکڑیوں اور جھاڑیوں سے بنے ہوتے ہیں۔ شادی کے وقت دولہا چھ سات جانور بطور تحفہ لے کر آتا ہے۔ دودھ مسائی لوگوں کی خوراک کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ البتہ یہ لوگ دودھ میں جانور کا خون ملا کر ہفتے میں ایک بار ضرور پیتے ہیں۔ گوشت کبھی کبھی کھاتے ہیں۔ جب کبھی جانور بیمار ہو کر مرنے کے قریب ہو تو یا تو اسے جلا دیا جاتا ہے یا اسے ذبح کر کے گوشت کھا لیا جاتا ہے۔ یہاں پر عورت یا لڑکی کے ذمے سارا کام ڈال دیا جاتا ہے۔

رہائش کے لئے ان کے ہاں گاؤں نما ''انکانگ'' ہوتا ہے۔ جس میں زیادہ تر تو رشتے وار رہتے ہیں۔ البتہ غیر رشتہ دار بھی ہوں تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں لیکن ہر قبیلے کے لوگ اپنے اپنے جانوروں پر مختلف قسم کے نشانات بنا دیتے ہیں کیونکہ یہ ان کا قیمتی سرمایہ ہے۔

''مسائی عورت کہ جس کو بانجھ ہونے کا خدشہ ہو۔ وہ چھوٹی سی گڑیا بناتی ہے۔ یہ اشارہ ہے

۱۔ کشور ناہید بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۵

کہ اے زمین! تو کہ ہمارے جانور پالنے کو گھاس پیدا کرتی ہے اور جانوروں کا دودھ پی کر ہم زندہ رہتے ہیں۔ تو مجھے بھی بچہ دے۔ حاملہ عورت کی گود بھرنے کے لئے سارے علاقے کی عورتیں جمع ہوتی ہیں۔ البتہ بچے کی پیدائش اپنے ہی گھر میں ہونا خوش قسمتی قرار پاتی ہے۔ بچے کی پیدائش پر ایک بکری ذبح کی جاتی ہے۔ جب تک بچہ ماں کا دودھ پیتا ہے۔ شوہر اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات دوبارہ استوار نہیں کرتا۔ البتہ اس دوران وہ اور شادی بھی کر لیتا ہے۔ ہر شوہر کی بیویوں کی تعداد کی کوئی حد نہیں۔ البتہ چار یا پانچ شادیوں سے زیادہ عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتی۔ عورت اور لڑکی .... گھر کے تمام کاموں کے لئے ذمہ دار ہوتی ہے۔ پانی لانا، کم از کم پانچ یا دس کلومیٹر سے .... لکڑیاں اکھٹی کرنا۔ کھانا بنانا اور بچوں کی نگہداشت۔ یہ سارے کام عورت کے سپرد ہیں۔ جانوروں کی دیکھ بھال بچے کرتے ہیں۔ مرد اپنے اوزار و ہتھیار تیز کرتے ہیں اور میٹھے تمبا کو کھاتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی عورت کبھی مرد کو پانی لانے یا لکڑی لانے کو کہتی ہے تو ایک دو ہنٹر کھاتی ہے اور اپنی اوقات پہ واپس آ جاتی ہے''۔(۱)

کشور ناہید صرف عورتوں کی مظلومیت پر نہیں لکھتی بلکہ اپنے گرد و پیش پر نگاہ بھی رکھتی ہے۔ ان کا مشاہدہ عمیق اور ان کی نظر میں وسعت اور گہرائی ہے۔ وہ چیز کی تہہ تک جانے کے فن سے آشنا ہیں۔ وہ ظاہری چمک دمک سے متاثر ہونے والی شخصیت نہیں ہیں۔ بلکہ اس چمک کے اندر جو اصل ہے جو بہت گھناؤنا اور درد و کرب کی اذیت میں مبتلا ہے۔ اس کو دیکھنے کی خواہش مند ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اس علاقے میں مردوں بے عام دستور کو لوگوں کے سامنے الٹنا چاہتی ہیں کہ کس طرح ان کی مردانگی برقرار رہتی ہے مثلاً مسائی مردوں کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''ڈھال اور لکڑی کے مٹھ بنے ہنٹرے لے کر چلنا ایک عام آدمی کی ضرورت ہے۔ مجھے وہ مٹھ والی لکڑیاں دیکھ کر یہاں کا ہتھوڑا گروپ یاد آ گیا تھا۔ وہ لکڑی راستے میں ملنے والے کسی بھی غیر متوقع جانور کے سر پر مارنے کے استعمال کی جاتی ہے اور لوہے کے طمانچوں کی طرح کے ہتھیار جو کسی بھی وقت الارم کے لئے استعمال کیئے جاسکیں اور بھالے یہ ہوتے ہیں ایک مسائی کے ہتھیار۔ ان مسائی مردوں کے بچوں کا میل جول اور محبت بھی ہے۔ یہاں دکھ تکلیف اذیت اور مصائب ہوں وہاں پر خوشی کے مواقع کہیں نہ کہیں نکل ہی آتے ہیں۔ خوش ہونا اور اداس ہونا یہ انسان کی فطرت میں ہے''۔ (۲)

مسائی خاندان میں ایک تقریب ہوتی ہے جس کا حال کشور ناہید یوں لکھتی ہیں''۔

۱۔ کشور ناہید، کرالہ وسالنہ، ص۔ ۱۰۲

۲۔ ایضاً۔ ص۔ ۱۱۵

'' سب سے خوبصورت تقریب ''خوشحال گھرانے '' کی تقریب کہلاتی ہے۔ایک میاں بیوی اپنے بچوں سمیت برادری کے سارے لوگوں کو کھانے پر بلاتے ہیں۔اعلان یہ کرنا ہوتا ہے کہ اس خاندان کے سارے بچوں اور بیوی میں مثالی محبت اور خلوص ہے۔ ایک بیل ذبح کیا جاتا ہے اور سارے مل کر روسٹ کرتے ہیں اور پھر محفل کے عروج پر میاں بیوی کی نوک جھونک کا منظر، سب کے لئے لطف کا ذائقہ رکھتا ہے۔ سب سے بزرگ لوگ پوری برادری کی ذمہ داری قرار پاتے ہیں۔مرتے وقت باپ بیٹے کو لوہے کا ایک کڑا دیتا ہے جو نسل در نسل ہوتا چلا جاتا ہے''۔ (۱)

کشور ناہید ایک ایسی ادیب خاتون ہیں جو صرف مرکز نگاہ سامنے کی چیزوں کی نہیں بلکہ محسوسات کو بھی نوک قلم تک لانے کی خواہش مند ہیں۔جو عام سیاح کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔

''سنو............تمہارا نام .... پر تمہارا نام وہی ہے جو میرا ہے۔ہم سب محسوس کرنے والی کڑھنے والی عورتیں ہیں............مگر میں نہیں............سنو کشور ناہید .... میں نہیں میں .... لینا .... ادھر دیکھو .... یہ کرسٹینا .... یہ میرا .... یہ گزاوا۔ یہ اور سب اس حصار سے باہر آ گئی ہیں............اب مرد کی ذات ....ان کی شریعت سے باہر ہے'' مگر کیسے ....کیونکر............بھلا کس طرح ....قدرت ....فطرت ....بائیولوجی .... علم الابدان............نفسیات ....پرورش ....قانون فطرت ....او............شٹ یہ کیا ہے ....سب مرد کی Interpretation نفسیات سے لے کر مذہب تک ....جو لکھا مرد نے لکھا............جیسا چاہا مرد نے لکھا۔فلسفہ ہو یا تاریخ نفسیات ہو علم الابدان کائنات ہو کہ جغرافیہ............ ہر چیز کی تعریف وتوضیح مرد نے کی۔ جیسے چاہی ....جیسے منظور کی............ عورت نے اسے یاد کیا ....زندگی کا عملی جامعہ بنایا۔اعتبار کیا اور خود کو ان اشاروں پر نچایا جو اس کے لئے مقرر کیئے گئے۔'' (۲)

عورت کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ پناہ چاہتی ہے۔مرد کے ساتھ چلنا چاہتی ہے لیکن برابری کے حقوق لیکر نہیں۔ تحفظ کا احساس لیکر۔مرد کی حاکمیت اور ذہنی برتری کو وہ دل وجان سے تسلیم کر چکی ہے وہ ذہنی طور پر غلام ہے۔مرد کی وہ

۱۔ کشور ناہید بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۲۳

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۶۰

نفسیاتی طور پر غلام ہے مرد کی۔ اس لئے اس کی گھٹی میں ڈال دیا گیا ہے کہ مرد اعلی و برتر ہے۔اس کی تربیت بہتر طریقے سے ہونی چاہیے اور عورت کمتر ہے۔ اسے حق نہیں۔وراثت میں اسے حق نہیں۔شادی بیاہ کے معاملے میں بولنے کا وہ، چاہے رات کو کسی کھمبے تلے بکنے کے لئے کھڑی ہو یا ہانگ کانگ کی منڈی میں شیشے کے کمرے میں نمبر لٹکا کر اپنے گاہکوں کی منتظر ہو۔گاہک کون مرد کہ اس کی مرضی ہے کہ وہ اسے پسند کرے یا نہ کرے یا اس کی کتنی قیمت لگائے۔ اس کی مرضی و منشا ہے۔عورت تو داسی ہے۔خدمت کرنا اس کا شیوہ ہے۔دیوی بھی مرد نے اپنی آتما کے لئے بنائی۔ورنہ وہ کہاں اسی کو اس مقام پر پسند کرتا ہے۔قدموں میں بیٹھی عورت جتنا اسے سکون دے سکتی ہے۔دیوی کے مقام پر تو مردانگی کو ٹھیس ہی پہنچ سکتی ہے۔عورت پر جبر کا استحصال نہ کبھی ہوا ہے نہ ہوگا۔ اس لئے کہ عورت حق لینا نہیں جانتی۔اسے علم ہے کہ اس کے مقدر میں حق ہے ہی نہیں۔اس لیے ہر برائی اسے منظور اور حق نامنظور کیونکہ حق لیکر وہ اپنے مرد کو خوش کیسے رکھ سکتی ہے اور یہ اسے منظور نہیں ہے۔

عورت کے ساتھ تخفیفی سلوک ختم ہونا چاہیے۔ اس کی تعلیم پر لڑکوں کی نسبت کم خرچ کیا جائے۔گھر میں اس کے ساتھ مساوی سلوک نہ کیا جائے لیکن اس کانفرنس کے دوران جب کینیا کی عورتیں حمایت میں اور مردوں کے خلاف بولیں تو ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا مثلاً

''کینیا کی جو عورتیں اس عوامی اعلان نامے میں شریک تھیں اور جنہوں نے بحث اور قراردادوں میں حصہ لیا۔ ان کی تصویریں کھینچی گئیں۔انعادم دینے کے لئے نہیں۔۔۔۔۔۔۔سزا دینے کے لئے۔۔۔۔۔۔حکومت کے خلاف عورتوں کے حق میں بولنے کی سزا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہاں مجھے اپنی ایک نظم یاد آ گئی۔۔

مجھے سزا دو

کہ میں نے اپنے لہو سے تعبیر خواب لکھی۔

''جنوں بریدہ کتاب لکھی''۔ (۱)

دنیا میں ہر طرف ترقی کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔کہیں ایٹمی ترقی، کہیں صنعتی ترقی لیکن عورت آج بھی ترقی سے دور بے بس، مجبور، بے جرم سزا یافتہ ہمہ وقت طلاق کی سولی پر لٹکی ہوئی وہ بے جان مورتی کی طرح کام کرتی ہے۔سارا دن مشقت کر کے رات کو خاوند کو جسمانی سکون بھی فراہم کرتی ہے۔بچے نالائق تو عورت کے لائق ہوئے تو مرد کے۔ علم حاصل کرنے کے باوجود بے علم کہ اگر کوئی علمی دلیل دینے لگے تو زبان دراز کہلائے۔تحفظ کرنا چاہے تو بے لگام ٹھہرے۔

۱۔ کشور ناہید بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۱۰

آنکھ اٹھائے تو گستاخ گردانی جائے۔ شکایت کرے تو بے ادب کیا جائے۔ پھر آخر وہ کس کے سہارے اپنی آواز بلند کرے۔ بلکہ موجودہ ترقی نے اسے اور بھی بے وقعت بنا دیا ہے کہ عورت پہلے سے زیادہ آسانی سے میسر ہے۔ جب نایاب تھی کمیاب تھی تو پھر اس کو تلاش کیا جاتا تھا۔ اب دستیابی نے اس اس کشش سے بھی دور کر دیا ہے۔ وہ اب ہر اشتہار میں ہے، ہر چوراہے پر ہے۔ ہر نیلام گھر میں ہر منڈی میں لیکن نہیں تو دل میں کہ اب وہ اتنی کم دیر کے لئے مرد کے گھر رہتی ہے کہ اسے دل میں جگہ دینے سے پہلے ہی اس کی اوقات بتا کر فارغ کر دیا جاتا ہے لیکن وہ پھر بھی تلاش کے سفر میں نکلی ہوتی ہے نہ جانے اس کا سفر کہاں ختم ہوگا۔ موت پر یا جسم کے بازار میں کشور ناہید کہتی ہیں۔

"گزشتہ بیس برسوں میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۸۰ء تک طلاقوں کی شرح تین گنا ہوگئی ہے کہ تیسری دنیا کی بھوک کو امریکی گندم راس نہیں آرہی۔ خاص کر عورت کو غریب ملکوں کو زر مبادلہ لانے والی فصلوں کا جنون کھا گیا ہے۔ زمین سے روئی کی جگہ پیسہ اگانے کے جنون نے صنعتوں کا جال بچھایا ہے اور اس میں عورت کو نوکری اس لیے ملتی ہے کہ اول تو وہ کم پیسے پہ کام کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ اپنی مجبوریوں کے باعث ٹریڈ یونین نہیں بناتی اور پھر جب بھی حاملہ ہو جائے تو دودھ میں مکھی کی طرح نکال باہر کی جاسکتی ہے کہ دنیا بھر میں زچگی کے دوران مرنے والی بھی وہی ہے اور تین سال تک کی عمر میں بچوں کی موت پر آنسو بہانے والی بھی وہی" (۱)

لیکن اس سب کے باوجود ترقی کے تمام منصوبوں میں ترجیح عورت کو نہیں بلکہ مرد کو دی جاتی ہے۔ کہ عورت کو ہمیشہ کم فہم کہہ کر اسے اس کے مقام سے گرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ وہی عورت ہے کہ جس نے ولی پیدا کئے۔ پیغمبر پیدا کئے۔ آج بڑے بڑے ایوانوں میں بیٹھنے والے بھی عورت کی ہی تخلیق ہیں لیکن تخلیق کی اذیت جتنا مقام بھی عورت کو نصیب نہیں۔

عورت کبھی بھی کسی مقام پر بھی عورت کے مقام و مرتبہ کی بات نہیں کر سکتی۔ زمانہ اسے گستاخ، بے ادب اور باغی قرار دے گا۔ جیسا کہ اکثر مرد کشور ناہید صاحبہ کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ عورت کا کام یہ نہیں ہے کہ مردوں سے آزادانہ ملے یا یہ کہ عورت کے اندر بیداری پیدا کرنے والی خواتین خود اپنے مقام سے آگاہ نہیں ہیں۔ ۔عورت خود آگاہی کے عذاب سے گزر رہی ہے۔ جس کی وجہ سے ذہنی بیماریوں کا شکار ہو رہی ہے۔ انیسویں صدی میں پاگل خانوں میں مردوں

۱۔ کشور ناہید بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۱۰

کی نسبت عورتوں کی تعداد زیادہ تھی کہ وہ مرد کی طرح سخت دل نہیں ہے۔ وہ حساس ذہن کی مالک ہے۔ اور پھر بیسوی صدی میں ماہرین نفسیات کے پاس بغرض علاج آنے والوں میں زیادہ بڑی تعداد عورتوں کی ہوتی ہے۔ ابھی تک معاشرتی ترقی کے لئے عورتوں کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا رواج کم ہے کیونکہ حصول معاشی کی تلاش مردانگی قرار دی جاتی ہے۔ اور عورتیں گھروں میں بیٹھ کر مرد کا انتظار کریں اور گھر کا انتظام چلائیں۔ خواہ ان کی ذہنی صلاحیت نکھٹو مرد کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو۔ لیکن عورت کے لب آزاد نہیں ہیں کہ وہ بولے اگر بولے گی تو سزا دی جائے گی۔ ننگ خاندان ٹھہرائی جائے گی۔ عتاب کا نشانہ بنے گی۔ بھائیوں کی غیرت اور باپ کی عزت و ناموس پر دھبہ ہوگی اور ایسی ذلت سے تو بہتر ہے کہ اسے اپنے ہاتھوں مار دیا جائے کہ وہ کم فہم بے شعور اور بیوقوف ہے۔ کشور ناہید لکھتی ہیں۔

'' جنوبی افریقہ میں عورت ہمیشہ نابالغوں کے زمرے میں شمار کی جاتی ہے۔ شادی سے پہلے باپ اور شادی کے بعد شوہر اس کی عزت اور رائے کے ذمہ دار ہیں۔ وہ نہ کوئی مقدمہ کر سکتی ہے اور نہ کوئی اس پر مقدمہ کر سکتا ہے۔ اس طرح نہ ہو کوئی تجارت کر سکتی ہے اور نہ وراثت میں حصہ دار بن سکتی ہے۔ کہ بھارت میں گزشتہ ۵ برسوں میں ۳۷۳۳ عورتیں جلا دی گئیں۔ مسئلہ وہی جہیز کم ملنے یا نہ ملنے کا تھا اور کمال کی بات یہ تھی کی یہ سو میں سے بس حد سے حد ایک کیس پولیس نے رجسٹرڈ کیا تھا۔ ورنہ عورتوں کو جلا دیا جانا کوئی جرم نہ ہوا ۔کہ پاکستان میں ایک عورت کی گواہی ۔۔۔۔ کافی نہیں دو عورتوں کی گواہی، ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے .... اور جب یہ فقرہ کہا گیا تو ہال میں قہقہہ اور تضحیک کے نعرے تھے۔ میں بھی ویسی تھی۔ مجھے اس کانفرنس نے بڑے دکھ دیئے۔ ''(۱)

اس کرب اور دکھ کے باوجود کشور ناہید کے ہاں نسوانی رنگ اور جزئیات سمیت منظر پوری دلکشی دکھ اور گہرے مشاہدے کا امین ہے کہ وہ جانتی ہیں منظر نگاری نہ صرف سفر نامے میں ضروری ہوتی ہے بلکہ اس کے اسلوب کو تازگی بھی فراہم کرتی ہے لیکن اس منظر کی جزئیات کو جیسے کشور ناہید نے پیش کیا ہے وہ کسی مرد سیاح کا کام نہیں ہے۔ وہ عسائی کے ایک گاؤں جاتی ہیں تو وہاں کا حال کچھ یوں بیان کرتی ہیں۔

''اس قدر مکھی تھی اور ہر بڑے، بچے، بوڑھے، عورت مرد کی ناک اور آنکھوں پہ بیٹھی تھی کسی کو بری بھی نہیں لگ رہی تھی اور کوئی مکھی اڑا بھی نہیں رہا تھا۔ پیروں سے ننگے سب کے سب

۱۔ کشور ناہید بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۱۱

عورتوں کے کانوں میں کندھوں تک لٹکتے تار اور دیسی موتیوں سے بنے بندے کان چھ چھ جگہ سے چھدے ہوئے، گلے میں گلو بند، تار اور موتیوں سے بنا ایک نہیں کئی کئی لمبے ہار بھی ہاتھوں میں تانبے کے اور موتیوں کے بنے کڑے، بدن پر ایک لمبا سکرٹ یا چادر، جس کا کندھے پہ سرا باندھ کر ستر پوشی کی گئی ہے اور سر کے بال، مردوں کی طرح مشین پھری ہوئی مگر گندگی کے باعث مٹیالے نظر آتے''۔

مرد بھی پیروں ننگے سر کے بال، مشین پھری ہوئی، وہی عورتوں کی طرح گندے اور مٹیالے بند لمبا چغا سا جو گھٹنوں تک آتا ہے۔کبھی صرف دھوتی جو گھٹنوں تک آتی ہے۔ہاتھ میں بالا'' (۱)

مجموعی طور پر ؔہر عورت اور اس کے حقوق کی پامالی کی وجوہات پر لکھا گیا ایک بہترین سفر نامہ ہے جس میں حقیقت کی عکاسی بھی ہے اور دکھ و کرب کی داستان بھی کہ جو کشور ناہید کے دل کی آواز ہے۔کہ وہ ہر عورت کو اس کے جائز حقوق دلوانے کی خواہش مند ہیں۔ خود لکھتی ہیں کہ ان کی یہ خواہش کیونکر پوری ہو سکتی ہے یا ہو بھی سکتی ہے یا نہیں۔

۱۔ کشور ناہید بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۱۱

باب پنجم

حج کے سفر نامے

۱)	غزالہ ارشد	:	اجالوں کا سفر
۲)	بشریٰ رحمٰن	:	باؤلی بھکارن
۳)	محمودہ عثمان حیدر	:	مشاہدات بلاد اسلامیہ
۴)	فاطمہ بیگم	:	حج بیت اللہ وزیارت دیار حبیب
۵)	انور ملک	:	زیارت حرمین
۶)	کنیز بیگم	:	ارض مقدس
۷)	وحیدہ نسیم	:	حدیث دل
۸)	عفت الٰہی علوی	:	سفر نامہ حجاز و حج بیت اللہ
۹)	بشریٰ اعجاز	:	عرض حال
۱۰)	بشریٰ رحمٰن	:	منزل عشق پر تنہا پہنچے
۱۱)	بشریٰ رحمٰن	:	نسیما جانب بطحا گذر کن

۱۲) زبیدہ حیٔ : زہے نصیب

۱۷) بلقیس ریاض : سفر حرمین

۱۸) سیدہ حمیدہ فاطمہ : لاہور سے دیار حبیب تک

۱۹) ڈاکٹر فوزیہ سلمی : حاضری

غزالہ ارشد (اجالوں کا سفر)

اردو سفرنامے کی تاریخ میں حج وحرمین پر بے شمار سفرنامے لکھے گئے۔ لکھنے والوں میں بڑے بڑے علماء، فضلا، ادبا، شعراء، اولیاء امیر وغریب وعاصی سبھی شامل ہیں۔ موضوع ومحل کی یکسانی کی وجہ سے منفرد لکھنا بہت مشکل ہے لیکن اس میں تنوع برقرار رہا اور اس کی وجہ لکھنے والوں کا متنوع ہوتا ہے اور اس متنوع نے حج وحرمین شریف کے سفر ناموں کو بہت حد یکسانیت کا شکار نہ ہونے دیا۔

حج بیت اللہ کے سفرناموں کو پڑھتے ہوئے قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا کیونکہ اس کی وابستگی دلبستگی کا باعث بنتی ہے۔ دراصل رسول اللہ سے عشق اور اللہ سے عقیدت یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ ابتدائے آفرینش سے اس پر کسی نے کسی طرح کچھ نہ کچھ لکھا جا رہا ہے اور پھر عشق رسولؐ پر لکھنا تو قلبی واردات ہے جو کبھی بھی ایک سی نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ واردات دل سے نگاہ اور پھر مقدر کی بات ہے یہاں کبھی اشکوں کی کہانی اشکوں کی زبانی ہے اور کہیں ظرف ہے۔ لینے والے کا کہ وہ دینے والے کی وسعت بیکراں سے کیا لیتا ہے۔ بہرحال یہ حال وکال کی محفلیں انشاءاللہ تا قیامت جاری رہیں گی اور لکھنے والے اس میں علم وفضل کے دریا بہاتے رہیں گے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

> ''سفر حج مادے کے بوجھ سے نجات حاصل کر کے باطنی کیفیات اور روحانی واردات میں سفر کرنے کا نادر تجربہ ہے۔ اس سفر میں پروانہ اپنے محبوب پر جان نثار نہیں کرتا بلکہ قرب محبوب سے تجدید حیات کرتا ہے۔ دیار محبوب کی زیارت اس کے قلب ونظر کو طہارت اور ایمان کو استحکام عطا کرتی ہے۔ روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ زندگی کا رنگ اتر جاتا ہے اور کھلی آنکھوں سے دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر سامنے آجاتی ہے''۔ (۱)

اجالوں کا سفر غزالہ ارشد کے لکھے ہوئے حج وعمرہ کی روداد ہے جو ان کی قلبی واردات کی داستان بھی ہے اور اس شوق وعقیدت کی غماز بھی جو ہر مسلمان کے اندر تڑپ تڑپ کر اسے کبھی اپنی کم مائیگی کا اور کبھی اچانک نوازنے کے انداز سے آشنا کرواتی ہے اور دل سے ایک آواز نکلتی ہے جسے چاہے اسے نواز دے۔ جہاں عمل ورتبہ نہیں نظر کرم کام آتی ہے۔

۱۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص ۴۶۰

اس سفرنامے کا آغاز بہت خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔غزالہ ارشد لکھتی ہیں۔

''میری اس سے جان پہچان اتنی ہی پرانی ہے جتنا میرا وجود جیسے جیسے میرے شعور نے ترقی کی منزلیں طے کیں ویسے ویسے وہ بھی واضح اور روشن ہو کر میرے سامنے آتا چلا گیا''۔(۱)

غزالہ کی اس ازلی وابدی جان پہچان نے بہت جلد اسے دنیا کے فانی اور اللہ کے لافانی ہونے کا احساس اس کے اندر جگا دیا کہ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر صرف اسے اپنا سمجھنے لگی تھی۔

''چھوٹی عمر میں ہی میرے والدین نے ایک بات سمجھا دی تھی کہ کبھی بھی کوئی وقت آ سکتا ہے جب میرے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ماں باپ نہ رہیں۔دوست احباب نہ رہیں۔دولت و جائیداد نہ رہے۔یہ زمین و آسمان نہ رہیں مگر ایک ہستی ایسی ضرور ہے جو پھر بھی رہے گا تو پھر کیوں نہ اسی سے دوستی کی جائے۔جس کے بچھڑنے کا اندیشہ نہیں۔جس کو فنا نہیں''۔ (۲)

زمانے کے سرد و گرم نے غزالہ ارشد کو وقت سے بہت پہلے سمجھا دیا کہ دنیا کا مقابلہ کھلی آنکھوں اور ننگے پاؤں کرنا ہے لیکن وہ اس میں کامیاب ہوئیں کہ کامیاب کرنے والے کے ساتھ دوستی گہری اور مضبوط تھی تو پھر دنیا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ بعض اوقات خدا اپنے بندوں کا ایمان مضبوط کرنے کے لئے امتحان لیتا ہے کہ کیا وہ صرف محبت کا دعوے دار ہی ہے یا اسکی محبت پر دکھ تکلیف میں قائم و دائم رہتی ہے۔ غزالہ ارشد کے بھی ساتھ یہی ہوا کہ شادی کے بعد ان کی تیسری بیٹی مریم پیدا ہوئی جو نہ سن سکتی تھی اور نہ بول سکتی تھی۔وہ دیوانہ وار ہر ڈاکٹر کے پاس گئیں لیکن سب سے مایوس ہو کر اپنے ازلی جان پہچان والے خدا کے حضور سجدہ ریز ہوئیں تو اللہ نے ان کی التجا سن لی اور ان کی سماعت سے محروم بیٹی جب سننے لگی تو یہ خوشی ان کے عمرے کا باعث بنی۔لکھتی ہیں۔

''پہلا عمرہ ادا کرنے تو اسی تشکر کے احساس کے ساتھ گئی تھی کہ اس پاک ذات نے میری بیٹی کو سماعت دی'' (۳)

ہر حاجی کی مشکلات کی طرح غزالہ ارشد کو بھی گھر کی بچوں کی اور سب سے بڑھ کر نوکری کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ سب شوق کے راستے میں مائل نہ ہوئیں بلکہ شوق کو دو آتشہ کیا اور منزل آسان ہوتی چلی گئی۔ کیونکہ مرکز و محور اللہ اور رسول کی ذات تھی۔ اس سفرنامے کی اہمیت اس تاثر کو حاصل ہے جو مقامات مدینہ منورہ دیکھ کر غزالہ ارشد پر طاری

۱۔ غزالہ ارشد اجالوں کا سفر قریشی پبلشرز لاہور ۱۹۸۶ ص ۱
۲۔ ایضاً ص ۲
۳۔ ایضاً ص ۴

ہوئیں اور کیفیت زیارات کو انہوں نے بڑے پرخلوص انداز میں بیان کیا ہے لیکن ان تاثرات میں تازگی بھی ہے اور طہارت قلب بھی۔ انہوں نے ان تمام کیفیات کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے محسوس کیا ہے اور سفرحج کی حرمت اور تقدس کو نمایاں تر کردیا ہے اور ہم غزالہ ارشد کی قلبی واردات کو محسوس کرتے ہیں۔

''حرم کے برآمدوں سے لرزتے قدموں کے ساتھ گزرتے جب عین اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے تو غلاف کعبہ پر نظر پڑتے ہی اشکوں کی برسات لگ گئی۔ شرمندگی، پشیمانی، سب ان اشکوں میں بہہ گئی اور جب جی ہلکا کر کے نظریں بھر کر اس گھر کو دیکھا تو جیسے اللہ تعالی سے محبت کا ٹھنڈا احساس عود کر آیا۔ جیسے دل پر ہاتھ رکھ کے اس نے یقین دلا دیا کہ راضی ہوں تم سے تب ہی تو اپنے در پر بلایا ہے۔ معاف کردیا ہے۔ تمہاری سرکشیوں کو اسی لئے تو یہ رحمت کے دروازے کھولے ہیں۔ پاک کرنا چاہتا ہوں تمہاری روحوں کو تب ہی حاجی کہلاتے ہو''۔ (۱)

دردمندی کا احساس سفرنامے میں جابجا ملتا ہے۔ اس سفرنامے میں نہ صرف تاریخ بلکہ تاریخ کے بعض پہلو بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کیئے گئے ہیں۔

''تین دوستوں کی ناقابل فراموش داستان، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمرؓ نے زندگی میں ساتھ دیا تو نبی نے بھی دوستی کا کیا خوب حق ادا کیا مر کر بھی ان دوستوں کو خود سے جدا نہ کیا۔ اگر عمرؓ گھمنڈ اور خودپرستی کا بت نہ توڑتے اگر وہ لحاتی تفخر کو ہی سب کچھ جانتے تو آج اتنا بڑا اعزاز کیسے پاتے کہ سرور کونین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ استراحت فرما رہے ہیں .... اچھی صحبت کے کیا ثمرات نظر آتے ہیں یہاں''۔ (۲)

غزالہ ارشد کا تبصرہ ایک جگہ پاکستانی قوم کے بارے اتنا سچا، کھرا اور جامع ہے کہ خود کو پاکستانی ہونے پر شرم محسوس ہوتی ہے۔ بیان کی لطافت عروج پر ہے۔

'' راستے میں سعودی حکومت کی طرف سے آب زم زم کی بوتلیں اور لنچ باکس تقسیم کیئے گئے

۱۔ غزالہ ارشد بحوالہ سابقہ ص ۱۴

۲۔ ایضاً ص ۲۲

۔ بڑے منظّم طریقے سے ہر بس کو روک کر ہر زائر تک یہ چیزیں پہنچائی جاتی تھیں ۔ نجانے کیوں خیال آ رہا تھا کہ اگر پاکستان میں تقسیم کرنے کے لیے دیئے جاتے تو نجانے اس میں سے کتنے غائب ہو چکے ہوتے ۔ یہاں حکومت بڑی فراخدلی سے اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں آنے والوں کے لئے خرچ کرتی ہے ۔ اکثر میرے دل میں خیال آتا تھا کہ اگر حرم پاک پاکستان میں ہوتا تو ہمارے ارباب اختیار کے ہاتھوں اس کے کیا حالات ہوتے ۔ اور بڑی بھیانک تصویر نگاہوں میں گھوم جاتی ۔ عاشقوں نے ہر طور آنا ہی تھا مگر ہمارے انتظامی حالات کیا ہوتے ۔ خدا بھی بڑی حکمت اور دانائی والا ہے ۔ اسی قوم کے حوالے امانت کرتا ہے جو اس کی اہل ہو‘‘ ۔ (۱)

غزالہ ارشد کیف جمالی کو گرفت میں لینے پر قدرت رکھتی ہیں ۔ لیکن اس پر کیف میں محبت اور شیفتگی بھی بے پایاں تن جذبہ اور ہمہ تن کیف اس سفرنامے کی روح رواں ہے ۔ بندہ و آقا کے درمیان جو دوئی کا پردہ قائم ہے ۔ ارض حجاز میں یہ مدار بدل گیا اور اب ہر چیز کا مدار دیار محبوب ہے ۔ یہاں حاضری سے پیدا ہونے والے تاثر میں وارفتگی بھی ہے اور خود کو جذب کرنے کی آرزو بھی ۔ اس سفرنامے کا ایک خوبصورت مشاہدہ کچھ یوں ہے کہ ہر قاری اس منظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے متحرک پاتا ہے ۔ یہ منظر ہے جب در کعبہ وا ہوتا ہے ۔ اس وقت زبانیں ساکت اور دھڑکنیں خاموش ہو جاتی ہیں ۔

’’ جیسے ہی شاہ .... نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا اور دروازہ کھلتے ہی روشنی ہوئی ۔ ساری فضا اللہ اکبر اور سبحان اللہ کے نعروں سے گونج اٹھی ۔ یوں لگا جیسے خود اندر سے نکل کر باہر آ گیا ہے ۔ اتنا جلال تھا فضا میں کہ جسموں پر لرزہ طاری تھا ۔ آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے اور ہذیانی کیفیت میں لوگ اللہ اکبر اور سبحان اللہ کا ورد کر رہے تھے کچھ لوگ بے قابو ہو رہے تھے اور دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے ۔ در کعبہ کھلا تھا ۔ رحمتوں کا نزول بے بہا تھا ۔ قدم قدم پر مانگنے کا سماں تھا ۔ جب سے یہاں آئے تھے جھولیاں پھیلائے ہمارے ظرف تو تنگ پڑ گئے ۔ مگر دینے والا خزانے بہائے جا رہا تھا ۔ در کعبہ کھلا دیکھ کر لوگ اپنی اپنی دعاؤں ، تمناؤں کی فائلیں کھول کر بیٹھ گئے تھے ۔ یوں تو یہاں ہر قدم پر قبولیت کی مہر لگ جاتی تھی مگر آج تو دینے والا اپنا گھر کھول کر بیٹھ گیا تھا ۔ (۲)

غزالہ ارشد نفسیات کی پروفیسر ہیں ۔ ان کے سفرنامے میں ایک منفرد چیز ان کا چیزوں اور جگہوں کے ساتھ

۱۔ غزالہ ارشد بحوالہ سابقہ ص ۳۴

۲۔ ایضاً ص ۴۶

انسانوں کا نفسیاتی مطالعہ ہے۔ وہ شعور اور لاشعور کو کہیں بھی فراموش نہیں کرتیں۔ عام لوگ تو Photo Therapy سے بھی واقف نہیں ہوتے لیکن غزالہ ارشد ایک اور Therapy سے آگاہ کرتی ہیں۔ مثلاً

''ایک روز چاہ زم زم پر گزرنے کے بعد مجھے اتنا لطف آیا اور ایسا سکون محسوس ہوا جیسے کسی بچے کو ٹب میں بٹھا دیا جائے اور پانی میں پہروں چھپا کیاں مارنے کے بعد بھی وہ سیر نہیں ہوتا۔ واقعی Water Therapy اپنا اثر رکھتی ہے۔ خاص طور پر جب پانی بھی زم زم کا ہو''۔ (۱)

اس سفرنامے کی ایک اور خوبی اس کا نسوانی رنگ ہے۔ کہ جس میں چہروں کے دکھ درد اور کرب کو ممتا کے رنگ میں محسوس کیا گیا ہے کہ جس کی محبت آفاقی بھی ہے اور لافانی بھی۔ عورت میں ممتا کا جذبہ ہر چیز سے زیادہ ہے وہ دنیا کے کسی بچے کو بھی دیکھے۔ اس میں وہ اپنے بچوں کی جھلک دیکھتی ہے اور اس کے لئے ویسے جذبات رکھتی ہے۔ جیسے اپنے بچوں کے لئے۔ جہاں سرشاری اور انبساط کی کیفیات طاری ہوں۔ جہاں وفور جذبات میں لوگ اپنوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ جہاں جذباتی وابستگی صرف اور صرف اللہ کے ساتھ ہوتی ہے کہ یہ سفر مبتلائے عشاق کا سفر ہوتا ہے۔ جہاں جذبے صادق اور نیت صاف ہوتی ہے۔ جہاں پر نیاز عقیدت کی چوکھٹ پر سرنگوں ہوتی ہے۔ وہاں کسی خاتون کو اپنے بچوں کے یاد میں دوسرے بچوں کے جذبات یاد آئیں لیکن ایمان کی پختگی کہ مناسک حج میں فرق نہ آئے۔ اللہ پر ایمان کو اور مضبوط کر دیتی ہے اور بے اختیار انسان کہہ اٹھتا ہے کہ ہوگا وہی جو اس کی چاہت ہے۔

''جیسے جیسے حج کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ اک عجیب خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ بھی تو ھم جیسے زائرین تھے جو منی میں جل کر راکھ ہو گئے اور دوبارہ اپنے بچوں کے انتظار میں جھلستے ہوئے چہرے نہ دیکھ سکے۔ وہ بھی تو ہماری طرح بچوں کو تسلیاں دے کر آئے ہوں گے۔ جو ہجوم میں کچلے گئے اور جن کے معلم نے بچوں کو صرف کھلونوں سے بھرے ہوئے بیگ پکڑا دیئے کہ ماں باپ دوران حج حادثے کا شکار ہو گئے۔ ان کے بچے نے بھی تو آنکھوں میں اس کے دیپ جلائے ہوں گے جو منی میں پل گرنے سے مر گئے تھے''۔ (۲)

۱۔ غزالہ ارشد بحوالہ سابقہ ص ۳۷

۲۔ ایضاً ص ۶۷

واقعی مسلمان کے لئے مال اور اولاد بڑی آزمائش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالی ہر صاحب ایمان کے دل کو سکینت دے اور بے قراری سے بچائے۔ اس سفرنامے میں آثار تاریخ کی دریافت بھی ہے اور بیان بھی اس میں زائر کی جذباتی وارفتگی بھی اور معاشرتی جھلکیاں بھی۔ حج وزیارات کے حالات بھی اور مناسک حج کے واقعات بھی بعض جگہ حج کے دوران ان کی بے بسی اور روحانی تجربے اضمحلال اور آزار کی صورت میں بیان کیئے گئے ہیں۔ لیکن اصل حاصل وہ دعائیں ہیں جو میدان عرفات میں اپنے لئے اور اپنے عزیز واقارب کے لئے مانگی گئیں اور سب سے پرلطف بات یہ کہ دل کو مانگ کر اور خالق کو دے کر عجیب طمانیت کا احساس ہے۔ غزالہ ارشد لکھتی ہیں۔

''دعاؤں کا سلسلہ ختم ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے یہی لمحات تھے جن کے لئے ساری تگ ودو تھی ۔ دل پر گہرے اطمینان اور سکون کی چادر تن گئی۔ آنسو خشک ہو گئے۔ لب خاموش ہو گئے اور ہاتھ نیچے گر گئے یوں لگا کہ اب کچھ مانگنے کو رہا ہی نہیں۔ کچھ دیر پہلے تک ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اندر ایک آلاؤ دہک رہا ہے اور اب ایسے لگ رہا تھا جیسے رحمت کے ٹھنڈے چھینٹوں سے وہ دہکتا آلاؤ یکدم سرد ہو گیا۔''(۱)

حج کے سفر میں غزالہ ارشد نے کئی جگہ مزاح کی بڑی خوبصورت تصویر کشی کی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی محفل میں کوئی اچانک جملہ بولا جائے تو محفل زعفران بن جاتی ہے۔ اس طرح سے غزالہ نے بھی اس مقدس فرض کو بوجھ سمجھ کر نہیں فرض سمجھ کر ادا کیا ہے اور کہیں بھی اکتاہٹ کے احساس کی بجائے ان لمحوں کو زندگی کا حصہ جان کر قبول کرتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ بعض جگہ انہوں نے پنجابی انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو کہ بے ساختہ ہے۔ اس لیے گراں نہیں گزرتا مثلاً

'' اللہ حیاتی کرے سعید محمد نے عرضی ڈال دی۔ اڈیک اڈیک کر (انتظار کر کے) آنکھیں

۱۔ غزالہ ارشد بحوالہ سابقہ ص۔ ۶۹

پتھرا گئیں۔سب کی عرضیاں آ گئیں۔میرا حکم نامہ نہ آیا''۔ (۱)

یا غزالہ ارشد کے ہاں ایک اور رنگ نظر آتا ہے جو ان کی خوش طبعیت ہونے کی دلیل ہے۔ان کا خاوند اکثر اوقات بہت زیادہ دعائیں مانگتے یا نفل پڑھنے سے بچتا ہے۔اس کا اظہار وہ یوں کرتی ہیں۔

''بدحواس، بدحال شیطان کے منہ پر کنکریاں مار کر نکلے تو شیطان سے زیادہ اپنا برا حال تھا۔''(۲)

یا پھر ان کے خاوند اور رشتے دار زاہد اور طارق کنکریاں مارنے کے بعد انتہائی ڈپریس تھے۔ اس وقت غزالہ ارشد کی رگ ظرافت پھڑ اٹھتی ہے۔

> ''ہاں بھئی ایک عمر گزری تھی ان کی قرابت داری میں آخر کو تو لنگوٹیا یار تھا۔بچپن سے لے کر اب تک کا ساتھ تھا۔ اب یکدم یوں اس سے اعلان بے وفائی شاق تو گزرے گا۔میں جانتی ہوں بڑی تکلیف سے آپ لوگوں نے ان احباب کو کنکریاں ماری ہیں لیکن اب یہ منہ لٹکا کر بیٹھنے سے کیا فائدہ''۔ (۳)

مجموعی طور پر غزالہ ارشد کا سفر نامہ دل کی داستان ہے جو بڑے خلوص کے ساتھ رقم کی گئی ہے۔بعض جگہ وہ بڑی جذباتی ہوگئی ہیں اور بعض جگہ وہ سراپا تشکر بن گئی ہیں۔ ان کا سفر نامہ روایت کے ساتھ ساتھ خارج سے داخل تک کے مطالعے کی بڑی عمدہ وقائع نگاری ہے۔ اس میں گدازی قلب کی کیفیت بھی موجود ہے اور اسلوب بھی عمدہ ہے۔

۱۔ غزالہ ارشد بحوالہ سابقہ ص۔ ۸۵
۲۔ ،، ،، ص۔ ۶۹
۳۔ ،، ،، ص۔ ۸۱

بشری رحمن (بائولی بھکارن)

حج فرض ہے۔ حکم پیغمبر ہے۔ خوشنودی خدا ہے۔ اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ حج 9 ھ میں فرض ہوا۔ سفر کئی قسم کے ہوتے ہیں مگر حج اپنی نوعیت کا انوکھا، نرالا اور خوشنودی رسولؐ کے لئے اختیار کیا ہوا روحانی سفر ہے۔ اس سفر میں آدمی اپنی نفی کرتا ہے۔ گناہوں کا اعتراف کرتا ہے اور کم مائیگی کا احساس مسلسل اس اعتراف پر مجبور کرتا ہے کہ دیار محبوب کی زیارت میں دراصل ماصل زندگی ہے۔ باقی سب بے کار۔ یہی قرب اللہ اور حب رسولؐ ہے۔

حج کے سفر اب صرف مناسک حج کے بیانیہ واقعات تک ہی محدود نہیں بلکہ اب اس میں ذہنی فکری اور قلبی مسافرت کے زاویے موجود ہیں۔

جدید دور کی مصنفہ بشریٰ رحمٰن کے سفرنامے ''باؤلی بھکارن'' اور نسیما جانب بطحا گزر کن'' اسی نوع کے سفر نامے ہیں۔ جن میں خارج سے داخل تک کا سفر ہے اور اہم بات بشریٰ رحمٰن کی انکساری اور کم اہمیتی ہے۔ جو اس کا اصل حسن ہے۔ یہ ایک رپورتاژ کی صورت میں ۵۶ صفحات پر مشتمل حج نامہ ہے۔ اس کی تاریخی اشاعت ۱۹۸۲ء ہے یہ سفرنامہ سراپا اشتیاق نظر آتا ہے۔ اور ہمہ تن جذبہ بن جاتا ہے۔

بشریٰ کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ حج سے پہلے عمرہ ادا کریں کیونکہ حج میں ہر حاجی سکون و تسلی کے ساتھ ایک ایک رکن ادا کرنے کی جگہ نہیں پاتا اور اس کی بے قراریوں کو چین اور تشنہ روح کو سیرابی حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ تھوڑی آگہی ساری عمر کی بے قراری بن جاتی ہے۔ اس لیے بے قراری کو قرار عمرہ اور پھر حج سے حاصل ہوتا ہے۔ جب بشریٰ سفر پر نکلتی ہیں تو لکھتی ہیں۔

> ''میرا دل دو قسم کے جذبات سے لبریز تھا۔ کم مائیگی اور تشکر جب ان کی رحمتوں کا جمال ذہن میں آتا ہے تو کم مائیگی کے پسینے میں لبریزہ جاتی ہوں اور جب اللہ کا کرم خیال آتا ہے تو زندگی کا ہر احساس سجدہ ریز ہو جاتا ہے''۔ (۱)

شوق طلب دل کے اندر آگ کو اور بھڑکا دیتا ہے اور جب یہ آگ جذبات کو بھڑکا دیتی ہے تو صدق دل سے دعا نکلتی ہے اور جس کا جتنا ظرف ہوتا ہے وہ مانگ لیتا ہے، پالیتا ہے اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس سفرنامے میں بشریٰ رحمٰن کی

۱۔ بشریٰ رحمٰن باؤلی بھکارن وطن دوست لمیٹڈ لاہور ۱۹۸۳ ص۔ ۷۲

عقیدت ومحبت کے عناصر کثرت سے جمع ہیں اور شوق وارفتگی میں اضافہ کا باعث بنتا ہے اور بے قرار تمنائیں تشنہ کام نہیں رہتی بلکہ دیدہ و دل سیر و سیراب ہو کر جھک جاتے ہیں۔ نیاز مندی کے ساتھ انسان اپنی زندگی میں بہت سی کیفیات سے گزرتا ہے کہ ان میں بعض کو لفظوں کے سانچے میں ڈھالنا ناممکن نظر آتا ہے۔ انہی میں سے ایک در اقدس پر حاضری ہے کہ جہاں عموماً ہم مسلمان عاجزی اور انکساری کی وجہ سے اسقدر جذباتی ہو جاتے ہیں کہ ہماری آنکھوں کا پانی سیل رواں کی طرح بہتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور عالم وارفتگی میں ہم پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ خدا اور اپنے وجود کی تلاش ہی انسان کو سرگرداں، اکھٹے ہونے میں اس شوق کی انتہا در اقدس ہے۔ بشریٰ رحمٰن لکھتی ہیں۔

> '' یہ شوق کا عالم میری گرفت میں نہیں آتا۔ کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی باؤلی بھکارن کی طرح میں جھولی بھر خیرات پا کر گریبان تار تار کرلوں گی۔ شوق کی دھجیاں بکھیر دوں گی۔ قہقہے لگاؤں گی۔ ہذیانی انداز میں چیخوں گی اور بالآخر آنسوؤں کی جھڑی لگ جائے گی اور کبھی یوں معلوم دیتا تھا کہ دم سادھے بیٹھی بیٹھی ساکت ہو جاؤں گی۔ مگر دم سادھے تو میں کافی دیر سے بیٹھی ہوں کیا مجھے مقدر کی رسائی حضور اور باریابی کا اعتبار نہیں رہا''۔ (۱)

جدہ کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر سب سے پہلا احساس لو کے تیز تھپیڑے کا تھا مگر ہوا کا فرق ہوتا ہے۔ بشریٰ رحمٰن کو یہی ہوا ماں جیسی شفقت اور استاد جیسی سرزنش محسوس ہوئی اور گرمی اس کے شوق میں حائل نہ ہوئی بلکہ جذبے کو دو آتشہ کر گئی کیونکہ

> ''ہر شوق کو کسی نہ کسی گرمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ شوق کی گرمی موسم کی حدت کے ساتھ ملکر جذبے کو دو آتشہ کر دیتی۔ '' (۲)

بشریٰ رحمٰن کے جذبوں میں وارفتگی بھی ہے اور جنون بھی۔ وہ جلد از جلد پاک خاک کو اپنی آنکھوں کا سرور اور مانگ کی افشاں بنانا چاہتی ہیں لیکن انتظار ہمیشہ شوق کا امتحان لیتا ہے اور بے قرار تمنائیں تشنہ کام رہتی ہیں۔ اسی بے قراری میں جب کوئی مسلمان وفور جذبات سے اپنے خدا کو پکارتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسی ٹوٹے ہوئے دل اور بے چین و بیقرار دل کی آواز سنتا ہے اور اسے نواز تا ہے کہ بندگی اپنی بے بندگی پر شرمندہ ہو جاتی ہے اور دینے والے کی سخاوت پر دم بخوردہ

۱۔ بشریٰ رحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۷۳

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۷۶

رہ جاتی ہے۔ جبکہ اپنا دامن عمل کی دولت سے یکسر خالی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

''اس سفرنامے میں اپنے تاثرات و کیفیات کو پیش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ اور اپنے ولولہ شوق کو دیکھتے ہوئے مناظر ہی آشکار کیا ہے۔ چنانچہ اس میں محبت اور اطاعت کے عناصر زیادہ ہیں۔ جذبے نے اظہار کی صورت یوں اختیار کی ہے کہ روئے سخن باہر کی جانب ہے لیکن آواز بشریٰ رحمٰن کے داخل سے ابھر رہی ہے اور آنسوشکرانے کے گلدستے بنتے جارہے ہیں''۔(۱)

بشریٰ رحمٰن ایک ایسی مصنفہ ہیں کہ جن کا دل اللہ اور اس کے رسول ؐ کی محبت سے سرشار ہے۔ وہ روضے کی جالیوں کے آگے پیاسی آنکھوں کو آنسوؤں کا عرق پلانا چاہتی ہیں۔ ان روح پرور مناظر کو اپنی آنکھوں میں بسانا چاہتی ہیں کہ جن کو دیکھنے کے لئے ان کی آنکھیں ترس رہی ہیں۔ اسی لئے وہ کبھی روزہ کا واسطہ دیتے ہوئے جب اجر مانگتی ہیں تو کبھی اپنے کو باولی بھکارن، کبھی گھٹیا سود خور اور کبھی فقیر کہہ کر پکارتی ہیں۔

بڑے خوبصورت انداز میں لکھتی ہیں۔

'' میری دعاؤں کی گٹھڑی کہیں راستے میں گر گئی ہے۔ گھر سے چلی تھی تو ساری دینوی ضرورتوں اور خواہشوں کو ایک گھڑی میں باندھ لیا تھا۔ روزانہ اپنے گھر بیٹھ کر انتہائی ڈھٹائی اور دھڑلے سے مانگا کرتی تھی۔ نت نئی بھیک، نت نئی خیرات، اور آج تو مانگنے کا دن ہے۔ بخشش کی گھڑی ہے۔ رب کعبہ کے در پر جھولی پھیلانا ہے۔ بڑی سے بڑی گٹھڑی کیوں نہ اٹھائی پر نہ جانے گٹھڑی کہاں رہ گئی ہے''۔(۲)

در کعبہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر خطے سے لوگ حب رسول ؐ کی وجہ سے اور فرمان خداوندی کی وجہ سے جوق در جوق آتے ہیں۔ دل کی سیاہیاں دھونے جہاں دامن گناہوں سے آلودہ ہو تب بھی عبادت باریاب ہو کر نکلتی ہے۔ چنری تار تار ہو تب بھی بھرنے والا بھر دیتا ہے۔ کیونکہ یہاں محبت کی آواز لبیک کا روپ دھار لیتی ہے۔ دوری کا نطق مل جاتا ہے۔ بے قراری کو چین مل جاتا ہے۔ سجدے کا کوئی دستور نہیں ہوتا۔ عشق رسموں سے ماوری ہے۔

۱۔ بشریٰ رحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۶۶

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۸۱

کیونکہ یہ وہ دن ہے جب

''آج سجدے کی آزادی ہے۔
ہر جا ہر طرف وہ ہے
آج محبت کرنے کی آزادی ہے
آج جنوں خرد پر بھاری ہے ۔
آج پکارنے کا دن ہے۔ (۱)

اور یہ آس کا گھر ہے کہ جہاں کہیں نظر نہ آنے کے باوجود قلب ونظر میں سمایا ہوا ہے۔ حجاب کے باوجود بے حجاب ہے۔ دور کے باوجود نزدیک ہے تو پھر اپنے دامن کی وسعت سے زیادہ کیوں نہ مانگا جائے۔ گھر کے مکین کا دروازہ کھٹکھٹائیں تو کیسے ہوسکتا ہے کہ جواب نہ آئے۔ اسی لئے بشریٰ رحمٰن بے قرار ہوکر مقام ملتزم یعنی رحمت کے پرنالے کے نیچے کھڑی دعا مانگ رہی ہیں۔

''یہاں دیوانے لوگ سینہ چاک کر دیتے ہیں اور جیسے اپنے اللہ سے لپٹ جاتے ہیں۔ دیکھا تم نے ....ویلز کو سینہ سے لگائے یوں چمٹے ہیں جیسے موت ہی ان کو جدا کر سکے گی۔ یہ اللہ کا دروازہ ہے۔ یہ اس کے گھر کی چوکھٹ ہے۔ فقیر چوکھٹ پہ کھڑے صدا لگاتے ہیں۔ اور پھر جس چوکھٹ سے کچھ ملنے کی امید ہو وہاں سے کون جا سکتا ہے'' (۲)

عشق میں عقل و دل کی جنگ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ بشریٰ رحمٰن بھی جب بعض مقامات پر وفور شوق سے اپنے اور خدا کے درمیان مائل پردے کو چیرنا چاہتی ہیں اور اپنی جان اسی شوق کے راستے میں قربان کرنا چاہتی ہیں تو ان کے اندر عقل و دل کی زبردست جنگ ہوتی ہے۔ کبھی عشق غالب آ جاتا ہے اور کبھی عقل جہاں پہنچ کر اگر کوئی خدا کی محبت میں دنیا بھی چاہے تو کیا دے۔

''جان کس کی دی ہوئی ہے؟ جان کس کو دی جا رہی ہے؟ کچھ اپنا بھی ہے۔ تیرے پاس؟ آرزو تیری، طلب تیری، تمنا تیری دنیا۔۔۔۔۔؟ نہیں یہ دنیا بھی تیری وہ دنیا بھی تیری، شرع تیری، محبت تیری، رضا تیری، بندگی تیری، خوف تیرا، نام تیرا، جان تیری، روح تیری، سب تیرا، داتا تیرا۔'' (۳)

۱۔ بشریٰ رحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۶
۲۔ ایضاً ص۔ ۱۸۶
۳۔ ایضاً ص۔ ۶۸

در کعبہ پر جب کسی مسلمان کی پہلی نظر پڑتی ہے تو وفور جذبات سے بے قابو ہو کر لرزنا شروع ہو جاتا ہے۔ آنسوؤں کی فصل جو دوری کی وجہ سے پک چکی ہے۔ آج زبان لفظوں کی محتاج نہیں بلکہ آنسو دلی جذبات کی کیفیت کو یوں عیاں کر رہے تھے کہ وہ کسی اسلوب کے محتاج نہ تھے۔

''خانہ کعبہ پر نظر گئی تو میں ٹھہر گئی۔ ہونٹ تھرتھرائے تو ساکت ہو گئے۔ اب کعبہ ....رب کعبہ..........بس سانس میں سے تو یہی آواز آ رہی ہے۔ اس قدر حسین ....اس قدر نرالا ....اتنا مکمل ....اتنا اجالا ...... ایسا انوکھا ....اتنا پیارا..........کتنا زندگی بخش..........یہ تیرا گھر ہے..............''(۱)

کسی فن پارے میں جب دل کی محبت اور روح کا گداز شامل ہو جائے تو پھر خدا اور بندے کے درمیان سارے پردے ہٹ جاتے ہیں اور پھ خدا سے ہمکلام ہوتے ہوئے من و تو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ وہاں صرف اپنائیت رہ جاتی ہے۔عقیدت رہ جاتی ہے مثلاً

'' نماز ختم ہوگئی۔نمازیوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ سب گڑگڑا رہے ہیں۔ مانگ رہے ہیں۔ تجھے تجھ سے چاہ رہے ہیں۔ یوں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنا اور بکھر بکھر کر ٹوٹنا۔ تجھے یہ منظر اچھا لگتا ہے نا؟ تو بھر دے ان سب کی جھولیاں..............''(۲)

اس سفرنامے میں بشریٰ رحمٰن کی کیفیت بالکل ایسی ہے کہ جسے کسی بچے نے سارا سال امتحان کا سلیبس نہ پڑھا ہو اور وہ کمرہ امتحان میں جاتے ہوئے روتا ہو۔ بالکل اسی طرح سے اگر نافرمانیوں کی فہرست طویل ہو تو آقا کتنا ہی مہربان کیوں نہ ہو قدم لڑکھڑا ہی جاتے ہیں۔ زبان رک جاتی ہے۔لیکن ہاتھ اٹھ جاتے ہیں۔آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔سر جھک جاتا ہے کیوں کہ ہمارے آقا گنہ گاروں کے شافعی ہیں۔وہ امت کے پاسبان ہیں۔ان کے در سے کوئی خالی نہیں آتا۔ ہاں اگر وہ اپنی بغل سے چور نکال دے اور من کو صاف کر دے تو تاکہ جب ہم اس کے حضور پیش ہوں تو کچھ ہدیہ ہمارے پاس ہو۔کچھ تو نذرانہ ہو کہ ہم عقیدت کے پھول نچھاور کر سکیں کیوں کہ

'' وہ تو اندر بیٹھا مسکراتا ہی رہتا ہے.......... بندے باہر کھڑے اشک بہاتے ہی رہتے ہیں اور انسانوں کی یہ زنجیر جو اس کے گھر کا طواف کرتی ہے اور گہری ہوتی رہتی ہے۔

۱۔ بشریٰ رحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۲۱

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۱۱

زنجیر شب و روز کسی لمحے میں نہیں ٹوٹی وہ ہنس رہا ہے .... زنجیر کیا ہے ؟
.... یہی میں ہوں ۔حجر اسود کو بوسہ دینے ولوں کا ہجوم ہو گیا ہے۔..............
فقط ایک بوسہ ہی ساری کائنات بن گی ہے ہر خزانے اور ہر خواہش پر بھاری یہ بوسہ کیا ہے؟
یہی تو میں ہوں۔(۱)

بشریٰ رحمان نے اس سفر نامے میں اپنے آپ کو ہمیشہ دامن پھیلانے والی بھکارن کے نام سے یاد کیا ہے اور یہ ان کی عقیدت واحترام ہے اور وہ وارفتگی ہے جو دل کو سکون اور زندگی کو قرار بخشتی ہے۔ بشریٰ رحمٰن کی کم مائیگی اور تشکر کی کیفیت اول تا آخر قائم رہتی ہے۔ وہ اس میں گم اور خاموش ہیں۔ان کے اندر سرشاری کی وہ کیفیت ہے کہ جب کسی فقیر کا خالی کشکول بھر جانے کے بعد کی ہوتی ہے۔

اس سفر نامے میں تشبیہ واستعارہ کے نادر کار استعمال اور خوبصورت پیرائیہ اظہار نے اس کو ادبی کارنامہ بنا دیا ہے مثلاً

''آج آنکھ کا موسم ہے۔ آج آنکھ کی باری ہے.........آج عبادت کو باریاب ہونا ہے........... آج زبان چپ رہے گی۔گنگ رہے گی، میں اندر آؤں..........آؤں کہ شرم کی بکل میں چھپ جاؤں۔ یہ تار تار چنری پر چھید چھید ہاتھ پھیلاؤں کہ چھپ جاؤں..........چھپوں تو کہاں چھپوں؟ سکتہ سا ہو گیا ہے مجھے .... جہاں لعل و جواہر کے ڈھیر لگے ہوں وہاں بھکارن بن جاتے ہیں۔
باؤلی اٹھ ! بھکارن بن کے تن من کی جھولی پھیلا دے۔ ''(۲)

کوئی بھی اسلوب کسی ادیب کی عرفان ذات کا سفر ہے۔جس میں جذباتی تسکین بھی ضروری ہے۔یہی اسلوب انسان کو زیست کرنے کے لئے ایک نئے مفہوم سے آشنا کرتی ہے اور اسے جستجو اور محبت کی راہ پر آگے بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔

بشریٰ رحمٰن نے اپنے اس سفر نامے میں اپنے مفہوم کو خوبصورت الفاظ کا جامہ یوں بنایا ہے کہ اثر پر اثر ہو گیا ہے ۔انداز انتہائی خوبصورت اور دل آویز ہو گیا ہے۔
لفظوں کی شرینی شعریت میں گھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔لیکن ادب کہیں بھی فراموش نہیں ہوا۔لکھتی ہیں۔
'' بس سانس میں سے تو بس آواز آ رہی ہے۔اس قدر حسین، اس قدر نرالا، اتنا مکمل اجالا ....ایسا انوکھا، اتنا پیارا، کتنا زندگی بخش........ یہ تیرا گھر ہے.............. یہ

۱۔ بشریٰ رحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۹۰
۲۔ ایضاً ص۔ ۱۶۱

ساری دنیا سے وسیع گھر ہے۔اس میں تیرے تنگ دل بندے، تیرے سنگ دل بندے دل
کی سیاہیاں دھونے چلے آتے ہیں۔"(۱)

یا پھر

" پھر دل خدا کے سپرد کر کے تعظیم کے ساتھ تکبیر، حرمت سے قیام، ہیبت سے ذات، تواضع سے رکوع، تفرع سے سجدہ، حلم سے مقود اور شکر سے سلام کرتا ہوں"۔(۲)

کتنا خوبصورت، مکمل اور جامع دل کا اظہار ہے۔ باؤلی بھکارن میں جو ایک طلب، کشش، صدق، کم مائیگی، بے بسی، حجت لاڈ اور مان ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ ہمیں بشریٰ رحمٰن کے ہاں نظر آتا ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ وہ لفظ کی معنوی رعائیت کو پورے کمال و جمال سے استعمال کرنے کا فن جانتی ہیں۔اس سفرنامے کی سب سے بڑی اور اہم خوبی انکسار اور کم اہمیتی ہے۔جس سے داخلی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ اور دل میں دردمندی اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے کہ دانہ خاک میں ملکر گل و گلزار ہوتا ہے تب ہی کوئی مقام حاصل کرتا ہے۔

ذوق عبودیت اور اطاعت رسولؐ بھی ایک خاص رنگ میں نظر آتی ہے۔جذباتی وابستگی کی وجہ سے اس میں ایک نئی شان اور نیا آہنگ پیدا ہو گیا ہے۔

۱۔ بشریٰ رحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۸۲
۲۔ ایضاً ص۔ ۱۸۲

محمودہ عثمان حیدر (مشاہدات بلاد اسلامیہ)

مشاہدات بلاد اسلامیہ، جنابہ محمودہ عثمان حیدر کا عراق، شام، فلسطین، ایران اور اردن کا سفرنامہ ہے۔ یہ سفرنامہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ جس میں صحابہ کرام، حضرت حذیفہ، حضرت جابرؓ، حضرت سلمان فارسی اور حضرت شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ جیلانی کے سوانحی خاکے ہیں۔ پہلا حصہ ''ایران'' سفرنامے کی صنف میں شامل ہوتا ہے۔

محترمہ عثمان حیدر نے ۱۹۲۸ سے ۱۹۳۳ تک کا چھ سال کا عرصہ اپنے شوہر محترم جناب سید عثمان حیدر کے ہمراہ مشرق وسطی میں گزارا۔ اس وقت ترکی میں کمال اتاترک، شاہ فیصل اول اور ایران میں رضا شاہ پہلوی اصلاحات میں مصروف تھے۔ دنیائے اسلام کے لئے یہ بڑا نازک دور تھا۔ اسلامی ممالک میں قدیم و جدید کے دوراہے پر کھڑے کشمکش میں مبتلا تھے۔ مادیت اور روحانیت اور مشرقیت کفر و اسلام کم و بیش ہر شعبہ حیات میں برسر پیکار تھا۔

محمودہ عثمان صاحبہ لکھتی ہیں۔

> '' میرے سرتاج آقائے سید عثمان حیدر کو مدت سے بلاد اسلامیہ کی سیاحت کی آرزو تھی۔ آخر میری نند مسز الطاف حسین کے جیٹھ اور ہمارے خالہ زاد بھائی مسٹر سید احمد حسین آکسٹر اسٹنٹ کمشنر سی پی او اور ان کے حقیقی بھانجے سید احمد صاحب کی کوششوں سے یہ آرزو پوری ہوئی''۔ (۱)

ایران براعظم ایشیا میں واقع ہے۔ ایران کے شہر اصفہان کو ایران کی نصف جان کہا جاتا ہے۔ اس کے مشہور شہروں میں تہران، مشہد، تبریز اور آبادان ہیں۔ اور سرکاری زبان فارسی ہے۔ ہمارے ادب پر اور خاص طور پر شاعری پر فارسی زبان اور فارسی شعراء کا بڑا احسان اور عمل دخل ہے۔ ایران میں سب سے زیادہ فقہ جعفریہ کے پیروکار آباد ہیں۔

ایران کا پرانا نام فارس تھا اور ایک بہت ہی خوبصورت رومانوی داستان یہاں کے ''پہاڑ کوہ بے سکون'' سے شریں فرہاد کا قصہ مشہور ہے۔

ایک اچھے سفرنامے میں زمانہ حال کو زمانہ ماضی کے ساتھ مدغم کیا جاتا ہے کہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے تاریخ اور ادب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کیونکہ سفر پڑھنے والوں کی رہنمائی بھی کرتا ہے اور آتش شوق کو بھڑکاتا بھی ہے۔

۱۔ محمودہ عثمان حیدر مشاہدات بلاد اسلامیہ ادارہ علم مجلس کراچی ۱۹۶۴ ص۔ ۱۱

اس لیے ایک اچھے سفر نامے میں ملک کی حالت عدالت، سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل کے بارے میں حتیٰ کہ علمی حالت کے بارے میں بھی مفید معلومات ہونی چاہیے۔

ایک خاتون ہونے کے ناطے وہ خواتین کے لباس اور مقام پر خاصی توجہ دیتی ہیں لکھتی ہیں۔

''عورتیں خواہ مسلمان ہو یا نصرانی یا یہودی، ایرانیوں کی طرح سیاہ رنگ کا ریشمی برقعہ جو بغیر آستینوں کی عبا کی مانند ہوتا ہے۔ سر پر ڈال لیتی ہیں۔ دو فی صد ہلکا سا نقاب بھی اکثر استعمال کرتی ہیں۔ یہاں بھی لیڈیز سیٹ کا رواج زور پکڑ رہا ہے''۔(۱)

عورتیں دنیا کے کسی بھی اسلامی ملک میں رہتی ہوں۔ پردہ اسلامی لحاظ سے ان پر لازم ہے اور عورت کا لفظی مطلب کے مطابق بھی ڈھکی ہوئی، چھپی ہوئی چیز ہے۔ جس کے ننگا ہونے سے شر کا خدشہ ہوتا ہے۔ اس لیے اسلام میں عورتوں کے پردے کے بارے میں سختی سے حکم دیا ہے۔

''بغداد ایک ایسا شہر ہے جو ہمارے افسانونی ادب میں خاصا سحر انگیز نام ہے اور بہت سی رومانوی داستانیں اس سے وابستہ ہیں۔ بغداد بہت پرانا شہر ہے۔ اور سلطنتوں کے عروج و زوال کے سینکڑوں منظر دیکھ چکا ہے۔ یہ شہر کبھی عروس البلاد کہلاتا تھا۔ اب اس گئے گزرے زمانے میں بھی اس قابل ہے کہ اسے عروس العراق کہا جائے''۔(۲)

اس میں مشہور واقعہ حضرت حذیفہ ایمانیؓ کے جواب میں ملک فیصل شاہ عراق سے خواہش کی کہ ہم دونوں (حضرت حذیقہ اور حضرت جابرؓ کو اصل مقام سے منتقل کر کے دریائے دجلہ سے ذرا فاصلہ پر دفن کر لیا جائے کیونکہ میرے مزار میں پانی اور حضرت جابر بن عبداللہؓ کے مزار میں نمی آنی شروع ہو گئی ہے لیکن امور سلطنت کی وجہ سے صبح کے وقت شاہ عراق یہ خواب بھول گئے۔ پھر عراق کے مفتی اعظم کو خواب میں اسی بات کی ہدایت کی۔ انہوں نے خود بادشاہ سے ملاقات کا بندوبست کیا۔ عراق کے محکمہ تعمیرات نے ۲۰ فٹ برابر بورنگ کر کے معلوم کیا کہ آیا دریا کا پانی اسطرف رس رس کر آ رہا ہے یا نہیں لیکن پانی کہیں نہیں تھا۔ اس لیے دونوں خاموش ہو گئے۔

اس کے بعد مفتی صاحب کو دوبارہ خواب آیا کہ یہ کام عجلت میں کیا جائے۔ شاہ عراق نے مفتی صاحب سے فتویٰ دلوایا اور اخبارات میں خبر چھپ گئی اور عالم نے جوش و خروش سے اس میں حصہ لیا۔ مختلف اسلامی ممالک ایران، ترکی،

۱۔ محمودہ عثمان حیدر بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۸

۲۔ ایضاً ص۔ ۴۱

مصر شام، فلسطین، حجاز، بلغاریہ اور افریقہ سب جمع ہو گئے اور یہ روح پرور منظر دیکھا جسکی تفصیل کچھ یوں ہے۔

''دوشنبہ کے دن ۱۲.۰۰ بجے لاکھوں نفوس کی موجودگی میں مزارات کھولے گئے تو معلوم ہوا کہ حضرت حذیفہ الیمانیؓ کے مزار کچھ پانی آ چکا تھا اور حضرت جابرؓ کے مزار میں نمی پیدا ہو چکی تھی۔۔۔ پہلے حضرت حذیفہؓ کی نعش مبارک کو کرین کے ذریعہ زمین سے اسطرح اوپر اٹھایا گیا کہ ان کی نعش کرین پر نصب کئے ہوئے اسٹریچر پر خود بخود آ گئی۔ اب کرین سے اسٹریچر کو علیحدہ کر کے شاہ فیصل، مفتی اعظم عراق، وزیر مختار جمہوریہ ترکی اور پرنس فاروق ولی عہد مصر نے کندھا دیا اور بڑے احترام سے ایک شیشے کے تابوت میں رکھ دیا۔ پھر اس طرح حضرت جابرؓ کی نعش مبارک کو مزار سے نکالا گیا۔ نعش ہائے مبارک کا کفن حتی کہ ریش ہائے مبارک کے بال تک بالکل صحیح حالت میں تھے۔ لاشوں کو دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ تیرہ سو سال قبل کی نعشیں ہیں۔ بلکہ گمان یہ ہوتا تھا کہ شاید انہیں رحلت فرمائے ہوئے دو تین گھنٹے سے زائد وقت نہیں گزرا.................. کہ ان دونوں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں اتنی پراسرار چمک تھی کہ بہتوں نے چاہا کہ ان آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں لیکن ان کی نظریں اس چمک کے سامنے نہ ٹھہرتی ہی نہ تھیں.............. ٹھہر بھی کیسے سکتی تھیں''۔ (۱)

اس واقع کے بعد عراق میں یہ حال ہو گیا تھا کہ ان تابوت کی جب لوگوں نے زیارت کی تو بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے اور ان کے ایمان پختہ ہو گئے۔ اور وہ اہل ایمان لوگوں میں شامل ہو گئے۔

''اس وقعہ کے فوری بعد بغداد میں عجیب کھلبلی مچ گئی اور بے شمار یہودی اور نصرانی خاندان بلا کسی جبر کے جہل و گمراہی پر افسردہ اپنے گناہوں پر نادم، ترساں و لرزاں جوق در جوق مسجدوں میں قبول اسلام کے لئے آئے تھے اور مطمئن شاداں و فرحاں واپس جاتے تھے اس موقعہ پر مشرف اسلام ہونے والوں کی تعداد اتنی تھی کہ ان کا اندازہ لگانا آسان نہیں''۔(۲)

شام میں چند روزہ قیام میں انہوں نے دمشق اور بیروت دیکھا۔ بیت المقدس دیکھا جو اب اسرائیل میں ہے۔ بیت المقدس کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''بیت المقدس کو جو مذہبی احترام اور تاریخی شہرت حاصل ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں یہ ایک عجیب شہر ہے۔ جس کا نظارہ کسی بلند مقام سے دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ تمام شہر قریب قریب سرسبز و شاداب پہاڑیوں پر آباد ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے مگر

۱۔ محمودہ عثمان حیدر بحوالہ سابقہ ص۔ ۶

۲۔ ایضاً ص۔ ۶۴

دولت میں یہودی بڑھے ہوئے ہیں۔ یہاں کے تمام مقدس مذہبی مقامات مسلمانوں کے مفتی اعظم کے زیر انتظام ہیں''۔(۱)

مسجد اقصیٰ وہ مقام ہے جو مسلمانوں کا کبھی کعبہ تھا اور اسی مبارک جگہ سے سرکار دو عالم رحمتہ العالمین شب معراج عرش لے جائے گئے اور یہیں پر حضرت موسیٰ و عیسیٰ کی امتوں کے مقدس ترین زیارت گاہ اور کعبہ مقصود ہے۔ .... مذاہب کے پیروکاروں کے لئے انتہائی مقدس جگہ ہے۔

'' مسجد اقصے یعنی ہمارے پہلے کعبہ یا مقام معراج سرکار دو عالم کو جیسی عظمت حاصل ہے ویسی ہی عظیم عظیم الشان اس کی عمارت ہے جس کی وسعت صحن کا دنیا میں شاید ہی کوئی مسجد مقابلہ کرے۔ مسجد کے غربی کنارے پر مفتی اعظم کے دفاتر اور اسلامی مجالس اعلیٰ کی شان دار دو منزلہ عمارت ہیں۔ اسی جانب پشت مسجد سے لگے بے شمار یہودی دن رات کھڑے رو رو کر توریت پڑھتے اور گناہوں کی معافی مانگتے رہتے ہیں''۔ (۲)

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

''یہ سفر نامہ دنیائے اسلام کی زیارت گاہوں اور مقامات مقدسہ کے بارے میں مفید اور قابل اعتماد معلومات فراہم کرتا ہے۔لیکن اس کا اجمال منظر کو پوری طرح منکشف نہیں کرتا اور معلومات بھی سطحی نوعیت کی اور رسمی سی ہیں۔لیکن اس کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سفر نامہ اس نوعیت کا ہے کہ اس میں جتنی معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ تاریخی لحاظ سے غلط نہیں ہیں۔ اس لئے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ سے بھاگنے والو تم اسے شوق اشتیاق سے یاد کرو تمہیں وہ تقریب وصال سے یاد کرے گا تم اسے حمد و ثنا سے یاد کرو وہ تمہیں اپنے انعامات و احسانات سے یاد کرے گا۔تم اس کے سامنے توبہ کرو اس سے مغرفت چاہو وہ تمیں اپنی بخشش و مغفرت سے یاد کرے گا۔تم اسے تنگ دستی میں یاد کرو وہ تمہیں فراخ دستی کے ساتھ یاد کرے گا''۔ (۳)

محمود عثمان حیدر نے بلاد اسلامیہ پر جو نظر ڈالی ہے وہ ایسی ہے کہ جیسے سیاح کے پاس وقت کم ہوتا ہے اور کم وقت

۱۔ محمود عثمان حیدر بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۱۴
۲۔ ایضاً ص۔ ۱۱۶
۳۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص۔ ۵۰۱

میں زیادہ سے زیادہ چیزیں دیکھنا چاہتا ہے۔

ایک اور خامی یہ ہے کہ ۳۲۔۱۹۲۹ کے ایران، عراق اور شام وغیرہ کے عوام کے سماجی، معاشی، معاشرتی حالات پر کچھ روشنی نہیں ڈالتا۔ اس میں جن شہروں کا ذکر بھی آتا ہے۔اس میں بھی تاریخی عمارتوں اور مزارات کا ذکر زیادہ ہے یا پھر ان کے شوہر کی ملازمت کا ذکر ہے۔

شام میں چندروزہ قیام میں انہوں نے دمشق اور بیروت دیکھا۔حضرت مریم کا مزار دیکھا۔الخلیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مزار دیکھا۔ اور بیت اللحم میں بھی لیکن ان سب کا حال نہایت مختصر پیرائے میں بیان کیا ہے۔

مسلمانوں کی ترقی اور سادگی کے بارے میں تفصیلاً درج ہے کہ وہ مہمان نواز زیادہ تھے اور بجائے اس کے وہ کسی تکلیف میں پڑتے تھے جو کچھ حاضر ہوتا تھا مہمان کے سامنے رکھ دیتے تھے۔

حضرت جابرؓ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

> ''سادگی مسلمانوں کی ترقی کا اصل راز ہے۔ حضرت جابر نہایت سادہ مزاج تھے۔صحابہ کا ایک گروہ مکان پر ملنے کے لئے آیا۔ اندر سے روٹی اور سرکہ لائے اور کہا بسم اللہ اس کو نوش فرمایئے۔سرکہ کی بڑی فضیلت آئی ہے پھر فرمایا کہ آدمی کے پاس اگر اس کے اعزہ و احباب آئیں تو جو کچھ حاضر ہو پیش کرے اس میں کوتاہی نہ کرے۔ اس طرح ان لوگوں کا فرض ہے کہ پیش کردہ چیز کو خوشی خوشی کھائیں اور اس کو حقیر نہ سمجھیں کیونکہ تکلف میں دونوں کی ہلاکت ہے''۔(۱)

اس طرح ہی وہ مسلمانوں کی زہد اور عبادت کے بارے میں ذکر کرتی ہیں اور ان کے تقوی وصبر و رضا کی شا کی کہ باوجود اعلی منصب پر فائز تھے کوئی سازوسامان نہ اپنے پاس رکھتے تھے اور سواری کے لئے ہمیشہ گدھا استعمال کرتے تھے۔

اس سفرنامے کے اسلوب سادہ ہے مگر زبان صاف ستھری ہے۔یہی وجہ ہے کہ پڑھنے کے قابل ہے۔

آخر میں انہوں نے سید سجاد حیدر یلدرم........کا ذکر کیاہے۔ ان کے چچازاد بھائی تھے اور ان کے خاوند عثمان حیدر صاحب کے سگے ماموں تھے۔ اور تحریر کی دلکشی شاید ان کے اثرات ہی کی وجہ ہے کہ سجاد حیدر یلدرم کی رومانیت نے اردو ادب پر بہت جاندار اثر ڈالا۔

۱۔ محمودہ عثمان حیدر بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۷۹

فاطمہ بیگم (حج بیت اللہ و زیارت دیار حبیب)

حج کا سفر ایک ایسا سفر ہے کہ یہیں سے عرفان ذات کا سفر شروع ہوتا ہے اور انسانی زندگی ایک نئے مفہوم سے آشنا ہوتی ہے کیونکہ مسلمانوں کا مذہبی شعور اس سانچے میں ڈھل جاتا ہے کہ اس ارض مقدس میں پیارے رسولؐ موجود ہیں۔ یہاں وجدان کی ناقہ پر سوار ہو کر عرفان کا محمل سجایا جاتا ہے اور یہاں پہنچ کر ہر مسلمان کی خواہش اولین ہوتی ہے۔ کہ لمحے امر ہو جائیں۔

کیونکہ عشق کی چنگاری جب سلگتی ہے تو جذبہ شوق کو ہوا دیتی ہے۔ پھر کم مائیگی کا احساس شدتوں کی انتہا کو چھو لیتا ہے۔ جذبے میں توانائی دیار محبوب میں حاضری کی قبولیت عطا کرتی ہے۔ تب دل میں محبت قلم میں توانائی اور فکر میں گہرائی پیدا ہوتی ہے اور انسان اگرچہ اپنے دلی جذبات کی عکاسی کرنے سے قاصر ہوتا ہے لیکن پھر بھی جذبوں کو جب زبان دی جائے تو کچھ نہ کچھ اظہار کا موقع تو مل ہی جاتا ہے۔

گو یہ سفر نامہ یعنی عام حج کے عام سفر ناموں جیسا ہی ہے مگر اس میں حج کے سفر ناموں سے منفرد بات یہ ہے کہ اس میں حج کے علاوہ بھی بہت سے دیگر مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو کہ عام طور پر حج کے سفر ناموں میں نہیں ہوتی۔

عرب ممالک کی حالت اب ویسی نہیں ہے جیسی کہ ابتدائی دنوں میں تھی۔ بلکہ اب تیل کی دولت نے اکثر عرب ممالک کو دولت سے مالا مال کر دیا ہے اور وہی غربت اور افلاس بھی یہاں پائی نہیں جاتی جیسی کہ اس دور یعنی ۱۹۵۹ کے حالات میں تھی۔ اور اب تو حجاز مقدس کے حکمران دیگر ممالک کو خود مدد کرتے ہیں بلکہ حکومت پاکستان کی بھی اکثر مواقع پر مدد کی جاتی ہے۔

اور یہ اللہ تعالی کا خاص کرم اور نوازش ہے کہ اس نے اپنے گھر کی حفاظت کرنے والوں کو اس نعمت عظمی سے سرفراز کیا اور آج یورپی ممالک تیل کی وجہ سے سعودی حکمرانوں کی قدر کرتے ہیں۔

فاطمہ بیگم سعودی حکمرانوں کے بارے میں لکھتی ہیں کہ بیالیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے لیکن سعودی حکمران جب حرم کعبہ میں داخل ہوتے ہیں تو اپنے آباؤ اجداد کے طریقے کے مطابق ہی داخل ہوتے ہیں۔ سلطان ابن السعود کے طواف کے بارے میں یوں تحریر کرتی ہیں۔

''امیر فیصل اور سلطان ابن سعود پہرے اور افسروں کے ہجوم میں طواف کو آئے ۔تمام لوگوں سے طواف کی جگہ کو خالی کرا لیا گیا اور کعبہ شریف کے پاس کوئی متنفس نہیں رہا۔۔۔۔۔اس کے بعد سلطان ابن سعود بندوقوں کے سایہ میں شمعوں کی روشنی کے ساتھ ایک پروسیشن کی صورت میں آئے ۔لوگ دونوں جانب صف باندھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ راستہ بنا دیا تھا۔ جو شخص ایک قدم بھی آگے ہوتا تھا۔ سپاہی چھڑی سے اسے پیچھے ہٹا دیتے تھے''۔ (۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا انکی اور انکے تیل کی تو محتاج ہے ہی لیکن یہاں کے انداز بھی بالکل شاہانہ ہیں۔ خاص طور پر دیار حرم میں داخل ہو کر یہ امتیازی سلوک برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ فاطمہ نہ صرف تاریخی پس منظر کے حوالے سے اپنا سفر نامہ مکمل کرتی ہیں بلکہ وہ عام رسم ورواج کا بھی ذکر کرتی ہیں اور اسلام کے شروعات کے وہ نقش جو سعودی حکمرانوں کے مطابق ہو۔ سعودی عرب میں حکمرانوں کو اسلامی قوانین کے مطابق صرف چار بیویاں رکھنے اور بہت لونڈیاں رکھنے کا رواج تک پایا جاتا ہے۔ مثلاً لکھتی ہیں۔

'' ہر وقت چار عورتیں نکاح میں رکھتے ہیں۔ جہاں کوئی اور عورت پسند آ گئی اس کے ساتھ نکاح کر لیا مگر پہلی چار عورتوں میں سے ایک بے گناہ کو طلاق دے دی۔ مطلقہ کو خرچ اور نان ونفقہ دے دیا جاتا ہے۔ قلعہ میں قیدی کی طرح رہتی ہے۔ سلطان ابن سعود ملک الحجاز بہت کثیر اولاد ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی اولاد کو گن بھی نہیں سکتے''۔ (۲)

مگر فی زمانہ اور رفتار زمانہ کے ساتھ حکمرانوں اور شاہوں کے انداز بھی بدلے اور اب قدیم غلامانہ دستور کو ترک کر کے محبت اور امن کے ساتھ بیویوں کو رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ لونڈیوں جیسا سلوک روا نہیں رکھتے۔ بلکہ شاہ فیصل نے تو اس رسم کو عملی طور پر ختم کر دیا تھا اور تمام لونڈی اور غلاموں کو حاکم معاوضہ دیکر آزاد کر دیا کرتے تھے اس وقت کا نقشہ کچھ اسطرح بیان کیا ہے۔

''گلی میں ہی دکان لگی ہے اور غلام تو گلی میں ہی پیڑھی نما کرسیوں پر بیٹھے ہیں مگر لونڈیاں ایک گلی کی چار دیواری کے اندر بیٹھی ہوئی ہیں۔ اس وقت باہر گلی میں دس بارہ لڑکے اور مرد

۱۔ فاطمہ بیگم، حج بیت اللہ اور زیارت دیار حبیب، پیسہ اخبار لاہور ۱۹۵۹ ص۔ ۸۰

۲۔ ایضاً ص۔ ۹۲۔ ۹۱

موجود تھے اور پانچ سات عورتیں اندر تھیں ۔۔۔۔ میں نے ایک جوان عورت کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا۔ اس کی قیمت کیا ہے۔ دلال نے کہا چھ سو انگریزی روپیہ۔ میں نے کہا یہ قیمت تو بہت زیادہ ہے۔ دلال نے حبشی کے موٹے موٹے ہونٹ۔ بے تکلف دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھولے اور دانتوں کی بتیسی دکھادی۔ مطلب یہ تھا کہ ابھی ایک دانت نہیں ٹوٹا تھا''۔ (۱)

اس سفرنامے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ نہ صرف تاریخ، معاشرت اور اوقات حج پر تبصرہ کرتی ہیں بلکہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے بھی غافل نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً حرم بیت اللہ میں کثرت سے فقیر ہیں اور اتنا زیادہ تنگ کرتے ہیں کہ نیا آنے والا حاجی ان صداؤں کی وجہ سے پریشان ہو جاتا ہے اور ہر طرف سے یا عمی کی صدائیں آتی ہیں۔

عرب میں اگرچہ قانونی طور پر منع ہے لیکن فقیروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جو کہ حاجیوں کے لئے پریشانی کا باعث بھی بنتی ہیں۔ خاتون ہونے کے ناطے وہ عرب خواتین کی طرف بھی خاص طور پر متوجہ ہوتی ہیں اور ان کی نجی محفل میں جا کر ان کے رسوم رواج سے آگاہی حاصل کرتی ہیں لکھتی ہیں۔

''عرب خواتین سے ملنے کا آج اتفاق ہو رہا تھا ۔۔۔۔ سب سے قبل چاء لائی گئی۔ خواتین گاؤ تکیوں سے لگی قالینی مسندوں پر بیٹھی تھیں۔ خواتین نے بے تکلف کئی کئی پیالیاں چاء کی نوش کیں۔ یہ چاء شیشے کے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں آئی تھی جس کو فنجان کہتے ۔۔۔۔ عرب خواتین تمباکو نوشی کی بہت عادی ہوتی ہیں۔ حقہ بھی موجود تھا اور سگریٹ بھی اس محفل میں بکثرت تھا ۔۔۔۔ ڈبیہ میں باریک کترا ہوا ٹرکش یا مصری تمباکو ہوتا تھا اور اس کے ساتھ باریک کاغذ ہوتے تھے۔ ہر بی بی اپنی مرضی سے اپنے ہاتھ کے ساتھ کاغذ میں تمباکو کو لپیٹ کر سگریٹ بنا لیتی تھی اور پے در پے اس کے کش لگاتی تھی''۔ (۲)

اس سے عرب کی خواتین کو عمومی حالت اور عادات کا علم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح سے بے تکلف محفلوں میں سگریٹ نوشی کرتی ہیں اور اس میں عمر کی بھی قید نہیں ہے کہ وہ کس عمر کی خواتین ہیں۔

فاطمہ صاحبہ نے یہ سفرنامہ عقیدت و احترام کے جذبوں کے ساتھ خاص طور پر ان امور کو مدنظر رکھ کر لکھا ہے کہ

۱۔ فاطمہ بیگم بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۸۷

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۲۶

عام قاری اور خاص طور پر حاجی کو صحیح معلومات فراہم کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتی ہیں مثلاً منی کی آبادی کے بارے میں لکھتی ہیں۔

'' اس کی اصل آبادی قریباً دو ہزار کی ہے مگر حج کے موسم میں چار پانچ روز کے لئے لاکھ دو لاکھ کی آبادی کا بڑا شہر بن جاتا ہے''۔(۱)

مجموعی طور پر اس سفرنامے کی زبان بہت سادہ اور معلوماتی ہے۔ خاص طور پر تاریخی بیان میں انہوں نے خیال رکھا ہے کہ بیان بوجھل اور خشک نہ ہونے پائے۔ اگر چہ روزمرہ اور محاورہ کی غلطیاں پائی جاتی ہیں لیکن چونکہ وہ کوئی اعلیٰ پائے کی ادیب نہیں ہیں۔ اس لیے یہ قابل گرفت ہونے کے باوجود تنقید کا باعث نہیں ہیں۔

۱۔ فاطمہ بیگم بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۲۶

انور ملک (زیارت حرمین)

حج ایک ایسا مقدس فریضہ ہے کہ جو دنیائے اسلام کے مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے کا باعث بنتا ہے۔ اس سے امت اور وحدت اسلام کا تصور بھی ابھرتا ہے۔ یہ سفر اللہ اور رسولؐ سے اطاعت کا بھی سبب ہے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر انسانوں کا سمندر جب طواف کعبہ میں مصروف ہوتا ہے اور پیہم یہ سفر جاری رہتا ہے تو کائنات کے جاری وساری ہونے کا مقصد بھی سمجھ میں آتا ہے۔ یہ دل کی آواز ہے۔ روح کی تڑپ ہے جو اللہ تعالی خوش نصیب انسانوں، دیار محبوب میں بلا کر نئی محبت کی سرشاری میں مبتلا کرتی ہے۔ یہاں جا کر انسانی رویے ہی نہیں انسانی تقدیر بھی بدلتی ہے۔

محترمہ انور سلطانہ سفر نامے کی ابتدا میں غرض وغایت۔ کے عنوان سے لکھتی ہیں۔

> '' جب میں حج بیت اللہ شریف کے لئے گئی تو باوجود کئی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے وہاں کی کئی جگہوں کے نام اور زیارتوں سے بالکل بے خبر تھی۔ کسی کتاب میں بھی پوری طرح مندرج نہیں تھے۔ اس لئے میں نے اپنی استطاعت کے مطابق وہاں کے حالات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے''۔(۱)

اس کے بعد کے حالات میں لکھتی ہیں کہ جب ۱۹۶۳ میں غلاف کعبہ پاکستان سے بھیجا گیا اور اس غلاف کعبہ مبارک کی زیارت لاہور اسٹیشن پر کروائی گئی تو وہ بھی اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ گئیں لیکن خود رش کے باعث غلاف کعبہ کی زیارت نہ کر سکیں اور دل میں خواہش جاگی کہ کاش کبھی زندگی میں ایسا موقع بھی آجائے کہ وہ خود جا کر نہ صرف حج کر سکیں بلکہ زیارت کعبہ کریں اور اس غلاف مبارک کو بوسہ بھی دیں۔

یہ در حبیب کی بات ہے کہ کبھی کبھی اللہ تعالی یوں دل کے قریب ہو کر سنتا ہے کہ خود عقل حیران رہ جاتی ہے کہ اللہ تعالی ہمارے اتنے نزدیک ہوتا ہے کہ وہ دل کی خواہشات کو لبوں پر لانے سے پہلے سن لیتا ہے۔ محترمہ انور صاحبہ کے ساتھ بھی کچھ یہی ہوا کہ اللہ تعالی نے ان کے لئے نہ صرف سامان حج فراہم کیا بلکہ سفر نامہ لکھنے کی بھی توفیق عطا فرمائی لکھتی ہیں۔

> ''اے رب العزت کبھی مجھ بے سہارا کو یہ سعادت نصیب ہوگی کہ اپنے ہاتھوں سے غلاف مبارک کو چھو کر بوسہ دے سکوں گی'' (۲)

۱۔ انور ملک زیارت حرمین نیو کریسنٹ پبلشرز لاہور س۔ن۔ ص۔ ۷

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۲

حج ایک ایسا فرض ہے کہ جس میں انسان دنیاوی آلائشوں سے دور ہو جاتا ہے۔ قلب ونظر میں صرف ایک ہی سوال ہوتا ہے کہ کہیں کوئی ایسا غلط قدم نہ اٹھ جائے کہ حج قبول نہ ہو کہیں کوئی ایسی نظر نہ اٹھ جائے کہ حج قبول نہ ہو۔ کہیں کوئی ایسی نظر نہ اٹھ جائے جو گستاخ ہو کہیں دل میں شیطان وسوسے نہ ڈال دے کہیں جدہ کے بازاروں کی چمک دمک انکھوں کے راستے دل میں نہ اتر جائے۔ انسان شعوری طور پر اپنے آپ کو اس سب سے بچاتا ہے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالی کے کرم کا احسان مند نظر آتا ہے کہ اتنے گناہوں اور نافرمانی کے باوجود وہ کتنا غفور رحیم ہے کہ اپنے محبوب کے صدقے سارے گناہ معاف کر کے صرف اپنی نظر کرم سے نوازتا ہے۔ طواف کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''باب اسلام سے داخل ہو کر مطوف کیساتھ نیت طواف کرنے کے بعد طواف شروع کیا۔ حجر اسود پر ایک چکر ختم ہوتا ہے اور سات چکروں کو ایک طواف گنا جاتا ہے۔ طواف پورے کر کے باب ابراہیم پر دو نفل پڑھنے کے بعد زمزم پیا جاتا ہے''۔ (۱)

محترمہ انور صاحبہ احرام باندھنے، صفا و مروہ کے سات چکر، احرام کھولنے، معلم کے گھر پہلا کھانے اور وہاں کی رہائش و انتظام کے بارے میں خاصی تفصیل سے تحریر فرماتی ہیں۔ خاص طور پر جدہ اور ارد گرد کے مقامات پر یہاں پر حاجیوں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ وہاں کے ناقص انتظامات پر وہ بہت زیادہ نالاں نظر آتی ہیں لیکن دوران سفر کچھ خواتین کے خلیق اور ملنسار ہونے اور خدمت گزاری کی بھی تعریف کرتی ہیں۔

روزہ مبارک پر اپنی حاضری کیفیت کا حال بھی تحریر فرماتی ہیں۔

''روضہ مبارک دیکھتے ہی دل بیتاب نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا سلام پڑھنے کا ہوش تو کسے تھا۔ دل پر رقت طاری تھی۔ آنکھیں تمام عمر میں پہلی بار بے بس ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کے آنسو بھی راہ حبیب میں رقیب معلوم ہوتے تھے جو کثرت روانی سے آنکھوں کو جھلملا دیتے تھے۔ آنکھوں کے راستے ندامت اور جدائی کا سیلاب رواں تھا۔ شمع رسالت کے پروانے دیوانہ وار قربان ہونے کو بے قرار تھے''۔ (۲)

اس سفرنامے میں مرد عورت کے احرام عورت کے حج کے بارے میں حتی کہ پاکی ناپاکی کا ذکر بھی کرتی ہیں اور یہ بھی بیان کرتی ہیں کہ ناپاکی میں عورت کیا کچھ نہیں کر سکتی ہے۔ زمزم، قربانی کے بعد اپنا سفر منڈوانا، طواف فرض، تمام

۱۔ انور ملک بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۴

۲۔ ایضاً ص۔ ۸۸

چکروں کی عربی میں دعائیں، مقام ملتزم کی دعا، مقام ابراہیم کی دعا، پھر مسجد قبا، مسجد جمعہ، مسجد قبلتین، مسجد البقیع، مسجد نبی احرام، جنت البقیع کا ذکر کرتی ہیں۔

مختلف ستون جو وہاں بنے ہوئے ہیں ان کی تفصیل کچھ یوں درج کرتی ہیں۔

''ستون حنانہ، ستون عائشہ، ستون ابولبابہ، ستون نوستون جبرائیل، ستون سریر، ستون حرس یہاں کے بارے میں روایت ہے کہ جس نے صدق دل سے یہاں سجدہ کیا۔ اس پر دوزخ کی آگ حرام ہوگئی۔ حضرت عائشہ کا حجرہ ریاض الجنت کہلاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خاتون جنت کا حجرہ ہے جہاں پر اسی زمانے کی اشیاء پڑی وہیں جو نہایت بوسیدہ ہو چکی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسجد نبویؐ کو نہایت خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔ بجلی کی شمعیں، جھاڑ، فانوس، اس حقیقی نور کو دوبالا کر رہے ہیں۔ حضور کے روضہ مبارک کی جالیاں سنہری ہیں لیکن اس کے اندر جو غلاف ہے وہ از حد شہید ہو چکا ہے''۔ (۱)

جذبوں کی گہرائی نہ صرف دلوں کو منور کرتی ہے بلکہ نگاہ کو بھی روشنی بخشتی ہے۔ محترمہ انور صاحبہ سفید رنگ کو تقدس کی شنائی تو سمجھتی ہی ہیں لیکن بیت اللہ شریف کا سعید احرام ان کے جذبوں کو نیا رنگ بخشتا ہے۔

''سات ذوالحج کو جب تمام مسلمان برائے حج احرام باندھتے ہیں تو اسی میدان بیت اللہ شریف کو بھی غسل دیکر نیا احرام باندھ جاتا ہے۔ پہلا غلاف سیاہ رنگ کا تھا۔ اور آج سفید احرام تھا۔ بیت اللہ شریف کو دیکھ کر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ اس کی عظمت اور برتری کو سفید احرام دوبالا کئے ہوئے ہے۔ تمام حرم شریف نور بنا ہوا ہے''۔ (۲)

فضائل زیارت مدینہ منور اور دعائیں ان تمام کی تفصیل اس مختصر سفرنامے میں درج ہے۔ اس کے بعد فضائل زیارت مدینہ منورہ کے بارے میں تفصیل بیان کرتی ہیں۔

''مسجد اقصے کے اندر درمیان میں مصلی جناب محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم، دائیں بائیں جانب حسن اور حسین، حضرت عیسی، حضرت موسی کے محراب ہیں۔ مسجد کے شمال جانب ایک کمرہ ہے جو محراب مریم کہلاتا ہے۔ اسی جگہ پر حضرت مریم کو اسی مسجد کی خدمت کے

۱۔ انور ملک بحوالہ سابقہ ص۔ ۸۹۔ ۸۸

۲۔ ایضاً ص۔ ۸۹

لئے بطور نذر بھیجا گیا تھا۔ اسی محراب سے حضرت مریم کے لئے کھانا عرشِ معلیٰ سے آتا دیکھ کر حضرت ذکریا نے خدا تعالیٰ سے اپنا جانشین مانگا تھا اور خدا نے حضرت زکریاؑ کو حضرت یحییٰ کی پیدائش کی بشارت دی تھی جبکہ اس وقت حضرت زکریا کی عمر ٨٠ برس ہو چکی تھی۔ مسجد عمر ہے جہاں حضورؐ نے معراج پر جانے سے قبل تمام انبیاء کو اپنی امامت میں نماز پڑھائی تھی''۔ (١)

انور سلطانہ نے اس سفرنامے میں مکہ اور مدینہ کے علاوہ خیبر، تبوک، عمان، بیت المقدس، بغداد، قم، تہران، مشہد اور زاھدان وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے اور کوئٹہ کے راستے سے واپس آتی ہیں۔ اس سیاحت میں ان کے تین ماہ صرف ہوئے تھے اور یہ سفرنامہ ان تین چیزوں کی داستان ہے۔

لیکن اس سفرنامے میں بغداد، کربلا، تہران اور مشہد وغیرہ کی زیارات مقدسہ کا حال نہایت ہی مختصر ہے اور کافی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایران کے سفر میں انہوں نے کئی اہم مقامات اور تاریخی واقعات کو فراموش کیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مقصد صرف زیارت کرنا تھا ورنہ ان کی سرسری نظر میں نظارے کی لپک ہوتی لیکن ان کی طائرانہ نگاہ اس بات کی غماز ہے کہ وہ ایک ارادہ کر کے گھر سے نکلتی ہیں تو یہی مقصد ان کے پیش نظر رہتا ہے۔

مزار غوث پاک کے بارے میں اظہار خیال کرتی ہیں۔

'' مزار غوث پاک جس میں لوگوں کے ٹھہرنے کے لئے سرائے بھی ہے۔ اس کے ملحقہ مدرسہ ہے۔ دونوں وقت لنگر تقسیم ہوتا ہے۔ شاہراہ اعظم پر روضہ امام اعظمؒ یا امام اعظمؒ ابوحنیفہ کہا جاتا ہے۔ بغداد قدیم میں گلیوں کے اندر مشہور بزرگ شیخ معروف کرغی اسی احاطے میں اور بھی قبریں ہیں۔ اس کے تھوڑے فاصلے پر زبیدہ زوجہ ہارون الرشید کی آرام گاہ ہے۔ نہایت خستہ حالت میں ہے''۔ (٢)

انور ملک چونکہ عقیدت واحترام کے تحت ان تمام شہروں میں جاتی ہیں اس لیے خاص طور پر ان کے ہاں زیارتوں کی زیارت کا اور تاریخ کو جاننے کا جذبہ بیدار ہے۔

''بغداد مزاروں کا شہر ہے۔ مندرجہ بالا زیارتیں مشہور لوگوں کی ہیں۔ ان میں سنی لوگوں کی زیارتیں تو نہایت خستہ حالت میں ہیں البتہ شیعہ بزرگان کی زیارتیں نہایت شاندار ہیں''۔ (٣)

آگے وہ شہر تہران کا ذکر کرتی ہیں۔ جو بغداد کی طرح دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک حصہ جدید تہران کہلاتا

١۔ انور ملک بحوالہ سابقہ ص۔ ١٥٣

٢۔ ایضاً ص۔ ١٦٠

٣۔ ایضاً ص۔ ١٦١

ہے اور دوسرا قدیم تہران لیکن دونوں کے موسم میں خاصا فرق ہے اور اتنا موسم کا تضاد کہیں اور نظر نہیں آتا۔ وہ یہاں کے مشہور پھلوں کے بارے میں بھی پوچھتی ہیں اور قاری کو بھی لطف اندوز کرواتی ہیں۔

''یہاں کے مشہور پھل شہتوت، خوبانی، گلاس، سٹابری اور زرد آلو نہایت سستے اور لذیز ہیں۔ (۱)

وہ فاصلوں کا تعین بھی کرتی ہیں اور جغرافیائی لحاظ سے معلومات بھی فراہم کرتی ہیں اور ارد گرد کے مناظر سے بھی تعارف کرواتی ہیں۔

''بغداد سے تہران رات دن چلنے کے باوجود بیس گھنٹے میں پہنچی تھی تمام راستہ لق و دق صحرا ہے۔ نشیب میں وادیاں بنی ہوئی ہیں۔ جہاں ہوٹل بنام قہوہ خان ہے یہاں پر چائے بھی دو قسم کی تلخ اور شیریں یعنی بغیر کھانڈ کے قہوہ یا ایک ڈلی مصری کی پیالی میں بھگو کر منہ میں رکھ لیتے ہیں اور کڑوا قہوہ پینا شروع کر دیتے ہیں''۔ (۲)

کہتے ہیں کہ کسی جگہ کے ماحول کا اندازہ لوگوں کے اخلاق اور میل جول سے ہوتا ہے وہ کس قدر مہمان نواز ہیں یا ان کا تہذیبی منظر کیا ہے۔ یہ سفر نامہ معلوماتی بھی ہے اور عقیدت کے جذبات سے بھرپور بھی ہے۔

۱۔ انور ملک بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۷۳

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۷۵۔۱۷۴

کنیز بیگم (ارض مقدس)

آستانہ نبوی، روضہ رسالت پناہ.......... ایک ایسا مقدس مقام ایک روح پرور منظر دل میں اتر جانے والے مناظر آرزوؤں کی تکمیل مذہب کی تعبیر، سکون کی آماجگاہ، راحت ومغفرت کا مرکز، مسلمانوں کی چاہتوں کا محور کہ جہاں زبان سے نہیں آنکھوں اور دل سے گفتگو ہوتی ہے۔ جہاں راز راز نہیں رہتے۔ دوری کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں ہزاروں ہی عقیدت مندان جذبہ وشوق سے بھر پور نگاہوں سے حاضری دیتے ہیں اور دل میں صدیوں جسکی تڑپ ہوتی ہے وہاں جا کر ان کی تشفی ہوتی ہے۔

ارض مقدس کنیز محمد بیگم کا یہ سفر نامہ جو انہوں نے واردات قلبی کی داستان کو رقم کرنے کے لئے منظر عام پر لائیں۔ اس میں حج بیت اللہ اور زیارات مکہ مکرمہ، سفر مدینہ منورہ اور زیارات مدینہ پاک کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

یہ سفر نامہ باقاعدہ شائع ہونے سے پہلے لاہور کے ایک ماہ نامے میں قسط وار بھی اکتوبر ۱۹۶۴ء سے لیکر فروری ۱۹۶۵ء تک شائع ہوتا رہا ہے۔ اس دور میں چونکہ حج کے سفر نامے اتنی تعداد میں نہیں لکھے جاتے تھے اور نہ لکھنے والے اتنی جزئیات سمیت اپنے سفر کے حالات قارئین کو پہنچائے جاتے تھے کہ جس میں قلبی وردات کا بھی ذکر ہو اس لیے اس سفر نامے کو قارئین نے بہت پسند فرمایا۔ اسی وجہ سے اس سفر نامے کو کتابی شکل دی گئی۔

واردات قلبی سب کی جدا جدا ہوتی ہے۔ اگر چہ سفر اور مناسک حج سب کے لئے ایک جیسا ہوتے ہیں۔ روضہ رسولؐ پر حاضری دراصل ہر مسلمان مرد اور عورت کا وہ دیرینہ خواب ہوتا ہے کہ جب یہ خواب حقیقت کا رنگ اختیار کرتا ہے تو دل ونگاہ کو یقین ہی نہیں آتا کہ ہم جسے عام اور بے نوا لوگوں کو بھی در حبیب پر حاضری نصیب ہوسکتی ہے اور حقیقت سامنے ہوتے ہوئے بھی شدت جذبات میں یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ دل ونگاہ کو یقین دلانا پڑتا ہے کہ یہاں ہم ہی ہیں اور پھر شدت جذبات سے جب آنکھوں میں دھند اور گلا رو رو کر بیٹھ جاتا ہے تو زبان بھی ساتھ نہیں دیتی اور صرف بے تاب آنکھیں ہی سارے منظر کو جذب کرتی ہیں۔ الفاظ وہاں کام نہیں دیتے۔ یہی حال محترمہ کنیز بیگم کا ہے کہ وہ جب روضہ رسولؐ پر حاضری دیتی ہیں تو عقیدت واحترام اور شدّت جذبات سے وہ اپنی کیفیات کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں۔

” کیسا مبارک اور کیا ہی سہانا سماں تھا جب ہم باب مجیدیہ کے سامنے کھڑے تھے اور گنبد خضرا اپنی تمام خوبیوں

اور رعنائیوں کو لئے دعوت نظارہ دے رہا تھا مگر یہاں

عین وصال میں مجھے حوصلہ نظر نہ تھا۔
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہ بے ادب

'' قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ عقل جواب دے رہی تھی مگر ایک کیفیت بے خودی تھی جو آگے جانے پر اکسار ہی تھی۔ اصولاً اس وقت معلم کی راہنمائی کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں جا سکتے تھے اور نہ ہی در رسول پر حاضری کی سعادت حاصل کر سکتے تھے مگر جذبہ شوق نے عقل اور اصول دونوں بھلا دیئے''۔(۱)

یہی وہ دل کی کیفیت ہے کہ جس سے ہر وہ مسلمان دوچار ہوتا ہے کہ جس کے دل میں لگن ہوتی ہے روضہ رسول کی تڑپ ہوتی ہے۔ خانہ کعبہ کی زیارت مقدسہ کی چاہت ہوتی ہے۔ آقا کی گلیوں میں پھرنے کی۔ آنکھیں ٹھنڈک حاصل کرنے کی تمنائی ہوتی ہیں اور قلب میں سے ایک ہی آواز نکلتی ہے۔ اے اللہ میری حاضری قبول فرمانا۔ دراصل مسلمانوں کی عقیدت واحترام ہی کا مرکز ومحور سامنے ہو تو پھر ہوش وخرد سے کون آشنا ہوتا ہے۔ جہاں منزل نظر آ رہی ہو وہاں نشان منزل کون تلاش کرے۔ جہاں سجدہ گاہ ہو وہاں پیشانی خود بخود جھک جاتی ہے۔ جہاں سمتوں کا تعین نہ کرنا پڑے۔ ہر نگاہ میں محبوب کا جلوہ ہو، ہر راہ آتش شوق کو بھڑکائے وہاں کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہاں خود دل رہنما اور منزل آسان ہو جاتی ہے۔

خاتون ہونے کے ناطے انہوں نے خواتین کا مشاہدہ بہت غور سے کیا ہے۔ اور یہاں جو خامیاں نظر آئیں ان کا ذکر تفصیل سے کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ خواتین میں جو بدعتیں اور عقیدتیں نظر آتی ہیں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ عورت کا مشاہدہ ویسے بھی باریک بین ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے مشاہدات میں یہ چیز نظر آتی ہے کہ انہوں نے طائرانہ نگاہ سے جائزہ نہیں لیا بلکہ منظر کو محسوس کر کے لفظوں کے ذریعے یوں ارتعاش پیدا کیا ہے کہ دل ونگاہ کو مرکز بنا کر جذبہ عقیدت کو بیان کیا ہے لیکن ہر منظر پوری جزئیات سمیت اس طرح بیان کیا ہے کہ بیان یوں محسوس ہوتا ہے کہ متحرک ہو کر سامنے آ گیا ہو۔ لکھتی ہیں۔

۱۔ کنیز بیگم ارض مقدس ملک پرنٹنگ پریس سیالکوٹ ۱۹۶۶ ص۔ ۹۹

''پردے کا یہ عالم ہے کہ برقعے ایک ایک فٹ تک زمین تک گھسیٹے جاتے ہیں کیا مجال ہے کہ ایک انگلی تک نظر آئے۔ نماز کے بعد رنگا رنگ محفلیں جمتی ہیں۔ مدت کی بچھڑی سہیلیاں ملتی ہیں۔کھانا پینا اور خوش گپیاں ہوتی ہیں۔ اکثر نوخیز لڑکیاں ایسے موقع پر نقاب کی قید سے بے نیاز رہتی ہیں''۔(۱)

سفر ایک ایسا سفر ہے جو زمان ومکان کے رابطے کو منقطع کر دیتا ہے۔لیکن نسوانی رنگ لیئے ہوئے ان کا بیان اس بات کا غماز ہے کہ معاشرتی جھلکیاں بیان کرتے ہوئے اگر چہ ان کا بیان سادہ ہے لیکن واقعات پر ان کی گرفت مضبوط ہے سب سے بڑھ کر ان کا جذبہ ہے جو صادق ہے۔

ارض مقدس کی فضا اور محبتوں کو انہوں نے سادہ سلیس اور رواں انداز میں بیان کیا ہے لیکن جذباتی وارفتگی کی وجہ سے اس کی سادگی پر اثر بھی ہے اور جذبے قابل رشک بھی ہیں۔

لیکن اس سفرنامے میں ایک خامی آخر تک کھٹکتی ہے اور وہ ہے املا کی غلطیاں۔اسلوب بیان اگر چہ سادہ ہے لیکن زبان زد عام الفاظ کی املا بھی غلط ہے اور اس پر ناشر اور خود مصنفہ نے بھی اس پر توجہ نہیں دی۔ ورنہ یہ سفرنامہ جذبوں سے بھر پور ہونے کے ساتھ ساتھ اسلوب کا بھی اچھا نمونہ ہوتا۔

۱۔ کنیز بیگم بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۰۰

وحیدہ نسیم (حدیث دل)

حج کے کثیر تعداد کے سفرناموں کے باوجود ہر سفر نامہ کوئی ایسا گوہر نایاب اور کوئی ایسا نغمہ سرحدی کا حامل ہے کہ جس سے دل ونگاہ میں سرور وسکون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ دامن فقر مالا مال ہو جاتا ہے اور بے قرار روح تسکین پاتی ہے۔ حج کا روحانی سفر ہر مسلمان کی روح کا سفر ہے۔ اس میں جذبہ شوق میں ہجر وصال میں قربت اور تشنگی دید میں بدل جائے۔ تو ارض مقدس دیار محبوب میں بدل جاتی ہے۔

ہر حاجی ایک نئے عزم اور نئی نظر کی آرزو کی تلاش یں سرگرداں رہتے ہیں۔ ان سفرناموں کو ہر مذاق اور ہر مشرب کے لوگوں نے لکھا۔ اللہ تعالی رحمٰن ورحیم ہے۔ وہ بے پناہ دینے والا اور بے حد کرم کرنے والا ہے۔ وہاں جا کس کو حاضری نصیب ہوئی ہے اور کس کی حاضری کے باوجود تشنگی برقرار رہتی ہے۔

وحیدہ نسیم کا سفرنامہ ''حدیث دل'' درحقیقت ان کے جذبہ وعقیدت سے بھرپور عمرے کی داستان ہے۔ اس کا آغاز وحیدہ نسیم نے یوں کیا ہے۔

اپنی حدیث دل کی تفسیر کیا لکھوں۔
اک خواب تھا وہ خواب کی تعبیر کیا لکھوں

حدیث دل میں موجودہ مسائل حج کے بارے میں اپنی عقیدت کے ساتھ ساتھ وہاں کی فضاؤں عقیدت احترام محبت جذبے سرشاری کی داستان رقم ہے۔ خاص طور پر مولویوں کے بارے میں ان کی رائے بڑی بھرپور ہے۔

''میں نے قیام پاکستان سے لے کر آج تک دو مولویوں کو ایک بات پر متفق نہیں دیکھا یعنی یہ کہ اگر ان سب کا مسلک ایک ہوتا تو اسلام کے نام پر ستر ہزار جماعتیں نہ بنتیں''۔ (۱)

واقعی یہ ایک بڑا مسئلہ ہے کہ پاکستان میں آج تک کبھی بھی لوگ یا مولوی اس بات پر متفق نہیں ہو سکے کہ ایک امام کے پیچھے نماز پڑھیں مگر حج کا سفر لحہ لحہ تبدیل ہوتے مناظر کے ساتھ دل کی کیفیات کے تبدیل ہونے کا بھی سفرنامہ ہوتا ہے۔ بڑے بڑے رند یہاں پہنچ کر عابد وزاہد بن جاتے ہیں۔ اور بڑے بڑے علماء عبادت وریاضت کے جس مقام پر بھی ہوں۔ دیار حبیب میں پہنچ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔

۱۔ وحیدہ نسیم حدیث دل غضنفر اکادمی کراچی ۱۹۸۰ ص۔ ۲۹

یہاں دل پر جمی دھول محبت کی سرشاری کی ہلکی ہلکی پھوار سے یوں دھل کر اور نکھر کر سامنے آتی ہے کہ ہر ذی نفس کے دل سے ایک ہی آواز نکلتی ہے۔

اے اللہ میں حاضر ہوں'' اور پھر حاضری میں حضوری اور وہ بھی دیار محبوب میں یہاں کس مستانے کو فرزانگی کا خیال رہتا ہے یہاں تو دیدہ و دل فرش راہ کئے صرف اس خوشبو کا انتظار ہے کہ جو قلب و نظر میں نعرہ مستانہ کی لے سے بھر دے۔ دیار حبیب میں پہنچ کر بڑے بڑے بزرگ اور قد آور شخصیات ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں وحیدہ نسیم لکھتی ہیں۔

''میں نے نماز پڑھی اور مجھے پہلی بار اس کا احساس ہوا کہ رکوع میں جھک کر ''سبحان ربی العظیم'' کہنے کا لطف صرف اسی وقت ہے جب خانہ کعبہ سامنے ہو اور دل واقعی اس کی عظمت کی گواہی دے۔ سجدے میں جا کر ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کہنے کا مزہ اسی وقت ہے جب جبیں نیاز مقام ابراہیم پر جھکے۔ رسائی کا اگر کیف ہے تو صرف حرم کی چوکھٹ پر ہے۔ وہ سجدہ ہے جس سے سر اٹھانے کو جی نہیں چاہتا''۔(۱)

جب جبیں عاجزی و انکساری کے ساتھ در حضور پر جھک جائے تو پھر اٹھانا بھی چاہو تو نہیں اٹھ سکتی کہ یہاں جھکنے میں وہ لطف ہے جو اٹھنے میں نہیں۔ یہاں کی فضاؤں میں محبت رچی بسی ہوئی ہے۔ حب رسول جذبہ عشق و محبت کو نہ صرف روشنی بخشتا ہے بلکہ جذبہ عقیدت کو بھی پروان چڑھاتا ہے۔ یہ ایسی خوشبو ہے جس کی خوشبو سے فضا سدا مہکے گی۔ اور اس محبت کی آبیاری آب زمزم سے ہوتی ہے۔ جسطرح سے بارش میں پھول دھل کر نکھر جاتے ہیں۔ اور شبنم کے قطرے پھولوں کے حسن کو نکھارتے ہیں۔ ندامت کے آنسو دلوں کو منور کرتے ہیں۔ آب زم زم ظاہری اور باطنی گرد و غبار کو دھو کر ایسا صاف و شفاف کر دیتا ہے کہ نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر مسلمان متحد ہو جاتے ہیں۔

اور آسانی سے زندگی ایک نئے مفہوم سے آشنا ہو جاتی ہے۔ عجز او انکساری کے ساتھ سرشاری کا یہ عالم ہے کہ پگھل کر پانی پانی ہو رہے ہیں لیکن محبت میں بھیگتے چلے جا رہے ہیں۔ ڈوبتے چلے جا رہے ہیں۔ وحیدہ نسیم نے منظر نگاری بھی خوب کی ہے کہ منظر نگاری متحرک ہو کر ذہن میں عجیب جذبہ بیدار کر دیتی ہے۔

''رات کے تین بجے ہیں۔ صحن حرم پر سنگ مرمر کا فرش چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ جن کے بیچ بیچ ریت کی بنی ہوئی کیاریاں عجیب بہار دکھا رہی تھیں۔ گول دائروں کی شکل میں بنی

۱۔ وحیدہ نسیم بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۲

ہوئی مسجدوں کے دالان عجیب ہیبت اور عظمت کے نشان چھوڑ رہے تھے اور ان دالانوں سے نکلی ہوئی روشنی جو مطاف تک جا رہی تھی۔ زبان حال سے کہہ رہی تھی کہ دنیا گول ہے۔ چاہے جس راستے سے آؤ، تم خدا تک پہنچو گے"۔ (۱)

اس سفر نامے میں جہاں عقیدت و احترام ہے۔ وہاں اسلوب بیان کے بھی بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑی خوبی حقیقی مشاہدات کا بیان ہے۔ اور اس حوالے سے اس حجاز نامے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

میں اپنی مخصوص تربیت اور تعلیم کی بنا پر خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئی۔"(۲)

یا

توبہ کیجیئے کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ دوسری نے جواب دیا۔"(۳)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وحیدہ نسیم موقع کے مطابق نثر کو نہ صرف رنگین بنا دیتی ہیں بلکہ اسے محاورات سے بھی سجانا جانتی ہیں اور بات میں بہتر تاثر پیدا کرنے کے لئے برمحل محاورات کا استعمال بھی جانتی ہیں۔

لیکن اس سفر نامے میں ایک خامی پائی جاتی ہے کہ کہیں کہیں انگریزی الفاظ و اصطلاحات کا استعمال ہے۔ حالانکہ اردو لغت میں اس کا نعم البدل اچھے اردو کے الفاظ بھی مل جاتے ہیں مثلاً Search Light یا Black Market وغیرہ اگر ان کو اردو میں لکھا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ لیکن رواں سادہ سلیس اور موقع محل کے مطابق اشعار نے اسے منفرد سفر نامہ بنا دیا ہے۔

اس سفر نامے میں جذبے کی آنچ بھی ہے اور عقیدت کی فراوانی بھی۔ جس نے کامیابی کی منزل آسان کر دی ہے۔ ان کا مجموعی تاثر انکشاف ذات اور حقیقت کے اعتراف کا ہے۔

۱۔ وحیدہ نسیم بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۵۹

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۲۲

۳۔ ایضا ص۔ ۲۲۵

عفت الٰہی علوی(سفر نامہ حجاز و حج بیت اللہ)

حج کے بارے میں لکھے گئے سفر نامے عموماً عقیدت ومحبت کا رنگ لیئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اوران میں ایک جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ یہ وہ جگہ ہے کہ جس کو رسول پاکؐ نے سرفرازی عطا کی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں اہل ایمان وایقان کے عقیدتوں کا رنگ نمو پاتا ہے۔ یہ سفرنامے ادب میں جذب وشوق کی گہرائیوں کو بیان کرنے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ ان میں حجاز کے حاجیوں کی مچلتی آرزوؤں اور پشیمانیوں کی داستان ہوتی ہے کہ جو زندگی بھران کے ساتھ چلتی ہیں۔[

اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر اور سمیع وبصیر ہے اور انسان کا کوئی عمل اس سے پوشیدہ نہیں لیکن حج کے موقع پر ہر بندہ یہاں پہنچ کر زندگی کا احتساب کرتا ہے اور پھر عمل کا جائزہ لیتا ہے۔ اور پھر نادم وشرمسار ہو کر گریہ وزاری کرتے ہوئے وہ صرف اور صرف طالب عفو ہوتے ہیں اور پھر جب بھی مسلمان عاجزی وانکساری کے ساتھ رحمت کا طلب گار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ رحمت وبخشش کے دروازے کھلتے جاتے ہیں اور یہ تو وہ مقام ہے کہ جہاں سے کوئی طلب گار تشنہ کام واپس نہیں آتا۔ عفت الٰہی لکھتی ہیں۔

> ''حج میں بے حساب دنیاوی فوائد بھی پوشیدہ ہیں۔ اس موقع پر مساوات اسلامی کا اصل مرقع ہماری نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ جب کہ ہر شخص بلا امتیاز رنگ ونسل سادہ وسفید پوشاک زیب تن کئے ہوئے ظرآتا ہے۔ اس وقت امیر کو غریب پر فوقیت نہیں نہ گورے کو کالے پر کوئی ترجیح ہوتی ہے بلکہ ہر شخص دنیا و مافیا سے بے خبر اللہ کی جناب میں طلبگار معافی ہوتا ہے۔ اس مقدس جگہ پر اقصائے عالم سے آگے آئے ہوئے مسلمان ایک دوسرے کی زبان سے عدم واقفیت کے باوجود صلح وآشتی صبر وتحمل کو دخل دے کر اور ہر عمل میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر کے صحیح اخوت اسلامی کا مظاہرہ کرنے میں محبت وراحت کا ایک سمندر موجزن ہوتا ہے۔ جس کی لہریں ایک دوسرے سے ٹکراتی نہیں بلکہ گلے ملتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں''۔ (۱)

دنیا کے کسی ملک کے بارے، کسی دو شہروں کے بارے میں اتنی عقیدت واحترام سے نہ لکھا گیا ہے۔ نہ لکھا جائے

۱۔ عفت علوی سفر نامہ حجاز و بیت اللہ انجمن پریس کراچی ۱۹۷۰ ص۔ ۷۔۶

گا۔ جس قدر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بارے میں لکھا جاچکا ہے لیکن اتنا کچھ لکھا جانے کے باوجود آج بھی بہت سے ایسے پہلو ہیں جو ابھی صفحہ قرطاس پر نہیں اجاگر ہوئے کیونکہ لاکھ کوشش کی جائے محبت و عقیدت میں کچھ کیفیتیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف محسوس کی جاسکتی ہیں۔ بیان نہیں کی جاسکتیں۔ اگر چہ حج کے کرنے والوں کی تعداد میں بے شمار اضافہ ہو رہا ہے لیکن حج کی سرزمین اور فرض ہونے کے باوجود کیفیات فرق ہیں اور انہی فرق کیفیات کی وجہ سے ان گنت بار کہی ہوئی باتوں میں دلکشی و رعنائی موجود ہے۔

عفت الٰہی کا سفر نامہ ''حجاز و حج بیت اللہ'' کافی معلوماتی سفر نامہ ہے۔ بیگم عفت الٰہی کے خاوند کو حج کے دوران میں جن جن کیفیات و مشکلات سے گزرنا پڑا وہ انہوں نے تفصیل سے اس میں درج کی ہیں اور آخر میں عمرے سے متعلق ایک ضمیمہ بھی درج ہے جو وہ دوبارہ عمرہ کرنے کے لئے گئے تو اس کا حال بھی درج ہے۔ کیونکہ عمرہ حج کے دنوں میں کیا گیا تھا۔ اس لیے رمضان کے دنوں میں مکمہ مکرمہ کی بہار اور حرم پاک کی پاک و مقدس فضاؤں کا ذکر بڑی عقیدت و احترام سے کیا گیا۔ عفت الٰہی خاص طور پر ذکر اس انداز سے کرتی ہیں کہ ایسے حاجیوں کو معلومات فراہم کر سکیں جو ان کے بارے میں نہیں جانتے مثلاً جس جگہ احرام باندھتے ہیں لکھتی ہیں۔

''یہ جگہ حدیبیہ ہے جہاں بیت رضوان ہوئی تھی۔ اب یہ شمسی کہلاتی ہے۔ یہ جذبے سے آنے والوں کے لئے میقات ہے۔ میقات اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں احرام باندھ کر حاجی مکمہ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں''۔(۱)

عفت الٰہی کا مشاہدہ اور مطالعہ دونوں ہی اس بات کے غماز ہیں کہ محترمہ نہ صرف اپنی کیفیات کو بیان کرنے پر دسترس رکھتی ہیں بلکہ تاریخی لحاظ سے بھی ان کی روایت ہے کہ آفرینش آدم کے بعد خدا کے وحدہ لاشریک کی عبادت کے لئے سب سے پہلے گھر جو خانہ خدا کے نام پر تعمیر ہوا مکہ میں تعمیر ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت و ریاضت اس شہر میں کرنے کے لئے دنیا کے تمام خطوں سے لوگ جوق در جوق دیوانہ وار آتے ہیں اور آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خانہ کعبہ کے بارے میں عفت الٰہی لکھتی ہیں۔

''خانہ کعبہ اور مطاف کے چاروں طرف حرم شریف کی عمارت کے درمیان کچا فرش ہے جس پر بجری پڑی رہتی ہے۔ لوگ اس بجری پر گندم خرید کر ڈالتے ہیں۔ جن پر کبوتروں کے غول

ا۔ عفت الٰہی بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۷

آ آ کراور دانہ چگ کراڑ جاتے ہیں مطاف سے حرم شریف تک فاصلہ طے کرنے کے لئے پختہ گزرگاہیں بنی ہیں۔ (۱)

اس میں قلبی کیفیات کا بھی ذکر ہے اوران پر جو کیفیات طاری ہوتی ہیں وہ ان کے جذبہ سرشاری کو ظاہر کرتی ہیں کہ جہاں وقت رک جاتا ہے۔ دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں اور روح ہر قسم کی کثافت سے پاک ہو جاتی ہے۔ یہاں دردمند دل تڑپتا ہی نہیں۔ مچلتا ہے۔ سرراہ ایک نئے عزم اور نئی آرزو کی منزل ہے۔

انسان اپنے رنگ ونسل وطن وقوم سے الگ صرف ایک سیل رواں ہے کہ جس میں ایک ہی لگن اور ایک ہی جذبے کے تحت تمام انسان بیک وقت پکارتے ہیں اوران کے دلوں میں ایک ہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور وہ ایک ہی لگن میں پکارتے ہیں۔ بیک وقت ایک ہی آواز ان کے دل سے نکلتی ہے۔

''اے اللہ میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں۔''

'' یہ صدا صرف لبوں سے ہی نہیں نکلتی بلکہ روح کی اتھاہ گہرائیوں سے نکل کر خوبصورت اور دلنشین فضا کا حصہ بن جاتی ہے۔ اور روحوں کے سفر میں شامل ہو جاتی ہے کہ جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی کہ جہاں خود حضور پاکؐ کے قدم مبارک نے بوسہ دیا۔ غلاف کعبہ کی روایت کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھتی ہیں''۔

''عرصہ تک مملکت مصر کو ہر سال نیا غلاف کعبہ بھیجنے کی سعادت حاصل رہی اور وہاں کے حکمران نہایت اہتمام سے تیار کروا کر باقاعدہ ایک سرکاری وفد کے ہمراہ تزک واحتشام کے ساتھ ارسال کرتے رہے لیکن کچھ عرصے سے مصر اور حکومت سعودی عرب کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جانے کے باعث مصر اس سعادت سے محروم ہو گیا ہےاور دیگر ممالک اسلامیہ سے غلاف کعبہ تیار ہو کر مکہ معظمہ پہنچنے لگا۔ پاکستان کو بھی ایک سال یہ سعادت نصیب ہوئی''۔ (۲)

اس کے علاوہ ''حرم شریف کے سات مناروں کے بارے میں ان کے نام کے ساتھ تفصیلی تعارف کروایا گیا ہے۔ لکھتی ہیں۔

۱۔ عفت الہٰی بحوالہ سابقہ ص۔ ۵۶

۲۔ ایضاً ص۔ ۷۸

’’سعی کی سنگ مرمر کی گزرگاہ فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ دونوں جانب ساگواں کی لکڑی کی بے شمار کھڑکیاں اور آٹھ دروازے ہیں۔ ان میں پیتل کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ محرابوں پر کلام مجید کی آیات و دیگر نقش و گار کندہ ہیں۔ درمیان میں کمزور اور ضعیف سعی کرنے والوں کے پہیہ دار کرسی پر بیٹھ کر چلنے کے لئے دورویہ تین تین فٹ چوڑے راستے بنے ہوئے ہیں۔ سعی کی مسافت تقریباً دو فرلانگ ہے‘‘۔ (۱)

اسلوب کے لحاظ سے سفرنامہ بہترین ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں دلی کیفیات کے لئے رقت طاری کو شعوری کاوش بھی نظر آتی ہے۔ اور اسلوب میں آمد کا نہیں بلکہ آورد کا احساس ہوتا ہے۔

۱۔ عفت الٰہی بحوالہ سابقہ ص۔ ۸۰

بشری اعجاز (عرض حال)

ہم سب معراج کے سفر کو جانتے ہیں۔اسی لیے انسان ازل سے لیکر ابد تک سفر میں ہے۔ زندگی سے موت تک سفر جاری وساری ہے۔ہم سب مراجعت کی طرف جاتے ہیں۔ یہ مراجعت عشق ہے اور عشق توانائی بخشتا ہے۔ حج کا سفر اطاعت کا سفر ہے۔ایمان کو استحکام بخشنے کا ذریعے ہے۔ ارض مقدس کو ہر مسلمان نے دیار محبوب کی نظر سے دیکھا اور دیار محبوب میں جانا ہر عاشق کی خواہش اولین ہوتی ہے لیکن یہ درحبیب کی بات ہے کہ کس کو کیسے اور کس وقت نوازتا ہے۔ ورنہ دل کی تڑپ تو ان کے اندر بھی ہے۔جو خالی کشکول رکھتے ہیں لیکن دل کا کشکول آنسوؤں سے لبریز رکھتے ہیں۔ اور انہی لوگوں کی مسافتیں ظاہری وسائل سے نہیں باطنی وسائل سے طے ہوئی ہیں۔ جہاں دل کا معاملہ ہے۔ اس لیے دل والے جانتے ہیں اگر چہ اس بات پر نادم بھی ہوتے ہیں کہ وہ ان عنایات کے مستحق نہیں ہیں لیکن جب دینے والا سخی ہوتو لینے والی کی جھولی خود بخود پھیل ہی جاتی ہے۔خواہ اس میں سو چھید ہوں۔بھرنے والا بھر ہی دیتا ہے اور بھرنے کے بعد جو رقت طاری ہوتی ہے۔اس کیفیت کو بیان کرنا مشکل ہے۔حج میں لبیک ہی دراصل وہ آواز ہے کہ جو خوش نصیب لوگوں کو اللہ کی طرف سے آتی ہے اور وہ دیوانہ وار تمام مسائل ومشکلات کو عبور کر کے صرف اس پکار کا جواب دینے کے لئے تیاری شروع کر دیتا ہے اور زندگی کی نفسانفسی سے نکل کر اطاعت کے سفر کی طرف رواں دواں ہو جائے کیونکہ کعبہ دارالامان ہے۔

بشری اعجاز کا یہ سفرنامہ ''عرض حال'' دراصل واقعی وہ عرض حال ہے کہ جو اجتماعی سفر ہونے کے باوجود انفرادی بھی ہے اور اس قلبی واردات میں انسان تنہا ہوتا ہے کوئی شریک سفر ہو کر بھی شریک دل نہیں ہوتا کہ یہ محبت سب محبتوں پر حاوی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی سعادت نہیں ہے کہ ہمارے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محت اپنی جان مال اور اولاد سے زیادہ ہو جب ہی ہم مسلمان ہونے کا حق ادا کر سکتے ہیں۔

بشری اعجاز لکھتی ہیں۔

''جس روحانی واردات کا حال میں آپ تک پہنچا رہی ہوں وہ ان رنگ برنگے لفظوں کے الٹ پھیر کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بہت کچھ کہنے کی خواہش رکھنے کے باوجود کچھ بھی نہیں کہہ سکی

کہ شاید اس دور میں لفظ اپنا اعتبار کھوتے جا رہے ہیں۔ ان کی حسرت، ان کی پاکیزگی کو
اپنے اپنے طور پر اس دور کا انسان داؤ پر لگانے کا فن جان چکا ہے۔ اس سے حسب خواہش
فائدہ اٹھانے کے ہنر میں طاق ہو چکا ہے۔اس وجہ سے اپنے دل میں بھی ایک کھٹکا ہے کہ
کہیں بے اعتباری کی مجرم نہ گردانی جاؤں کہیں اپنے ہی لفظوں کی صلیب پر نہ لٹکا دی
جاؤں۔یہی سوچ میری کم فہمی کا موجب بنی ہے''۔(۱)

حج کے سفر ناموں میں اب بہت سی باتیں قدر مشترک کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔جن میں حج کے موقع پر مختلف اقوام کا ذکر کہ جس کی وجہ امت مسلمہ ایک وحدت میں پروئی جاتی ہے اور خاص طور مزدلفہ کے میدان میں انسانوں کا سمندر اس بات کا ثبوت ہے کہ خدائے لم یزل کی ذات ہی ہمیشہ رہنے والی اور عظیم و برتر ہے۔باقی سب فانی ہے جو ہم سے پہلے اس میدان میں جمع ہوئے یا ہم سے بعد میں ہوں گے۔سب فنا ہو جائیں گے لیکن بقا ہے اس افسانوں کے سمندر کو نہیں اس ہستی کو کہ جو یکتا ہے اور جس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اور اس پر دیدہ و دل نثار کرنے کو جی چاہتا ہے اور کسی بھی زائر کی جذباتی وارفتگی کو حدود پیمانہ میں نہیں ماپا جا سکتا کہ انتہائی مشکل ہے۔ کیونکہ بیان واقعہ بعض اوقات محسوسات کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔یہاں جذبات کی حدت لو دیتی ہے اور بے بسی قرب اللہ اور محبت رسول کا باعث بنتی ہے۔

بشریٰ اعجاز لکھتی ہیں۔

''جذبہ ایمانی جب شوق کی ان راہوں کی طرف چلتا ہے تو دھوپ ٹھنڈا گھنا سایہ
بن جاتی ہے اور چٹیل پتھروں والا میدان، ریشمیں نرم و ملائم قالین کی مانند لگتا ہے یہ تو اپنے
اپنے جذبوں اور شوق کے قصے ہیں۔''(۲)

بشریٰ اعجاز کے سفر ناموں میں ایک منفرد چیز جو ان کے سفر ناموں کو نمایاں کرتی ہے وہ ہے پنجابی اشعار کا استعمال۔ انہوں نے ہر باب کے شروع میں پنجابی اشعار کا استعمال کیا ہے۔و
جو ان کے شاعرہ ہونے وکی دلیل تو ہے ہی لیکن ان کے جذبوں کی گہرائی کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ ان میں کتنی شدت ہے اور وہ ان کو کیسے اشعار کے قالب میں ڈھالتی ہیں۔مثلاً

۱۔ بشریٰ اعجاز عرض حال، سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۰ ص۔ ۹
۲۔ ایضاً ص۔ ۱۶

میں تاں ڈھوک پتن وی جانا
مینوں لگڑا عشق او لڑا اول دا روز ازل دا
میں اڈیکاں کر رہی
آج تاں روز مبارک چڑھیا۔

یا اسی قسم کے اور بہت سے اشعار کہ جوان کے ہر باب کے عنوان کے ساتھ ان کیفیات کی بھی عکاسی کرتے ہیں لیکن زیادہ خوبصورت عکاسی تو وہ ان لمحات کی کرتی ہیں کہ جب کبھی وہ جانے کی خواہش کرتی تھیں اور ایک ہی تڑپ تھی کہ گناہ گاروں کا بھی کردے بھلا۔ صدقے محمدؐ کے اور جب یہ جوت کسی مسلمان کے اندر جاگ اٹھتی ہے تو پھر قبلہ دم کعبہ کی لگن اسے ہمہ وقت بے چین و مضطرب رکھتا ہے اور وہ جلد وہاں کی فضاؤں اور ہواؤں سے نہیں بلکہ در کعبہ کے نظاروں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے اور اس کی خواہش یوں الفاظ میں ڈھلتی ہے۔

”ایسا بھی کوئی دن آئے کہ میں حجاز مقدس کی نیت کروں اور وقت میرا ساتھ دے میں حج کے فارموں پر دستخط کروں یہ خیالات حقیقت کی دنیا کا منہ دیکھتے تو اپنے خول کے اندر سمٹ کر رہ جاتے۔ وقت کی تلخیاں حالات کے الجھاؤ کچھ اس طرح سے میری سوچوں کا منہ چڑاتے کہ میں سہم کر رہ جاتی کہاں کا حج کدھر کا قصہ۔ زندگی کے دھندے عمر کے چکر ایام کی گردش ایسے حالات یں بھلا وہ سب کچھ کیوں کر ممکن تھا بس چپ کر جاتی۔ دل کو سمجھا کر کہ جب بارگاہ الٰہی سے بلاوا آئے گا تو کوئی مشکل و منزلوں کے درمیان حائل نہ رہے گی“۔ (۱)

لیکن کرن جب روشنی کا ہالہ بنتی ہے تو سارے اندھیرے خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔ منزلیں نزدیک ہو جاتی ہیں۔ روکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں اور راستے آسان تر ہو جاتے ہیں۔ یہی حال بشریٰ اعجاز کا ہے جب وہ اس مقدس فریضے کے لئے منتخب کر لی جاتی ہیں۔ اللہ کے حضور اس کا بلاوا قبول کر لیا جاتا ہے اور حاضری کے لئے مقدس فضاؤں کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ ایک تڑپ جو ماں ہونے کے ناطے بشریٰ اعجاز میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں جیسی خوبصورت اور محبت کرنے والی ہستی بنائی ہی اس لیے ہے کہ کائنات میں اس کی محبت کا سلسلہ جاری و ساری رہے تو یہ محبت کرنے والی ہستی کیوں کر بچوں کو فراموش کر سکتی ہے۔ کہیں تو وہ محبت کرنے والی اور وفادار بیوی ہے کہ شوہر کی خدمت کرنا اس کا فرض

۱۔ بشریٰ اعجاز بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۴

اولین ہے اور کہیں وہ معصوم آواز اور پاکیزہ جذبوں کی پکار ''ماں'' ہے۔ وہ ماں جو اپنا تن من لٹا کر بھی بچوں کو تکلیف نہیں ہونے دیتی۔

لیکن جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے کہ تمہارا ایمان اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک تم اپنی اولاد اور اپنے مال سے زیادہ رسول خداؐ سے زیادہ محبت نہیں کرتے۔ یہیں پر آ کر مسلمان کے دل کا امتحان ہوتا ہے اور ایک سچا مسلمان رسولؐ کی محبت میں ہر چیز کو چھوڑ دیتا ہے۔

بشریٰ اعجاز نے بھی اپنے بچوں اور خاوند کے لیے حتی الامکان سہولیات فراہم کیں اور خود جوگن بن کر نبیؐ کی گلیوں کا دیدار کرنے نکل گئیں لیکن وہ سرشاری کی کیفیت کا لکھتی ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ واقعی وہ اپنے دل میں خلش نہیں بلکہ حب رسولؐ لیکر نکلی تھیں اور مکمل ایمان اور یقین کے ساتھ لکھتی ہیں۔

''شاید میں اپنی اس انوکھی کیفیت کا اظہار نہ کرسکوں۔ شاید دنیا کے لفظ بہت کم ہیں اور جذبوں کی دنیا کی شدتیں بہت زیادہ جو لفظوں کی قید میں آ ہی نہیں سکتیں''۔ (۱)

ہر مسلمان جب کعبہ اور دیار اقدس کے نظاروں سے مستفید ہوتا ہے تو اپنی کم مائیگی کا احساس اسے احساس ندامت سے گھیر لیتا ہے کہ وہ ہستی کتنی عظیم ہے کہ جو اتنے گناہوں کے باوجود اسے نواز رہی ہے اور اللہ تعالیٰ کو تو بندے کی یہ شرمندگی اتنی عزیز ہے کہ وہ اپنی رحمتوں کی بارش کر دیتا ہے اور وہ کچھ دے دیتا ہے کہ جس کا تصور انسانی عقل کر ہی نہیں سکتی کہ وہ خود عقل وشعور کی حدوں سے باہر ہے۔ اسے صرف عشق کے ذریعے پہچانا جاسکتا ہے۔

مناسک حج میں کوہ صفا، مروہ، مسجد فتح و دیگر مساجد بیت المقدس کی اہمیت حوض کوثر میدان عرفات اور ان میں سے حاجیوں کی کیفیات تمام کا ذکر ایک حاجی جب کرتا ہے تو وہ تمام معلومات فراہم کرتا ہے اور تاریخ کو بھی دہراتا ہے۔ جن سے ان شہروں اور جگہوں کی مسلمانوں کے نزدیک اہمیت اور حرمت کا بھی انداز ہوتا ہے اور آنے والے مسلمانوں حاجیوں کے لئے رہنمائی کا پیغام بھی دیتا ہے۔ جو حج کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یا جو اپنے دل میں تڑپ رکھتے ہیں اور ان سب کے بیان میں عقیدت واحترام کا جذبہ غالب ہوتا ہے۔

لیکن اس عقیدت میں لرزتے کانپتے قدموں میں جب سفر کر کے زائرین حج جب اس شان وشوکت، عظمت وبلندی کے مالک کے پاس پہنچتے ہیں تو احساس ہوتا ہے۔

۱۔ بشریٰ اعجاز، بحوالہ سالبقہ، ص ۲۹۔

''مگر گناہوں کے بوجھ سے بھاری قدم آگے بڑھنے کی ہمت نہ پا رہے ۔ آرزوؤں کی تپش ے آنکھوں میں انگارے بھر دیئے تھے۔شرمندہ آنکھیں کیسے اٹھیں گی کیسے اس عظمت وجلال کے منبع کو دیکھ پائیں گی۔ یااللہ کیسی آزمائش کی گھڑی آ پہنچی۔ کیسی کھٹن منزل آگئی کہ منزل پرپہنچ کر پاؤں لہولہان تھے پرواز کے سارے پر کٹ گئے تھے۔ میں یوں کھڑی تھی جیسے کوئی مجرم عدالت کے کٹہرے میں سزا کے دن کھڑا ہوتا ہے''۔(۱)

اللہ کے گھر میں پہنچ کر اگر دل میں رقت اور جذبے بیدار نہ ہوں تو پھر اس اعلی وارفع مقام پر پہنچ کر بھی تشنگی کا احساس رہتا ہے کیونکہ یہاں عظمت وجلال کے آگے سرنگوں ہوکر ہی مراد ملتی ہے۔

''سبز گنبد اپنی ابدیت سمیت نظروں کے سامنے تھا۔ ہرطرف خاموشی باادب نظریں پانی پانی جسم کانپتا لرزتا دل بے حس وحرکت وجود یہ زندگی کا کیسا روپ تھا''۔ (۲)

یہ گنبد وہ ہے جو عظمت وجلال کا شان وشوکت کا مظہر تو ہے ہی لیکن امیدوں کا مرکز اور نگاہ عشق ومستی میں اول و آخر بھی ہے کہ یہاں بے ادب بھی باادب ہو جاتے ہیں اور عاصی وگناہ گار بھی مرادیں لیکر نکلتے ہیں۔

دیار محبوب کی ہر چیز پیاری لگتی ہے۔گلیوں کے کانٹے اور دھول بھی گھنے سائے اور پھول دکھائی دیتے ہیں اور پھر یہ تو محبوب بھی انوکھا ہے تو یہاں کی ہر چیز کیوں نہ عظیم ہو۔زیارت مکہ معظمہ جنت المعلی کا بیان کہ جس میں عقیدت ہی عقیدت ہے۔

'' طیبہ کی پرنور فضائیں میٹھی میٹھی ادائیں،خوبصورت صبحیں دلکش شامیں جھلملاتی روشنیاں ایماں کی حرارتیں ہمیں ہردم ہرگھڑی اپنی خوش نصیبی کا احساس دلاتیں۔ کتنے خوش بخت تھے ہم جس کی چاہ کی اسے پالیا''۔(۳)

حج کے دوران انسان پرطرح طرح کی کیفیات طاری ہوجاتی ہیں کبھی کبھی دوران حج حاجی پر بے بسی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور وہ اس روحانی تجربے کی بنا پراضمحلال کا شکار ہوجاتا ہے۔

چنانچہ بعض اوقات کیفیت واقعہ محسوسات کی گرفت میں نہیں آتی لیکن انسان بہت سے دکھوں سے آزاد ہوجاتا ہے اور بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے۔

۱۔ بشریٰ اعجاز بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۰
۲۔ ایضاً ص۔ ۹۷
۳۔ ایضاً ص۔ ۹۹

''پشیمانی جرم گناہ جرم، بے وفائی، جرم، بے اعتباری میں ایسے جھکتے ہوئے پشیمان سر کو زمین عرفات سے لگائے اس معبود سے بخشش کی طلبگار تھی۔ عذاب زیست کے لمحے میرے گناہوں کی صورت چمٹے میرا لہو نچوڑ رہے تھے۔ زندگی کا رس ہولے ہولے نچڑ رہا تھا۔ زندگی پانی کی صورت بہہ رہی تھی۔ جان عذابوں کی سولی پر لٹکی ہوئی تھی جسم کے پنجرے میں جنموں سے قید روح زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی ....سولی پر لٹکتے جسم کی جان آنکھوں میں آ کر اٹک گئی تھی'' (۱)

سب سے خوبصورت منظر وہ ہوتا ہے کہ جب حاجی جسمانی طور پر بھی اور روحانی طور پر بھی ایک ہی جذبے سے سرشار ایک ہی آواز میں صرف ایک ہی صدا سنتے ہیں جو ان کے دلوں کو سرشاری اور روح کو بالیدگی بخشتی ہے اور وہ سب اس بات پر شاداں نظر آتے ہیں کہ آج صدیوں سے ترستی خواہشات کو زبان ملی۔ آج پیاسی آنکھوں کی پیاس بجھتی آج بے چین دل کو قرار آیا۔ آج وصال دیار حبیب ہوا آج میں اس مقدس سرزمین میں مقیم ہوا۔ آج میں ان پاکیزہ فضاؤں میں نور کے اس حالے میں اسیر ہوا۔ آج میں دل کی دعاؤں کو لفظوں سے آنسوؤں سے بیان کروں گا۔ آج میری دلی کیفیت بیان کی محتاج نہیں ہے۔ آج میں اس در پر حاضر ہوں کہ جہاں سے مانگنے والا خالی نہیں جاتا۔ آج اگر نہیں ملتا تو اس میں رہنے والے کی......................نہیں مانگنے والے کے اندر کجی ہے۔ کہ اسے مانگنے کا طریقہ نہ آیا۔ ورنہ دینے والا آج سات آسمانوں کے پردے چاک کیئے دے رہا ہے کہ آج اس کے بندے عاجزی و انکساری کے ساتھ جھکے ہوئے ہیں۔ اس کی دہلیز پر اور گھر آئے مہمان کو تو کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے۔ تو وہ غنی ہے۔ جو اس کے در پہ آیا وہ غنی ہوا۔ دل کا بھی اور دنیا کا بھی یہ اپنی اپنی چاہت ہے کہ کوئی کیا مانگتا ہے۔ دینے والے کے پاس کسی قسم کی کمی نہیں ہے۔

''بشریٰ اعجاز لکھتی ہیں۔

'' اس پاس ارد گرد کچھ بھی نہ تھا۔ اندر باہر ادھر ادھر لبیک ہی لبیک تھا۔ وہ دل میں گھر کر جانے والا لبیک وہ زندگی سے ملا دینے والا لبیک وہ ہم سب کا لبیک، وہ ہمارے جینے کی آس لبیک، جسم و جان روح و دل میں چھن چھن بج رہا تھا۔ بصارتیں گم بصیرتیں غائب وجود فنا سب کچھ فنا قائم و دائم زندہ وسلامت بصارتوں بصیرتوں کا سر چشمہ لبیک'' (۲)

۱۔ بشریٰ اعجاز بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۰۲

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۲۲

اسلوب بیان کے لحاظ سے یہ ایک خوبصورت سفرنامہ ہے کہ جس کو اشعار کے مصرعوں نے مزید رنگینی عطا کی ہے لیکن بشریٰ نے دلی کیفیات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سادہ اور رواں زبان میں بیان کیا ہے کہ جہاں بناوٹ کا گمان نہیں ہوتا ہاں کہیں کہیں فقروں میں شاعری کا گمان ضرور ہوتا ہے اور لفظوں کی بندش بھی بڑی خوبصورت ہے۔ جس سے جذبے زیادہ پر تاثیر ہو گئے ہیں اور بامعنی بھی ہیں کہ لفظ مناسب وقت پر اور مناسب طرز ادا کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اس لیے خوبصورت بھی ہیں اور جامع بھی۔

''کیا یہ واقعی حقیقت ہے میں حاجن ہوں۔ خوش نصیب ہوں مبارک کی حق دار ہوں۔ دل کو حیرت سے ٹٹولتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ سب کچھ وہی تو تھا۔ دل وہی، دماغ وہی، سوچیں وہی انداز وہی تو پھر اضافہ کہاں ہے۔ تبدیلیاں کہاں آتیں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ تبدیلیاں یہ اضافے بلکہ اب تو بہت کچھ بچھڑ چکا ہے۔ جسم کچھ ادھورا ہو گیا ہے۔ خالی خالی جیسے روح ساتھ چھوڑ چکی ہے۔ جیسے بچھڑ چکی ہے''۔(۱)

جب تک ہم ان ایمان افروز لمحات سے دور ہوتے ہیں برداشت ہو جاتا ہے لیکن ایک دفعہ کا ملاپ عاشق کے دل میں اور تڑپ پیدا کر دیتا ہے اور اس تڑپ کی وجہ سے بشریٰ اعجاز بھی سفرنامے کے آخر میں اپنے آپ کو ادھورا خیال کر رہی ہیں۔

۱۔ بشریٰ اعجاز بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۳۷

بشری رحمان (منزل عشق پر تنہا پہنچے)

مدینے کی آب وہوا شاید ایسی ہے کہ دل ودماغ کے اندر نئے جذبے ولولے اور امنگیں پیدا ہو کر دیتی ہے۔ محبت اور سرشاری کی وجہ سے آواز بے قابو اور دل پھڑ کنے ولگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حجاز مقدس کے جتنے سفرنامے پڑھیں۔ ان میں ایک عقیدت اور محبت کی فضا رچی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ جب مرکز ومحور ایک ہو تمنائیں ایک ہوں۔ خواہش ایک ہو تو بیان بھی ایک جذبے میں رچا ہوا نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ مقام خاص ہے کہ جہاں پہنچ جانے والے خوش نصیب ہوتے ہیں اور دور دیس میں بے چین وبے قرار دل خاک مدینہ کو آنکھوں سے لگانے کے لئے بے چین وبے قرار نظر آتے ہیں۔ کیونکہ دیار نبیؐ کی ہوائیں بھی مقدس اور فضائیں مطہر ہے۔ فقیر خوش قسمت ہیں کہ یہاں کے گلی کوچوں میں صدائیں لگاتے ہیں۔ حاجی باعث رشک ہیں کہ دیدار دیار نبیؐ کرتے ہیں۔

ان فضاؤں سے ہواؤں سے انسیت ہر مسلمان کے دل میں ہے لیکن وسائل پیدا کرنا اب کریم کا کام ہے کہ حاضری کی قبولیت روپے سے نہیں ہوتی نظر کرم سے ہوتی ہے۔ جہاں ہم قدموں کے بل نہیں سر کے بل جانا باعث سعادت سمجھتے ہیں۔

بشری رحمٰن کا یہ سفرنامہ ''ٹک ٹک دیدم ٹوکیو'' میں شامل ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۰ اصفحات پر مشتمل جون ۱۹۸۹ء کو پہلی بار شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ حدیث دل بھی ہے اور حدیث دیگراں بھی بلکہ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ بشری رحمٰن جس طرح باؤلی بھکارن میں دل کی محبت اور روح کا گذر شامل ہے یا جس کم مائیگی اور تشکر کی کیفیت وہاں ہے کہ بھکارن کو اپنے کشکول سے زیادہ بھیک مل گئی ہے اور وہ مقام ادب کو ملحوظ خاطر رکھتی ہیں اور ان کا انداز مردہ جسموں میں حیات کی نئی روح پھونک دیتا ہے۔ وہ اس میں نظر نہیں آتا ہے بلکہ اس میں ان محسوسات کو جو حج کو روحانی تجربہ بنادیتے ہیں نظر انداز کر دیا ہے۔

اس میں مصنفہ نے اپنی ذات کو مختلف طریقوں سے عیاں کیا ہے اور ہر موقع پر امیر غریب کے فرق کو اور حج کے دوران سہولیات کا ذکر اور ان کے استعمال کے بارے میں عجیب تنقیدی نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔

حج کا موقع ایسا ہے کہ جہاں امیر غریب، جاہل، عاقل، متقی، پرہیز گار، عاصی، گنہگار سب ایک ہی لباس اور ایک ہی مقام پر کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ خدا بزرگ و برتر اس اعلیٰ وارفع مقام پر سب کو برابر قرار دیا ہے۔ یہاں بشری

رحمٰن کا یہ ناروا رویہ بہت کھٹکتا ہے۔ کیونکہ ایک ایسی وخاتون جو اللہ اور رسول کی محبت میں سرشار ہو ہمہ وقت اس کے دل میں خوف خدا ہو وہ یوں انسانیت کی تذلیل کرے۔ بہت ہی ذہن کو دھچکا لگانے والی بات ہے۔

ایک اور بات کہ اس سفرنامے میں بشری نہ صرف تذلیل کرتی ہیں بلکہ بعض اوقات وہ بیان میں تضادات سے بھی کام لیتی ہیں۔ سرکاری افسروں اور ریٹائرڈ شدہ ملازمین کے بارے میں بھی انہوں نے غیر مناسب طنزیہ رویہ اختیار کیا ہے جو کسی طور بھی ان جیسی ادیبہ کو ذیب نہیں دیتا ہے۔

ہم مسلمان جو رب کائنات سے بے پناہ عشق کرتے ہیں۔ ہمہ وقت ان کے در پر حاضری کے لئے بے چین و بے قرار رہتے ہیں اور اگر ہمیں رب کعبہ نواز دیتا ہے تو ہمیں اس کی محبت میں زیادہ عاجزی وانکساری دکھانی چاہیے کیونکہ ہمارے عمل ہی ہمارے لئے زادراہ ہیں۔ یہ دنیاوی سہولتیں تو صرف چند روز زیست کے لیے ہیں جب تک دم ہے ہمارے ساتھ ہیں۔ ہمیشہ رہنے والی چیز تو ہمارا حسن خلق اور اعمال ہیں کہ جن کی وجہ سے کوئی امیر دراصل امیر ہوگا۔ بشری رحمان اس میں ان مشکلات ومصائب کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ جو دوران حج پاکستانی حاجیوں کے دوران پیش آتی ہیں۔ وہ خدام الحاج، معلم مقرر کئے گئے تھے۔ وہ وہاں تعاون کی بجائے ان سے لاپرواہ نظر آتے ہیں۔ سب سے زیادہ بدنظمی اور بدانتظامی پاکستانی بسوں اور رہائشی فلیٹ کے بارے میں ہے وکہ وہاں کھانے کے انتظام سے لیکر سونے کا نظام تک سب انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں ہے۔ یہ تو وہ انتظامی صورت حال ہے لیکن یہاں پر بشری رحمٰن کا تبصرہ انتہائی ناگوار گذرتا ہے کہ .... وہ مقام ہے کہ جہاں بندہ وصاحب وغنی ومحتاج ایک ہوتے ہیں۔ جہاں ایاز ومحمود اس کے سامنے اکھٹے جھک جاتے ہیں۔ وہاں پر یہ سوچنا کہ میں اپنے ہم وطنوں سے اعلی ہوں اپنے وملک کی ہی نہیں بلکہ انسانیت کی تذلیل کی ہے۔ فرماتی ہیں۔

> ''معلم نے ہر قسم وکے جانور ایک ہی کھونٹے سے باندھ دیا ہے۔ تمام ناخواندہ اوران پڑھ لوگوں کے ساتھ مجھے کمرہ دے دیا ہے''۔ (۱)

یہاں نچلے طبقے کو بیان کرتے ہوئے بشری رحمان کا قلم زہر اگلتا ہے۔ خدا نے اپنے بندوں کا مقام ومرتبہ دنیاوی رتبوں سے نہیں بلکہ عبادت وریاضت تقوی و پرہیز گاری سے مرتب کیا ہے۔ یہاں کسی گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر فضیلت حاصل نہیں ہے۔ یہاں کسی ان پڑھ کو پڑھے لکھے سے کم مقام ومرتبہ نہیں ملتا۔ یہاں کسی بادشاہ کو فقیر

۱۔ بشریٰ رحمٰن منزل عشق پر تنہا پہنچے ادارہ وطن دوست ۱۹۸۹ ص۔ ۳۷

سے زیادہ پذیرائی نہیں ملتی کیونکہ یہ وہ مقام ہے وکہ جسے چاہے اسے نواز دے۔ یہ اس کی رحمت وکرم ہے کیونکہ حج کا سفر خاص اللہ کی ذات تک رسائی کا سفر ہے۔ یہ سفر تلاش وجستجو کا سفر ہے۔ جہاں کے روح پرور نظارے جذب ومستی کے ساتھ ساتھ سرشاری کی کیفیت بھی طاری کر دیتے ہیں اور ایسے عالم میں عبودیت کا ذوق اور اطاعت کی خودسپردگی کہاں اجازت دیتی ہے کہ ایسے روح پرور نظاروں میں امیر وغریب پڑھے لکھے اور ان پڑھ لوگوں کے فرق کو روا رکھیں۔ جہاں پہنچ کر صرف انکسار ہی انکسار رہ جاتا ہے۔ باقی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی احساس باقی رہ جاتا ہے تو یہ کہ اتنے کم دنوں کے مہمان ہیں کاش یہ سب کچھ زیادہ بلکہ تا عمر کے لیے ہوتا لیکن مہمان تو مہمان ہوتا ہے۔ اسے جانا بھی ہوتا ہے۔ یہی چیز جذبہ عشق کو دو آتشہ کرتی ہے اور وہ خاک مدینہ کو آنکھوں کا سرمہ بنانے کا متمنی نظر آتا ہے۔ کہ وہاں کی خاک مانگ کی افشاں اور وہاں کی دھول آنکھ کا سرمہ بننے کے ہی ولائق ہے کیونکہ ان گلیوں میں اس خاک پر وہ مقدس قدم پڑے کہ جن قدموں کو عرش بریں نے بھی چوما۔ جہاں لوگ اس عشق کی سرشاری میں جاتے ہیں کہ جس کے عشق میں خود خدائے بزرگ وبرتر کی ذات ہوتی ہے اور سی عشق نے انہیں وہ مقام عطا کیا کہ وہ معراج تک جا پہنچے جہاں دل کی دھڑکن ہی طلب صادق کی نوا بنتی ہے اور خدا کی خدائی کے آگے سر نیاز جھک جاتا ہے۔

اس سفرنامے میں بشریٰ کی توجہ کا مرکز خانہ کعبہ اور دیگر مقامات زیارت نہیں بلکہ ان کی ساری توجہ بہتر ائر کنڈیشنز، رہائش، اچھی گاڑی، صاف ستھرے غسلخانوں کی جانب ہے۔ باؤلی بھکارن میں اپنے کو عشق رسول میں سرشار خاتو کو اگر یہاں دیکھا جائے تو یہ کیفیت اور انداز بالکل فرق نظر آتا ہے۔ بلکہ یہ بناوٹ اور دکھاوے کی ذیل میں آتا ہے کیونکہ اگر کوئی اس مقام پر آ کر بھی اپنے آپ کو مادی آسائشوں، خواہشوں اور نچلے طبقے کی نفرت سے باز نہیں رکھ سکتا تو پھر اس کی عاجزی وانکساری سب دکھاوے کی ہے۔

کیونکہ مسلمان وہ ہے جو ہر حالت میں سجدہ شکر بجالائے اور ان خلفائے راشدین کو یاد کرے کہ جنہوں ے دنیا کی تمام آسائشات رکھنے کے باوجود صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کی ہے اور دنیا کو ترک کیا۔

بشریٰ رحمان (نسیما جانب بطحا گذر کن)

مدینہ جو ہماری تاریخ کا سنہری باب ہے۔ جس نے مسلمانوں کے لئے ایک ایسا مرکز بنایا جو تا قیامت مسلمانان دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ مدینے کا مسافر'' اس بھٹکتے ہوئے آہو کی مانند ہے کہ جب قرب حرم سے ہمکنار ہوتا ہے تو اس کی حسرتوں اور تمناؤں کی تکمیل ہوتی ہے دیار نبیؐ کا ذرہ ذرہ مقدس ہے۔ اس کی فضاؤں میں تقدس اور ہواؤں میں لطافت و پاکیزگی ہے۔

بشریٰ رحمٰن کا ۵۲ پر مشتمل یہ حج کا عرض حال بھی ہے اور ایک مختصر رپورتاژ بھی ہے جو مئی ۱۹۸۱ء کے سفر حجاز کی روداد ہے لیکن جو لطف سرور اور کیف ان کے سفرنامے باؤلی بھکارن میں نظر آتا ہے یا جو عاجزی اس میں ہے اور کہیں نہیں ہے۔ اس رپورتاژ میں جو سفرنامے کی حدوں کو ملاتا ہے۔ بشریٰ جذبے کے ساتھ ساتھ کھلتی آنکھ کے ساتھ مشاہدہ کرتی ہیں۔ وہ صرف اپنے اوپر رحمت کی طلبگار نہیں بلکہ پورے مسلمانوں کے لئے دعا کرتی ہیں اور جسطرح ماں کی ممتا اپنے بچوں سے لیکر پوری دنیا کے بچوں کے لئے یکساں ہوتی ہے اس طرح وہ خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے ممتا کے جذبات کے ساتھ اظہار کرتی ہیں۔

بشریٰ رحمٰن لکھتی ہیں۔

> '' یہ تیرے ننھے ننھے بندے............... چھوٹے انسان............... ان پر رحمت کی نظر رکھنا............... کل ان کی وجہ سے مجھے اور میری وجہ سے انہیں تیرے حضور شرمندہ نہ ہونا پڑے...............'' (۱)

یہ سفر عقیدتوں اور نیازمندوں کے بحر بیکراں کا سفر ہے۔ جذبوں کو لفظوں کی شکل میں ڈھالنا مشکل امر ہے اور پھر تہجد کی اذان کے وقت تو خاص اللہ تعالی کی رحمتیں اپنے ان بندوں کو نوازتی ہیں جو رات کا آرام چھوڑ صرف اور صرف اپنے خدائی خوشنودی کے لئے رکوع سجود میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اگر یہی منظر دیار حبیب کی فضاؤں میں ہو تو وہاں تو رحمت و نور کی برسات اور بھی زیادہ ہوتی ہے اور انوار و تجلیات بشریٰ رحمٰن خانہ کعبہ میں تہجد کی آذان کے وقت کا سماں کچھ یوں باندھتی ہیں۔

۱۔ بشریٰ رحمٰن نسیما جانب بطحا گذر کن ادارہ وطن دوست لاہور ۱۹۸۱ ص۔ ۲۳۱

’’کعبۃ اللہ کی اک اک اینٹ اللہ اللہ ورد کرنے لگی۔ دیواروں نے دم سادھ لیے .... مینار جھومنے لگے.........................ستاروں نے اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے۔ آسمان نیچے جھکا۔ اس زمین کو بوسہ دینے کے لئے۔ تاریکی کا باریک دوپٹہ پھٹ گیا۔ صبح کا چہرہ نوزائیدہ بچے کی طرح پہلے نیلا اور اودا ہوا پھر ایک عجیب سا رنگ آسمان پر بکھر گیا۔ دھیرے دھیرے اودے رنگ کے اندر سے اصلی صبح مسکراتے ہوئے یوں آ رہی تھی جیسے طفل شیر خوار ماں کی گود سے باہر آتا ہے۔ (۱)

بشریٰ رحمٰن کی یہ جذب وسوز کی کیفیت ایسی ہے کہ جو ہر مسلمان اپنے قلب ودل میں محسوس کرتا ہے۔

آب زم زم کی اپنی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ ہر شخص جو بھی وہاں جاتا ہے۔ زم زم کے ذائقے اور اس کی اہمیت و افادیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ یہ محض پانی نہیں آب حیات ہے۔ مسلمانوں کے لئے جس کی تاثیر سے کبھی بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے۔ بشریٰ رحمٰن بھی باؤلی بھکارن سے لیکر اب تک مسلمان خواتین کو آب زم زم سے نہ صرف گناہوں سے پاک ہونے کے لئے استعمال کرتے دیکھا ہے بلکہ من کی کھوٹ بھی دھوتے بھی دیکھا ہے۔ لیکن بشریٰ اس چیز پر اصرار کرتی ہیں کہ تن کی بجائے من کی میل دھونی چاہیے۔ کہ من کے دھوبی گھاٹ پر اگر میل جمی رہ گئی تو تن کو اجلا کرنے کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔ پاپ باطن سے ظاہر کا سفر کرتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تن من کو پاک کیا جائے اور راستوں کے پیچ وخم اور مشکلات کو رحمت خداوندی کے ذریعے دور کیا جائے اور اپنے ودل کے تار نظر کو عشق مصطفےٰ کی جلوہ گری سے راستوں کو منور کیا جائے۔

بشریٰ رحمٰن لکھتی ہیں۔

ہم سب آسان رستوں کو اپناتے ہیں۔ وسیلے ڈھونڈتے ہیں۔ آسرے بناتے ہیں۔

’’کفن کو زمزم سے دھو لیتے ہیں تا کہ سوال وجواب سے بچ جائیں‘‘۔ (۲)

آب زم زم کے بعد سعودی عرب میں ایمان بالغیب اور اذان کے تقدس کی حالت یوں بیان کرتی ہیں جونہی اذان ہوتی ہے تمام کاروبار بند ہو جاتے ہیں۔ دوکانوں پر کپڑے لٹکا دیئے جاتے ہیں اور ہر مسلمان نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس نماز کی برکت یہ ہے کہ سعودی عرب میں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں اور نمازوں میں بھی سرور کی کیفیت

۱۔ بشریٰ رحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۴۷

۲۔ ایضاً ص۔ ۲۴۰

باقی ہے۔

''سعودی عرب میں یہ بہت اچھی بات دیکھی جو جہاں جس حالت میں ہو اذان سن کر نماز پڑھنے لگتے ہیں۔(۱)

یہ سفر عام سفر نہیں ہے کہ ہم یہاں بے نیازی سے مناظر کے پاس سے گذر جائیں اور ہم سوچیں کہ یہ دن نہ ہی پھر کسی اور دن، بیت اللہ کا نظارہ ایسا ہے کہ جہاں ضبط وصبر، پیمانہ جھلک ہی جاتا ہے۔ آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب جانا کوئی بڑی بات نہیں کہ خانہ کعبہ پر پہلی نظر ہی فرزانوں کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ اور وارفتگی میں جسم ساکن ہو جاتا ہے۔ ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں اور آنکھیں ان نظاروں کی تاب نہ لاتے ہوئے کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ آنسو لگاتار بغیر آواز کے گرتے ہیں۔ ہاتھ اٹھے رہ جاتے ہیں۔ لفظ بھول جاتے ہیں۔ صرف دل کی آنکھ روشن ہوتی ہے کہ جہاں سے رب پاک بغیر الفاظ کے اور ہر زبان سے دعاؤں کو سنتا بھی ہے اور قبول بھی کرتا ہے۔ کیونکہ وہ مانتا ہے کہ محبت ہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانوں کے اندر ایسی کیفیات کو پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

بشریٰ رحمان کے اس سفرنامے میں نماز سے لیکر لباس تک اگر مشاہدہ کیا جائے تو ہم ایک بات محسوس کرتے ہیں کہ اس میں مشاہدہ رب ذوالجلال کی جگہ مشاہدہ دنیا زیادہ ہے۔ اور انہوں نے غیر سطحی چیزوں کو زیادہ اہمیت دینی شروع کر دی ہے۔ مثلاً باؤلی بھکارن میں بشریٰ رحمٰن کو یہی گرم ہوا ماں کی ممتا کی طرح ٹھنڈی اور پرسکون محسوس ہوتی ہے اور وہ ہوا کے ان گرم تھپیڑوں کو پہلا استقبال کہتی ہیں لیکن اس میں انداز کچھ دیگر ہے کہ میں

''عین پنکھے کے نیچے ٹھنڈے پانی کے کولر کے ساتھ نیت باندھے کھڑی تھی''۔ (۱)

یہ بات درست ہے کہ انسان ہر جگہ سہولیات تلاش کر لیتا ہے لیکن ایک طرف تو ہم اللہ اور اس کے رسول ؐ کی محبت کا اقرار کرتے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ رسول پاک ؐ نے کسطرح عرب کے صحرا میں درویشانہ زندگی گزاری تھی۔ اگر ہم ان کی امت میں تو پھر اس جسد خاکی کو کیوں اتنی آسائشات کا عادی بنا لیا ہے کیونکہ وہ لوگ بھی بشریٰ کے ساتھ ہی تھے جو سورج کی تمازت وحدت کی پرواہ کئے بغیر خدائے بزرگ و برتر کے حضور سجدہ ریز تھے۔ اس کو دیکھتے ہوئے بشریٰ رحمٰن کے دل میں بھی شرمندگی اور ندامت کا احساس جاگ اٹھتا ہے اور وہ اپنی اس کوتاہی پر بہت نادم ہیں۔
لیکن دوسری طرف دنیاوی معاملات میں وہ ایک عام خاتون نظر آتی ہیں کہ جو ذرا بہتر لباس پہنتی ہیں تو احساس

۱۔ بشریٰ رحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۴۷

تفاخر میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی یہ کمزوری ہے کہ وہ جذبات کے بہاؤ میں بہہ کر عام طور پر خود نمائی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جو کبھی کبھی مبالغہ آرائی کو بھی جنم دیتا ہے۔ خود کو خوامخواہ منفرد ثابت کرنے کی کوشش یہاں بشریٰ رحمٰن کے ہاں نمایاں نظر آتی ہے بلکہ زیب داستان کے لئے وہ واقعاتی مبالغہ آرائی سے بھی کام لیتی ہیں۔

'' آج ظہر کے وقت ایک ہم وطن خاتون میرے پاس آ بیٹھی ....اچانک پوچھنے لگی۔
آپ نے خوشبو کونسی لگا رکھی ہے؟...........ہائے آپ نے دیسی عطر کیوں نہیں لگایا۔ ولائتی
خوشبو میں تو الکحل ہوتی ہے یہ لگانا تو حرام ہے''۔ (۱)

یہ اس قسم کی باتیں ہیں جو اللہ کے گھر جا کر یاد نہیں رہنی چاہیے۔ وہاں صرف اس کی رضا حاصل کرنے کی فکر ہونی چاہیے۔ لیکن یہیں پر بس نہیں بلکہ پھر خالص نسوانی انداز میں یوں اظہار کرتی وہیں جس سے امارت کا اظہار کرنا بھی مقصود ہے۔ اور اپنی پسند پر فخر بھی جھلکتا ہے۔

''اسی وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پیچھے سے کوئی میری قمیص کا کرتا کھینچ رہا ہے۔ وہ تھوڑی
دیر میری طرف دیکھتی رہی پھر ہنس کر بولی آپ نے سوٹ کا کپڑا کہاں سے لیا ہے''۔ (۲)

اس طرح کے اور واقعات میں کہیں اپنے چہرے اور کہیں اپنی بہن کی تعریف کرتی نظر آتی ہیں۔ کیونکہ عورت کہیں بھی ہو اپنی فطرت سے باز نہیں آتی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور وہ اپنی برتری کا اظہار کر جاتی ہے لیکن ان کا اسلوب داخلی قوت سے محروم نہیں ہو اپنے ساتھ قاری کو لیکر چلنے کا فن جانتی ہیں۔ اور اپنے واقعات میں دلآویزی پیدا کرنا بھی ان کا خاصا ہے۔

وہ روح پرور نظاروں کی جذبات میں ڈوب کر سرمستی وسرشاری کی کیفیت بھی بیان کرتی ہیں اور دنیا کے رنگین نظاروں سے بھی آشنا کرواتی ہیں وہ مقام عبد سے واقف ہیں اور جہاں رنگ و بو سے لطف اندوز ہونا بھی جانتی ہیں۔

۱۔ بشریٰ رحمٰن بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۵۳
۲۔ ایضاً ص۔ ۲۵۹

زبیدہ حنئی (زھے نصیب)

حج کے سفرنامے لکھنا یا حج کے بارے میں تاثرات قلم بند کرنے کی روایت حضورؐ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حجۃ الوداع کے بعد قائم ہوئی۔ حج چونکہ دین اسلام کا رکن بھی ہے اور ہر صاحب استطاعت پر فرض بھی ہے۔ اس لیے حج کے سفرنامے زمانہ قدیم سے لیکر دور جدید تک لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔

انور سدید لکھتے ہیں۔

''حج کے سفر میں زائر کسی نئی سرزمین کو دریافت نہیں کرتا بلکہ اس سرزمین کا مشاہدہ بچشم خود کرتا ہے۔ جسے پہلے اس کی باطن آنکھ نے دیکھا تھا۔ حج کے سفرناموں میں نئے احصار و دریا سامنے نہیں آتے بلکہ ہر سفرنامہ نگار ہمارے سامنے اپنے مشاہدات باطن کی تعبیر پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مقامات مقدسہ کو ان گنت دفعہ سفرناموں میں پیش کیا گیا لیکن ہر مرتبہ نئی کیفیت بیدار ہوئی۔ ہر دفعہ روحانی تجربے کی ایک نئی صورت سامنے آئی''۔ (۱)

زبیدہ حنئی کا سفرنامہ ''زہے نصیب'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے کہ جس میں انہوں نے عمرہ کے دوران اپنے تاثرات کو بڑی محبت اور علمیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

افضل علوی لکھتے ہیں۔

''زہے نصیب'' ان کے خاک پاک حجاز کے اس مبارک و مسعود سفر کی مبسوط روداد ہے۔ جو انہوں نے ادائے عمرہ کے سلسلہ میں اختیار کیا اور پھر عقیدتوں، چاہتوں، خودسپردگی اور والہانہ پن کی تمام تر کیفیتوں میں ڈوب کر اس کو قلمبند کرنے کی سعادت بھی حاصل کر لی ....ان کا یہ سفرنامہ فقط ایک سفرنامہ ہی نہیں بلکہ پاکیزہ جذبوں کی ایک ایسی دلآویز دستاویز بھی ہے جس کی ایک ایک سطر میں اور ایک ایک حرف میں ایمان کی حرارت تاثرات کی صداقت اور فکر و نظر کی طہارت ہلکورے لیتی محسوس ہوتی ہے''۔ (۲)

ہر مسلمان جو عقیدت کے جذبے سے سرشار ہوتا ہے اور وسائل مین ناکام اس کا جسم اپنے

۱۔ انور سدید بحوالہ سابقہ ص۔ ۴۶۱

۲۔ افضل علوی سخنے چند دیباچہ زہے نصیب از زبیدہ مئی، نعت اکادمی فیصل آباد ۱۹۸۳ ص۔ ۸۔۹

وطن میں مقیم ہوا ہے لیکن روح دیارِ نبیؐ کی فضاؤں کی سیر کرتی ہے اور ہر گھڑی ہر لمحہ وہ روحانی و قلبی طور پر ان مقدس فضاؤں کی سیر کرتا ہے کہ جہاں سراپا دعاؤں میں ڈھل جاتا ہے۔ اور لب التجاؤں میں زبیدہ مئی نے بھی فیصل آباد سے کراچی تک کا سفر شوق و تجسس میں طے کیا اور جدہ جو عقیدتوں کا مرکز ہے اس کے بارے میں زبیدہ مئی لکھتی ہیں۔

''وہی جو ہر مسلمان کی آرزو ہے
جو ہر چاہنے والے کی معراج ہے
جو زندگی میں اور اس کے بعد بھی حیات ہے
جہاں سدا ہریالی ہے۔ جو دل و نگاہ کا مرکز ہے
جہاں ابلیس ناکام ہے
جہاں عطا ہی عطا ہی ہے''۔ (۱)

عشق و احترام ایک ایسا جذبہ ہے کہ جو جتنا کسی مسلمان میں ہوتا ہے۔ اتنا ہی اس کا دل خوف خدا سے لبریز ہوتا ہے و اور جذبہ ایمانی تازہ۔ ایمان کے مکمل ہونے میں عشق و اظہار ہے کہ اس کا جلوہ مختلف کیفیات اور مختلف لوگوں پر مختلف انداز میں ہوا لیکن جب مرکز نگاہ ایک ہو تو لڑی وہ جڑ جاتی ہے کہ جہاں سے آغاز ہوا تھا۔ وہاں پہنچنے کے راستے کسی کے لئے آسان اور کسی کے لئے پرخار ہیں لیکن حاصل مقصود ایک ہی ہے۔ یہی وجہ ہے وکہ زبیدہ حسنی نے بڑے مختصر لیکن جامع انداز میں پوری تاریخ بیان کردی۔

''عشق کربلا میں عیاں، عشق صبر ایوب میں بیاں، معرکہ بدر و حنین عشق، ندائے وابراہیم علیہ السلام و آذان بلالؓ عشق، جانثاری ابوبکر صدیق، عشق عشق کبھی دار پہ رقصاں، کبھی تپتی ریت پر زیر شعلہ آفتاب، گرم زرہ بکتر میں، بند جسم میں پروانہ وار انصار کا جذبہ ایثار، عشق، عشق عمرؓ اور شمشیر حیدرؓ سے عیاں، انتہائے عشق روح دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے جواں ہے'' (۲)

عشق کا بیان اور عشق کا راستہ دونوں ہی مشکل ہیں کہ مادی کثافتیں انسان کی آزمائش کے لیے مگرمچھ کی طرح منہ کھولے کھڑی ہیں۔ ان سے دامن بچانا اور اللہ کے راستے پر ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ دنیاوی

۱۔ زبیدہ حسنی بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۹
۲۔ ایضاً ص۔ ۴۹

جاہ وجلال، حسد، کینہ وبغاوت مقام ومرتبہ کے جال میں جکڑا ہوا انسان بے بس ہے۔ وہ اللہ تعالی کے بے شمار اور لازوال نعمتوں کا شکرادا کرنا چاہیے تو بھی تو نہیں کرسکتا کہ نعمتیں بے حساب اور حد درجہ اور دنیاوی حرص وطمع کا جال مضبوط زبیدہ مئی نے اس عمرہ کی داستان میں اسلامی تاریخ، قرآنی حوالے افکار اقبال رومی وجامی کی تشریحات، عربی تراجم، قرآن وحدیث غرض کہ موقع کے مطابق جو علم وفن کا عرفان رکھتی ہیں اس کا اس سفرنامے کی خوبصورتی کے لیے پیش کردیا ہے۔

انور سدید لکھتے ہیں۔

> ''زبیدہ حمئی نے لکھا ہے وکہ حج فریضہ ہے اور عمرہ شوق ان کا سفرنامہ زہے نصیب حجاز مقدس کی وان تجلیات کا مرقع ہے جو انہوں نے ۱۹۸۱ میں عمرہ کے دوران سمیٹیں۔ اس سفرنامے کی نسبت میں ارکان دین کا اثبات ارض مقدس کی تاریخ اور حضور کی سیرت طیبہ سے کیا گیاہے''۔ (۱)

زبیدہ حمئی پر ہر عمرہ کے دوران بے خودی طاری رہی اور اس بے خودی میں کم مائیگی کا احساس بھی کہ وہ مقدس سر زمین ہی ایسی ہے کہ بڑے بڑے کجکلاہوں کی .... وہاں سجدہ ریز ہوی ہے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان ہمیشہ کسی واپنے سے دکھ کہنے یا سنانے کے لئے کوئی وسہارا تلاش کرتا ہے کسی کو آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتا ہے اور وہاں اظہار جب سانچے یں ڈھل کر پیش ہوتا ہے وکہ جہاں ہمیں یہ بھی ومان ہوتا ہے کہ جہاں جو بھی آیا بامراد گیا اور پھر جب سامنے کعبہ ہو تو قبلہ وکعبہ یکجا ہو کر دل ونظر میں یوں سما جاتے ہیں۔ سرشاری کی اس کیفیت کا بیان اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کہ ~~حضور دا اور وہ سرشاری کی اس کیفیت کا بیان اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کہ~~ ''حضوری'' اور وہ بھی باب کعبہ کے سامنے ''سبحان اللہ'' کہ جہاں حاجت کو زبان کی اور بیان کو الفاظ کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ آنسو وہ زبان وبیان ہیں جو ہر روپ میں ایک ہی جیسا اثر رکھتے ہیں اور ایک ہی جیسی محبت وعقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

زبیدہ لکھتی ہیں۔

> ''سیاہ چمکیلا رنگ سنہری حروف میں آیات سے مرقع۔ رات کے اندھیرے کے باوجود روشن روشن اجالوں کا مرکز بقعہ نور۔ جیسے رات چاند کو بہت نکھار بخش دیتی ہے: آج دنیا کا فاضل واعلی ترین مقام مجھ گنہگار کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ کوتاہ نظر وکم ذوق آنکھوں کے سامنے ہاں .... فیصل آباد کی خاک چھاننے والی آنکھوں کے سامنے'' (۲)

۱۔ زبیدہ حمئی بحوالہ سابقہ ص۔ ۵۲۸

۲۔ ایضاً ص۔ ۵۲۹

زبیدہ مئی کے پورے سفرنامے میں ان تمام مقامات کا تفصیلاً ذکر ہے کہ جہاں جہاں دونوافل ادا کرنا افضل ترین ہے اوران کی سوچ قابل وفخر ہے کہ انسان عبادت تو اپنے نفع کے لیے کرتا ہے۔ اللہ کی ذات تو اس سے بے نیاز ہے اور پھر دنیاوی خواہش ترک کر دینے کی وہ لحاتی خواہش کہ جو ہر جائی کے دل میں اس وقت ضرور جنم لیتی ہے لیکن پھر دنیاوی .... اسے ایسے جکڑ لیتے ہیں کہ مکڑی کے جال کی طرح اس کو اپنی لپیٹ میں گم کر دیتے ہیں۔ مدینہ کی طرف جاتے ان مقامات مقدسہ کا ذکر کہ جہاں معرکہ بدر وحنین ہوئے۔ وہاں پر مجاہدین کی تعداد اوران کی فتوحات کا ذکر تفصیلاً کیا ہے۔ پھر مدینہ میں ریاض الجنۃ مقام ابراہیم، باب جبریل وغیرہ کا ذکر کر کے وہ اس طور عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں لکھتی ہیں۔

> '' یہ وہ مبارک ستون ہے جس کی فضیلت رسول اکرمؐ نے بیان فرمائی کہ میری مسجد میں ایک ٹکڑا ہے۔ اگر کسی کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو بغیر قرعہ وہاں کسی کو نماز ادا کرنے کی سعادت نصیب نہ ہو اور یہ کہ لوگ اس مقام پر نماز پڑھنے کے واسطے کٹ مریں'' (۱)

ان کا بیان احد کے بارے ہو یا مساجد خمسہ کے بارے میں عقدیت واحترام اور قاری کو کچھ بتانے اور سمجھانے کا ہے۔ یہ مقام وہ ہے کہ جہاں سر کو قدم بنا کر چلنا پڑتا ہے۔ خواتین کا مشاہدہ مردوں سے زیادہ ہنوتا ہے۔ اگرچہ مطالعہ کم ہی کیوں نہ ہو۔ زبیدہ مئی نے ایک خاتون کو دوران عمرہ دیکھا تو بے اختیار ان کے الفاظ میں ہی کیفیت بیان کر دی۔ ایک خاتون جو میانوالی کے خاص وڈیروں میں سے تھی اسے روضہ اطہر کے پاس یہ کہتے سنا گیا۔

> ''وے سوہنیاں اتھے کتھے آ وسیاں۔ جے وطن اچ ہونڈوں میں تیرا روضہ سونے دا بنواندی،
>
> کتنا پیارا سوال ہے کتنی پیاری صداقت اللہ اللہ غلامان رسولؐ کے جذبے'' (۲)

یہ تو وہ جذبے ہیں جو دل کی گہرائیوں سے نکل کر وقت کی ساعتوں میں مقید ہو جاتے ہیں لیکن دراصل اس میں وہ تڑپ ہے کہ جب کسی کے پاس وسائل نہ ہوں لیکن دل تڑپ تڑپ جائے کہ کاش اللہ خود کہیں سے اس کے گھر میں اتنی رقم چپکے سے دے جائے کہ وہ تمام کاروباری اور دنیاوی الائشوں سے پاک ہو کر ایک مرتبہ روضہ اقدس پر حاضری دے اور ایسے میں اگر کوئی وسیلہ نہ نظر آئے تو پھر دوری کا احساس کہ کاش اللہ کا گھر اپنے ہی وطن میں ہوتا زیادہ ہو جاتا ہے۔

۱۔ زبیدہ مئی بحوالہ سابقہ ص۔ ۶۰

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۶۴

زبیدہ حسی کا اسلوب قرآنی، تاریخی اور معاشرتی حوالوں کے باوجود اکتا دینے والا نہیں ہے بلکہ افضل علوی لکھتے ہیں۔

'' اپنے پاکیزہ و معطر موضوع سے قطع نظر زہے نصیب ویسے بھی بہت سے ادبی محاسن کی حاصل تحریر ہے جس میں گھلاوٹ بھی ہے اور ملاوٹ بھی۔ دبی دبی شوخی بھی ہے تو تیکھی تیکھی سنجیدگی بھی بالفاظ دیگر شوخی ہے مگر متانت کے ساتھ سنجیدگی بھی ہے مگر ذہانت کے ساتھ بعض بعض فقروں اور جملوں کا تو شعر منثور کا درجہ دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ان کی تحریر میں تصنع نہیں بلکہ ایک ایسی معصومانہ سادگی اور بے تکلفی ہے جو ایک ایمان اور عقیدت بھرے دل کا خاصہ ہو سکتی''۔ (۱)

''پورا سفر نامہ اسلوب کی رنگا رنگی اور بیان کے تنوع میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور سحر انگیزی کی ایک داستان معلوم ہوتا ہے۔ جہاں زبیدہ حسی اپنے علاوہ قاری کو بھی گم کر دیتی ہیں۔تاہم کہیں کہیں نسوانی رنگ یہاں کی عقیدت بھری فضا میں بھی نظر آتا ہے۔ کہ عمرہ کے دوران انہیں ایک پاکستانی خاتون نظر آتی جو یہاں ظہر سے مغرب تک قیام پذیر ہوتی تھی۔ فرماتی ہیں۔حب الوطنی کے جذبے کے تحت میں نے پوچھا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔'' پاکستانی اچار لائی ہو؟ بڑا جی چاہتا ہے۔ وہ شرما کے بولی۔خاتون نے میرا منہ بھی کرارا کر دیا۔گھی یا اچار وغیرہ لانے پر تو پابندی ہے البتہ میرے پاس کچھ دوسری چیزیں ہیں آپ وہ لینا چاہیں تو لے سکتی ہیں''۔ (۲)

اس سفرنامے میں ایک چیز کھٹکتی ہے کہ کئی جگہ پر املا کی غلطیاں ہیں اور بعض جگہ اشعار غلط درج ہیں مثلاً اقبال کا مشہور شعر

'' حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں ، کو یوں لکھا ہے
زندگی ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں''

بہرحال مجموعی طور پر یہ سفرنامہ عقیدت و محبت کی ایک دلآویز داستان ہے۔

۱۔ افضل علوی دیباچہ زہے نصیب ص۔ ۹
۲۔ زبیدہ حسی بحوالہ سابقہ ص۔ ۸۴

بلقیس ریاض (سفر حرمین)

زندگی کے ان گنت رنگوں یں سے کوئی گوشہ اور کوئی رنگ جس طرح سے مصنف کو متاثر کرتا ہے۔ وہ اپنے انداز میں اس کو بیان کر دیتا ہے اور یہی حسن بیان اس میں تنوع اور انفرادیت کا باعث بنتا ہے لیکن کونسا لمحہ، کونسا رنگ اہم ہونے کی منزل طے کرتا ہے۔ یہ اس داتا کا کام ہے کہ جسے چاہے اسے نواز دے۔

بلقیس ریاض کا سفرنامہ تمنا کی تکمیل ہے کہ خدا نے انہیں کار خیر کے لئے آخر کار ان کی خواہش کے لئے چنا۔ اور انہیں فیضان منزل بھی نصیب ہوئی۔ راستے کی مشکلات یا قیام کی مشکلات وہ رضائے خداوندی اور حب رسولؐ کے لئے برداشت کرتی ہیں کیونکہ ان کا دل خارج سے نکل کر داخل کا سفر کر رہا ہے۔ یہاں پر بھی ودنیاوی خواہشات یا آسائشات کوئی معنی ہیں رکھتے۔ یہاں صرف عمل کو دخل ہوتا ہے۔ اور عمل بھی وہ جو صرف خدا کی خوشنودی کے لئے کیا جاتا ہے۔ اس میں دکھاوے کا کہیں ذرا سا بھی دخل نہیں ہوتا۔ وہاں صرف فیوض و برکات حاصل کی جاتی ہیں اور اس سعادت کے نصیب ہونے پر شکر خداوندی۔

سفر حرمین کا کوئی دیباچہ یا پیش لفظ نہیں ہے۔ سنگ میل پبلی کیشنز نے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا ہے۔

بلقیس ریاض اس سفرنامے میں ان تمام مقامات اور امور کا ذکر کرتی ہیں جو ان کے نزدیک عام لوگوں کے علم میں نہیں ہوتے ہیں اور ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگ وہاں پر اگر جائیں تو ان کو اس کے بارے میں علم ہوتا کہ انہیں کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس لئے وہ عمرہ کے لغوی معنی سے لیکر اس کے تمام مراحل کا ذکر کرتی چلی جاتی ہیں۔ مثلاً عمرہ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

> ''عمرہ کا لغوی معنی زیارت ہے اور اس سے مراد بیت اللہ شریف کا دیدار اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک بلاوہ نہ ہو کوئی انسان اس مقدس سرزمین میں قدم نہیں رکھ سکتا''۔ (۱)

چونکہ بلقیس کا اصل مقصد اس سفرنامے کا یہ ہے کہ معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ اس لیے آگے وہ عمرہ کے ضروری عوامل کا ذکر کچھ یوں کرتی ہیں۔

> ''عمرہ میں چار ضروری عوامل ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میقات سے پہلے احرام باندھنا، دوسرا

۱۔ بلقیس ریاض سفر حرمین سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۹ ص۔ ۲۴

عمل بیت اللہ کا طواف کرنا، تیسرا صفا و مروہ کی سعی کرنا اور چوتھا سر کے بال کٹوانا''۔(۱)

اس کے بعد وہ حجر اسود اس کے سات چکر ہر چکر کی دعا کے بارے میں جو حکمات دوران طواف پڑھے جاتے ہیں۔یعنی تیسرا کلمہ اور پر طواف ختم کرنے کے بعد مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز دعا اور آب زم زم تک کی تفصیل لکھتی ہیں۔ صفا و مروہ پر دعائیں اور پھر سر کے بال کٹوائیں تا کہ جس حاجی کو علم نہیں ہے وہ اس کی تمام تفصیل کو جان لے۔

یہی وہ جگہ ہے کہ جہاں انسان کو صحیح معنوں میں اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے کہ ندامت سے آنسو چھلک چھلک جاتے ہیں کہ ہمارے دامن رجال میں ہماری جھولی تو گناہوں سے بھری ہوئی ہے لیکن پھر یہ احساس کہ کچھ تو ہے کہ جس کی وجہ سے اللہ تعالی نے یہ کرم کیا ورنہ ہم اس مقدس سرزمین پر کیونکر اتنے مسائل کے باوجود قدم رکھ سکتے تھے۔ اور اسی احساس ندامت میں اللہ کی رحمت کا کا جوش مارتا سمندر اپنی آغوش مین لے لیتا ہے اور ہم اس کی رحمت اور بخشش کے امیدوار بن جاتے ہیں۔

''کسی اور مذہب میں انسانوں کا اتنا بڑا اجتماع نہیں ہے شاید ہی کوئی ایسا لمحہ ہوگا کہ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر کعبہ شریف کے اردگرد طواف نہ کر رہا ہو............... دنیا کے تمام کلمہ پڑھنے والے بنا کسی امتیاز اور تفریق کے شانوں کے ساتھ شانے ملائے ہوئے رب کریم کے روبرو پیش ہوتے ہیں اور عاجزی سے گڑگڑاتے ہیں اور مختلف زبانوں میں خدا سے بخشش کی دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ ایک دیدنی کا سماں ہوتا ہے''۔ (۲)

انسان جب تک زندہ ہے خواہ وہ اللہ تعالی کے گھر میں حاضر ہو، یہ دنیاوی خواہشات اسے کسی طور چین نہیں لینے دیتیں۔ خانہ کعبہ کے اندر جو انسان دنیا سے بے نیاز ہو کر صرف اور صرف اللہ کی رحمت کا امیدوار رہتا ہے وہی انسان انتہائی عاجزی وانکساری کے بعد جب جدہ کے بازاروں میں نکلتا ہے تو پھر دنیا کی چمک اس کو اسیر کر لیتی ہے۔ مثلاً

''نہ چاہتے ہوئے بھی ہم لوگ باہر کی جانب لپکے............... حرم شریف سے باہر آتے ہی مکہ کی جگمگاتی دکانوں نے ہمیں اپنی طرف کھینچ لیا............... چند لمحوں پہلے کسی چیز کی طلب نہیں تھی مگر بازار سے گزرتے وقت فرشتوں نے خالی پیکروں میں ڈھلنا شروع کر دیا............... دنیاوی ہوس آن کی آن میں جاگ اٹھی''۔ (۳)

۱۔ بلقیس ریاض سفر حرمین ص۔ ۲۴
۲۔ ایضاً ص۔ ۶۶
۳۔ ایضاً ص۔ ۲۷

بلقیس ریاض منی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہاں حج کے دنوں میں بڑی رونق ہوتی ہے۔ شہر کے باہر خیمے نصب ہوتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی دکانیں لیکن بعد میں وہاں ویرانی چھا جاتی ہے لیکن وہ اس ویرانی کے ساتھ منی کی تاریخ کو دھراتی ہیں اور ہماری آنکھوں میں وہ سنہری دور یاد دلاتی ہیں کہ جب باپ بیٹے کی قربانی دینے کے لئے جا رہا تھا۔

''ہماری موٹر منی کی سڑک پر رواں دواں تھی، ویران سا شہر............ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی .... شاید یہ وہی شہر تھا جہاں ابلیس نے حضرت ابراہیمؑ کو تین مرتبہ بہکانے کی کوشش کی تھی۔ جب وہ اپنے بیٹے اسمٰعیل کی انگلی پکڑے اس راستے پر جا رہے تھے تو شیطان نے ورغلاتے ہوئے کہا تھا، اے ابراہیم بیٹے کی قربانی دینا کہاں کی عقلمندی ہے .... خدا کو کسی کی قربانی کی ضرورت نہیں ہے .... واپس لے جاؤ بیٹے کو .... لیکن ابراہیم پر شیطان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے اسمٰعیل کو بہکاتے ہوئے کہا کہ لگتا ہے تمہارے باپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے .... اتنے پیارے بچے کو قربان کرنے جا رہا ہے .... بیٹے بھاگ جاؤ۔ یہ شخص ضرور پاگل ہو چکا ہے۔ .... دیکھتے کیا ہو بھاگ جاؤ .... جان بڑی قیمتی ہے۔ بچا لو اپنے آپ کو .... چھڑا لو ہاتھ مگر اسمٰعیلؑ بھی شیطان کے بہکاوے میں نہیں آیا'' (۱)

آپ کو خاتم النبیینؐ بنا کر بھیجا گیا۔ اور ان کا پیغام تمام آفاقی حدود و قیود سے آزاد تھا۔ حضورؐ خاص طور پر عورتوں کے لئے بہت ہی زیادہ رحمت اور سکون کا پیغام لیکر آئے۔ عورت اسلام سے پہلے صرف اور صرف لونڈی یا ایک ایسی عورت تھی جو جانوروں سے بھی بدتر تھی لیکن اسلام نے نہ صرف اسے اعلیٰ مقام پر فائز کیا بلکہ ماں کے روپ وہ تقدس دیا کہ کسی اور مذہب میں ماں، بہن بیوی اور بیٹی کے لئے وہ عزت و احترام نہیں ہے جتنا کہ ہمارے اسلام میں ہے۔
بلقیس ریاض لکھتی ہیں۔

''ظہور اسلام سے قبل دنیا بھر میں خواتین کی حالت نہایت ہی قابل رحم تھی۔ ہندومت کے لوگ عورت کا مستقل وجود تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے نزدیک عورت کا وجود مرد کے

۱۔ بلقیس ریاض بحوالہ سابقہ ص۔ ۴۶۔ ۴۷

تابع ہے۔ اسی لیے شوہر کی وفات کے بعد اس کی بیوی کو آگ میں جلا دیا جاتا تھا اور یہ ستی کی رسم کہلاتی تھی۔ ہندوؤں میں آج بھی بیوہ عورت کو منحوس اور پاپ تصور کیا جاتا ہے اور اکثر اس کو گھر کے باہر رکھا جاتا ہے تاکہ وہ گھر والوں سے دور رہے۔ ہندوستان میں عورت کے لئے حصول علم کی ممانعت تھی۔ مصر اور ہندوستان میں حسین دوشیزاؤں کو بتوں کے نام پر قربان کیا جاتا تھا۔ مصر میں جب دریائے نیل چلنا بند ہو جاتا تو وہاں کے لوگ کسی حسین دوشیزہ کو دریا کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے'' (۱)

لیکن اسلام نے عورت کو اعلیٰ مقام دیا اور ان کو نہ صرف جائیداد میں حصہ دیا بلکہ ان پر تعلیم کے دروازے بھی کھول دیئے۔

اگلا باب خواتین کے حقوق و فرائض تعلیمات نبوی کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ اس میں عورت کے نہ صرف حقوق کا تعین کیا گیا ہے بلکہ اس کے فرائض بحیثیت عورت ماں اور بیوی کے بہت زیادہ مؤثر طریقے سے بنائے گئے ہیں۔ مثلاً بیوی کے فرائض کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''عورت کا پہلا فرض ہے کہ خاوند کی مکمل اطاعت کرے کیونکہ سرکار دو عالم کی ایک حدیث واضح ہے کہ اگر خدا کے بعد کسی اور کو سجدہ جائز ہوتا تو وہ خاوند کو کرتی '' (۲)

لیکن عورت صرف خدمت گزاری کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں دونوں یکساں اور مساوی طور سے شریک ہیں۔ اس لیے خدا کی نگاہ میں ان کا مرتبہ اور مقام بالکل مساوی ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے۔

'' اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں، وہ اچھے کام کرنے کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ زکواۃ دیتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان پر اللہ رحم کرے گا۔ بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے''۔ (۳)

لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہوگا جب عورتیں اپنے فرائض پوری طرح ادا کریں گی۔

آخری عنوان میں محسن نسواں کے عنوان سے ہے۔

اس میں خاص طور پر اس امر پر اظہار کیا گیا ہے کہ حضورؐ سے پہلے عورتوں کے کسی بھی قسم کے کوئی حقوق نہیں تھے لیکن آپؐ کے بعد نہ صرف عورتوں کو حقوق ملے بلکہ معاشرے میں بھی ان کا مقام بلند ہوا اور وہ بھی باعزت طور پر

۱۔ بلقیس ریاض بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۳
۲۔ ایضاً ص۔ ۱۰۶
۳۔ ایضاً ص۔ ۱۰۷

معاشرے میں متعارف ہوئیں۔اس سے پہلے تو ماں کے علاوہ بیٹی باعث شرم تھی۔ اور اسے زندہ زمین میں گاڑھنا باعث ندامت نہیں تھا بلکہ ذلت ورسوائی اس چیز میں تھی کہ بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ بلقیس لکھتی ہیں۔

''ازل سے عورت چکی میں پستی رہی اور مسلسل استحصال، بربریت اور ظلم کا شکار رہی۔ ایسے عالم میں سرور کائناتؐ کا ظہور ہوا۔ چنانچہ سلمان ندوی نے اپنی کتاب سیرت النبی میں لکھا ہے کہ

''عورتوں کی حالت نہایت ہی خراب تھی۔ ایسی صورت کہ ترکہ میں ان کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ عربوں کا قول تھا کہ میراث اس کا حق ہے جو تلوار پکڑ سکتا ہے''۔ (۱)

ایسے عالم میں اللہ تعالی نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا تا کہ پوری دنیا پر بھی اور عورتوں پر بھی رحم ہو۔حضور نے عورت اور مرد کے حقوق میں مساوات قائم کرتے ہوئے ایک نئے معاشرے کو جنم دیا۔ اس طرح عورت کو باضابطہ طور پر وراثت کا حق دار قرار دیا گیا اور حق مہر کی ادائیگی بھی لازمی قرار دی گئی۔ بلکہ طلاق کا حق بھی دیا گیا کہ عورت اگر چاہے تو اپنے خاوند سے علیحدگی بھی اختیار کرسکتی ہے۔

ویسے مجموعی طور پر دیکھا جائے تو آخری باب سفرنامے کے ضمن میں شمار نہیں ہوتے ہیں کیونکہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا ذکر زیادہ ہے۔ اور عمرہ کے دوران بھی آنکھوں دیکھے حال میں بھی تاریخ کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔ اسلوب بیان کے لحاظ سے بھی ہمیں اس میں کوئی خاص چیز نظر نہیں آتی۔ یہ بات ضروری ہے کہ ان کی تاریخی معلومات اور خاص طور پر اسلامی تاریخ کے بارے میں معلومات خاصی اچھی ہیں اور قرآن مجید کی آیات کا حوالہ بھی درست ہے لیکن بحیثیت مجموعی ایک عورت ہونے کے ناطے انہوں نے عمرہ کے دوران اور آخری بات میں ہر چیز کو نسائی نقطہ نظر سے دیکھا اور یہ بیان کیا کہ عورت بہرحال افضل و برتر ہے اور عمرہ کے بارے میں بھی انہوں نے مرحلہ وار تمام معلومات دی ہیں۔ اس طرح یہ ایک تاریخی اور معلوماتی سفرنامہ ہے۔جس میں مشاہدہ بھی ہے اور مطالعہ بھی۔جس میں قلبی واردات بھی ہے اور دیدہ ودل کے لئے روشنی کا سامان بھی ہے۔خاتون ہونے کے ناطے وہ وہاں کی خواتین کے مخصوص انداز اور پردے کے انداز بھی خاصا مشاہدہ کرتی ہیں اور ان کے برقعے کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''کالے سفید برقعے پہنے جو کہ خاص عربی سٹائل کے تھے .... سارا جسم برقعوں میں چھپا تھا اور صرف منہ ننگا تھا۔عربیوں کی کوئی بات اچھی نہ لگی تھی لیکن ایک بات نے بے

۱۔ بلقیس ریاض بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۲!!

حد متاثر کیا تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو پانچ وقت کی نماز مسجد نبویؐ میں پڑھواتے ہیں .... یہ نہیں دیکھتے کہ بچے چھوٹے ہیں۔ نماز با جماعت میں رو بھی سکتے ہیں۔ اس بات کا خیال ان کے دل میں آتا ہی نہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بڑے ہونے کی عمر تک وہ پکے نمازی بن جاتے ہیں''۔(۱)

اسلام نے زندگی کے ہر موقع پر نئی اساس پیدا کی ہے۔ اور اس نئی اساس کی وجہ سے خدا کی رحمت بھی آشکار ہوتی ہے اور اس رحمت میں حب رسولؐ کی وجہ سے نئی معنویت اور نیا مفہوم بھی پیدا ہوا ہے۔ عشق بغیر وصل کے اور محبت بغیر عمل کے ادھوری رہتی ہے اور ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بچوں سے کسقدر محبت تھی اور وہ کسطرح انہیں ہمیشہ پیار ومحبت سے نہ صرف دیکھتے تھے بلکہ اوروں کو بھی تلقین کرتے تھے۔ تو پھر وہ خاص جگہ جہاں پر مقام رسولؐ ہے۔ کسطرح ممکن ہے کہ بچوں کی معصوم فرشتوں جیسی آواز نہ آئے۔ خواہ وہ رونے کی ہو یا چہکنے کی۔ بلقیس صاحبہ پوچھتی ہیں کہ

''مسجد نبوی میں بچوں کو لیجانے کی ممانعت نہیں ہے''

''نہیں جی .... یہاں پر کسی قسم کی روک ٹوک نہیں۔ آپ جب چاہیں بچے اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں کیونکہ ہمارے رسولؐ بچوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اس لیے یہاں کی حکومت نے بچوں پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی ہے .... اگر کبھی یہ لوگ کوشش بھی کریں یا پابندی لگانے کی تو ان کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ لوگ ڈر کے مارے کچھ نہیں کہتے۔'' (۲)

کتنی خوبصورت بات ہے کہ جو اللہ کے رسولؐ کو پسند ہے اگر اس بات سے انحراف کیا جائے تو نقصان ہوتا ہے۔ ارض مقدس میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جہاں اللہ کے غفور والرحیم ہونے کا مکمل یقین ہو جاتا ہے۔ اطاعت کے سفر میں محبت شامل نہ ہو، تڑپ شامل نہ ہو تو سفر رائیگاں ہو جاتا ہے کیونکہ حج ایک زندہ سوچ اور زندہ مرکز کی جانب سفر ہے۔ اس سفر کی گرد صرف آنسوؤں سے دھوئی جاسکتی ہے اور دل کی کھوٹ اور میل صرف اشکوں سے، نیت سے ممکن ہے دور ہو سکے ورنہ ممکن نہیں ہے۔

۱۔ بلقیس ریاض بحوالہ سابقہ ص۔ ۵۸

۲۔ ایضاً ص۔ ۵۹

بلقیس ریاض نے وہاں ایک ایسی خاتون کو دیکھا جو مسلسل رو رہی تھی اور پوچھنے پر بتاتی ہیں کہ ان کے دل میں کبھی خواہش نہ تھی کہ وہ عمرہ کرے لیکن اچانک ان کے شوہر اور جٹھانی کے ساتھ ان کا بھی پروگرام بن گیا۔ لیکن ان کی ہمسائی جو ہر لمحہ بے قرار رہتی تھی اسے لندن جانا پڑا اور واپسی پر وہ سعودی عرب کا ویزا لگوا کر بڑی بے چینی اور بے قراری کے ساتھ جدہ کا انتظار کرتی ہے اور آخرکار جب جدہ ہوائی اڈے پر اترنے والے ہوتے ہیں کہ اسے شدید درد گردہ ہوتی ہے اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان آ جاتی ہے۔ تا کہ بروقت طبی امداد مل سکے۔ اس بے چاری کا بلاوا نہیں تھا اس لیے اسے واپس جانا پڑا۔

'' میں اس لیے رو رہی ہوں کہ اس خاتون کی نسبت میرے دل میں کبھی کوئی خواہش اتنی شدت سے نہیں جاگی تھی مگر میں سوچتی ہوں کہ اللہ میاں اور میرے پیارے نبی نے اس گناہ گار کو کیسے بلا لیا.............. میں شرمندگی سے نہیں رو رہی ہوں۔ اس خاتون کی باتوں سے میں حیران رہی تھی .... اور سوچ رہی تھی کہ اللہ کی ذات کتنی بے نیاز ہے جس کو چاہے اپنے کرم سے نواز دے '' (۱)

آخر میں انہوں نے اصلاح معاشرہ میں خواتین کا کردار تعلیمات نبوی کی روشنی میں اور اس میں انہوں نے بتایا کہ جب حضورؐ ولادت باسعادت ہوئی تو آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور دنیا کا کونہ کونہ آپ کے نور اور اخلاق حسنہ سے روشن ہو گیا۔ حضور کی ذات کو رحمۃ اللعالمین اور فخر دو جہاں اور سب سے بڑھ کر محسن انسانیت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ بلقیس ریاض کا اسلوب بڑا خوبصورت اور جاندار ہے۔ مثلاً

'' حضور نے فرمایا کہ عرفاں میرا سرمایہ ہے۔ عقل میرے دین کی اصل ہے۔ محبت میری بنیاد ہے۔ شوق میری سواری ہے۔ ذکر الٰہی میرا مونس ہے۔ اعتماد میرا خزانہ ہے۔ حزن و میرا رفیق ہے۔ علم میرا ہتھیار ہے۔ صبر میرا لباس ہے۔ خدا کی رضا میری غنیمت ہے۔ عاجزی میری وجہ اعزاز ہے وزہد میرا پیشہ ہے۔ یقین میری طاقت ہے۔ صدق میرا سفارشی ہے۔ اطاعت میرا بچاؤ ہے۔ جہاد میرا کردار ہے او رمیری انکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے ''۔ (۲)

یوں تاریخ اسلام، معاشرت اور تہذیب کا خوبصورت سنگم یہ سفرنامہ ہے۔

۱۔ بلقیس ریاض بحوالہ سابقہ ص۔ ۷۷

۲۔ ایضاً ص۔ ۹۳

سیدہ حمیدہ فاطمہ (لاہور سے دیار حبیب تک)

اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت ہر مسلمان پر فرض ہے لیکن اگر کسی کے دل سے یہ محبت ابھرے اور اس کے در پر حاضری کی تڑپ جاگے تو اس پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی نظر کرم بھی ہو جاتی ہے۔ اور حاضری کے اسباب بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتے ہیں۔ جذبے کی آنچ سے معمور یہ سفرنامہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ آغاز میں حمیدہ فاطمہ صاحبہ لکھتی ہیں۔

> ''میں نے لاہور سے دیار حبیب'' کتاب کے پہلے حصے کو اپنی ذاتی جذبات و احساسات کا موضوع بنایا ہے۔ یعنی اس سفر میں جتنے بھی مقامات آئے ہیں۔ اور اس حصہ میں مقامات سے جتنے بھی تاریخی واقعات وابستہ ہیں۔ میں نے پیش کئے ہیں اور اس انداز سے تحریر کرنے کی کوشش کی ہے کہ قاری کے سامنے مقامات مقدسہ کی منظر کشی عیاں ہو جائے۔ اس طرح مناسک حج ادا کرتے وقت میرے دل پر جو کیفیتیں طاری ہوئیں انہیں بھی من و عن تحریر کرنے کی کوشش کی''۔ (۱)

کتاب کے دوسرے بقیہ حصے کو ارکان حج کی تفصیلات، حج کی اصطلاحات، حج کے فضائل، حج کی اصل روح اور اس کا بنیادی مقصد مقدس مقامات مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی معلومات پر تقسیم کیا گیا ہے''۔

اس سفرنامے کا دوسرا عنوان جسے (دیباچہ) کے عنوان سے بھی لکھا جا سکتا ہے اس کا نام اس کا داخلی سفر ایڈیٹر روزنامہ مشرق لاہور نے لکھا ہے۔ سرور مجاز لکھتے ہیں۔

> ''لاہور سے دیار حبیب کے صرف اول سے آخر تک کا مطالعہ کرنے سے یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ محترمہ نے برس ہا برس پر پھیلی ہوئی حسرتوں، آرزوؤں اور تمناؤں کے احساس کا یہ سفر تا دم تحریر جاری رکھا۔ اس احساس کے حوالے سے ان کی یہ خواہش رہ جاتی۔ عظمتوں کی حامل ہے اور یہ داخلی سفر لافانی یادوں سے ذہنوں اور دلوں کو ہمیشہ منور رکھے گا۔ اس سفر کے آغاز سے انجام تک کے عرصے کی تمام مصروفیات کی روشنی میں جتنے عنوانات سے سجایا گیا ہے اس سے بھی عقیدت و محبت شیفتگی کا پتہ چلتا ہے۔'' (۲)

۱۔ سیدہ حمیدہ فاطمہ لاہور سے دیار حبیب تک الحمرا پرنٹرز لاہور ۱۹۸۴ ص۔ ۷

۲۔ سرور مجاز دیباچہ لاہور سے دیار حبیب تک ص۔ ۱۰

اس سفرنامے کا آغاز سورۃ آل عمران کی آیات مبارکہ کے ترجمہ سے کیا گیا ہے اور پھر وجد کی کیفیت ہے کہ دل ونگاہ کی سرشاری ہی ختم نہیں ہوتی۔ تخیل اس مادی دنیا سے نکال کر ایسی روحانی دنیا کی سیر کرواتا ہے کہ جہاں عشق سے ساری منازل طے ہوتی ہیں۔ خرد کہیں دور رہ جاتی ہے فاطمہ صاحبہ مکہ کی تاریخ، نقشہ لمبائی، باب ابراہیم، مسجد الحرام اس کے دروازے، اس کی توسیع کس کس دور میں ہوئی سب کا ذکر کرتی ہیں۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اس سفرنامے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''سیدہ فاطمہ کا حجاز نامہ لاہور سے دیارِ حبیب تک حد درجہ مختصر تحریر ہے لیکن ناپ تول میں پوری انتہائی پر مغز اور نک سک سے درست ہے۔ سیدہ حمیدہ فاطمہ نے اپنے بیان سے متعلق بیس عنوانات قائم کئے اور انہیں تک محدود رہیں۔ عنوانات کی جدت اور تنوع ملاحظہ ہو''۔ پہلا وہ گھر، آرزو برآئی، سنہرے سفر کا آغاز، حجر اسود کو بوسہ، ہاجرہ کا اضطراب یاد آ گیا اے اللہ میں حاضر ہوں''۔(۱)

فاطمہ صاحبہ نے کتنے خوبصورت اور دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جانے والے انداز میں عنوانات کی تقسیم کی ہے حج کے سفرنامے اس ضمن میں آتے ہیں کہ یہاں آپ جولانی قلم کی بجائے جولانی دل اور روح کی سرشاری دکھاتے ہیں کیونکہ یہ وہ قلبی واردات ہے کہ جسے ہر شخص وا اپنے اپنے ظرف کے مطابق اور توفیق اللہ کے مطابق محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ جب مسلمان حج کے ارادے سے گھر سے نکلتا ہے تو اس کے تاثرات عام سیاح سے مختلف ہوتے ہیں کیونکہ یہ سفر عام سفر بھی نہیں ہے۔ یہ سفر سفر دار المصطفی ہے اور سیاح اگر عرب کی سیاسی، سماجی، تمدنی اور تہذیبی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر بھی کرتا ہے تو تقدس واحترام ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔

فاطمہ صاحبہ کا کمال یہ ہے کہ جذبوں کے بیان پر عبور رکھتی ہیں اور ان شدتوں کو بھی بیان کرتی ہیں جو انہوں نے وہاں کی فضاؤں میں محسوس کی ہیں۔ اس سفرنامے کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ مختصر ہونے کے باوجود فاطمہ صاحبہ جس منزل سے بھی گزری ہیں وہاں کی پوری تصویر بمعہ تاریخی حوالے کے درج کی ہے۔ اور اس میں تحقیق بھی ہے اور عقیدت بھی۔ اس لحاظ سے یہ ایک مفید اور معلوماتی سفرنامہ ہے۔ مثلاً حجر اسود کے بارے میں لکھتی ہیں۔

> ''خانہ کعبہ کے جنوب مشرقی گوشے کا نام حجر اسود ہے اس جگہ چاندی کے خول کے اندر وہ

۱۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ اسلام آباد ۱۹۸۷ ص۔ ۳۷

متبرک اور مقدس پتھر نصب ہے۔ جسے حجر اسود کہتے ہیں۔ خانہ کعبہ کے بیرونی گوشے ارکان کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ شمال گوشے کو رکن عراقی کیونکہ یہ عراق کی سمت ہے۔ جنوب مشرقی کا نام رکن حجر اسود ہے۔ یہاں حجر اسود نصب ہے۔ مقابل گوشہ کو رکن یمانی کہ یہ یمن کی جانب اور چوتھے کا نام شامی ہے کہ یہ شام کی طرف واقع ہے۔ حجر اسود سیاہی مائل کا ایک بیضوی پتھر ہے اور حجر اسود کے معنی بھی سیاہ پتھر کے ہیں''۔(۱)

صفا و مروہ کے دوران شاید خاتون ہونے کے ناطے کہ وہ عورت کی کیفیت کو اور اس تکلیف کو زیادہ محسوس کر سکتی ہے جو بی بی ہاجرہ کو تھی یا ممتا کے وہ جذبات جو ماں کے بچے کے لئے ہوتے ہیں کہ وہ اس کے لئے اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا دیتی ہے۔ اس وجہ سے وہ بی بی ہاجرہ کا اضطراب بیان کرتے ہوئے خاصی جذباتی ہو جاتی ہیں اور پوری تاریخی تفصیل کے ساتھ اس واقعے کو بیان کرتی ہیں۔ اس کے بعد ہی وہ مقام آتا ہے کہ جس کی طلب حاجیوں کو کشاں کشاں ہوئے حبیب اور پھر در حبیب کی منازل طے کرنے میں معاون و مددگار ہوتا ہے کہ جہاں دل کو درد محبت سے بھر دیا جائے اور راستے کی دشواریاں اور مشقتیں اذیت کی بجائے لطف پیدا کر دیتی ہیں۔ پاؤں کے چھالے اور سر کی گرمی آتش عشق کو دو آتشہ کر دیتی ہے کہ جہاں بے خوابی اور بیداری بے کار نہیں ہے بلکہ ہر قدم تمنا کا قدم ہے اور نظارہ شوق کا نظارہ ہے۔ ہر لطف لطف دیگر ہے اور ہر مقام مقام عشق ہے۔

سیدہ فاطمہ اپنے دل کی کیفیات کا اظہار اس پیرائے میں کرتی ہیں۔

'' یہ وہ یادگار دن تھا جب میرے دل میں شوق اور جستجو کے جذبات موجزن تھے۔ جو لہروں کے اضطراب کی طرح بڑھتے چلے جاتے تھے۔ دربار حبیبؐ جانے کا لمحہ روضہ رسول پر حاضری دینے کی ساعت اور میرے دل ذرا صبر سے کام لے۔ یہ بے خودی کا مقام نہیں ہوش کی جگہ ہے۔ دیکھ کہیں صبر کا دامن ہاتھ سے وہ چھوڑ دینا۔ مدینہ منورہ کے در و دیوار اور گلیوں کی زیارت کہیں مجھے بے خود نہ کر دے۔ میری اضطرابی کیفیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میرا دل اچھل کر باہر آ رہا تھا۔ ایک رشک آمیز خوشی نے مجھے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا''۔(۲)

۱۔ سیدہ حمیدہ فاطمہ بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۷

۲۔ ایضاً ص۔ ۳۵

ڈاکٹر انور سدید اس سفرنامے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''سیدہ حمیدہ فاطمہ کا حج نامہ لاہور سے دیار حبیب تک میں اگرچہ ذاتی جذبات و احساسات کو پیش کرنے کی پوری کاوش نظر آتی ہے لیکن یہ عہد قدیم کے روائتی حج ناموں کے سلسے ہی کی ایک سنہری کڑی نظر آتا ہے اور اس میں حالات سفر کے علاوہ ارکان حج، اصطلاحات اور مقدس مقامات کی تفصیلات پیش کرنے کی زیادہ کوشش کی گئی ہے اور اسے معلوماتی بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تاہم جہاں انہوں نے تاریخ کے بطون میں سفر کیا ہے وہاں ایک لطافت کے ساتھ حزن کی کیفیت بھی پیدا ہوئی ہے''۔ (۱)

اس سفرنامے کے آغاز میں فاطمہ صاحبہ لکھتی ہیں کہ میں نے حج کے دوران مدینہ منورہ کے گوشے گوشے اور چپے چپے کو مرکز نگاہ شوق بنایا ہے۔ اور میں اسی شوق دیوانگی کے ساتھ جو کچھ محسوس کیا ہے اسے اس سفرنامے میں لکھ دیا ہے۔

سیدہ فاطمہ صاحبہ مسجد نبوی کی تفصیل اس کی توسیع کس کس خلیفہ کے دور میں ہوئی اور کب اس کے میناروں کے رنگ کیا تھا۔ سب کی تفصیل بڑی خوبصورتی سے بیان کرتی ہیں۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ کہتی ہیں کہ ہمارے اکثر بزرگ عقیدے واحترام کی وجہ سے حج کرنے جاتے ہیں لیکن حج کی اصل فضیلت کیا ہے اس سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ وہ حج کی فضیلت بیان کرتی ہیں۔

''حج کا اجتماع ایک ایسا اجتماع ہے جس نے مسافتوں کو قریب کر دیا ہے۔ رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو یکسر مٹا کر رکھ دیا ہے۔ چھوٹے اور بڑے کی تمیز کو باطل قرار دے دیا۔ عربی کو عجمی پر اور گورے کو کالے پر کوئی تفریق نہیں رہنے دی۔ ایک ہی لباس ایک ہی انداز، ایک ہی پکار، ایک ہی کلمہ، ایک ہی دل، ایک ہی طلب، ایک ہی مقصود، ایک ہی منزل، ایک ہی عقیدہ، ایک ہی خیال، ایک ہی نظریہ اس اجتماع میں اسلامی مساوات کے بھائی چارے ہمت واخوت اور بندگی کے وہ تمام مظاہر دیکھے جا سکتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کا حسن ہیں''۔ (۲)

اس کے بعد حج کی اصطلاحات کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کیونکہ فاطمہ لکھتی ہیں کہ ہم میں سے اکثر لوگوں کو یہ علم نہیں ہوتا کہ حج کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ معلومات خاص طور پر ان لوگوں کے لئے ہیں کہ جو ناواقف ہیں اور ان کو یہ پڑھ کر واقفیت حاصل ہو اور عوام کو اس سے فائدہ پہنچے۔

۱۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص۔ ۵۲۷

۲۔ سیدہ حمیدہ فاطمہ بحوالہ سابقہ ص۔

۳۔ ایضاً ص۔ ۴۸

پھر وہ احرام، طواف، تلبیہ، سعی، رمی اور ضروری مسائل کا ذکر کرتی ہیں۔

اس کے بعد وہ طواف کعبہ کا ذکر کرتی ہیں لیکن یہ ذکر اس اہتمام کے ساتھ ہے کہ وہ ہر چکر کی اہمیت وافادیت کے ساتھ ساتھ طواف کعبہ کے ساتوں چکر کی دعائیں بھی تحریر فرماتی ہیں تا کہ اگر کوئی حاجی چاہے تو صرف اس کی مدد سے تمام مناسک حج کو ادا کر سکے اور پھر مقدس مقامات کا ذکر ہے جن میں خانہ کعبہ، مقام ابراہیم، مساجد، تمام خلفائے راشدین کا مقام اور احوال، غسل خانہ کعبہ کے ساتھ ساتھ تاریخ غلاف کعبہ کی بھی تفصیل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک خاص اہم بات یہ ہے کہ سیدہ حمیدہ فاطمہ صاحبہ کا نقطہ نظر اصلاحی ہے مثلاً

> ''اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہ اور عائشہ کے مقدس شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو۔ اگر اولاد والے ہو تو فاطمہ کے باپ اور حسن وحسین کے پاک نانا کا حال پوچھو، اگر تم دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو۔ غرض تم جو کچھ بھی ہو اور کسی حال میں ہو تمہاری زندگی کے لئے نمونہ تمہاری سیرت کی درستی واصلاح کے لئے سامان تمہارے ظلمت خانہ کے ہدایت کا چراغ، راہنمائی کا نور محمد عربی کی جامعیت کبری کے خزانہ میں ہمہ وقت اور ہمدم مل سکتا ہے۔ (۱)

یہ کتاب یعنی سفر نامہ واقعی زائرین کی راہنمائی کے لئے لکھا گیا ہے۔ خاص طور پر اس کا طرز بیان سادہ اور عام فہم ہے۔ جس کی وجہ سے حج پر جانے والے اگر اس کو پڑھ لیں تو مناسک حج اور وہاں کے عمومی حالات سے اچھی طرح واقف ہو سکتے ہیں اگر چہ سفر نامہ بہت ضخیم نہیں ہے لیکن اس کے باوجود نہایت مفید ہے اور کارآمد بھی مثلا

> ''طواف سے قبل احرام کی چادر کو دائیں بغل کے نیچے اسطرح نکال لیتے ہیں کہ دایاں مونڈھا کھلا رہتا ہے پھر دوسرے سرے کو بائیں کندھے پر ڈال لیتے ہیں اور اس عمل کو اصطباع کہا جاتا ہے۔ یہ عمل صرف مردوں کے لئے ہے۔ عورتوں کے لئے نہیں۔ طواف کعبہ میں ایک پھیرے یا چکر کو شوط کہتے ہیں۔ ہر شوط کے بعد دوسرا شوط شروع ہوتا ہے''۔ (۲)

حضور پاکؐ کی ذات گرامی سے محبت مال اولاد اور جان سے زیادہ ہونی چاہیے۔ اس کی ہر مسلمان مرد اور عورت کو ضرورت ہے کہ یہ زندگی فانی ہے۔ بقا صرف اور صرف اس کی ذات کو ہے کہ جس نے ہمیشہ رہنا ہے۔ اور یہ کائنات ارضی اس کے حکم کے مطابق چلتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ حضور کی ذات کامل واکمل نمونہ ہے۔

۱۔ سیدہ حمید فاطمہ بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۱

۲۔ ایضاً ص۔ ۹۸

سیدہ فاطمہ صاحبہ جامعیت کبری کے عنوان سے لکھتی ہیں۔

''حضور نبی رحمت، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی میں اور آپ کی حیات طیبہ میں آدم کا خلق شیثؑ کی معرفت حضرت نوح کی شجاعت، ابراہیمؑ کی دوستی، اسماعیلؑ کی زبان، اسحاقؑ کی رضا، صالحؑ کی فصاحت، لوطؑ کی حکمت، موسیٰؑ کی سختی، ایوبؑ کا صبر، یونسؑ کی اطاعت، یوشع داؤدؑ کی آواز، الیاسؑ کا وقار، یحییٰؑ کی پاک دامنی اور عیسیٰؑ کا زہد اور دیگر تمام پیغمبروں کے اخلاق سموئے ہوئے ہیں۔ حضور نبی کریمؐ کی حیات طیبہ پر نظر دوڑاؤ۔ جامعیت کی حقیقت کا سکہ پورے طور پر نمایاں نظر آئے گا''۔ (۱)

سیدہ فاطمہ کا نہ صرف تاریخی مطالعہ مستند جامع اور مکمل ہے بلکہ نہایت پر اثر بھی ہے کہ ہم ان کی ذہانت کے بھی قائل ہوتے ہیں اور فن مختصر نویسی کے بھی کہ انہوں نے صاف، سادہ اور سلیس انداز میں نہ صرف پیغمبروں کی خصوصیات بتائی ہیں بلکہ پوری تاریخ ہمارے سامنے واضح کر دی ہے۔

سیدہ فاطمہ صاحبہ کا اسلوب بھی اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے پیغمبروں کے حالات و واقعات حتیٰ کہ مناسک حج کے لئے بھی کوئی مشکل اسلوب اختیار نہیں کیا بلکہ سادہ اور عام فہم انداز میں اپنی بات کو مناسب طریقے سے بیان کیا ہے جو کہ قاری کے دل پر نقش دوام کا اثر رکھتا ہے۔

آخر میں انہوں نے بہادر شاہ ظفر، محسن کاکوری، حفیظ جالندھری، اقبال سہیل اختر شیرانی، مولانا ظفر علی خان کے حمد یہ اور نعت کے اشعار لکھے ہیں جو اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی عقیدت و احترام کے جذبے کو نثر میں تو اپنی زبانی بیان کر دیا ہے لیکن وہ دلی جذبات جو شاعروں کے محتاج تھے اس کو انہوں نے دوسرے شعراء کا کلام لکھ کر واضح کر دیا ہے۔

مجموعی طور پر معلومات سے بھرپور سفرنامہ ہے لیکن اس میں جذبے و عقیدت کی شمولیت نے اسے معلومات عامہ یا حج نامہ کی بجائے ایک خوبصورت سچائیوں اور محبتوں سے لبریز سفرنامہ بنا دیا ہے۔

۱۔ سیدہ حمید فاطمہ بحوالہ سابقہ ص۔ ۹۱

۲۔ ایضاً ص۔ ۹۸

ڈاکٹر فوزیہ سلیمی (حاضری)

ڈاکٹر فوزیہ سلیمی ایک ممتاز استاد، ماہر تعلیم اور باصلاحیت ادیبہ ہے انہوں نے یہ سفرنامہ حج کے بارے میں لکھا ہے۔ حج کے بارے میں اب سے نہیں صدیوں سے لوگ عقیدت و احترام کے جذبے کے تحت لکھتے آئے ہیں کہ یہ سعادت بھی باسعادت لوگوں کو نصیب ہوئی ہے لیکن فوزیہ اپنے سفرنامے کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''اردو ادب میں سفرنامہ اب ایک خاص مقام حاصل کرتا جارہا ہے۔ اپنے اس سفرنامہ حج کو میں نے محض ادبی رنگ دینے کے ساتھ ساتھ اس میں تحقیق کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کی وجہ سے میرے مزاج اور طریق کار کا تحقیقی ہونا ہے۔ ریسرچ کرتے کرتے اب کچھ عادت سی ہوچکی ہے کہ ہر چیز کے کیا کہوں اور کیسے کو سوچتی چلی جاتی ہوں۔ لہذا حج کے دوران بھی مقامات و رسومات کے بارے میں میرے اندر سوال و جواب ہوتے رہے'' (۱)

فوزیہ نے اپنی سوالات کا جواب حاضری میں دیا ہے کہ حج کے مقامات اور رسومات کے بارے میں لوگ جان سکیں۔ ڈاکٹر عبدالوحید قریشی لکھتے ہیں۔

''پورا سفرنامہ مذہبی فضا کے ساتھ ساتھ ایک دنیادار قاری کے لئے بھی دلچسپی کے بہت سے سامان رکھتا ہے دلکش مناظر، ندرت فکر اور دلفریبی اثر آفرینی کی بنا پر سفرناموں میں یہ کتاب الگ مقام کی طالب ہے۔ سفر کے آغاز سے ہی فوزیہ کی خوش طبعی کے اثرات نظر آتے ہیں کہ ابتدا ہی میں ذکر کرتی ہیں کہ بچوں کے بغیر صرف ہنی مون کا تجربہ تھا اور اب حج کی توفیق اس بیان سے ان کے خاندان کی خوشگوار زندگی کا احساس ہوتا ہے''۔ (۲)

خانہ کعبہ میں داخل ہونے کے جذبات اور پھر ان کا بیان کافی رقت آمیز ہے۔ حرم شریف کی فضاؤں اور دعاؤں کا حال فوزیہ نے بڑے عقیدت مندانہ جذبات سے کیا ہے۔

''امام کعبہ کا سورہ فاتحہ پڑھنے کا جو انداز تھا اس جیسا ترنم و ردھم وہ سوز اور وہ نشہ میں نے کبھی کسی گانے میں بھی محسوس نہیں کیا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے امام صاحب اپنے محبوب آقا اور

۱۔ ڈاکٹر فوزیہ سلیمی   حاضری   فیروز سنز لاہور   ۱۹۹۵   ص۔ ۹

۲۔ ڈاکٹر عبدالوحید قریشی   دیباچہ حاضری   ص۔ ۱۲

مالک کی تعریف کرر ہے اور ہم امام صاحب کے پیچھے مئودب کھڑے ہیں اور ایک بچے جیسے وہ ماں کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے ....ہم اپنی خواہشات کا اظہار اپنے رب کے سامنے کرتے ہیں اور مجھ سے مدد مانگتے ہیں۔(۱)

ایک مسلمان ہمیشہ اپنے خدا ہی سے مدد مانگتا ہے کہ وہ قادر مطلق ہے۔فوزیہ نے ان تمام مقامات کا کہ جن کا ذکر حج کے لئے لازمی ہے۔ بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اور پورے تاریخی پس منظر کے ساتھ کہ اس پس منظر میں محبت اور عقیدت کی اپنی جگہ ہے۔اور پھر اپنی کم مائیگی کا احساس اس عقیدت کو دوگنا کر دیتا ہے کہ شاید وہاں جا کر آنکھوں کی برسات اس گرمی کے سفر کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ موقع محل کے مطابق فوزیہ کے اشعار ے بھی اس سفر نامے کی دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے۔ افضل توصیف اس بارے میں لکھتے ہیں۔

''فوزیہ نے بے شک عقیدت مندی اور فریضے کی ادائیگی کے لئے دیار رسولؐ کا سفر کیا لیکن واپسی پر اس مقدس سفر کا حال بھی لکھنے لگیں۔ عام طور پر اس قسم کی تحریر سفر نامہ یا حج نامہ بن کر رہ جاتی ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر فوزیہ سلیمی کی یہ تحریر اس سے آگے جا کر زیادہ اہمیت کی حامل ہو سکتی ہے..............کچھ بھی ہو سائنس کا مطالعہ انسان کو ایک سائنٹیفک نکتہ نگاہ ضرور دیتا ہے''۔(۲)

یہی وجہ ہے کہ فوزیہ کی نظر سے نہ پیر بچ سکے، نہ فقیر وہ سب پر بلا روک ٹوک تبصرہ کرتی ہیں لیکن محبت و عقیدت میں کہیں بھی کمی نہیں آئی۔مسجد نبوی ہو یا مسجد الحرام وہ ہر جگہ کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتی ہیں۔ریاض الجنۃ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''منبر رسول اور روضہ رسول کا درمیانی حصہ ریاض الجنۃ کہلاتا ہے۔اس مقام کے بارے میں آپؐ نے فرمایا تھا جو جگہ میرے گھر اور منبر کے درمیان ہے وہ جنت کے باغوں میں سے ایک ہے............اس حصہ میں سنگ مرمر کے ستون بنائے گئے ہیں۔جن کے نچلے حصے میں سنہری خول چڑھے ہوئے ہیں۔حضرت عائشہ کا ستون بھی ان ستونوں میں سے ایک ہے۔شاید ستون اس جگہ پر واقع ہے جس کے بارے میں حضور پاکؐ نے فرمایا میری مسجد میں ایک ایسی جگہ ہے کہ اگر اس کی اہمیت معلوم ہو جائے تو لوگ وہاں نماز پڑھنے کے لئے قرعہ نکالنے لگ جائیں'' (۳)

۱۔ ڈاکٹر فوزیہ سلیمی بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۹

۲۔ افضل توصیف تعارف حاضری از فوزیہ سلیمی ص۔ ۷

۱۔ ڈاکٹر فوزیہ سلیمی بحوالہ سابقہ ص۔ ۸۱۔ ۸۰

''ایک محقق کا ذہن عام ذہنوں سے منفرد اور اس کی نظر کی وسعت بھی زیادہ ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ مسجد الحرام میں مختلف جگہوں سے آنے والی عورتیں بھی ان کی نظر سے نہ بچ سکیں اور وہ ان کے رہن سہن ،قد کاٹھ کے بارے میں مشاہدہ کرتی رہیں کہ ملائشیا اور انڈونیشیا کی عورتیں چھوٹے چھوٹے اور قد آور چپٹے چہرے والی ہوتی ہیں۔مصری عورتیں سرخ وسفید،قطر اور کویت کی عورتیں نازک اور خوبصورت، ہندوستان کی عورتیں بوڑھی اور باتیں کرتی ہیں لیکن حبشی عورتوں کے نقش موٹے اور رنگ کالا ہوتا ہے۔ یہ عورتیں بہت طاقتور ہوتی ہیں اگر گزرتے ہوئے ان کا کندھا کسی کے ساتھ ٹکرا جائے تو اس کا جوڑ ہی اتر جاتا ہے۔ یہ عورتیں مکہ کی گرمی میں بھی ننگے پاؤں چلتی ہیں اور گرمی سے بچنے کے لئے پاؤں کو مہندی لگا لیتی ہیں''۔ (۱)

غار حرا، جبل احد، کے ساتھ ساتھ چاروں خلفائے راشدین کی مساجد کا ذکر بھی بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے لیکن ان کو پڑھ کر دل بے اختیار چاہتا ہے کہ وہاں جا کر اپنے دامن سے ان قالینوں کی مٹی اور اپنی آنکھوں کی پلکوں سے اس دھول کو چن کر مانگ میں سندور بنا کر سجا لیا جائے کہ ایسا کیوں ہے اور دل میں ایک بے چینی اور کرب کروٹیں لینے لگتا ہے کہ کاش پر لگ جائیں اور پلک جھپکنے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں لیکن حسرت ان خواہشوں پر کہ جو صرف سوچنے سے پوری نہیں ہوتیں۔

حضرت علیؓ کی مسجد کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''مسجد ابوبکر صدیقؓ کے نزدیک حضرت علیؓ کی مسجد ہے۔ اس مسجد کی حالت نہایت خستہ تھی۔ اور اس کا کچھ حصہ گو گر بھی رہا تھا۔ اس مسجد میں کوئی متولی نہ تھا اور نہ ہی پنکھا۔ ایک خستہ سا قالین تو بچھا ہوا تھا لیکن اس پر مٹی کی ایک تہہ جمی ہوئی تھی جیسے ایک مدت سے اس کی صفائی نہ کی گئی ہو۔جتنی تھوڑی بہت صفائی تھی وہ آنے والے زائرین کے سجدوں کی وجہ سے تھی کیونکہ تھوڑی تھوڑی مٹی وہ اپنی پیشانی کے ذریعے اٹھا رہے تھے''۔ (۲)

اس مسجد کی حالت دیکھ کر جو حالت فوزیہ کی ہوئی وہ تو بیان کر دی لیکن جو حالت پڑھنے والے کی ہوتی ہے وہ شاید نا قابل بیان ہی رہے تاہم فوزیہ کا کمال یہ ہے کہ حج کے سفر نامے میں بھی انہوں نے نسائی رنگ کی بھرپور جھلکیاں دکھائی ہیں۔مثلاً حج کے دوران سعی کے بارے میں لکھتی ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر فوزیہ سلیمی بحوالہ سابقہ ص۔ ۸۹

۲۔ ایضاً ص۔ ۱۰۹

’’ تمام لوگوں کو جو عمرہ یا حج کے لئے جاتے ہیں ۔ حکم ہے کہ وہ بھی اس طرح سعی جیسے حضرت حاجرہ نے کی تھی یہ ماں کی سعی یہ تھی جس نے اللہ کو خوش کر دیا اور ماں کے قدموں کے نیچے جنت رکھ دی گئی ! یہ ایک عورت کی سعی تھی جس نے مردوں کے لیے اس کو ایک سنت بنا دیا ۔ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان تا قیامت مرد بھاگتے رہیں گے ۔ یہ عورت کی سعی ہی تھی جو دنیا کی عورتوں کو عزت دے گئی ۔ آپ حج کے سارے مناسک پورے بھی کر لیں .... جب تک آپ سعی نہ کر لیں ۔ کتنا رتبہ ہے اس سعی کا .... ایک ممتا کے جذبے کا‘‘ ۔ (۱)

کیسا غرور کیسا بیان فوزیہ کے اسلوب کی جان بنا ۔ یہ وہ جذبہ ہے جو عورت نے ایک عورت کو بخشا ۔ ان جذبات کی عکاسی شاید سلیمی صاحب کرتے تو اتنی مؤثر نہ ہوتی جتنا رنگ فوزیہ نے عطا کیا ۔

ڈاکٹر عبدالوحید صاحب لکھتے ہیں ۔

’’ سائنس کی دنیا سے تعلق کی وجہ سے ان کے ہاں اختصار پسندی اور Down to Earth رویوں کی کثرت ہے ۔ اسی بناء پر اس کتاب میں اطناب ، طویل کا زور نہیں ۔ انہیں بات گھما پھرا کر بیان کرنے کا چسکا بھی نہیں اور نہ انہیں بات کا پتنگڑ بنانے کا شوق ہے ۔ وہ تو زبان کو اظہار کا وسیلہ جانتی ہیں اس لئے انہوں نے تحریر کو تشبیہات و استعارات کے گل بوٹوں سے نہیں سجایا ۔ وہ تو جذبات کو سیدھے طور پر بیان کرنے کی عادی ہیں اور عبارت آرائی کے بغیر سادگی سے جذبات کے مدوجزر کو واضح کرنے کا سلیقہ رکھتی ہیں ۔ زبان کا یہ ہنر مندانہ استعمال کسی سائنسدان ہی سے ممکن ہے ۔ (۲)

یہی وجہ ہے کہ ان کا سفرنامہ منفرد خصوصیات کا حامل ہے جس میں مشاہدے اور مطالعے کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ کا صحیح شعور ، جزئیات پر نظر واقعات کا بیان نئے زاویے اور نئے نقطہ نظر کے ساتھ سامنے آتا ہے ۔ جس کی وجہ سے حج کے طویل سفرناموں میں فوزیہ کے سفرنامے کو مقبولیت نصیب ہوئی ۔

---

۱ ۔ ڈاکٹر فوزیہ سلیمی بحوالہ سابقہ ص ۔ ۲۳ ۔ ۲۲

۲ ۔ ڈاکٹر عبدالوحید قریشی دیباچہ حاضری ص ۔ ۱۱

باب ششم

۱) : خواتین کے سفرنامے کا ادبی مقام

۲) : بحیثیت مجموعی تقابلی جائزہ

خواتین کے سفرناموں کا ادبی مقام

ادب بنیادی طور پر تخلیق حسن کا نام ہے اور یہ حسن صرف داخلی کیفیات ہی کا نام نہیں بلکہ خارجی زندگی کا حسن انسانی حسن میں یوں مدغم ہوجاتا ہے کہ تخلیق حسن کے لئے بہترین مواد فراہم کرتا ہے۔ اور یہ مواد مشاہدے اور محسوسات کو تجربات میں ڈھالتا ہے۔ اور ادیب کو شعور و آگہی حاصل ہوتی ہے اور وہ زندگی کے تقاضوں کے مطابق اپنی تخلیقات کو اس میدان کا مظہر بنالیتا ہے جو حالات کا تقاضا ہوتا ہے۔ اسطرح زندگی اور ادب بہترین سانچے میں ڈھل کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

کسی بھی ادب کے لئے سفرنامہ لکھنا ایک خوش آئند بات ہے کسی دور میں جب کوئی کسی جانب گیا اور اسکی واپسی پر جب کسی نے اس سے تجسس یا محض تفریح کی خاطر کچھ سوال پوچھے ہونگے تو جواب میں مسافر نے جب حال سفر بیان کیا ہوگا تو غالباً دنیا کا پہلا سفرنامہ اسے ہی کہا جاسکتا ہے۔ سیاح جب اپنے مشاہدات کو مناظر کی تمام تر جزئیات سمیت پیش کرتا ہے تو اپنے ساتھ ساتھ وہ پڑھنے والے کو بھی ان علاقوں کی سیاحت میں شریک کرلیتا ہے اور وہاں کے تمام تمدنی، تہذیبی، معاشرتی حالات کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔

صنف نازک نے ادب کے میدان میں مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی اور اپنی تخلیقات کو لازوال بنایا۔ اسطرح اس نے سفرنویسی کے میدان کو بھی سر کیا اور اس میں اپنی فہم و فراست سے نت نئی جہتیں تلاش کیں۔ کیونکہ سابق صدی کے آغاز کے ساتھ ہی خواتین کو معاشرے میں جب اپنی پہچان کا مرحلہ درپیش آیا تو تب عورت کو بھی صنف مخالف نے ایک فرد کی طرح سمجھنے کی کوشش کی کیونکہ مردانہ معاشرے میں اثبات وجود کے لئے اسے وہ سہولتیں میسر نہیں جو مرد کو حاصل ہیں۔ عورت کو شخصیت کے اظہار کے لئے بیشتر دروازے بند ملتے ہیں اور اسطرح عورت عمر بھر اثبات ذات اور گریز ذات کی پیدا کردہ الجھن کی اسیر رہتی ہے۔ حالانکہ اسی معاشرے میں تمام عمر معاشرتی کرداروں کو مختلف روپ میں اپنے من کو مار کے اپنی خواہشات کو ترک کر کے نبھاتی ہے جسے شبنم شکیل یوں بیان کرتی ہیں۔

سکھائی ہے مجھے حالات نے اداکاری
سو میری بات سے نکلتا نہیں حال میرا

اس صدی کی لڑکی زیادہ خوش قسمت ہے کہ اسے تعلیم کے ساتھ ساتھ اقتصادی اور اسکے نتیجے میں معاشرتی آزادی بھی حاصل ہے۔اگرچہ ابھی بہت سی روکاوٹیں ہیں لیکن کم ازکم اتنا تو ہے کہ عورت تخلیقی سطح پر اپنے وجود کو تسلیم کروا رہی ہے اور اب وہ زمانہ بھی نہیں رہا کہ عورت اپنے نام کو پردے میں رکھنے اور بنت فلاں، بیگم فلاں، والدہ فلاں کے نام سے متعارف کروائے۔ اب عورت خود اپنے نام سے لکھتی ہے بلکہ اپنی تحریروں میں وہ اپنی ذات کا منظرنامہ مسائل اور نفسیات کو بھی پیش کرتی ہے۔

ادب کے میدان میں جہاں زبان و بیان کے اندر تذکیرو تانیث کے واضح فرق موجود ہوں وہاں عورت کو اپنے آپ کو منوانا اور تسلیم کروانا آسان کام نہیں ہے۔عورت کو ادب کے میدان میں وہ اجنبیت دور کرنا تھی جو مرد معاشرے میں قائم تھی اور خود کو قابل احترام بھی ثابت کرنا تھا۔حالانکہ لکھنا لکھانا آسان کام نہیں ہے اور خاص طور ہر عورت ذات کے لئے جو کہ پابند سلاسل ہے لیکن سفرناموں کے ذریعے اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس راستے پر چل کر اس کے بال و پر آزاد ہیں۔آج کی زہین، حساس اور تخلیقی جبلت کی حامل عور معاشرتی دباؤ اور استحقاقی جبر کے دو پاٹوں کے بیچ کس طرح پستی ہے۔ یہ اسکا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ ہے اور سفرناموں میں وہ اپنے طرح کی عورت کو مختلف علاقوں میں مختلف تہذیبوں میں دیکھتی ہے تو محسوس کرتی ہے کہ کہیں پر تو وہ اس سے ہی مشابہت رکھتی ہے۔کہیں وہ زیادہ آزاد ہے اور بے باک ہے لیکن اکثر جگہوں پر عورت کے دکھ مشترکہ ہی نظر آتے ہیں۔عورت کو رشتوں کو کامیابی سے نبھانے کے لئے خطہ ارض پر اپنے اعصاب اور اپنی ذات کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔ لہذا وہ سفرناموں میں یہ اجاگر کرتی ہے کہ غیر مرئی زنجیروں جیسے رشتے اور انکی پیدا کردہ گھٹن اور انکے بوجھ تلے نسوانی روح کن کن عذابوں سے گذرتی ہے۔ عورت اس میدان میں نو وارد ہے۔لہذا اسکے لئے نہ راہ شوق آسان ہے نہ حصول منزل سہل۔ تاہم جو کچھ وہ لکھ رہی ہے وہ بھی غنیمت ہے۔ کیونکہ خواتین کی تحریروں کو بہت اعلی تو کبھی بھی نہیں کہا گیا ہاں اسکی Sensation کے مطابق پسند اور ناپسند کے نمبر دیئے جاتے رہے۔جیسا کہ کشور ناہید نارمن ہیلر کے حوالے سے کہتی ہیں۔

’’خاتون اچھا لکھنے والی تو خیر ہوتی ہی نہیں۔ اگر وہ کال گرل ہو جائے اور پھر اسکے قصے لکھے جائیں تو مزیدار مواد مل سکتا ہے‘‘۔(۱)

عورت کا قصہ اپنی جگہ الگ ہے۔ اسکے اندر بقول فلورنس نائیٹیگیل، خواہش، خواب سرگرمیاں اور عیب سب باری باری مرجاتے ہیں۔آخر میں جو چیز مرتی ہے وہ ہے ذہانت۔ذہانت بغیر کسی سہارے کے زندہ رہنے کی قوت رکھتی ہے۔اسکو بہت دبایا جائے تو عورت میں ذہانت اظہار کی قوت نہ ملنے والی چیز سے بھری رہتی ہے۔ کیونکہ معاشرتی زندگی میں مرد کی ہمیشہ برتری تسلیم کی گئی ہے۔اگرچہ مغرب میں یہ فرق نسبتاً کم نظر آتا ہے اور اب اسکی بازگشت مشرق میں بھی سنائی دینے لگی ہے۔ تاہم جنوب ایشیا کی مسلم خواتین اب بھی مردوں کی زیردست ہیں۔اور مشرقی عورت جب کبھی سفر پر نکلتی ہے تو اسکے احساسات جدا ہوتے ہیں۔وہ واقعات، کرداروں اور مناظر کو حیرت کی آنکھ سے دیکھ کر نیا تجربہ حاصل کرتی ہے۔اسکے محسوسات بھی الگ ہوتے ہیں۔

اور یہ بات بالکل درست ہے کہ عورتوں کی نفسیات عورتیں ہی بہتر سمجھتی ہیں اور خواتین کے متعلق جب وہ اظہار کرتی ہیں تو انکا انداز مردوں سے مختلف ہوتا ہے۔ لہذا جاوید اختر پنڈت کشن پرشاد کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

’’عورت ذات اپنے نفس کی گہرائیوں میں کیا اور کسطرح محسوس کرتی اور نہیں کہہ سکتی ہے ~~اور نہیں کہہ سکتی ہے~~ یہ سب اب تک ہم پر سربستہ راز رہا ہے‘‘ (۲)

مگر یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عورت کا مشاہدہ مرد سے زیادہ عمیق اور گہرا ہے مرد منظر نگاری اور کرداروں کی چھوٹی چھوٹی جزیات کو فراموش کر دیتا ہے اسے زیورات کپڑ وں رنگوں اور فیشن کے متعلق اتنی معلومات نہیں ہوتی کہ وہ ان لوازمات کو پورا کر سکے خاص طور پر عورت کے متعلق سراپا نگاری کو اور اس کے حسن کو چار چاند لگانے والے زیوات اور رنگوں کے امتزاج کو جسطرح ایک نسائی قلم بیان کر سکنے کی طاقت رکھتا ہے مرد اس اوپر پورا اترہی نہیں سکتا ۔مثلا ایک عورت جزیات سمیت جس طرح منظر اور ماحول کا مطالعہ کرتی ہے اور رنگوں کے فرق کے ساتھ ساتھ گھر کی عورت کے حسن ذوق سلیقہ مندی سجاوٹ اور بول چال کے طریقوں پر غور کرتی ہے مرد کبھی بھی ان پر غور نہیں کر سکتا۔

بیانیہ صنف میں اس چیز کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے کہ آرائش و زیبائش میں تضاد نظر نہ آئے لیکن مردوں کے سفرنامے میں یہ چیز واضح طور پر نظر آتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ہر علاقے کے رسم و رواج زندگی موت شادی بیاہ بچہ کے پیدا ہونے کے جشن سب الگ الگ ہوتے ہیں اور ان میں جہاں غم ہوتا

۱۔ کشور ناہید بری عورت کی کتھا سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۹ ص۔ ۱۳۲

۲۔ ڈاکٹر جاوید اختر اردو ناول نگار خواتین ترقی پسند دور سے دور حاضر تک سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۳ ص۔ ۲۲۳

ہے وہاں رنگوں کی بھی بہار ہوتی ہے آرائش وزیبائش بھی ہوتی ہے۔ تو ان قوس وقزح کے رنگوں کو زیورات کو جیسے عورت بیان کرسکتی ہے مردوں کو عورتوں کے زیورات کے نام تک کا علم نہیں ہوتا۔ تو ان کا بیان کیونکر اور کیسے حقیقت پر مبنی ہوسکتا ہے۔ یہ مشاہدہ کے ساتھ معلوماتی انداز بھی رکھتا ہے۔ اسطرح خواتین خانگی مسائل اور انکے ممکنہ حل کی بنیادیں بھی بڑی خوبصورتی سی استوار کرتی ہیں انکی عکاسی بہت بہتر طریقے سے کرتی ہیں بلکہ مہارت اور خوبصورتی سے کرتی ہیں کہ وہ اس معاشرتی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب بن جاتا ہے۔ خواتین کی تحریروں میں ایک اور اچھی بات انکی حقیقت پسندی ہے انکے قلم سے کرداروں کے لیے ملمع کاری کم ہی ہوتی ہے بلکہ انکے کردار جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ وہ جیسا دیکھتی ہیں ویسا بیان کردیتی ہیں۔ اسکے برعکس مردوں میں یہ رجحان کم نظر آتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں اور خاص طور پر مردانہ کردار کو مافوق الفطرت حد تک وجیہ اور قومی دکھاتے ہیں۔

عورت کی تحریر میں ذکر خواہ مرد کا ہو یا عورت کا حقیقی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ رنگ گردش زمانہ سے بدلتے رہتے ہیں۔ خواتین لکھنے والیوں میں یہ رجحان قابل تعریف بھی ہے اور قابل غور بھی لیکن کہیں کہیں خواتین جب نسائی کرداروں کے بارے میں لکھتی ہیں تو وہ ان کو مثالیت بخش دیتی ہیں۔ شاید مرد کو نیچا دکھانے کے لئے کہ وہ ہمیشہ احساس برتری میں مبتلا ہے اور اس نے عورت کو حقیر اور ہیچ شے سمجھا۔ ستر ہزار حجابوں میں رہنے کے باوجود اسکے کردار پر شبہ کیا گیا۔ اسے فاتر العقل اور وجہ فساد قرار دیا گیا۔ نئی تہذیب کی روشنی میں عورت کو آزادی ملی۔ اسے حقوق عطا ہوئے لیکن مردوں کا اسکے ساتھ رویہ تضحیک آمیز ہی رہا اور اسی احساس برتری کی وجہ سے انہوں نے عورت کو ایک ناگوار روپ میں پیش کیا۔

کہیں اسے جادوگرنی دکھایا گیا کہیں اسے تعویز گنڈے کی رسیا، کہیں وہ جسم فروشی کے اڈے پر کبھی دغا وفریب اور کہیں بے وفائی کے پیکر کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ مرد وزن کے اس رویئے کے خلاف نئے عہد کی خواتین نے خواتین کو بہتر صورت میں پیش کیا ہے۔ انہیں ایک مثالی صورت میں بھی پیش کیا۔ لیکن اس کے باوجود عورت کی تخلیقات کو کم اہمیت دی جاتی ہے۔ جیسا کہ کشور ناہید جیلانی بانو کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

> ''مرد نقاد خواتین لکھنے والیوں کے ساتھ سرپرستانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یا پھر انہیں بالکل نظر انداز کردیتے ہیں۔ خواتین لکھنے والیاں انکے نظر کرم کی محتاج ہوتی

ہیں کیونکہ ادب کی دنیا پر مردوں کا ہی قبضہ ہے اسی وجہ سے مغرب میں وہ حقوق نسوانی کی ''تحریک'' نے جنم لیا یعنی ایک ایسا تنقیدی اور نظریاتی عمل جو مردانہ پدری نظام اور تنقید جنسی امتیاز کے خلاف ہے۔ (۱)

کیٹ میلٹ نے اپنی کتاب ''Sexual Politics'' میں لکھا ہے کہ حقوق نسواں سے متعلق نقادوں اور نظریہ سازوں کا کام یہ ہے کہ ادبی اور ثقافتی میدان میں عورتوں پر مردوں کی بالا دستی کا پردہ چاک کریں اور وضاحت کے ساتھ بتائیں کہ ہمارے کلچر کا جو سب سے نمایاں پہلو ہے۔ اسکا تعلق بنیادی طور پر مردوں کی بالا دستی ہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ نسائی تجربہ اور حقوق نسواں کی سیاست کے تعلق کو واضح طور پر سامنے رکھا جائے تا کہ نسائی تجربہ مجموعی انسانی تجربہ کے اظہار میں جائز حق پر اصرار تو کرے۔

عورت اپنے ادبی تجربات کی روشنی میں اپنی پہچان کروانا چاہتی ہے۔ لہذا مردوں کو چاہیے کہ عورت کی حیثیت کو اسکے تجربات کے حوالے سے پہچاننے کی کوشش کریں۔ اسکے بعد اسے بحیثیت انسان سمجھیں۔ اسطرح خواتین کی تخلیقات کو بھی لگے بندھے اصولوں کی روشنی میں نہ دیکھا جائے بلکہ خواتین کی ان کے مخصوص تجربات اور خاص جذباتی حوالوں سے دیکھنا چاہیے اور سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس طرح سے خواتین کی تخلیقات کی نئی روایت تشکیل پائے گی۔ یہ کام خواتین نقادوں کا ہے کہ وہ اس روایت کو آگے بڑھانے میں مدد دیں اور لکھنے والی خواتین کی حوصلہ افزائی کی جائے کیونکہ ادب میں عورتوں کا الگ ایک تعصب کلچر یا ذیلی ثقافت جنم نہیں لینی چاہیے۔ کیونکہ ادب میں کوئی ایسی روایت نظر نہیں آتی۔ جسے نسائی سب کلچر کہا جا سکے۔

ادبی میدان میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کیا تخلیق کیئے جانے والے ادب میں عورت کو اسکے اصل روپ میں پیش کیا گیا ہے کہ نہیں۔ ایک ایسے روپ میں جس میں وہ اپنی ذات اور اپنی قسمت کی خود مالک ہے۔ کبھی ادب میں اسے آرٹ کے بے جان نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی گڑیا کہا جاتا ہے۔ گویا اسکے احساسات اور جذبات کو بالکل بے جان سمجھا جاتا ہے۔ اگر چہ اب جدید ادب میں مختلف خواتین جن میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، بانو قدسیہ وغیرہ نے کافی حد تک ادب کو جرأت کے ساتھ پیش کیا ہے ار ادب میں اپنا مقام و مرتبہ بھی منوایا ہے۔ تاہم ابھی عورت کے راستے میں کافی رکاوٹیں ہیں۔

کشور ناہید شانتا کرسٹنا سوامی کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

۱۔ کشور ناہید بحوالہ جیلانی بانو عورت زبان خلق سے زبان حال تک سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۳ ص۔ ۲۴۲

''ناقابل عبور رکاوٹیں اب بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔ بچوں کی پرورش کے ساتھ عورت اپنی خودمختیاری کیسے برقرار رکھ سکتی ہے۔ گھریلو زندگی ماں بننے کا عمل اور اپنی روحانی تشکیل کی کشمکس میں توازن کیسے برقرار رکھا جائیگا۔ یہ ایسے سوال ہیں جن کے جواب تلاش کرنا ضرور ہیں''۔ (۱)

عورت کو لکھنے میں بے حد مشکلات پیش آتی ہیں۔ اسے مردوں کی طرح وہ سہولیات میسر نہیں جو تخلیق کے اظہار کے لئے لازمی ہیں جیسا کہ ورجینا وولف کہتی ہیں کہ

''کسی خاتون کے لکھنے کے لئے دو چیزوں کا ہونا بہت ضروری ہے ایک یہ کہ اسکے پاس پیسے ہوں اور دوسرے اسکا اپنا ایک کمرہ ہو''۔ (۲)

بظاہر یہ شرائط بڑی معمولی سی لگتی ہیں لیکن درحقیقت بہت مشکل ہیں عورت کے پاس ان دونوں کی کمی عام حالات میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ کمرہ صرف اس کا ہونا ممکن ہے۔ اور روپے جو صرف اس کے ہوں مشکل، سوان حالات میں عورتوں کو ''فریڈم آف مائنڈ'' ملنا بہت ضروری ہے۔ جس کو مرد کبھی قبول ہی نہیں کرتا کہ عورت بھی حساس ہوسکتی ہے۔ ہر وقت کے سماجی و معاشرتی بندھنوں سے آزادی اس کا بھی حق ہے یہ جرأت کسی کسی میں ہوتی ہے جیسا کہ Johngay کہتا ہے۔

''مرد جھوٹ بولنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور عورت اس پر یقین کرنے کے لئے'' (۳)

پروین شاکر اردو کی بے حد معروف اور جذبوں کی شاعرہ نے بھی اس واردات کو یوں بیان کیا ہے۔

'' میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی۔
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا۔

سفرنویسی میں خواتین کی مشکلات کو اگر پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان حالات میں بھی جن خواتین کو سفر کا موقع ملا اور انہوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو پیش کرنے کی جرأت کی ہے وہ یقیناً قابل تحسین و آفرین ہے۔

حالانکہ سفرنگاری کی جدید تاریخ اس صدی کی ساٹھ کی دہائی میں زیادہ تر متعارف ہوتی ہے۔ لیکن خواتین نے بہت جلد ہی اس میں منفرد مقام پالیا ہے۔ خواتین سفرنامہ نگاروں میں اگر سفرنامے کی ابتدا سے دیکھا جائے تو ہمارے سامنے ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق اردو کی پہلی سفرنامہ نگار خاتون نازلی

۱۔ کشور ناہید بحوالہ سابقہ ص۔ ۲۴۴
۲۔ ایضاً ص۔ ۲۴۷
۳۔ علی حیدر ملک نیلم احمد بشیر کا فن ماہ نو س۔ن۔ لاہور ص۔ ۷۷

رفیعہ سلطان کا سفر نامہ ''سیر یورپ'' ہے جو ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس بارے میں ڈاکٹر مرزا ناصر بیگ لکھتے ہیں۔

''یہ سفر نامہ سفر یورپ کے دوران ہندوستان میں قیام پذیر بزرگوں کو لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے۔ جبکہ اس سفر نامے کی دوسری نمایاں پہچان نسوانی انداز تحریر ہے۔ سیر یورپ میں ایک مشرقی عورت کی نظر سے یورپی تہذیب کا مشاہدہ جداگانہ لطف کا حامل ہے''۔ (۱)

اس کے بعد بیگم سربلند کا سفر نامہ دنیا عورت کی نظر میں ۱۹۱۰ء میں سامنے آیا۔ صغریٰ حیا بیگم، بیگم حسرت موہانی وغیرہ کے سفر نامے ۱۹۴۰ء تک منظر عام پر آ چکے تھے۔ اسی دور میں ایک اور خاتون جن کا نام عطیہ فیضی ہے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

''عطیہ بیگم فیضی رحمٰن کا یہ سفر نامہ لندن کی زندگی کو اونچے طبقے کی تہذیبی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اور قاری کو مرعوب کرنے والی تصویریں دکھا دیتا ہے''۔ (۲)

اس کے بعد اردو ادب میں سفر نامے کا حصہ زرّیں آتا ہے جو کہ ۱۹۸۷ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں بیگم اختر ریاض الدین کا نام آتا ہے۔ جن کے سفر نامے نے اردو ادب میں منفرد مقام بنالیا تھا۔ ان کے سفر نامے دلچسپ بھی ہیں اور معلومات افزاء بھی ہیں۔

یوں سفر نامے کی صنف میں بہت زیادہ تعلق کا احساس ہوتا ہے۔ اب نہ صرف سفر نامے لکھے جا رہے ہیں بلکہ سفر نامہ نگاروں نے اپنی ذات کو شامل کر کے اس میں اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کاوش کی ہے۔ جدید دور میں سفر کی سہولتوں نے بھی صنف نازک کو گھر کی حد بندی سے نکل کر دنیا کی وسعتوں کو کھنگالنے کا حوصلہ عطا کیا ہے اور موقع بھی فراہم کیا ہے۔ اس لئے عورت نے دنیا کو اپنے مخصوص انداز نظر سے دیکھا اور محسوس کیا۔ اس لئے اس کا بیان بھی مردوں سے مختلف ہے۔

کیونکہ عورت کی نسائی لطافت اس کی تحریریں، دھنک کے حسین رنگ بکھیر دیتی ہیں۔ قدیم زمانے ہی سے عورت بچپن کی کہانیوں کی داستان گو رہی ہے۔ اس لیے جب اسے جدید دور کے سفری سہولتوں اور محدود آزادی کی بنا پر دنیا کے چند گوشوں کو دیکھ کر بیان کی ذمہ داری سنبھالی تو اسکے اندر چھپی ہوئی داستان گو نے ایک

۱۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ — اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ — مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد ۱۹۸۷ ص۔ ۶۹

۲۔ ڈاکٹر انور سدید — بحوالہ سابقہ — ص۔ ۲۰۱

سحر باندھ دیا۔اسی لئے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں۔

''وہ سورج تلے زندگی کے ہر موضوع پر قلم اٹھا کر مردوں کے معاشرے میں تخلیقی سطح پر اپنی انفرادیت اور اہمیت تسلیم کرا سکتی ہے۔ اب اس کے لئے نالے کو پابند کرنا اور فریاد کو لے دینا ضروری نہیں رہا''۔ (۱)

کیونکہ اس سے پہلے ادب میں عورت کی تصویر کشی کی گئی۔ دنیا بھر کے اہل قلم اور اہل فن کے لئے عورت ہی سب سے بڑا تخلیقی محرک رہتی ہے اور ہر انداز میں اس کی تعریف و توصیف سے لیکر مذمت کے لئے لاتعداد پہلو اختیار کیئے گئے لیکن مرد کی حاکمیت کی تشفی نہ ہوئی۔

خواتین سفر نامہ لکھنے والیاں صرف ملکوں ملکوں گھومنا ہی نہیں جانتی بلکہ دیکھنا اور محسوس کرنا بھی جانتی ہیں۔ اس سطح پر بیگم اختر ریاض الدین کے سفر ناموں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے کہ ان میں وہ رنگینی اور دلچسپی ہے کہ جو خواتین میں احساسات، تاثرات اور محسوسات زیادہ وسیع معنوں میں دکھائے گئے ہیں۔ ان میں گھریلو زندگی کی مثالیں، کبھی ممتا کی جھلک اور شفقت، کبھی گھر کی فکر اور کبھی خاوند کا خیال، کبھی روپے کی بچت اور کبھی سسرال کا خوف، کبھی معاشرتی اور تہذیبی ثقافتوں کا احساس اور بیان اور علاقوں کی ثقافت کا گھلا ملا رنگ سب ان کے سفر ناموں میں ملتا ہے۔ کہیں حیرتیں یکجا ہوتی ہے کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ کیونکہ وہ اس دنیا کو ایک نئے رنگ میں دیکھتی ہے۔ جو کبھی خوشنما ہے اور کبھی عورت کے وجود کی طرح بظاہر رنگ و بو کا سیلاب سمیٹے ہوئے اور اندر سے کرچی کرچی، چور چور زخموں سے بھرپور۔

اس طرح بیگم اختر ریاض کے سفر ناموں کو نئے انداز جزئیات نگاری، رنگینی، لطافت اور جرأت اظہار کی وجہ سے بے پایاں شہرت ملی اور انکے سفر نامے ہاتھوں ہاتھ لئے جانے لگے تو ان کی دیکھا دیکھی دیگر خواتین نے بھی اس اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئیں۔

سفر نامہ نگاری میں ایک اور بڑا نام بشریٰ رحمان کا ہے جو مستنصر حسین تارڑ کی طرح ذات کی نرگسیت میں اسیر نظر آتی ہیں لیکن ان کو تکلف اور تصنع کے بغیر عام روائتی اسلوب نے شہرت عام اور بقائے دوام بخشی۔

بشریٰ رحمان کی نثر میں شعر کا مزہ ملتا ہے۔ ان کا سفر نامہ وہ براہ راست زبردست شعریت کا عنصر لیئے ہوئے ہے جو پڑھنے والوں پر گراں بھی نہیں گزرتا اور زبان کی چاشنی بھی برقرار رہتی ہے۔ ان کے سفر ناموں

۱۔ احمد ندیم قاسمی ابتدائیہ نقوش لطیف، نیا ادارہ، لاہور ۱۹۴۶ ص۔ ۱۳

کا ایک اور وصف تقدس کی فضا کا نقشہ پیش کرتے ہوئے صوفیانہ کلام کا سہارا لینا ہے۔ خاص طور پر خواجہ غلام فرید کا سرائیکی کلام والہانہ جذبات اور لطیف احساسات کا رنگ چوکھا کر دیتا ہے۔ اس طرح خواتین کے سفر ناموں میں زیادہ الجھاؤ نظر نہیں آتا۔ نہ خواہ مخواہ کی باتیں بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عموماً جو کچھ دیکھا جاتا ہے قلمبند کر دیا جاتا ہے۔ جو تاثرات ہوتے ہیں بغیر کسی کمی بیشی کے لکھ دیئے جاتے ہیں۔ نہایت سادہ اسلوب میں سادہ زبان میں سفر کی روداد بیان کرنا خواتین کا ہی خاصا ہے۔ کیونکہ ان کے بیان میں خود رفتگی کی سی بات دکھائی دیتی ہے جو پڑھنے والوں کو مسحور کر دیتی ہے۔

خاص طور پر خواتین کے حقیقی مشاہدات جب سفر نامے کی صورت میں سامنے آتے ہیں تو ایک نیا سماں باندھ دیتے ہیں اور بالخصوص جب دو تہذیبوں کا ادغام ہو یا ٹکراؤ تو ایسے میں نسوانی تحریروں میں وہ حسد اور ایک عجیب سا محلے پن والا رویہ ظاہر ہونے لگتا ہے۔ کہیں کوسنے سننے کو ملتے ہیں اور کہیں قسمت کی ستم ظریفی کا گلہ کہیں خاوند کے عیاش ہونے کا شکوہ اور کہیں اولاد کے نافرمانبردار ہونے کا گلہ اور خاص طور پر جب ہماری مشرقی خواتین مغربی تہذیب کا بے باکانہ تصویر دیکھتی ہیں وہاں کی خواتین کی عریانیت، فحاشی اور کھلم کھلا میل جول تو وہ اس کو اور ہی طریقے سے متعارف کرواتی ہیں کہ جہاں ان کے دل کا غبار بھی قلم کے ذریعے آہستہ آہستہ نکل جاتا ہے اور ایک سچی اور کھری تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ کیونکہ جو چیز حسد کے ذریعے اور احساس کمتری یا برتری کے ذریعے بیان کی جائے وہ مکمل شاہکار ہوتی ہے۔ مشرقی خواتین چونکہ اپنی غیرت عزت اور ناموس کا خیال رکھنا اپنا فرض اولین سمجھتی ہیں۔ اس لیے اس معاملے میں ان کا قلم جو زہر نا کی اگلتا ہے وہ مردوں کے بس کی بات نہیں کیونکہ مرد کے لئے عورت اور وہ بھی آسانی سے دستیاب شدہ عورت کبھی بھی باعث ملائمت نہیں رہی اور یوں خواتین دنیا کا تعارف کروانے میں مردوں سے کسی طور بھی پیچھے نہیں رہیں۔

اس دور میں ایک اہم نام قرۃ العین حیدر کا ہے جن کے سفر نامے ''جہان دیگر'' اور دکھلا یئے لے جا کے اسے مصر کا بازار'' اردو ادب میں ایک نئے اور فکر آمیز اسلوب کے شاہکار ہیں۔ انور سدید اس بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''وہ سفر نامے کے موجود میں ناموجود ماضی کو بھی زندہ کر دیتی ہیں اور زندگی کے حقیقی گھمسان سے اتنی دانش تلاش کر لاتی ہیں کہ ان کے سامنے ایک بڑی لائبریری بھی

حقیر نظر آنے لگتی ہے۔.............. ان کے سفر نامے مناظر اور اشیا کی بجائے دانش کے سفر نامے ہیں۔ چنانچہ ان میں شخصیات کا ایک جہاں آباد ہے۔ ان کرداروں کو قرۃ العین حیدر نے آئینے کے طور پر استعمال کیا ہے اور ان سے دور بین کا کام لینے کی کاوش بھی کی ہے لیکن ان کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ سفر نامے سے تحیر کو کسی لمحے بھی زائل نہیں ہونے دیتیں''۔ (۱)

ان کے معیار اور انداز کو چھو لینا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیونکہ تاریخ اور تہذیب کا جو حسین سنگم ان کے ہاں نظر آتا ہے وہ بہت کم سفر نامہ نگاروں کے ہاں ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے سفر نامے خشک نہیں ہوتے کہ تاریخ کے اوراق کا احساس ہونے لگے۔ ان کا مشاہدہ انتہائی باریک بینی پر مشتمل ہوتا ہے لیکن مشرقی و مغربی تہذیبوں کا مقابلہ کرتے وقت وہ کبھی احساس کمتری کا شکار نظر نہیں آتیں۔ ہاں البتہ یہاں کی ترقی سے متاثر ضرور نظر آتی ہیں۔ وہ چشم تصور سے ایسا نظارہ کرواتی ہیں کہ حقیقی تصویر بھی شاید اتنی دل آویز نہ ہو۔ جب وہ سفر کی داستان مرتب کرتی ہیں تو مختلف علاقوں اور شہروں کے طرز تمدن، رہن سہن، عادات واطوار کا بھی گہرا مشاہدہ پیش کرتی ہیں۔ اور خوب جزئیات نگاری سے کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوسکتی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں خواتین میں سیاحت ناموں کا نیا شعور پیدا ہوا وہاں وہ اسکے جدید بنیادی تقاضوں سے آگاہ ہوئیں اور اب خالص مذہبی، سیاسی، تاریخی، صحافیانہ طرز کے سفر ناموں سے آگے بڑھ کر انہوں نے بردباری، علمی شان اور مربوط وخوشگوار بیان بازی کے حامل سفر نامے لکھے۔ اب سفر نامہ ان کے ہاں معروضی اور موضوعی دونوں سطحوں پر ایک توازن قائم کرتا ہوا نظر آتا ہے وہ اب مذہبی، سیاسی اور تاریخی بیان میں ذاتی حسیات اور اپنی شخصیت کی جھلک بھی دکھاتی ہیں۔ مثلاً سلطانہ آصف فیضی کا سفر نامہ ''عروس نیل'' سے ایک ایسی روایت جنم لیتی ہے جہاں پابندی کی جگہ آزادی اور گھٹن کی بجائے ایک گونہ کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔

اس طرح صالح عابد حسین کا سفر نامہ ایک آئینہ خانہ ہے۔ جس میں مشرق و مغرب کی سچی تصویریں نظر آتی ہیں۔ کیونکہ سفر نامہ بیانیہ اصناف میں آتا ہے۔ اس میں مشاہدے کا عمل دخل زیادہ اور تخلیقی عمل کا عنصر

۱۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۶۴

قدرے کم ہوتا ہے۔ کیونکہ خارجی ماحول کو باریک بینی کے ساتھ قدرتی انداز میں بیان کرتا کہ وہ منظر قاری کی ذہنی سطح کے ساتھ دل پر بھی اثر انداز ہو۔ مشکل امر ہے جس کو خواتین کامیابی سے نبھا رہی ہیں۔

پروین عاطف ان سفرناموں کی خالق ہیں۔ کہ جن میں سحر آگہی، شگفتہ بیانی اور منفرد اسلوب ہے۔ ان کا بیان واقعہ اور حقیقت کو اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ کمال و جمال کے ساتھ ساتھ وہ کرب جو وہ کرن تتلی بگوئے'' میں محسوس کرتی ہیں۔ اس کا بھی احساس ہوتا ہے کیونکہ زندگی کے تلخ اور بوجھل حقائق کو بھی انہوں نے لطافت سے بیان کیا ہے۔ انور سدید ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

'' پروین عاطف نے اس صنف کی طرف رجوع کیا تو آزادی فکر کی نئی لذتوں کو فروغ ملا''۔ (۱)

انہوں نے بنکاک، منیلا، ہانگ کانگ، سری نگر، ٹوکیو، کیلاش اور نیروبی کے شہروں کی صرف سیر ہی نہیں کی بلکہ وہاں کی تہذیب وتمدن، ثقافت، جذباتی میلانات کو اس طرح سے محسوس کیا کہ جیسے وہ صدیوں سے ان کے ساتھ مل جل کر ان کی روح کے زخموں پر پھاہا رکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ عورتوں کی جو تذلیل وہاں وہ دیکھتی ہیں کہ جن کا حال جانوروں سے بھی ابتر ہے۔ تو شاید عورت ہونے کے ناطے انہیں اسقدر دکھ اور اذیت ہوتی ہے کہ وہ قاری کو بھی اس سطح تک لے جانے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ جہاں ان کے ضمیر کو جھنجوڑا جائے اور اس بات کا احساس دلایا جائے کہ عورت صرف جسمانی لذت ہی کے لئے پیدا نہیں کی گئی۔ اس کے اندر ایک معصوم دل اور ازلی وابدی اپنا گھر ہونے کی خواہش ہے جو کہ مشرق سے لیکر مغرب کے ہر کونے کی اور ہر خطے کی عورت میں ہے۔ کاش مرد اس بات کو فراموش کر دے کہ عورت اعتبار کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے اور وہ جھوٹ بولنے کے لئے اس لئے وہ ہمیشہ عورت کو بلیک میل کرتا رہا۔ پروین جسموں کی اکبری منڈی سے بہت نالاں ہیں۔ لیکن ان کے ہاں اسلوب بیان ان کی شخصیت کا عکس ہے۔ جو درحقیقت ایک مخصوص مزاج کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں جاذبیت واور دلکشی ہے جو کسی شعوری کاوش سے نہیں ہوسکتی۔ ان کا اسلوب موضوع اور مواد کے تابع ہے۔

کیونکہ خواتین کے سفرناموں میں مبالغہ آرائی اور تخیل کی خامیاں کم نظر آتی ہیں۔ انکے سفرناموں میں اندر کی سچائی کھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور ساتھ ساتھ وہ مصالحت پسندانہ رویہ جو انکی طبعیت کا خاصہ ہے۔ اسکے

۱۔ ڈاکٹر انور سدید بحوالہ سابقہ ص۔ ۱۳۳

سوشیو
علاوہ خالصتاً نسوانی حوالوں کے ساتھ نفسیاتی اور سوشیو پولیٹکل Socio Political تجزیہ نگاری،
نیز نسوانی زبان کے ساتھ ساتھ خواتین کے مخصوص محاوروں کے ساتھ ایک نیا رنگ وآ ھنگ جنم لیتا ہے۔ جو مرد
سفرنامہ نگاروں کے ہاں اول تو ہے ہی نہیں اور کہیں دانستہ کوشش بھی کی ہے تو وہ اعلی درجے کی نہیں ہے۔

جس طرح نسوانی حسن اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے۔ اس میں ایک جاذبیت ہے۔ یہ ہی کشش نسوانی
ادب اور خاص طور پر نسوانی سفرناموں میں بھی پائی جاتی ہے۔ جسکے باعث انہیں اہمیت حاصل ہے کیونکہ انکی
تاثیر جادوانی ہے۔

سفرناموں کی مقبولیت اور غیر مقبولیت کا بالخصوص خواتین کے حوالوں سے اسطرح بھی دیکھی جاسکتی ہے
کہ وہ کن حلقوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ وہ خود کن حلقوں کو متعارف کروا رہی ہیں اور کہاں چھپتی ہیں۔ جیسا کہ
رضیہ فصیح احمد کا سفرنامہ ''سفر ہے شرط'' اخبار جہاں میں بالاقساط شائع ہو چکا ہے۔ اس میں لندن، پیرس، روم
، ایمسٹرڈم وغیرہ کی سیر کروائی گئی ہے۔ اس میں رضیہ نے ہر شہر کے باطن میں جھانک کر وہاں کے جلال و جمال
کے ساتھ ساتھ وہ ان کے ماضی میں جھانکتی ہیں کہ حال کے لرزیدہ لمحوں کو گرفت میں لیا جاسکے۔ انکے سفرنامے
عوامی حلقوں میں پڑھے گئے اور وہ طبقہ جو کتاب خریدنے کی خواہش یا سکونت نہیں رکھتا۔ انہوں نے بھی اس کو
دلچسپی سے پڑھا اور بہت سراہا۔ اس طرح انہیں مقبولیت کی سند حاصل ہوگئی۔ اگرچہ اختر ریاض کا سفرنامہ بھی
ادبی دنیا میں قسط وار شائع ہوا لیکن ہمارے ہاں ادبی جریدے پڑھنے کا رواج بہت ہی کم ہے۔

بلقیس ظفر کا سفرنامہ ''مسافتیں کیسی'' پاکستان سے بیروت تک کا سفر ہے۔ جس کرب سے وہ بیروت
کی جنگ سے گزری ہیں۔ اس کا حال تو انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے لیکن جو تاثر وہ قائم کرنا چاہتی ہیں وہ ان
کے بیان میں نظر نہیں آتا بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے وکہ وہ زندگی اور موت کے اس کھیل کو صرف سرسری تماشائی کی
نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ جیسے کوئی اخباری رپورٹر حادثے کی تباہی کا ذکر کرتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ
مرنے والے یا بچھڑنے والوں میں اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔

ڈاکٹر ثریا حسین کا سفرنامہ پیرس و پارس کئی شہروں کا تذکرہ ہے لیکن خاص طور پر پیرس کا ذکر پہلے،
ہے۔ پیرس ایک ایسا شہر ہے جو دنیا بھر میں جدیدیت کے لحاظ سے مشہور و معروف ہے۔ جہاں عریانی و فحاشی دن
بدن بڑھتی جارہی ہے اور نئی نسل کا اخلاق اور مستقبل خراب ہو رہا ہے۔ انہوں نے اس سفرنامے میں خاص طور

پر ایک اہم مسئلے جنریشن گیپ کا بھی ذکر کیا ہے کہ جس کی وجہ سے آنے والی نسل بے راہ ہوتی جا رہی ہے۔ انہوں نے وہاں کے پارکوں، فواروں اور تفریح گاہوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہاں کی چند ادبی شخصیات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ کیونکہ ایک ماہر معلّمہ ہے اس لئے وہ یہاں کے نظام تعلیم و تحقیق کا بھی ذکر کرتی ہیں۔

دور جدید کے سفر ناموں میں وحیدہ نسیم کا سفر نامہ ''حدیث دل'' ان کے عمرے کا احوال ہے۔ جس کا آغاز انہوں نے ایک نعت سے کیا ہے۔ اس سفر نامے میں موقع محل کی مناسبت سے اشعار نہ صرف بیان کی معنویت میں اضافے کرتے ہیں بلکہ اسلوب بیان کو دلچسپ بتاتے ہیں۔

ڈاکٹر مرزا ناصر بیگ لکھتے ہیں۔

> ''خواتین کے ہی کیا جملہ حجاز ناموں میں حدیث دل کی انفرادیت اس کا اسلوب ہے۔ شعری لحن نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں''۔ (۱)

اس خوبصورت اور دل پر اثر کرنے والے سفر نامے میں جو چیز دل کو کھٹکتی ہے وہ ہے بعض مقامات پر انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال لیکن شاید وہ ان کی ضرورت ہوں اور بہتر اردو الفاظ پر ان کی دسترس نہ ہو جس کی وجہ سے وہ ان الفاظ کے استعمال پر مجبور ہوں۔ بہر حال مجموعی طور پر یہ ایک بہتر سفر نامہ ہے جہاں واقعی دل کی داستان بیان کی گئی ہے۔

سیدہ حمیدہ فاطمہ حجاز کا سفر نامہ لاہور سے دیار حبیب تک مختصر سفر نامہ ہے۔ لیکن اس میں فاطمہ صاحبہ نے اہم نعت گو شعراء محسن کاکوروی، محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان اور ڈاکٹر اقبال کے کلام سے انتخاب جو اس میں شائع کروایا ہے۔ وہ ان کے اعلیٰ ذوق شعری کا غماز ہے۔

یہ سفر نامہ ارکان حج اور اس سے متعلق اصطلاحات اور تفصیلات بھی فراہم کرتا ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنے اس سوز و گداز کا بھی ذکر کیا ہے جو ہر مسلمان وہاں جا کر محسوس کرتا ہے۔ ان کا بیان حد درجہ مشاہدے کی مثال ہے جس میں خود رفتگی بھی ہے اور رقت قلب بھی۔

بشریٰ رحمان کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ ان کا حج کے بارے میں سفر نامہ ''باؤلی بھکارن'' (اللہ میاں جی) نام کی طرح اپنے اندر خاصی کشش رکھتا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر مرزا ناصر بیگ بحوالہ سابقہ ص۔ ۳۵

زبیدہ حئی کا سفرنامہ ''زہے نصیب'' قابل رشک محبت، عقیدت، بے چارگی، بے بسی کی داستان ہے۔ ان کی نثر عمدہ اور انداز بیان منفرد ہے۔ ان کا مشاہدہ اور بیان دلچسپ اور حیران کن فضا کو جنم دیتا ہے۔ اسلوب میں ضرب الامثال کا استعمال اور تاریخی واقعات کا بیان ان کے وسعت مطالعہ کی دلیل ہے۔ وہ اشاروں کنایوں میں بات کرنے کا فن بخوبی جانتی ہیں۔ کیونکہ تخلیق کار معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ وہ دردمند دل اور حساس شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے لئے جسمانی آسودگی بہت ضروری ہوتی ہے۔ یہ آسودگی جب عورت کو میسر آئے تو اس کے نوک قلم سے خوبصورت تحریر جنم لیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج عورت اس سرزمین میں زندگی کے ہر موضوع پر قلم اٹھا کر مردوں کے معاشرے میں تخلیقی سطح پر اپنی انفرادیت اور اہمیت تسلیم کروا رہی ہے۔ وہ اسلوب کے تقاضوں سے بھی واقف ہے اور فنی ریاضت سے بھی اس لئے عورت کی تخلیق کو محض عورت ہونے کی وجہ سے کمتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بحیثیت مجموعی تقابلی جائزہ

ہمارا معاشرہ اکائیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں عورت کا وجود مرد کے معاشرے میں بہر حال اہمیت کا حامل ہے۔ اور اس کی عدم موجودگی میں معاشرہ نامکمل ہو جاتا ہے۔ تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خواہ وحشت کا دور ہو یا تمدن کا عورت زر اور زمین کے ساتھ ہمیشہ باعث تنازعہ رہی ہے۔ اور اس طرح عورت کی قدر و منزلت جس کی وہ حقدار تھی یا جو مقام اسلام کے مطابق اسے ملنا چاہیے تھا وہ نہ مل سکا۔

حالانکہ معاشرہ میں ہر ایک فرد کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی کہ دوسرے فرد کو کیونکہ افراد کی اجتماعیت سے معاشرہ پروان چڑھتا ہے۔ جبکہ تباہی وتنزلی کا شکار وہ معاشرہ ہوتا ہے جو ایک فریق کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ ہمارا معاشرہ افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور فرد میں مرد اور عورت دونوں ہی شامل ہیں اور کسی ایک کی کمی معاشرے میں عدم استحکام کا پتا دیتی ہے۔ جو کہ سارے مسائل کی جڑ ہے۔ موجودہ دور میں عورت اور مرد کے مقام و مرتبہ کی بحث نے اس کو کافی پیچیدہ اور غور طلب مسئلہ بنا دیا ہے۔

دراصل ان دونوں کے تعلقات میں ایسی غلط توجیحات کو شامل کر لیا گیا ہے جن کا نہ تو ہمارے معاشرے سے کوئی تعلق ہے نہ ہی مذہب سے کیونکہ اگر ترقی یافتہ اقوام پر نظر ڈالی جائے تو وہاں بھی کہ جہاں وہ ممالک اپنی ترقی میں اوج ثریا تک پہنچ چکے ہیں۔ وہ اس عورت سے جابرانہ سلوک سے مبرا نہ تھے۔

ادوار کے لحاظ سے زمانہ وحشت، ابتدائی تمدن، اور خالص تمدن کا دور کہلاتا ہے لیکن یہ تبدیلی بہت آہستہ آہستہ ہوئی۔ لیکن ان ادوار میں بھی عورت کے زوال اور استحصال کا دور جاری رہا۔ عقیدے اور مذہب بدل گئے۔ زمانے اور لوگ بدل گئے۔ ہاتھ اور تلوار بدل گئی لیکن نہ بدلی تو عورت کی تقدیر کہ وہ ازل سے محکوم ہے اور محکوم رہے گی۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (۱)

اس اصول کے تحت انسان کی حیثیت خواہ مرد ہو یا عورت فرش خاک سے سر بلند ہو کر کائنات تک جا

۱۔ القرآن سورۃ والتین آیت نمبر ۶

پہنچی ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

'' اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑ پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔ (۱)

جس سے ثابت ہوتا ہے عورت کوئی جداگانہ مخلوق نہیں بلکہ مرد کی طرح ایک انسان ہے۔ جب دونوں کا منبع ومخرج ایک ہی ہے پھر ان دونوں میں عناد کیونکر ہوسکتی ہے۔

سورۃ بقرہ میں ارشاد ہے۔

'' وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو''۔ (۲)

اسلام کے واضح احکامات کے باوجود مسلمانان دنیا عورت کے بارے میں کوئی بہتر نقطہ نظر قائم نہیں کر سکے۔ عورتوں کے بارے میں آج بھی ان کا رویہ معاشرے میں دوہرے پن کا شکار ہے۔ اس معاشرے میں مرد برتری کا مظہر ہے اور عورت کا نام ہے کمزوری، بزدلی اور قابل شکست شخصیت۔ اس لیے مرد کو جب کمزوری و یا بزدلی کا طعنہ دیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے و۔ عورتوں کی طرح ہمت ہار رہے ہو۔ چوڑیاں پہن لو۔ یہ عورت کی توہین ہے۔ اس لیے وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتے ہوئے بھی ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا سامنا کرتی ہے۔

ذلت ڈر اور خوف یہی وہ حربے ہیں جنہوں نے عورت کی ذہنی حالت کو متاثر کیا ہے۔ عورت جتنی مظلوم کل تھی اتنی ہی مظلوم آج ہے۔ عبدالوہاب لکھتے ہیں۔

'' رومیوں کا عقیدہ تھا کہ عورت ایک بے جان قالب ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اخروی زندگی میں کوئی حصہ نہیں پائے گی۔ وہ ناپاک ہے۔ اس کو گوشت کھانے پینے، ہنسنے اور بولنے کی اجازت ہرگز نہیں دینا چاہتے۔ اس کو اپنے تمام اوقات زہد و عبادت اور خدمت گزاری میں صرف کرنا ضروری ہے''۔ (۳)

مظہر الدین نے اپنی کتاب ''اسلام سے قبل دختر عرب کی حالت'' کے بارے میں لکھا ہے۔

۱۔ القرآن سورۃ النساء آیت نمبر ا

۲۔ ایضاً سورۃ بقرہ آیت نمبر ۱۸۷

۳۔ عبدالوہاب اسلامی نظام حیات فیروزسنز لاہور س۔ن۔ ص۔ ۱۳۲

Prior to Islam daughter were looked upon with disfavour and as a Kind of economic and social burden. The result was that the male member of the family enjoyed a respect which was denied to those of the fair sex. There were marked difference in the treatment and up bringing of sons and daughter" (۱)

جب معاشرے میں بیٹی کو باعث زحمت اور باعث ننگ قرار دیا تو اسلام نے اس معاشرے میں بیٹی کو باعث رحمت قرار دیا۔ یہاں تک کہ اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رحمۃ اللہ سے آپ کا سلوک مثال بن گیا۔ اسلام نے عورتوں کو حق یورپ کی ترقی یافتہ قوموں سے زیادہ اور پہلے دیا۔ جسے انہوں نے ایک ہزار سال بعد مانا۔

ہمارے برصغیر پاک و ہند کے علاقوں میں تعلیم نسواں کے فروغ اور خواتین کی سماجی اصلاح کے لئے ہندوستان کے مختلف حصوں سے نکلنے والے رسائل و جرائد نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ان رسائل کی ابتدا ۱۸۸۰ء میں لکھنو سے ہوئی تھی۔

عیسائی مشنریز نے ایک رسالہ رفیق النساء کے نام سے شائع کیا۔ جو بیک وقت اردو، ہندی و دیگر زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے ہاں پہلے زنانہ جریدے کی ابتدا مولوی سید احمد دہلوی نے کی۔ انہوں نے ۱۸۸۴ء میں ''اخبار النساء'' جاری کیا۔ اس طرح ۱۸۸۶ء میں ''تہذیب نسواں'' مولوی ممتاز اور محمدی بیگم کی زیر صدارت جاری ہوا۔ ۱۹۰۰ میں عبدالحلیم شرر نے دہلی سے ''پردہ عصمت'' کے نام سے جاری کیا۔

اس طرح ۱۹۰۴ اور ۱۹۰۸ میں شیخ عبداللہ اور راشد الخیری نے رسائل جاری کئے۔ اس زمانے میں خواتین کے ایک اور جریدے کا اجراء بھوپال سے ہوا۔ جس کا نام ''الحجاب'' تھا۔ ان تمام رسائل و اخبارات میں اس دور کی مشہور خواتین مثلاً فاطمہ بیگم، عباس بیگم، موتی بیگم، مہدی بیگم، سلطان خانم اور بیگم جہاں آرا شاہنواز کی کاوشوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

---

1. Muhammad Mazhar-ud-Siddiqui Women in Islam Lahore 1986 P. 15

یہی وجہ ہے کہ اب خواتین ادب کی کسی بھی صنف پر لکھتے ہوئے گھبراتی نہیں ہے۔ وہ جانتی ہے کہ قلم کا سہارا ایک مضبوط سہارا ہے۔ اس کا ذوق نظر، مشاہدہ، مطالعہ، ذوق سیاحت، شاعری کے لطیف احساسات، دکھ، ہجر، کرب، جدائی، ملاپ، غم، اذیت، خوشی، غمی، دوری، نزدیکی، رشتے اور بدلتے رشتوں کے انجام محبت، ثقافت، تہذیب وتمدن، تاریخ، ادب، کلچر، علاقے دور دراز کے موسموں کی تغیر وتبدل ولہجوں کی تھکن، بچوں کی محبت، موت، زندگی غرض کوئی بھی چیز یا غم اس سے نہ دور ہے اور نہ نزدیک۔ اس لئے ہر چیز پر وہ آسانی سے قلم اٹھا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے صنف سفر نامہ میں بھی اپنا آپ منوایا۔ اگر چہ اس کے لئے اس کو بڑے مصائب برداشت کرنا پڑے لیکن اس کے صبر وتحمل اور پختہ ارادے نے اس کے اندر آہنی استقلال پیدا کیا اور وہ جو ساری عمر سہاروں کی محتاج رہی تھی۔ اب اللہ توکل گھر سے سیاحت کے شوق میں نکل کر ہر جگہ پر نہ صرف پہنچی بلکہ اپنی روداد سفر میں اشیاء ماحول اور لوگ بھی نظر انداز نہ کئے۔

ایک وقت تھا کہ جب سفر نامے کو صنف ادب ماننے سے انکار کیا جاتا تھا لیکن اب سفر نامہ بتدریج وقت کے تقاضوں اور زبان و بیان کے نئے اسلوب سے ہم آہنگ ہوتا ہوا محکم صنف ادب بن چکا ہے۔ اردو سفر نامہ دل فریب ادبی تخلیق ہے۔ اردو کے سفر نامہ کی اضافی خوبی یہ ہے کہ اردو کے شعراء ہوں، مزاح نگار ہوں، افسانہ نگار ہوں، ناول لکھنے والے تنقید نگار ہوں یا محقق سب کے سب سفر نامے میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی خوبی کی بناء پر سفر نامے اپنے قارئین کو محظوظ بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ علم و دانش کی بیش بہا دولت سے لطف اندوز کرتے ہوئے مستفید بھی۔

سفر نامہ نگاروں کے اس تنوع کی وجہ سے سفر نامہ اردو ادب کی مقبول ترین صنف بن چکا ہے۔ میرا موضوع خاص طور پر سفر نامہ نگار خواتین سے متعلق ہے۔ یوں تو ادب میں جنس کے امتیاز سے خانے بنانا کچھ ناروا ہی ہے لیکن اس بات کو تسلیم کئے بنا چارہ نہیں کہ خواتین اور مردوں کی بنیادی سوچ میں فرق ہوتا ہے۔ خاص طور پر مشرقی عورت کی پرورش جن خطوط پہ کی جاتی ہے اور مرد اور عورت کے مابین تفریق کی جو حدود مقرر ہیں ان کی وجہ سے سوچ کا تفاوت بہت بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے میں نے سفر نامہ نگار خواتین پر لکھنے کا سوچا کہ سفر نامہ لکھتے ہوئے خواتین کی تخلیقی صلاحیتیں کسطرح ان کی بنیادی سوچوں سے متاثر ہوتی ہیں۔ اس کا جائزہ لیا جائے۔ دوسرا اس بات کی تحقیق کی جائے اور پرکھا جائے کہ کیا خواتین اس صنف میں اپنا مقام بنا سکتی ہیں اور

اس صنف میں تخلیقی اضافے کا باعث ہیں یا نہیں۔

یوں تو خواتین کو سفر نامے لکھنے کا موقع تبھی ملے گا جب کوئی مردان کی انگلی تھامے گا اور ان کو سفر کی سعادت بخشے گا۔ اور یہ مجبوری تو خانہ خدا میں حاضری تک کے لئے ضروری کر دی گئی ہے۔ اس لیے خواتین سفر نامہ نگاروں کی تعداد بہت کثیر نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی یہ تعداد اتنی کم نہیں کہ ادب میں اسے کوئی مقام ہی حاصل ہو سکے۔

اس فہرست میں بے شمار ایسے نام ہیں جنہوں نے اس صنف ادب کو نہ صرف اعلی مقام دلایا بلکہ فروغ ادب کے سفر میں بھی ساتھ دیا۔ عورت فرق ہے مرد سے اپنی سوچ میں۔ اپنے مقام میں اپنے ہی تجربات میں اور اپنے اردگرد کے ماحول میں اور سب سے بڑھ کر اسی میں جو تکلیف اسے زندہ تخلیق کو جنم دے کر ملتی ہے اور اس سے وہ کائنات کی تمام اشیاء سے زیادہ محبت کرتی ہے۔ وہ وہی قرب اور کرب اپنی اس ادبی تخلیق کو لکھتے ہوئے محسوس کرتی ہے کہ وہ حساس بھی ہے اور دل و دماغ میں راجہ اندر بننے کی خواہش لیکر نہیں نکلتی بلکہ کچھ پالینے اور کرگزرنے کے جذبے کے تحت نکلتی ہے۔ اور یہی جوش جنوں اسے نئے راستوں اور ان دیکھی منزلوں کو پتا دیتے ہیں۔ اور وہ سخت کوشی کے ساتھ ان مراحل کو طے کرنے پر آمادہ ہے۔ کسی بھی تخلیق کا جائزہ لیا جائے تو اس میں سب سے اہم چیز مشاہدہ، مطالعہ، تجربہ، اسلوب اور انداز بیان ہے کہ سیاح کسی چیز کو کس طرح پرکھتا ہے۔ پس منظر اور پیش منظر کو کیسے بیان کرتا ہے۔ بدلتے رنگ اور بدلتے لوگ اور بدلتی رتیں کیا تاریخی پس منظر کے ساتھ اس پر اثر انداز ہوتی ہیں یہی کچھ جاننے کے لئے ہم چند مشہور مرد و خواتین کے سفر ناموں کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں۔ اردو میں سب سے پہلا باقاعدہ سفر نامہ نگار یوسف کمبل پوش ہے۔ انہوں نے یہ سفر انیسویں صدی کے نصف اول کے انگلستان میں کیا۔ تو کم علمی کے باعث وہ مشاہدات کو حقیقی انداز میں پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ اس وجہ سے ان کا سفر نامہ انگلستان لکھے تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، ثقافتی اور تاریخی تصویر ہے۔ اسلوب بیان بھی ثقیل نہیں ہے۔ سادہ اور سلیس انداز ہے۔

اس طرح اردو کی پہلی سفر نامہ نگار خاتون پر نظر ڈالی جائے تو نازلی رفیعہ سلطان کا سفر نامہ سیر یورپ جو ۱۹۰۸ میں شائع ہوا۔ ان کا مشاہدہ خطوط کی شکل میں ہے لیکن عورت ہونے کے ناطے ان کا مشاہدہ گہرا بھی ہے اور یورپ کی اندرونی زندگی کے حالات کا نقشہ ایک مشرقی حیا یافتہ عورت نے بڑے خوبصورت انداز میں

پیش کیا ہے۔

بیگم سر بلند کا سفر نامہ دنیا عورت کی نظر میں بھی یورپ کی زندگی کا مشاہدہ ہے اور سلطان جہاں بیگم کا سیاحت سلطانی بھی اسی نوع کا سفر نامہ ہے۔

دوسری طرف سرسید احمد خان مسافران لندن محمد حسین آزاد، سیر ایران، شبلی نعمانی سفر نامہ روم ومصر وشام، حامد علی خان سیر حامدی وغیرہ بہترین سفر نامے ہیں لیکن ان تمام اکابرین نے کسی مقصد کے تحت ان ملکوں کی سیاحت نہیں تھی بلکہ اپنی زوال پذیر قوم کے لئے راہ تلاش کرنی تھی کہ ان کو ادب میں سیاست، معاشی، سیاسی، سماجی طور پر بہتر بنایا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انیسوی صدی کے سفر نامے خواہ وہ خواتین کے ہوں یا مرد حضرات بحثیت مجموعی کمزور ہیں اوران میں انکسار اور حیرت زیادہ ہے اور پھر کچھ زبان وبیان نے بھی اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ ہم ان کا جائزہ نسوانی لحاظ سے الگ لے سکیں۔ یوں مجموعی طور پر انیسویں صدی انتشار، بے چینی، بدامنی، سکون کی تلاش، منزل کی جستجو کی صدی تھی۔ اس لیے دونوں قسم کے سفر ناموں میں کوئی اعلیٰ قسم کا ادبی مقام تلاش نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا دور ۱۹۱۰ سے لیکر ۱۹۴۷ تک کا ہے کہ یہ اردو ادب کی تمام اصناف میں عبوری دور کہلاتا ہے۔ اس میں اگر چہ کچھ سفر نامے ایسے ہیں جو خواتین میں پہلے لکھے گئے لیکن شائع بعد میں ہوئے۔ یوں یہ سفر نامے انیسویں صدی کے شمار ہونگے۔ خواتین میں عطیہ فیضی کا ''زمانہ تحصیل'' بہت مشہور ہوا۔ شاہ بانو کا ''سیاحت سلطانی'' وغیرہ نسوانی نقطہ نظر سے خاصے اہم سفر نامے ہیں۔

دوسری طرف خواجہ غلام الثقلین کا ''سیاحت نامہ'' قاضی عبدالغفار کا ''نقش فرنگ'' شیخ عبدالقادر کا ''مقام خلافت'' سید سلیمان ندوی کا ''شہر افغانستان'' خواجہ حسن نظامی کا سفر نامہ مصر، فلسطین وشام۔ اس دور کا اگر مجوعی جائزہ لیا جائے تو ہم واضح طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اس میں سفر نامے محض روداد سفر نہیں ہیں بلکہ ناطرفدارانہ اور غیر جانبدار رویے رکھ کر پرکھنے والے سفر نامے ہیں۔ اب یورپ، روس، مصروشام، ایران، عراق، فلسطین، جاپان، افغانستان کو اس نظریے سے نہیں دیکھا جاتا کہ ہم ترقی میں بہت پیچھے ہیں بلکہ کچھ کر لیتے اور اور آگے بڑھنے کے سبب سے دیکھا جاتا ہے۔ اس میں اگر مقابلہ کیا جائے تو مرد حضرات کے مواقع زیادہ ہونے کے باوجود سفر اور روپے کی کھلی سہولت رکھنے کے باوجود خواتین سفر نامہ نگار کہیں بھی کم دکھائی نہیں

دیتی ہیں۔

خواتین کے لکھے گئے سفر نامہ جو خاص طور پر سفر یورپ کے متعلق ہیں وہ اپنے اندر نہ صرف مرد سفر نامہ نگاروں کے لئے بلکہ پڑھنے والے بے شمار لوگوں کے لئے ایک نئی دنیا کا تعارف بن جاتے ہیں۔ ان میں سے خواتین صرف یورپ اور دیگر ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں بلکہ انہیں یہ شدت سے احساس ہے کہ ایشیائی ممالک بالخصوص برصغیر پاک و ہند تعلیمی لحاظ سے پسماندہ اور تہذیبی اعتبار سے بھی غیر ترقی یافتہ ہے۔

اور خواتین مرد سفر نامہ نگاروں کی نسبت سامان آرائش، اشیائے خورد و نوش، لباس و زیورات، گلے کوچے، مفلسی اور اس کے دکھ، گھر سے دوری اور بچوں کی مجبوری بعض جگہوں پر نہ جانے کا دکھ، مردوں کی برتری، دعوتوں کے سامان، مردوں کی خودستائی کی عادات، ان کا انداز تفاخر یہ سب چیزیں ہمیں خواتین سفر نامہ نگاروں میں بخوبی نظر آتی ہیں۔

اردو سفر نامے کا دور زرین ۱۹۴۱ سے ۱۹۹۰ تک کا ہے۔ سفر میں مشاہدہ جتنا عمیق ہوتا ہے۔ اتنا ہی تجزیہ کا عنصر زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ذوق سفر کو زیادہ تسکین ملتی ہے۔ ایک عام سطحی نظر رکھنے والا سیاح اچھا سفر نامہ نگار نہیں ہوسکتا لیکن سفر نامہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخ، جغرافیہ، ادب و معیشت، سیاست، تہذیب و تمدن، عام بول چال اور رسم و رواج کو بھی سفر نامے میں شامل کرے اور لطیف کیفیات جن سے وہ گزرا ہے۔ ان کو بھی اپنی قوت باصرہ کو زندہ کر کے دوبارہ پیش کرے۔ لیکن سفر نامہ نگار خواہ مرد ہو یا عورت۔ رنگ و نسل اور مذہب کے ساتھ ساتھ احساس کمتری یا برتری کا شکار نہ ہو کیونکہ اس سے تعصب پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے شاہ بانو سفر نامہ سیاحت سلطانی کے بعد جب روداد سفر لکھی تو اس میں انہوں نے اسی تعصب سے کام لیا اور اپنے مخصوص نظریات و عقائد پر قائم رہیں۔

عہد زریں میں خواتین میں اگر چہ ''سفر نامہ اسٹریلیا''، ''پیرس پارس''، ثریا جبین ''الکویت نسرین بانو اکرم، امت القدیر کا ''کراچی سے چاٹگام تک'' وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے جاپان، پیرس، ماسکو، لندن وغیرہ کی سیر عورت نے دنیا کو مخصوص انداز میں دیکھا اور اس کا بیان بھی منفرد ہے۔ مشرقی عورت پاؤں میں ان دیکھی اور انجانی زنجیریں رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کے تجربات میں حیرت ہے۔

بشریٰ رحمٰن ایک ایسی سفر نامہ نگار ہیں جو خودستائی میں مبتلا ہیں۔ وہ دنیا کو کھلی آنکھ سے دیکھتی ہیں لیکن

مستنصر حسین تارڑ کی طرح ہر جگہ پر دو چار عاشق دیدہ و دل فرش راہ کیئے ہوئے ہیں لیکن وہ ماحول جگہ، لوگ، تاریخ، پسند و ناپسند پر بڑے خوبصورت انداز میں تبصرہ کرتی ہیں۔

پروین عاطف بھی روشن خیال مصنفین کی طرح عورت کے ذاتی زندگی کے تلخ تجربات کی بنا پر عورت کی تحریر میں ایک نمایاں فرق ہے۔ انہوں نے ذات کی تنہائی کی وجہ سے خود کلامی پیدا کی اور رنگ نے باہر کی طرف سے افسانہ نگاری کا رنگ بھر دیا۔ ان کا اسلوب بھی نمایاں اور منفرد ہیں۔

جدید عہد میں محمود نظامی کا سفر نامہ بہت مشہور ہوئے۔ ان کا سفر نامہ ''نظر نامہ'' اور سفر نامہ نگاروں کا نیا موڑ ہے۔ وہ حال اور ماضی کا خوبصورت سنگم پیدا کرتے ہیں۔ اور تاریخ کو اچھوتے انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کا رومانوی مزاج سفر نامے کی حقیقت کو افسانے کے نزدیک لے جاتا ہے۔ انکے ہاں نرگیست اجاگر ہے۔ ان کے تمام تر سفر ناموں میں وہ خود کو بحیثیت ہیرو متعارف کرواتے ہیں۔ عطا الحق قاسمی، محمد خالد طاہر کے سفر ناموں نے کچھ ایسا منفرد انداز اختیار کر کے سفر نامے کو ادب کے نزدیک کر دیا۔ پھر محمد سید کاظم نے سفر نامے کو سادگی و پرکاری عطا کی۔

ممتاز احمد نے جہاں نما لکھا، حکیم محمد سعید دہلوی نے ''جرمنی نامہ'' اور ''یورپ نامہ'' میں معاشرے کو تنقیدی لحاظ سے جانچا اور پرکھا اور ایک ماہر معالج کی طرح اسلوب کے انوکھے انداز میں پیش کیا۔

سید احتشام حسین کا سفر نامہ ''ساحل اور سمندر'' جو تعلیمی نقطہ نظر سے کیا گیا۔ ریاض احمد ریاض کی ''برسبیل سفر'' جمیل زبیری کا ''دھوپ کنارا'' امجد اسلام امجد کا ''شہر در شہر'' اسلوب، مشاہدہ، مطالعے، سیاحتی نقطہ نظر، وطن کی محبت، یورپی اقوام، کی ترقی کے بیان کے لحاظ سے بہت خوبصورت نمونے ہیں۔ جمیل زبیری کا سفر نامہ ہندوستان کا سفر نامہ ہے۔ انتظار حسین کا زمین اور فلک اور انتظار حسین کے ماضی کی محبت کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔

رفیق ڈوگر کا سفر نامہ اے آب رود گنگا صحافتی نقطہ نظر کا سفر نامہ ہے۔ ہندیاترا ممتاز مفتی کا زمانی اعتبار سے بہت پیچھے کی روداد ہے۔ لیکن بہت مکمل اور بھرپور ہے۔

اس طرح محمد طفیل کے سفر نامے ''محترم'' دوستوں کی خوبصورت اور زندہ دلی کی محفل ہے۔

''پاکستان یاترا'' جوگندر پال کے بچپن کا عکاس ہے۔ ان کا ہر فقرہ اور ہر شعر جذباتی کیفیت کا عکاس ہے۔ یوں اگر ان سفر ناموں کا مجموعی لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو عورت کی آزادیاں محدود تر ہیں اور اگر ایسے میں پروین عاطف جیسی اپنے دامن میں گہرے احساس دلکش مرقعے نسائی انداز میں پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے سفر نامے کو تخلیقی تجربہ بنا دیا ہے۔ کشور ناہید، ثریا حسین، نوشابہ نرگس، کوثر جمال، تابندہ بتول کے ہاں معاشرتی شعور بڑا گہرا ہے۔ وہ نصیحت بھی کم کرتی ہیں لیکن تہذیب کی کینچلی اتار کر گھٹی گھٹی یا روشن چمک دار فضا سے نکل کر خوبصورت اور ماڈرن و دنیا میں سانس لیتی ہیں لیکن یہ سانس تشنج پیدا نہیں کرتا بلکہ حقیقتوں کو عریاں کرتا ہے۔ اور ان کے اسلوب میں تازگی و رعنائی کے ساتھ معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ قاری کو معلومات بھی بہم پہنچاتی ہیں اور اپنے مقام سے بھی نہیں گرتیں۔ اگر چہ کشور ناہید کے بقول۔

> ''مرد کے لئے ساری کائنات اور عورت کے لئے صرف گھر (بلکہ وہ بھی نہیں) مرد اپنے شوق سے کسی بھی وقت کسی خوف سے بے نیاز ہو کر سفر کر سکتا ہے اور آسانی سے ایک کامیاب و کامران سیاح بن سکتا ہے۔ عورت ضرورت کے تحت ''محرم'' کے ساتھ سفر پر روانہ ہوتی ہے اور اگر کوئی لڑکی اپنے شوق جہاں گردی سے مجبور ہو کر اکیلی رخت سفر باندھ لے تو اس کے سامنے کامیاب سیاح بننے کے امکانات کم اور کچھ اور بننے کے خطرات زیادہ ہوتے ہیں۔(۱)

اس کے باوجود مردوں کی نسبت عورتوں نے کائنات کو ایک نئے زاویے سے دیکھا ہے اور تجربات و مشاہدات کا ایسا جہاں سمیٹا ہے کہ جن میں تضاد بھی ہے۔ معاشرتی اونچ نیچ بھی پابندیاں بھی، آزادیاں بھی، کم فرصتی بھی اور کندھوں پر تلخ زندگی کا بوجھ بھی لیکن میدان کارزار (ادب) میں نکلیں اور اپنا آپ منوایا۔ اسلوب کے لحاظ سے خواتین سفر نامہ نگار خواتین کا اسلوب ان کا انداز فکر ان کی قوت مشاہدہ، انداز بیان ان کی شخصیات کا عکاس ہے۔ وہ ہر علاقے کی سرزمین پر بسنے والے انسانوں کے جذبات، احساسات، ثقافت، معاشرت فکری و جذباتی ترجیحات اور خانگی امور کو بھی مدنظر رکھتی ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں صرف ضیافتوں کا ذکر ہی نہیں ہوتا بلکہ ذائقہ بھی ہوتا ہے۔ اور یہ ذائقہ خاتون ہونے کے ناطے سے ہوتا ہے۔ اکثر اسلوب میں ان کی تشبیہات اور انداز بھی خالص نسوانی ہوتا ہے۔ مثلاً، بشریٰ رحمٰن اپنے سفر نامے میں لکھتی ہیں۔

۱۔ کشور ناہید آجاؤ افریقہ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۵ ص۔ ۷

یوں چل رہے ہوں چّج بٹناں دی جوڑی (۱)

اس طرح ٹک ٹک دیدم ٹوکیو میں

'' سمندر دور سے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کسی بے پرواہ گرہستن نے آٹا گوندھ کے راستہ میں پرات کا پانی گرادیا ہو۔ (۲)

یا پھر پروین عاطف لکھتی ہیں۔

'' یقین کیجیئے لاگ، لپٹ سے دور اپنے وجود کی چاٹی کو بلو بلو کر قلچھٹ سے معنی نکالنے کی جدو جہد اس سے بہتر کہیں اور نہیں ہو سکتی''۔ (۳)

ایک اور جگہ لکھتی ہیں۔

'' نعوذ باللہ وہ جب چاہتی ہے، جسے چاہتی ہے جبلی شرینی کی بناء پر اپنی چھوٹی سی سانولی چھنگلی کے گرد سوٹ کی اٹی کی طرح ول لیتی'' (۴)

مرد سفر نامہ نگار جب سفر پر نکلتا ہے تو وہ سفر نامے میں اپنی فتح مندیوں کا ذکر یوں کرتا ہے جیسے سکندر اعظم فتوحات دنیا کا تذکرہ کرتا ہے اور اس کے لئے ہر لڑکی دیدہ و دل فراش راہ کیئے آنکھوں میں جوت جگائے من میں لگن بسائے صرف اور صرف اسی کا انتظار کر رہی ہے اور وہ اپنے آپ کو راجہ اندر بنا کر پیش کرتا ہے۔

دوسری طرف خواتین سفر نامہ نگاروں کو بے شمار مصائب کا سامنا ہے۔ ان مذہبی، ثقافتی مجبوریاں، فطری شرم و حیا، ازلی جھجک ان کی کچھ حدود متعین کر دیتی ہیں اور یہ عورت کی بالغ نظری اور وسعت مطالعہ ہے کہ وہ ان کی بہترین منظر کشی کرتی ہے کہ لفظوں کا جادو متحرک ہو کر بولتا ہے۔ آزادی کے باوجود شوہر کے پیدا کردہ محور کے گرد گھومتی ہے۔ پاکستانی عورت تو کھل کر آزادی سے لطف اندوز ہو ہی نہیں سکتی کہ مرد کی شان کے خلاف ہے کہ عورت دنیا کی وسعتوں اور زندگی کی رنگا رنگی کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھے لیکن اس کے باوجود عورت نے سفر نامے کو اپنی نسوانیت کے لطیف رنگوں سے بھر دیا ہے۔۔ اور زندگی کے ایسے دلکش گوشے اور خوبصورت مناظر ہمارے سامنے پیش کئے ہیں کہ مرد اپنی ذی فہمی کے باوجود ان پنہاں گوشوں سے روشناس نہیں ہو سکا۔ عورت کسی مقام سے بے نیاز ہو کر نہیں گزرتی وہ حسن لطافت سے ہر منظر میں جان ڈال دیتی ہے۔ وہ زندگی کے متنوع رنگ، دکھ سکھ میں ہی نہیں صبح کی چمک اور رات کے اندھیرے میں بھی منزل تلاش کرنے کی صلاحیت

۱۔ بشریٰ رحمٰن براہ راست ادارہ وطن دوست ص۔ ۴۲

۲۔ بشریٰ رحمٰن ٹک تک دیدم ٹوکیو ص۔ ۱۵

۳۔ پروین عاطف ٹپر داسی ص۔ ۱۰

۴۔ پروین عاطف ٹپر داسی ص۔ ۷۱

رکھتی ہیں۔ وہ محبت، امن، شانتی کے جذبوں کو اجاگر بھی کرتی ہے اور زندگی کے روشن پہلوؤں کا احاطہ بھی کرتی ہے۔ وہ شخصیات کا مطالعہ اپنے انداز فکر اور قوت مشاہدہ سے کرتی ہے۔ وہ تاریخ کے جھروکوں کا سفر انسانی تجربات کے ساتھ کرتی ہیں۔ کہیں کہیں خواتین کے ہاں نسائی رنگ کے ساتھ ساتھ ماما کا جذبہ بھی بھرپور انداز میں نظر آتا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سفرنامے کا فن شخصیت، ماحول، حقائق، واقعات اور اسلوب نگارش پر مبنی ہے اور یہ تمام فنی چیزیں ہمیں خواتین سفرنامہ نگاروں میں نظر آتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ زیرکی اور خالص نسوانی نقطہ نظر جس کی وجہ سے خواتین سفرنامہ نگاروں کا مقام کہیں بھی قابل مذمت نہیں بلکہ قابل ستائش ہے۔

اختتامیہ وحاصل بحث :-

اس تمام تحقیقی کام کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو سفر نامے کے ابتدائی دور پر اگر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں ہندوستانی معاشرے کے لیے تہذیبی، تمدنی، سیاسی، معاشی، معاشرتی طور پر انقلاب آفرین صدی تھی۔ مغلیہ سلطنت کمزور ہو چکی تھی۔ انگریز زبردستی عنان حکومت پر قابض ہو چکے تھے۔ مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں مفلوک الحال اور فاقہ زدہ تھے۔ مغربی تہذیب وتمدن کی چمک دمک سے لوگ متاثر تھے اور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ مذہب کو نئے سانچے میں ڈھال کر دیکھا جا رہا تھا۔ جدید علوم اور سائنسی ترقی سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔

جبکہ انیسویں صدی ایک ایسی صدی تھی جس نے مشرق کے حاضر کو مغرب کی ظرف راغب کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور جو بھی سیاح ان ملکوں میں گیا وہاں کی ترقی اور سہولیات کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ احساس کمتری کا شکار ہو گیا۔ اس احساس کمتری کیوجہ سے وہ وہاں کی بے حد تعریف وتوصیف کرنے لگا۔ اس کی بڑی وجہ تو ملکی وتعلیمی پسماندگی اور دوسرا محکومی تھی کہ جس کی وجہ سے وہ ذھنی طور پر بھی غلام بن گیا اور اسکا فطری سیاح پن کھل کر سامنے نہ آسکا۔ بلکہ محکوم قوم کا محکوم سفر نامہ جو ایسے پیرائے میں اظہار کرتا ہے کہ اس سے اس کی ذھنی کشمکش بالکل واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

اگر چہ اس دور میں سرسید احمد خاں جیسے سیاح بھی تھے جو اس ترقی کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ ایسی ترقی اور فلاح و بہبود انہی راستوں پر چل کر اپنے ملک کے لیے بھی تلاش کی جائے تاکہ قومی سطح پر اس ڈوبتی ناؤ کو بچایا جاسکے۔ یعنی انگریزی تعلیم اور سائنسی ترقی کو وہ اپنے لوگوں کی بہتری کے لیے متعارف کروانا چاہتے تھے تاکہ اس صدی کے چیلنجوں کا مقابلہ کیا جاسکے۔ مگر بحثیت مجموعی مشرق کے لوگ مغرب سے متاثر ہی نہیں دم بخود بھی تھے۔

تو یوں پاکستان بننے سے پہلے کے سفر ناموں کی تاریخ کا جائزہ لینے سے یہ بات پتہ چلتی ہے کہ اس دور کا سفر نامہ نگار تخلیقی عمل اور سیاسی نقطہ نظر سے دوسرے ممالک کے بارے میں سطحی معلومات فراہم کرتا ہے۔ وہ خارج سے داخل کا سفر نہیں کرتا وہ مسرت کشید کرنے کے ہنر سے ناآشنا تھے وہ نظاروں کو عطیہ خداوندی سمجھ کر لطف وانبساط حاصل نہیں کرتا وہ ذات کو پس پشت ڈال کر صرف تاریخی حقائق اور کوائف اور تہذیبی ترقی پر روشنی ڈالتا ہے۔

اس دور کے سفر نامہ نگاروں کا بیان اور منظر نگاری متحرک ہونے کی بجائے سپاٹ ہے اور اسلوب بیانیہ کی بجائے صرف لفظوں کا استعمال ہے۔ ۱۹۴۷ سے قبل کا سیاح جب یورپ گیا تو انہیں یورپ کی ترقی عجوبہ نظر آئی وہ ان

کی تعلیمی اور سائنسی ترقی سے بہت متاثر ہوئے یہی وجہ ہے کہ اس دور کی خواتین سفر نامہ نگاروں کے ہاں ایک تو تعلیم کی کمی اور دوسرا تاریخی پس منظر سے لاعلمی کی وجہ سے اور سب سے بڑھ کر آزادی میسر نہ ہونے کے باعث ان کے ہاں زندگی اور سفر نامہ کا کینوس بہت محدود نظر آتا ہے اور بالکل سطحی سا لگتا ہے

اس دور کے سفر نامے اسلوبی لحاظ سے بے حد کمزور ہیں۔ خواتین کا نسائی انداز اگر چہ کہیں کہیں دلچسپی کا سامان پیدا کرتا ہے مگر ان کی دلچسپی کا محور رہن سہن کے بارے میں ہے۔ جن میں ان کی ملکوں کی معاشرت سے زیادہ سجاوٹ کا ذکر کیا گیا ہے۔

ایک اور اہم نقطہ اس دور کے سفر ناموں کے بارے میں قابل ذکر ہے کہ یہ سفر نامے ڈائری یا روز ناموں کی شکل یا پھر ان خطوط کا مجموعہ ہیں جو ان خواتین نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو لکھے تھے اور یوں ان خواتین کی واقعات کے ساتھ جذباتی وابستگی نہیں۔ صرف لفظی دل بستگی تھی۔ منظر پوری طرح بیان کرنے کے باوجود بھر پور تاثر نہیں جمتا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے قبل کے سفر نامے باوجود اس کے کہ اس میں یورپ کی قصیدہ خوانی ہے۔ اتنی دلچسپی سے نہیں پڑھے جاتے۔

اس دور میں جن خواتین نے سفر نامے لکھے۔ ان میں زیادہ امراء اور نوابین کی خواتین تھیں کہ جن کی معلومات ذاتی طور پر کم مگر سنی سنائی باتوں پر زیادہ انحصار تھا اور اس قسم کے سفر ناموں میں عام آدمی کے مسائل اس کی ذات اس کے معاشرتی مقام کی بجائے رؤسا اور امراء اور سیاسی شخصیات کا ذکر ہے۔ جس سے عام قاری اتنی دلچسپی نہیں رکھتا ہے لیکن ایک بات بہر حال طے ہے کہ ان سفر نامہ نگار خواتین کے دل میں ذوق تجسس اور لگن تھی کہ وہ دنیائے ادب کے لئے کچھ کریں۔ اس کی آبیاری کریں تا کہ اس سے نئی کونپلیں تیار ہوں اور اگلی صدی تک تناور درخت بن کر کامیاب وہ کامران ہوں۔ اس لئے ہم ان کی ان کوششوں کو فراموش نہیں کر سکتے۔

سفر ذہنی اور دنیاوی دونوں سطحوں پر کار آمد ہوتا ہے۔ کسی بھی دور کا ادب ادیب کے ذہنی اور زندگی میں تبدیلی کے رویوں کا مظہر ہوتا ہے بیسوی صدی کے ساتھ ہی ادبی دنیا میں بھی نیئے رجحانات اور انقلاب نظر آنے لگے۔ ہندوستان کی زندگی میں صدیوں پرانی تہذیب واقدار کی بظاہر شاندار مگر کھوکھلی عمارت اب منہدم ہو چکی تھی۔ انگریزی حکومت کے جبر اور گری ہوئی عمارت کے ملبے کے درمیان کھڑے ہوئے شخص کے وہ قفل آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگے تھے۔ وہ قفل جن کے تحت وہ ملکی اور عالمی سطح کے حالات سے بے خبر اور لاعلم ایک ہی طرز اور ڈگر پر زندگی گزار رہا تھا۔ اب وہ آزادی کے بعد کشمکش سے نکل کر ایک واضح لائحہ عمل تیار کر چکا تھا۔ دنیا کا نظارہ وہ کھلی آنکھ اور ذہن کیساتھ کر رہا تھا۔ وہ آزاد ملک کا آزاد شہری تھا۔ انتھک محنت کے بعد منزل پانے کے جوش نے اس کے اندر شدت اور توانائی پیدا کر

دی تھی۔ اب اس کی سوچ کا مرکز ومحور اندھیرا، سایہ، تاریکی یا گمنامی نہیں بلکہ ایک روشن صبح اور حسین مستقبل ہے۔
مستقبل کی اس امید اور لگن نے اسکے اندر جو توانائی پیدا کی تھی۔ اسکے باعث اب وہ مغرب اور یورپی اقوام کیساتھ انکھ ملاتا ہے۔ترقی کی دوڑ میں پیچھے نہیں رہتا۔ بلکہ کچھ کرنے کا عزم اور منزل پر پہنچ کر بھی نہ بیٹھنے کا جذبہ اسکے اندر بیدار ہوئے کہ وہ ایک خوبصورت مضبوط ٹھکانے اپنے گھر یعنی پاکستان کا شہری ہے۔ اس لئے اس دور کے ادیب کے اندر ۱۹۴۷ والا احساس کمتری نہیں ہے وہ یورپ کی ترقی سے متاثر ضرور ہوا ہے لیکن اب وہ انکے قدم ملانے کی خواہش رکھتا ہے اور جذبے جوان ہوں تو منزلیں آسانی سے مل جاتی ہیں۔

اس لئے آزادی کے بعد کا سیاح نہایت ذہین، زیرک، وضع دار، رکھ رکھاؤ والا اور مخصوص نہج پر سوچنے والا تھا۔ پرانی روایات اور علامات سے ہٹ کر پوری قوم کو ایک مرکز پر اکھٹا کرنا ادب کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ کیونکہ اب قوم نئے معیار کے ساتھ مستقبل کی تشکیل کرنا چاہتی تھی۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کا ادب اپنے اندر بے شمار رویوں کو رکھتا ہے۔ جہاں ایک طرف صدیوں کی غلامی کے بعد اب ذہن و دل اذنِ پرواز مانگ رہا تھا۔ دلفریب مناظر کی رعنائیاں اب پچھتاوے کی آگ سے نکل کر روایت میں جکڑنے کی بجائے مغربی کلچر کی تقسیم کی خواہاں تھیں۔ وہیں پر ۱۹۷۱ء کے سانحہ نے ادیب اور سیاح کے فکری سانچوں کو یک لخت بدل دیا تھا۔ ہر دور اپنے اندر بے پناہ صلاحیتیں رکھتا ہے۔ ادب میں ماضی، حال اور مستقبل کے رویے بولتے ہیں کسی بھی صنف کے ادیب کی انفرادیت اسکے مشاہدے، مطالعے اور عمیق نظری کیساتھ، فکری گہرائی میں ہوتی ہے۔ اسی سانحے نے ہمارے سیاح کے اندر فکری اختلاف کو جنم دیا کیونکہ ادیب معاشرے سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ بے روح تخلیقات کبھی معاشرے میں انقلاب کا باعث نہیں بنتی ہیں۔

تخلیق میں تنوع اور ہمہ رنگی کی صفات اگر موجود ہیں تو زمانی حدود و قیود سے مبرا ہو کر وہ شہرت اور بقائے دوام حاصل کر لیتی ہیں۔ انسانی رابطوں کی تلاش ادیب کا نہیں قاری کا کام ہے لیکن معاشرے میں انکو منظم کرنے کی کاوش ادیب کی ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اس دور کے سفرناموں میں جہاں ہم بے حد طمانیت محسوس کرتے ہیں وہاں ایک خوف کی فضا بھی نظر آتی ہے لیکن مجموعی طور پر ادب کی فضا میں ایک انقلاب ضرور آیا جو کہ مرد سفرنامہ نگاروں کے ہاں زیادہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔

کیونکہ اب ادیب نے خود آگاہی اور خود پسندی کا علم حاصل کر لیا ہے۔ اب وہ نظارے کیساتھ ہم نظارہ ہو کر اپنا مدعا بیان کرتا ہے پھر نوک قلم سے انہیں دلکشی عطا کر کے اسے دلچسپ پیرائے میں بیان کرنے کا فن جانتا ہے۔ اس دور کے ادیب نے سفرنامے کو افسانے سے قریب کر دیا ہے۔ کیونکہ فکری آزادی اور سائنسی ترقی نے

سیاح کونظریاتی طور پر بھی وسعت بخشی ہے۔اب سفرنامہ معلوماتی کیساتھ ساتھ مزاح،طنز،رومان،شوخی لئے ہوئے ہے اب سیاح محض مبصر ین نہیں بلکہ منظراور راستہ ہے۔ اب وہ ذات کواولیت بخشتا ہے۔ اس دور کا ادیب بے باک،نڈراور منفرد شخصیت کا حامل ہے۔ جسے بیگم اختر ریاض الدین کی مثال ہے کہ جنہوں نے مغربی کلچر کی تشریح ہی صحیح طور پر نہیں کی بلکہ انہوں نے مغربی معاشرے کی خود انحصاری کیساتھ ساتھ نئی نسل کی برگشتگی اور سائل کو بھی محسوس کیا ہے۔

اس دور کا سیاح کوائف ہی جمع نہیں کرتا بلکہ وہ فطری انداز میں قاری کو ساتھ لیکر چلتا ہے اور کچھ کرنے کی لگن بیدار کرتا ہے۔ وہ قطرے کو گہر بنانے کے فن سے آشنا ہے۔اگر چہ اس میں اسے بہت کاوش درکار ہوئی۔

اس کے بعد ۱۹۷۱ء سے تا حال کے سفرناموں کا جائزہ اگر لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ تخلیق خلا میں جنم نہیں لیتی، کسی ادبی ذوق میلان اور تخلیقی امکان کی عمر قطعی اور دوٹوک انداز میں ممکن نہیں تاہم کسی تخلیقی تجربے کو عمومی قبولیت اور پختہ عوائد کے پہنچنے میں دو تین دہائیوں سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے پچھلے تخلیقی تجربے کے امکانات ختم نہیں ہوتے بلکہ رخ بدل لیتے ہیں۔ کیونکہ اچھی تخلیق روایت کی مضبوطی اور تجربات کی بھٹی سے ہی گذر کر کندن بنتی ہے۔ تخلیق جب تحریر بن کر تاریخ وادب کا حصہ بنتی ہے تو وہ لوگوں کے دل و دماغ دونوں پر حکومت کرتی ہے

اور جب روایات بدلتی ہیں تو معاشرے کے بندھن بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھر معاشرے اور ذہن کی پیداوار کی تخلیقی سطح از سرنو تعمیر کرنا پڑتی ہے۔ یوں ۱۹۷۱ء کے بعد زندگی نئے سرے سے رخ سے نقاب اتارتی ہے کیونکہ ایک ہی زاویے اور رخ سے دیکھنے سے زندگی واضح نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی اسکی تمام جہتیں اور اسکے تمام پرت کھل کر سامنے آتے ہیں۔ جب اس مرقع میں درد وغم کیساتھ فرحت بخش اور لطافت آمیز کیفیات کشید کی جاسکتی ہیں۔ اس دور کے اہم سفرنامہ نگاروں میں ش فرخ، بشریٰ رحمٰن، سلمیٰ یاسمین، پروین عاطف، کوثر جمال، سائرہ ہاشمی، فرخندہ جالی وغیرہ ہیں کہ جنہوں نے مشاہدے کیساتھ جذبات اور احساسات سے ہم آہنگ ہو کر دنیائے ادب میں انقلاب برپا کردیا۔

ان خواتین سفرنامہ نگاروں کے ہاں گہرائی ہے وہ غیر منطقی فکر کو پسند نہیں کرتی ہیں بلکہ توازن اور تناسب سے نئی فکر کو پیدا کرتی ہیں۔ وہ قوموں کے تہذیبی وتاریخی پس منظر سے آشنا ہیں وہ ذومعنی فقروں اور اسلوب پر مکمل دسترس رکھتی ہیں۔ جسکی وجہ سے ان کے سفرنامے نئے رنگ میں نظر آتے ہیں۔ جس میں تخیل اور حقیقت کا حسین امتزاج ہے۔

اس دور کی خواتین کے ہاں نسائی رنگ پوری جزئیات سمیت نظر آتا ہے۔ جیسے پروین عاطف ہیں وہ عورت کے باطن کا سفر بغیر جھجھکے کرتی ہیں۔ وہ تجربے میں مشاہدہ کا رنگ بھر دیتی ہیں کہ زندگی خوبصورت نظر آنے لگتی ہے۔

ہے اور اسکی سنگینیاں بھی کسک دیتی ہیں ۔ اپنی معلومات اور اسلوب پر دسترس کی وجہ سے وہ اپنے اندر چھپی ہوئی خواہشات اور باہر ناچتی ہوئی دنیا اور سسکتی ہوئی Sex پر بھی بے باک تبصرہ کرتی ہیں۔ انکے سفرنامے اس صدی کی عورت کے باطنی کرب کے سفرنامے ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف آخر سے لیکر اب تک سینکڑوں سفرنامے لکھے گئے ہیں۔ ان دھائیوں میں تاریخی، معلوماتی اور مذہبی سفرناموں کا رجحان بھی سامنے آیا ہے۔ اب سفرنامے متحرک ہو کر قاری کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آج کا سفرنامہ طنز و مزاح کی چاشنی سے بھی مزین ہے جیسے سلمٰی یاسمین کا کوئے ملامت ہے کیونکہ مستنصر حسین تارڑ جیسے سیاحوں نے کھلی آنکھ کی بجائے دنیا کو کھلنڈری آنکھ سے دیکھا اور حیرتوں میں گم کرنے کے ساتھ ساتھ حقیقتوں کو بھی وا کیا ہے۔ اب سیاح یہ جانتا ہے کہ معاشرتی ناہمواریوں پر اظہار تاسف کی بجائے کھل کر قہقہہ لگانا ہے۔

وطن سے دور رہ کر بقا کی جنگ لڑنے والوں کے لئے جواز بیتیں ہیں خواتین سفرنامہ نگاروں نے عمومی طور پر مگر خواتین کے اس قبیلے کی کشور ناہید نے اور کوثر جمال نے انہیں پوری شدت سے محسوس کیا ہے اور لفظوں میں اسکا نقشہ اس طرح سے پیش کیا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ ہم خود اسی کرب سے گذر رہے ہیں۔

اسی طرح حج کے سفرنامے لکھنے کا رواج بھی نئے دور کے زاویوں میں سے ہے۔ حج عقیدتوں کا سفر ہے۔ حج کے کثیر تعداد سفرناموں کے باوجود ہر سفر کرنے والا اپنے جذبوں کو عشق کے رنگ میں ڈھال کر کوئی ایسا گوہر نایاب تلاش کرتا ہے کہ جہاں دل و نگاہ کو سرور اور سکون حاصل ہو، حقیقتاً حج کا سفر مسلمان کی روح کا سفر ہے۔ اس سفر میں جذبہ و شوق ہجر و وصال جب دید کے وصال سے سرشار ہوتے ہیں تو کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

انسان عبادت و ریاضت زہد و تقویٰ کے جس مقام پر بھی ہو دیار حبیب پہنچ کر اپنی کم مائیگی کا احساس اسے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ اس وقت کا احساس جب لفظوں کا روپ دھار لیتا ہے تو تب نظارہ روح پرور ہو جاتا ہے۔ آنکھ حد ادب کو مدنظر رکھتی ہے۔ اور دل دھڑکتا ہے اور لبیک لبیک کرتے ہوئے سر جھکتا ہے۔ اللہ ہو کا نعرہ مستانہ ہوتا ہے اور عجز و انکساری سے انسان پگھل پگھل جاتا ہے۔ بڑے بڑے پارسا حقیر تنکے کی طرح یہاں رسائی کے خواہشمند ہیں کیونکہ سفر اگرچہ ایک جیسا ہے مگر واردات قلبی مختلف ہے اور یہ ہی انسان کے بنیادی رویوں کی داستان ہے۔ یہاں زندگی ایک نئے مفہوم سے آشنا ہوتی ہے۔ یہاں پہنچ کر وجدان کی ناقہ پر عرفان کا محمل سجایا جاتا ہے یعنی وہ مقام کہ جہاں ہر مسلمان کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش میں وہ لمحہ ہوتا جہاں قبولیت مجسم ہو کر سامنے آتی ہے۔ حجاج سیاح اپنی کم مائیگی کا اور عجز کا حال نمناک آنکھوں اور ڈوبتے دلوں سے کرتے ہیں اور دیدہ و دل کی فرش راہ کیئے ایسا نظارہ پیش کرتے ہیں کہ قاری پر بھی وجد کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے اور جذبہ شوق اور بھڑک اٹھتا ہے

اور ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

خواتین سفرنامہ نگاروں میں بیگم ہمایوں مرزا اور محمودہ عثمان صاحبہ نے مقامات مقدسہ اور زیارت گاہوں کے بارے میں کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ کنیز بیگم کا ارض مقدس، وحیدہ نسیم بشریٰ رحمٰن، زبیدہ بیگم وغیرہ کے سفرنامے عقیدت و محبت کی عجیب داستان لیے ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی سے لیکر بیسویں صدی کے وسط کے بیشتر حج نگاروں کا بنیادی مقصد صرف راہنما کتب کی فراہمی تھی۔ احکام و مسائل اور مناسک حج کے سلسلے کی معلومات فراہم کرنا تکنیکی اعتبار سے ڈائری یا آپ بیتی کا انداز زیادہ تر سفرناموں میں نظر آتا ہے۔ آخری دور میں دردمندی ساتھ ساتھ تاریخ اور جغرافیہ کا بیان اور ذہنی اور قلبی داستان بھی سفرناموں کا حصہ بن گئی کیونکہ ادب میں داخلیت، اصلیت اور جمالیات ہم آہنگ ہو کر انسانی افکار و نظریات کی تعمیر کرتے ہیں۔ ادب کے تقاضے اور فکری لوازمات دوسری اصناف سخن کیطرح سفرنامے کے لیے بھی لازم ہیں۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ادب کی صنف میں سفرنامے ایک معتبر حوالہ ہیں اور وقت اور زمانے کے ساتھ ان کی نوعیت تکنیک اور ساخت اور بیان میں تبدیلیاں آتی رہیں ~~تھا~~ ہیں۔ جب تک انسان ہے سفر اسکی زندگی کا حصہ ہے۔ اسی لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ سفرنامے کی تاریخ بہت تابناک ہے اور اسکا مستقبل روشن ہے۔

———— :۰ ————

کتابیات

(۱) القرآن

۱۔ تفسیر القرآن از ابوالاعلیٰ مودودی (تفہیم القرآن) ج ۶ ترجمان القرآن لاہور

۲۔ تحقیقی و تنقیدی کتب

۱۔ ابن بطوطہ، سفر نامہ ابن بطوطہ، مترجم رئیس احمد جعفری نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۱ء

۲۔ [illegible]

۳۔ افتخار شیروانی، عورتوں کی محکومیت، فیروز سنز لاہور ۱۹۹۳ء

۴۔ افضل علوی، سخنے چند، دیباچہ زہے نصیب از زبیدہ حئی ۱۹۸۳ء

۵۔ افضل علوی، دیکھ لیا ایران، الحروف لاہور ۱۹۸۳ء

۶۔ انور سدید، (ڈاکٹر) اردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۸۷ء

۷۔ تاراچند (ڈاکٹر)، تمدن ہند پر اسلامی اثرات، آلہ آباد ۱۹۴۹ء

۸۔ جمیل زبیری، موسموں کا عکس، بختیار اکیڈمی کراچی ۱۹۸۴ء

۹۔ رشید امجد، آسمان گواہ اپنا، از رفعت گل (پیش لفظ) ماڈرن بک ڈپو اسلام آباد ۱۹۸۴ء

۱۰۔ رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۱ء

۱۱۔ رفیق ڈوگر، اے آب رود گنگا، نوائے وقت پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۱ء

۱۲۔ سید عابد علی عابد، اصول انتقاد ادبیات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۹ء

۱۳۔ سید عبداللہ (ڈاکٹر)، حافظ و خیام، (پیش لفظ) از مقبول بدخشانی غالب پبلشرز لاہور ۱۹۷۹ء

۱۴۔ صابر نظامی، آزادی عورت، ادارہ تفہیم الاسلام لاہور ۱۹۸۸ء

۱۵۔ ظہیر احمد صدیقی، سخنے چند، دیکھ لیا ایران از افضل علوی دیباچہ اشرف اکیڈمی لاہور ۱۹۹۲ء
۱۶۔ عبادت بریلوی (ڈاکٹر)، ادب اور ادبی قدریں، ادارہ ادب وتنقید لاہور ۱۹۸۳ء
۱۷۔ عبدالوہاب، (مولانا) اسلامی نظام حیات، فیروز سنز پریس س۔ن۔
۱۸۔ غلام اکبر ملک، عورت کا مقدمہ اسلام کی عدالت میں، جنگ پبلیکیشنز لاہور ۱۹۸۳ء
۱۹۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۷۹ء
۲۰۔ کشور ناہید، عورت زبان خلق سے زبان حال تک، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۲ء
۲۱۔ گستاؤلی بان، تمدن عرب، مترجم سید علی بلگرامی حیدرآباد دکن ۱۹۳۶ء
۲۲۔ قدسیہ قریشی، (ڈاکٹر) اردو سفرنامے انیسوی صدی میں، نصرت پبلشرز لکھنو ۱۹۸۷ء
۲۳۔ قطب النساء ہاشمی، تین مسافر، نیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن ۱۹۴۶ء
۲۴۔ محمد طاہر بنیرہ آزاد (آغا)، سیر ایران (دیباچہ)، از محمد حسین آزاد کریمی پریس لاہور ۱۹۸۴ء
۲۵۔ محمود نظامی، نظر نامہ، گوشہ ادب لاہور ۱۹۸۵ء
۲۶۔ مرزا حامد بیگ، (ڈاکٹر)، اردو سفر نامہ کی مختصر تاریخ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۷ء
۲۷۔ مستنصر حسین تارڑ، فلیپ (جس دیس میں گنگا بہتی ہے)، از ثریا حفیظ الرحمٰن بک ٹاؤن،
اسلام آباد ۱۹۹۵ء
۲۸۔ مسرت کانجوی، بیسویں صدی میں اردو ادب، اردو اکادمی سندھ کراچی ۱۹۱۸ء
۲۹۔ مشفق خواجہ، دیباچہ موسموں کا عکس از جمیل زبیری، بختیار اکیڈمی کراچی ۱۹۸۱ء
۳۰۔ مظہر الدین صدیقی، عورت اسلام میں، مکتبہ آرٹ پریس لاہور ۱۹۸۲ء
۳۱۔ وزیر آغا (ڈاکٹر)، چوری سے یاری تک، مکتبہ اردو زبان سرگودھا ۱۹۹۶ء
۳۲۔ وحید قریشی (ڈاکٹر)، تبصرہ اے آب رود گنگا، از رفیق ڈوگر نوائے وقت پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۱ء
۳۳۔ وحید الدین سلیم، مضامین سلیم، ج ۲ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۴۱ء
۳۴۔ یوسف کمبل پوش، عجائبات فرنگ، (تاریخ یوسفی) مکتبہ نول کشور لکھنو ۱۹۷۳ء

۳۔ خواتین کے سفر نامے

۱۔ امت القدیر، کراچی سے چاٹگام تک، آفتاب اکادمی کراچی س۔ن۔

۲۔ امیر خانم، میرا سفر، اشرف پریس لاہور ۱۹۹۵ء

۳۔ بشریٰ رحمٰن، ٹک ٹک دیدم ٹوکیو، ادارہ وطن دوست لاہور ۱۹۸۶ء

۴۔ بشریٰ رحمٰن، براہ راست، ادارہ وطن دوست لاہور ۱۹۸۳ء

۵۔ بلقیس ریاض، بحر ظلمات سے آگے، مقبول اکیڈمی کراچی ۱۹۸۳ء

۶۔ بلقیس ریاض، مسافتیں کیسی، جنگ پرنٹنگ پریس لاہور ۱۹۸۴ء

۷۔ بیگم اختر ریاض الدین، سات سمندر پار، حمایت اسلام پریس لاہور ۱۹۶۳ء

۸۔ بیگم اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، ادارہ فروغ اردو لاہور ۱۹۹۹ء

۹۔ بیگم تاج یسٰین، آسٹریلیا کی جھلک، الہدیٰ بک ایجنسی لاہور ۱۹۶۳ء

۱۰۔ بیگم عطیہ وجیہ الدین، آسٹریلیا اور اس کے لوگ، ادبی دنیا لاہور ۱۹۵۸ء

۱۱۔ تابندہ بتول، شالیمار سے تاج محل تک، مکتبہ آرٹ پریس لاہور ۱۹۹۴ء

۱۲۔ پروین عاطف، کرن تتلی بگولے، جنگ پرنٹنگ پریس لاہور ۱۹۸۷ء

۱۳۔ پروین عاطف، ٹپر واسنی، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۱ء

۱۴۔ ثریا حفیظ الرحمٰن، جس دیس میں گنگا بہتی ہے، بک ٹاؤن اسلام آباد لاہور ۱۹۹۱ء

۱۵۔ خالدہ ادیب خانم، سفرنامہ ہند، مترجم سید ہاشمی فرید آبادی، تخلیقات لاہور ۱۹۹۴ء

۱۶۔ ذکیہ ارشد، سورج کے ساتھ ساتھ، مکتبہ دانیال لاہور ۱۹۹۴ء

۱۷۔ رضیہ فصیح احمد، سیر کر دنیا کی، ادارہ ادب و تنقید لاہور ۱۹۸۸ء

۱۸۔ رضیہ فصیح احمد، دو تھے مسافر، مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۹۴ء

۱۹۔ سائرہ ہاشمی، کیمرج اور کیمرج، مکتبہ آرٹ پریس لاہور ۱۹۸۹ء

۲۰۔ سلطان جہاں بیگم، سیاحت سلطانی، مفید عام پریس، آگرہ، ۱۹۱۵ء

۲۱۔ سلطانہ آصف فیضی، عروس نیل، مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۵۲ء

۲۲۔ سلمیٰ اعوان، میرا گلگت و ہنزہ، مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۹۷ء

۲۳۔ سلمیٰ اعوان، یہ میرا بلتستان، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۸۵ء

۲۴۔ ش فرخ، نئی دنیا پرانی دنیا، ادارہ ادبیات کراچی، ۱۹۷۶ء

۲۵۔ صغریٰ بیگم حیا، سفرنامہ یورپ، ج۔اول و دوئم، گیلانی پریس لاہور ۱۹۵۲ء

۲۶۔ عطیہ بیگم رحیمن، زمانہ تحصیل، مفید عام پریس آگرہ ۱۹۲۲ء

۲۷۔ فرخندہ جالی (ڈاکٹر)، گرین کارڈ، فیروزسنز لاہور ۱۹۹۲ء

۲۸۔ فرخندہ جالی (ڈاکٹر)، کریڈٹ کارڈ، فیروزسنز س۔ن

۲۹۔ فرخندہ جالی (ڈاکٹر)، پرایا سفر، فیروزسنز لاہور ۱۹۹۷ء

۳۰۔ کوکب خواجہ، نی ہاؤ، فیروزسنز لاہور ۱۹۹۰ء

۳۱۔ کوثر جمال، چینی منگولوں کے شہر میں، نیوای پبلشرز اسلام آباد ۱۹۸۷ء

۳۲۔ قراۃ العین حیدر، جہان دیگر، مکتبہ اردو ادب لاہور س۔ن

۳۳۔ مہر النساء، ہمارا سفر سرگزشت، ارسطو اکیڈمی حیدرآباد دکن ۱۹۵۲ء

۳۴۔ نجمہ افتخار راجہ، میرے بھی سفرنامے، مکتبہ اہل قلم ملتان لاہور ۱۹۲۸ء

۳۵۔ نجمہ افتخار راجہ، سایونارا، بیکن بکس ملتان ۱۹۸۹ء

۳۶۔ نسرین بانو اکرام (الکویت)، اردو پریس لاہور، ۱۹۶۳ء

۳۷۔ نوشابہ نرگس، سفر کہانی، بیکن بکس ملتان ۱۹۹۰ء

۳۸۔ نیلم احمد بشیر، نیلا ان نیپال، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۸ء

۷۔ حج کے سفر نامے

۱۔ انور ملک، زیارت حرمین، نیو کریسنٹ لاہور س۔ن۔

۲۔ بشریٰ اعجاز، عرض حال، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۰ء

۳۔ بشریٰ رحمٰن، باؤلی بھکارن، ادارہ وطن دوست لاہور ۱۹۸۳ء

۴۔ بشریٰ رحمٰن، نسیما جانب بطحا گذر کن، ادارہ وطن دوست لاہور ۱۹۸۱ء

۵۔ بشریٰ رحمٰن، منزل عشق پہ تنہا پہنچے، ادارہ وطن دوست لاہور ۱۹۸۸ء

۶۔ بلقیس ریاض، سفر حرمین، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۱ء

۷۔ زبیدہ حئی، زہے نصیب، اردو اکادمی کراچی ۱۹۸۷ء

۸۔ سیدہ حمیدہ فاطمہ، لاہور سے دیار حبیب تک، الحمرا پریس لاہور ۱۹۸۳ء

۹۔ عفت الٰہی علوی، سفر نامہ حجاز و حج بیت اللہ، انجمن اسلام پریس لاہور س۔ن

۱۰۔ غزالہ ارشد، اجالوں کا سفر، اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۸۲ء

۱۱۔ فاطمہ بیگم، حج بیت اللہ و زیارات دیار حبیب پیسہ اخبار لاہور ۱۹۵۹ء

۱۲۔ فوزیہ سلیمی (ڈاکٹر)، حاضری، فیروز سنز لاہور ۱۹۹۵ء

۱۳۔ کنیز بیگم، ارض مقدس، جنگ پرنٹنگ پریس سیالکوٹ ۱۹۴۴ء

۱۴۔ محمودہ عثمان، مشاہدات بلاد اسلامیہ، ادارہ علم مجلس کراچی ۱۹۹۰ء

۵۔ لغات اردو و انگریزی

۱۔ فیروز اللغات، فیروز سنز لاہور س۔ن۔

۲۔ جامع اللغات اردو، خواجہ عبدالحمید بی۔اے ج۔۳، لاہور ۱۹۹۲

۳۔ Webster Illustrated Contomparary Dictionary

۴۔ Webstar New World Dictionary (Encyolopedia Edition)

۵۔ American Language Dictionary College Edition

۶۔ مجلات و اخبارات

۱۔ ماہنامہ سیپ خالد اقبال یاسر، نظم سفر نامہ، شمارہ ۵۷۰ سیپ پبلی کیشنز ستمبر ۱۹۹۱ء

۲۔ ماہنامہ اوراق، جنوری فروری مضمون مرزا ادیب، ۱۹۷۸ لاہور

۳۔ ماہنامہ اوراق، جنوری فروری مضمون سلیم اختر، ۱۹۷۸ لاہور

۴۔ سماہی معاصر، ج۔ا مضمون ڈاکٹر عصمت ناز ''سفر ناموں کی تاریخ و تدوین'' لاہور جولائی ۲۰۰۱ء

۵۔ سماہی الزبیر، ج۔ا مضمون نفیسہ حق، ''سفر نامہ فن اور جواز'' بہاولپور ۱۹۹۸ء

۶۔ سفر نامہ، نوائے وقت ادبی ایڈیشن مضمون محمد کاظم، ''نجیب احمد سے مکالمہ'' ۱۳ مارچ ۱۹۷۷ء